سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ

حصہ دوم

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ
اردو بازار
لاہور

انما انا قاسم والله یعطی

سوانح قاسمی

یعنی

سیرت سیدنا الامام الکبیر شمس الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی

قدس اللہ سرہ العزیز

جلد دوم

مؤلفہ

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی عم فیضہ

بایماء

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مرتب ہوکر

دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی

(نیشنا پرنٹنگ پریس دیوبند)

فہرست مضامین سوانح قاسمی جلد دوم

سوانح قاسمی

جلد دوم

خدمات و اصلاحات

ذاتی و شخصی حالات، یا خانگی و عائلی تعلقات کے بعد سیدنا الامام الکبیر سے لینے والے نے جو جو کام لئے، اور جن مہمات کی سرانجامی کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا گیا۔ عقلی ترتیب کے ساتھ ہم ان کو چند حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی ہندوستان کی اسلامی آبادی یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ خود اپنی ملت اور قوم کے لئے جو کچھ آپ نے کیا، ہم اس کی تعبیر "داخلی اصلاحات" کے عنوان سے کریں گے، اور غیروں کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی جن خدمات کا ظہور آپ سے ہوا، "خارجی اقدامات و تحفظات" کے عنوان کے نیچے ان کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ پیش کی جائیگی۔

داخلی اصلاحات

یوں تو سیدنا الامام الکبیر کا وجود باجود ہی جیسا کہ آپ دیکھ چکے مسلمانوں کے لئے بجائے خود مجسم اصلاحی نمونہ تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس عام قاعدے کا ذکر کرتے ہوئے کہ

"علماء ربانی کا وعظ تین قسم کا ہوتا ہے، قولی، فعلی، حالی۔ قولی ادنیٰ مرتبہ کا وعظ ہے اور فعلی متوسط، حالی اعلیٰ درجہ کا، اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قولی وہ وعظ ہے جو محض زبان سے احکام خداوندی لوگوں کو سنا دیئے جائیں اور خود ان پر عمل نہ کرے،

اور فعلی وہ ہے کہ خود عمل کرے، بعد میں لوگوں کو ہدایت کرے، یعنی کر کے دکھلائے، اور حالی وہ ہے کہ حال غالب ہو جائے، یعنی نیکی کا کرنا، بدی کا چھوڑنا عادت ہو جائے، اور اس کے کرنے میں تکلف کی حاجت نہ ہو"

پھر دبی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق اپنا یہ مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے

"اصول میں یہ تھا کہ جس فعل کو اول خود نہ کر لیتے تھے دوسروں کو اس کے کرنے کی نصیحت نہ کرتے"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ گفتار کے ساتھ آپ کا وجود سراپا کردار تھا، اور یہی نہیں آگے دبی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب تھا"

جو کچھ اب تک آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، بلاشبہ اس سے مصنف کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے، دین ہی سیدنا الامام الکبیر کی زندگی تھا، اور ان کی زندگی دین کے سوا درحقیقت اور کچھ باقی نہیں رہی تھی، اسی لئے "مسلمانوں کی داخلی اصلاحات" کے سلسلے میں تو گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ عمل کا پیغام بنا ہوا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ اس راہ میں "گفت" سے زیادہ آپ اپنی "رفت" اور "روش" ہی سے کام لیتے رہے جس کا اندازہ ان لوگوں کے بیان سے بھی ہوتا ہے، جنہوں نے آپ کی تقریریں سنی تھیں، مواعظ و خطبات کا بچا کھچا حصہ ہم تک جو پہنچا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام مولویوں کی طرح مسلمانوں کی عملی کمزوریوں کا ذکر ان میں کم پایا جاتا ہے، بلکہ عموماً اسلام کی اصولی باتوں پر آپ کی تقریریں مشتمل ہوتی تھیں۔

گویا زبان سے تو ہمیشہ علم تقسیم فرماتے تھے اور عمل کا وعظ بجائے قول کے عمر بھر صرف اپنے عمل سے کہتے رہے۔ تاہم مسلمانوں کی عملی زندگی سے تعلق رکھنے والی بعض خاص اہم باتوں کے متعلق اس کا پتہ چلتا ہے کہ "کردار" کے ساتھ ساتھ "گفتار" سے بھی ان کی تبلیغ و اشاعت میں کام لیا جاتا تھا، اس سلسلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے مسلمانان ہند کے ان چند غیر دینی رسوم کا

تذکرہ کیا ہے، جن کی گرفت اب تو بحمداللہ بہت کچھ ڈھیلی پڑ چکی ہے، لیکن سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں ان رسوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے تھے، جاننے والے جانتے ہیں کہ اسلامی گھرانوں میں ان کی پابندی کن حدود تک پہنچی ہوئی تھی، خوشی اور غمی، ولادت، شادی، موت کے مواقع پر اس ملک کے دوسرے باشندوں کی کچھ صحبت اور اس سے بھی زیادہ ثروت و دولت کی کثرت نے ان میں اتنی اہمیت پیدا کر دی تھی کہ اسلام کے قطعی مطالبات اور مکتوبات و فرائض سے بھی کہیں زیادہ ان کی پابندی پر سوسائٹی نے ان کو مجبور کر دیا تھا، تکاثر و تفاخر کی معرکہ آرائیوں میں دیوانوں کی طرح لوگ مشغول و منہمک تھے۔ امیر ہو یا غریب چونکہ ہر ایک اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ نتیجہ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے خوشی کی تقریبوں کے متعلق لکھا ہے کہ

"عمر گذشتہ کا سارا سرمایہ صرف کر دیں اور آئندہ عمر بھر کے واسطے قرض کر لیں۔"

اور موت کی غمی کے سلسلہ میں وہی لکھتے ہیں کہ مصارف کے لحاظ سے

"ایسی رسمیں مقرر تھیں جن سے نہ میت کو نفع، نہ اہل میت کو اور مثال یہ صادق آتی تھی "گھر لٹا اور سر پیٹا۔" ملخصاً

خلاصہ یہ ہے کہ ریاء الناس (لوگوں کے دکھانے کے لئے) بیہودہ مصارف کے ایسے ابواب کھلے ہوئے تھے کہ

کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا	جیسے وہ صاف پتھر جس پر مٹی پڑ جائے پھر اس پر بارش برسے اور وہ صاف کا صاف ہی رہ گیا۔

کی مصداق مسلمانوں کی معاشی زندگی بنی ہوئی تھی، حکومت کا زور جب تک موجود تھا، "تلافی" کی شکلیں کسی نہ کسی طرح جائز و ناجائز ذرائع سے چونکہ نکل آتی تھیں، اسلئے جیسا کہ چاہیے کاروبار کے ان بیہودہ طریقوں کے برے نتائج کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ لیکن حکومت کی یہ "جھول" بھی جب اتر گئی تو ننگی پشت سب کے سامنے آ گئی۔ رسی جل چکی تھی، اینٹھن باقی تھی۔ ان عام "رسوم قبیحہ" میں جن میں کچی بات یہی ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں دوسرے ممالک کے مسلمان بھی

مبتلا تھے۔ خاص کر اس ملک کو وطن بنا لینے کی وجہ سے معصیت کا جو پہاڑ مسلمانوں کے شریف گھرانوں کی خواتین مخدرات عفاف پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ "عقد بیوگان" کا مسئلہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ بنی نوع انسانی میں شریک ہونے کے باوجود عام انسانی حقوق سے عورتوں کی محرومی بنی آدم کی تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے لیکن عرب اپنی جاہلیت کے تاریک دور میں جیسا کہ کہا جاتا ہے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے تک کی بے رحمی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کی اس بے رحمی و ناخدا ترسی کی غیر معمولی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ قیام قیامت کی تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ آفتاب کی روشنی ڈھانک دی جائے گی ستارے ماند پڑ جائیں گے سمندر بھبک اٹھیں گے کائنات کے ان ہائلہ حوادث کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کے متعلق پوچھا جائے گا کہ کس قصور میں ان کو قتل کیا گیا یعنی "اذا الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت" کا جو ترجمہ ہے۔ بظاہر اس خاص ترتیب کے سلسلہ میں جنس نازک کی اس مظلومیت کا تذکرہ بتاتا ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے یہ واقعہ بھی ایام قیامت کے جانگسل، روح فرسا حوادث کا ہم پلہ و ہم وزن اور اہمیت میں ان ہی کے مساوی ہے، ان بیشمار جرائم اور گناہوں کے مقابلہ میں اس موقعہ پر عرب جاہلیت کے صرف اسی ظلم کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے؟ اور ایک یہی کیا، عرب کی جاہلی زندگی میں جن فریب کاریوں سے مرد عورتوں کے حقوق کو پامال کرتے تھے ان کی فہرست یقیناً بہت طویل ہے۔[1]

---

[1] خود قرآن میں بھی اس سلسلہ کی بعض چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں ایک دل چسپ چال یہ بھی تھی کہ جن جانوروں کا گوشت عرب کھاتے تھے مثلاً بھیڑ بکریاں وغیرہ ان کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ کہتے تھے کہ زندہ بچے ان کے پیٹ سے جو پیدا ہوں وہ صرف مردوں کے لئے ہیں، ہاں! مردہ بچوں کے گوشت میں مانتے تھے کہ عورتوں کا بھی حق ہے کہتے تھے ما فی بطون ھذہ الانعام خالصۃ لذکورنا ومحرم علی ازواجنا (سورۃ انعام) اس جاہلی دستور کی جو تشریح تفسیر کی کتابوں میں کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نر بچوں کے متعلق کہتے تھے کہ ان پر مردوں کا حق ہے، اسی لئے نر بچوں کو ذبح کر کے صرف مرد کھاتے تھے، اور مادہ بچے جب پیدا ہوتے تو عورتوں سے کہا جاتا کہ ان کو اگر ذبح کر دیا جائے گا تو مویشیوں کا سلسلہ ہی گھر میں ختم ہو جائیگا۔ یوں زندہ بچوں کے گوشت سے عورتیں ہمیشہ محروم رہتی تھیں، اتفاقاً مردہ بچہ اگر پیدا ہوا تب اس کے گوشت میں عورتیں شریک ہو سکتی تھیں ۱۲

لیکن باوجود ان مظالم کے بیوہ عورتوں کو آئندہ نکاح کے قانونی حق سے قطعی طور پر محروم ٹھہرانے کا فیصلہ عرب کے ان جاہلوں نے بھی نہیں کیا تھا ظلم کا یہ پہاڑ اس صنفِ نازک و ضعیف پر اسی ملک میں توڑا گیا، جہاں کی عورتیں مردہ شوہروں کے ساتھ جل کر اپنی غیر معمولی وفاداریوں[1] کا ثبوت پیش کر رہی تھیں گویا ان ہی وفاداریوں کا صلہ یہ تھا کہ عرب کے جاہلوں کی زندہ درگور لڑکیوں سے بدتر حال میں اس ملک کے مردوں نے یہاں کی عورتوں کو ہزار ہا ہزار سال سے تڑپنے اور پھڑکنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا[2]۔ سچ تو یہ ہے کہ قبر میں دفن ہو جانے کے بعد زندہ رہنے کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے، اسی لئے میں تو کہتا ہوں کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے جرم کے واقعی مجرم حقیقی معنوں میں درحقیقت ہمارے ملک کے باشندے تھے، اور ان میں کتنے اب بھی ہیں جن کو اپنے جرم پر اس وقت تک شرافت کا دھوکہ لگا ہوا ہے، اور تعجب اس امت پر ہے جو جاہلیت سے نکالنے ہی کے لئے برپا کی گئی تھی، اس ملک میں پہنچ کر اس نے بھی اپنی معیاری زندگی میں اسی کالے، بدترین کالے ظالمانہ گناہ کو شریک کر لیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہندی رسم و رواج

[1] ستی کی رسم بھی شاید عقد بیوگان کی ممانعت کی طرح ہندوستان کی خاص ملکی رسم تھی۔ ہندی خواتین کے جذبہ مہر و وفا کو اس رسم کا منشاء ٹھہراتے ہوئے ایک صاحب اس ظالمانہ انسانیت سوز رسم کی داد دے رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ "مہر و وفا" کے لئے کیا صرف غریب عورت پیدا ہوئی ہے۔ محبت و انس ہی کا تقاضا یہ تھا تو چاہئے تھا کہ مرد بھی بیوی کے مرجانے کے بعد اس کے ساتھ جل جاتا۔ لیکن یک طرفہ معاملہ خود بتا رہا ہے کہ عرب کے جاہل دھوکہ دے کر عورتوں سے جیسے کھیلتے رہتے تھے۔ اسی قسم کی بازیگری مردوں کے جذبات نے ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی تھی۔ ۱۲ (از بندہ محمد طیب غفرلہٗ) یہ وفاداری نہیں تھی بلکہ اس مظلومیت اور ذلت آمیز زندگی سے چھٹکارے کے لئے جو بیوگی کے زمانہ میں عورت کو گذارنا پڑتی تھی یہ جل جانا ایک مذبوحی حرکت ہوتی تھی۔ عمر بھر کے جلاپے سے بچنے کیلئے وہ ایک ساعت کا جلاپا بہت سہل سمجھتی تھیں۔

[2] خود اس ملک میں بھی دختر کشی کی کب کمی تھی۔ پیدا شدہ لڑکیاں گلا گھونٹ کر اور بعض اوقات آنول نال پیدا شدہ لڑکی کے منہ میں رکھ کر زہر سے ماری جاتی تھیں۔ برطانیہ کی حکومت نے سرکاری قوت سے ان رسوم قبیحہ کو بند کیا ہے پس ہندوستان عورت کی تذلیل و توہین اور بیخ کنی میں عرب سے کہیں آگے تھا۔ عرب میں عورت کی مظلومیت اور اس کی بیخ کنی کی رسوم بد کو حضرت خاتم الانبیاء صلعم کی نبوت کی روشنی نے ختم کیا اور ہندمیں نائبانِ رسول نے عورت کی گلو خلاصی کے لئے مساعی جلیلہ فرمائیں جن میں حضرت قاسم العلوم قدس سرہ نے تو اس مسئلہ کو اپنی زندگی کے نصب العین کا جزو اعظم بنا لیا تھا۔ ۱۲ محمد طیب غفرلہٗ

اور دوسری خصوصیتوں کو تو مسلمانوں نے آہستہ آہستہ اختیار کیا، لیکن جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے خافی خان نے جو یہ لکھا ہے کہ

"در شادی و کدخدائی بہ طور پیروی آن جماعت (یعنی ہنود) بہ عمل می آوردند"

پھر اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ اسلامی دنیا کے کسی حصہ میں اس رسم بد کا رواج نہیں ہے، بلکہ

"وارثان آنہا نیز در عقد کفو می آرند"

اپنے زمانہ یعنی عہد محمد شاہی تک کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ

"در ہندوستان کہ میان شرفائے اسلام کہ مراد از اصل مشائخ عرب است این عمل (عقد بیوگان) در ہندوستان قبیح و عیب دانستہ ترک رویہ آباد اجداد را کہ موافق حکم خدا و مطابق شرع محمدی ست نمودہ اند"

مسلمانوں نے اس ملک میں آباد ہو جانے کے بعد اس طریقہ کو کیوں اختیار کیا۔ اسکی توجیہ کرتے ہوئے خافی خان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ

"اگر دختر شیر خوارہ را بہ عقد کسے در آرند، و شوہر ہماں شب اول بمیرد باز بہ نکاح دیگرے نمی آرند"

اور یہ بیان کرکے کہ شرافت و نجابت کا دار مدار ہندوستان میں چونکہ اسی رسم پر ہے، اور بقول خافی خان کے عام قاعدہ ہے کہ

"چوں شرفا ہر قوم را بہ اشراف ہر دیار ہم جنسی بہ میان می آید، بہ تقاضائے غیرت کہ ما از چہ راہ کمتر ازیں جماعت باشیم تبعیت ایں رسم را سرمایہ آبرو و غیرت و نشان شرافت و نجابت دانستہ ترک رویہ بزرگان سلف نمودہ اند"

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں شرافت و نجابت کا معیار چونکہ عموماً یہی قرار پا گیا تھا کہ بیوہ ہونے کے بعد کسی دوسرے مرد کا منہ عورت نہ دیکھے، اس لئے مسلمانوں نے بھی اپنی شرافت کا معیار اسی کو ٹھیرا لیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] اس وقت

اس مسئلہ کے متعلق دلوں میں کچھ اصلاحی خیالات ابھرنے لگے تھے۔ کیونکہ آخر میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی ان الفاظ میں کیا ہے،

"اگرچہ ایں طریقہ عقلاً وشرعاً محمود نیست و دریں ضمن مفسدہ بسیار حاصل می گردد کہ بہ توضیح آں نہ پرداختن اولیٰ" ص ۲۲

اور یہی وہ زمانہ ہے، جب مسلمانانِ ہند کو چونکاتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ یہ الزام فرماتے ہوئے کہ

"یکے از عادت شنیعہ ہنود آں ست کہ چوں شوہر زنے بمیرد نگذارند کہ آں زن شوہر دیگر کند"

اور یہ بتاتے ہوئے کہ

"ایں عادت اصلاً در عرب نہ بود، نہ قبل از آں حضرت و نہ در زمان آنحضرت و نہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم"

ان تمہیدی امور کے بعد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسلمانانِ ہند کو وصیت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ عبارت ان کے وصیت نامہ ہی کی ہے۔ مگر رسم و رواج نے مسلمانوں کے اندر بھی اس بری عادت کو اس حد تک مستحکم کر دیا تھا، کہ بجائے وصیت کے بے ساختہ اس موقعہ پر وہ دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں، کچھ کہنے سننے کی جگہ فرماتے ہیں۔

"خدا تعالیٰ رحمت کناد برآں کس کہ ایں عادت شنیعہ را متلاشی سازد"

جس سے یوں بھی شاہ صاحب کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے، نیز آگے ان ہی کے ان فقروں سے کہ

اگر ممکن نباشد کہ از عموم ناس مرتفع شود، در میان قوم خود اقامت ایں عادت عرب باید کرد و اگر ایں نیز ممکن نباشد ایں عادت را قبیح باید دانست و بدل	اور اگر عام مسلمانوں سے اس رسم کا ازالہ ممکن نہ ہو تو چاہیے کہ خود اپنے کنبہ میں عرب کی اس عادت کو جاری کیا جائے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو، تو اس عادت کو چاہیے کہ دل سے برا سمجھا جائے۔

اور اس کا دشمن بن جانا چاہئے کہ بری بات کے انسداد کا یہی آخری درجہ ہے۔	دشمن آں باید بود کہ ادنیٰ مراتب نہی منکر ہمیں ست ص۱۳۱ وصیت نامہ

میں نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ان کی پوری عبارت اسی لئے نقل کی ہے کہ اس رسم بد کی گرفت کی سختی جس حد تک ہندوستان کے مسلمانوں میں پہنچ چکی تھی اس کو ان کے مذکورۂ بالا الفاظ سے ہم سمجھ سکیں، ان کا دل تڑپ رہا تھا چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو اس کے ترک پر آمادہ کریں لیکن حالات ان کے سامنے ایسے تھے کہ بظاہر کامیابی سے کچھ ناامید نظر آتے ہیں اسی لئے آخر میں دل سے برا جاننے کی آخری تدبیر کے استعمال تک وہ اتر آئے ہیں اور اسی سے امیر شاہ خان مرحوم کی ان روایتوں کی بھی تصدیق ہوتی ہے جنھیں مسئلہ عقد بیوگان کے سلسلہ میں ہم ارواح ثلاثہ میں پاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نانیہالی قصبہ پھلت کے مستند بزرگوں کے حوالہ سے امیر شاہ خاں یہ روایت کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید جیسا کہ معلوم ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے ہیں، مولانا شہید کی ہمشیرہ کا عقد گھر ہی میں مولانا رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمن صاحب سے ہوا تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد مولوی عبدالرحمن صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور مولٰنا اسماعیل شہید کی ہمشیرہ صاحبہ بیوہ ہو گئیں، اب سنئے خود شاہ ولی اللہ کے گھرانے کا یہ قصہ ہے، مولانا اسمٰعیل کا یہ بیان امیر شاہ خان نے نقل کیا ہے کہتے تھے کہ

> "جب میں اپنی بہن کو مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتا تھا، تو نکاح ثانی کے فضائل قصداً چھوڑ دیتا تھا کہ مبادا میری بہن کو ترغیب ہو، اور وہ نکاح کرے" ص۱۹ ارواح

عقد بیوگان کے مسئلہ میں خانوادہ ولی اللہی کے احساسات کی نزاکتوں کا یہ حال تھا، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی ذہنیت اس باب میں کیا ہی ہو گی، یا کیا ہو سکتی تھی۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کراہتے ہوئے دل کی دعا قبول ہوئی اور

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس رحمت کے مستحق ہوئے جس کی دعا شاہ صاحب نے مانگی تھی، یہ قصہ کافی طویل ہے، سیرت سید احمد شہید میں اس کی تفصیلات پڑھئے، امیر شاہ خان کہا کرتے تھے کہ مولنا اسماعیل شہید سے کسی نے پوچھا کہ اپنے چچا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے زیادہ سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے گرویدگی کی وجہ آپ کیلئے کیا ہوئی؟ تو جواب میں اسی کا حوالہ دیا کہ ان کی صحبت میں یہ جرأت مجھ میں پیدا ہوئی کہ اپنی بیوہ بہن کا عقد دوسرے کر دیں سے تجدید کرا دیا۔ جس کی تفصیل خاں صاحب ہی یہ بیان کرتے تھے کہ پھلت میں "عقد بیوگان" کی طرف مسلمانوں کو ایک دن برسر منبر مولنا اسماعیل شہید توجہ دلا رہے تھے کہ مجمع میں کسی نے عرض کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، مولانا شہید سمجھ گئے، اور منبر سے اتر گئے، فرمایا کہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پھر پوچھنا، یہ کہتے ہوئے سیدھے پھلت سے دلی پہنچے، اور اپنی بیوہ بہن کے قدموں پر عمامہ ڈال دیا، اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگے کہ

"تم چاہو، تو میں وعظ کہہ سکتا ہوں، ورنہ نہیں کہہ سکتا"

وہ بے چاری حیران تھیں کہ قصہ کیا ہے تب کھلے کہ تمہارے عقد نہ کرنے کی وجہ سے میری دعوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مولنا شہید کی ہمشیرہ صاحبہ حالانکہ بیمار تھیں، اور نکاح کی صلاحیت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی، لیکن بھائی کے اصرار سے راضی ہو گئیں، اور پھلت ہی کے مشہور عالم سید شہید کے رفیق مخلص مولانا عبدالحئی سے ان کا نکاح کر دیا گیا[1]۔ واللہ اعلم بالصواب امیر شاہ صاحب کا یہ علم تھا، یا واقعہ یہی تھا کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں

"مولوی اسماعیل صاحب کی بہن کا نکاح ثانی سب سے پہلا نکاح ثانی تھا" ص۲۵

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک کا آغاز حضرت سید شہید اور ان کے رفقاء کی طرف سے ملک میں جب شروع ہوا تو اس سلسلہ میں مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ صاحبہ کا

---

[1] بعینہ یہی صورت حال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کو بھی پیش آئی ہے اور انہوں نے بھی اپنی بڑی بہن کا نکاح اسی طرح کر کے اس دعوت (نکاح بیوگان) میں قوت پیدا کی تھی۔ (محمد طیب غفرلہ)

عقد ثانی پہلا عقد ثانی تھا۔گویا اس رسم بد کے ازالہ کے سلسلے میں یہ پہلا تاریخی نمونہ تھا۔

ارواح ثلاثہ وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر علماء کا ایک طبقہ عقد بیوگان کی کوششوں میں منہمک اور مشغول ہوگیا تھا، کوئی بے چارے مولوی عبدالرحیم صاحب تھے وہ تو "رانڈوں کی شادی والے" مولوی کے نام ہی سے مشہور ہوگئے تھے (دیکھو ارواح ثلاثہ ص۸) اس سلسلہ میں مولوی محبوب علی دہلوی مرحوم کا نام بھی خاص طور پر لیا جاتا ہے[1]۔ مگر بایں ہمہ نسلاً بعد نسل کی راسخ رسم جو دلوں کی گہرائیوں میں پشتہا پشت سے جاگزیں تھی، اس کی جڑوں کا نکالنا آسان نہ تھا، اور تو اور یہی دیوبند کا قصبہ جہاں آج دارالعلوم ہے، اسی کا ایک قصہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی سلسلہ میں نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ پھلت کے ایک عالم باعمل مولانا وحید الدین مرحوم تھے، وعظ ان کا عام طور پر مقبول تھا، خصوصیت کے ساتھ دیوبند کے شیخ زادوں میں غیر معمولی احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ان کی اصلاحی باتیں عموماً لوگ مان لیتے تھے۔ ایک دن دیوبند ہی میں وعظ کہتے ہوئے، مولوی وحید الدین بے چارے نے عقد بیوگان کے مسئلہ کا ذکر بھی چھیڑ دیا، کہتے ہیں کہ ابھی تمہید ہی شروع ہوئی تھی کہ مجلس سے قصبہ کے ایک رئیس شیخ زادے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اور منبر کے پاس بے ساختہ دوڑتے ہوئے پہنچے، مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا، اور برسر مجلس ڈانٹتے ہوئے بولے کہ

"بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو" الخ

---

[1] ابتداء میں حضرت سید شہید کی جہادی مہم میں یہ بھی شریک تھے۔ لیکن بعد میں اپنے بعض اختلافی نقاط نظر کی وجہ سے دہلی واپس آ گئے تھے، ارواح ثلثہ میں ان ہی کے کردار کے ایک غیر معمولی نمونہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ غدر کے ہنگامہ میں کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا فتویٰ تھا کہ حکومت قائمہ کے خلاف شورش وبغاوت جائز نہیں ہے، جب ہنگامہ فرو ہوا تو اپنے اس فتوے کے صلہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے گیارہ گاؤں کا وثیقہ پیش ہوا کہ تمہاری جاگیر میں حکومت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ لکھا ہے کہ وثیقہ کو لے کر اسی انگریز افسر کے سامنے مولوی صاحب نے پھاڑ دیا۔ جس نے وثیقہ پیش کیا تھا، غصہ میں کہہ رہے تھے کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے نہیں کیا تھا بلکہ میرے نزدیک مسئلہ کی شکل یہی رہی تھی۔ ص۳۴ ارواح

بیان کیا ہے، کہ بے چارے مولوی صاحب مرحوم دم بخود ہو کر رہ گئے، کیونکہ مجلس میں کسی کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ شیخ صاحب یہ کیا کر رہے ہو، گویا ساری مجلس شیخ صاحب ہی کی مؤید اور ہم نوا تھی،

بہرحال یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "عقد بیوگان" کی اس تحریک کی مخالفت میں بدبخت مسلمانوں کی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا، حتی کہ سید شہید کی جہادی مہم کی ناکامی تک میں معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ دوسرے اسباب کے "عقد بیوگان" کے سلسلے کی کش مکش کو بھی دخل تھا۔ تاہم حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دعاء اندر ہی اندر اپنا کام کرتی چلی جاتی تھی، سید شہید اور ان کے رفقاء کے بعد جیسا کہ ہمارے مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اضلاع سہارنپور و مظفرنگر وغیرہ میں سیدنا الامام الکبیر کے استاذ حضرت مولانا مملوک علی اور کاندھلہ کے مشہور بزرگ مولانا مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ حسن تدبیر کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مشغول رہے، مولانا مظفر حسین کاندھلوی کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہوئے وہی فرماتے ہیں کہ

"بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً ان ہی سے ہوئی، اور والد مرحوم (مولانا مملوک علی صاحب) نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا۔" ص ۳۱

اور ان بزرگوں کے بعد، جیسا کہ مصنف امام ہی نے اطلاع دی ہے کہ

"ان دونوں بزرگواروں (مولانا مظفر حسین و مولانا مملوک علی) کے قدم بقدم حضرت مولانا (سیدنا الامام الکبیر) نے اس کو پورا شائع کیا۔" ص ۳۱

ان کی اس تاریخی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ "خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را" — "خدا رحمت کند بر آں کس کہ ایں عادت شنیعہ را متلاشی سازد" اس ولی اللہی دعا اور تمنا کی تکمیل بالآخر سیدنا الامام الکبیر کی ذات بابرکات پر ہوئی۔ "اس کو پورا شائع کیا" ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت تو اجمالی الفاظ میں ادا ہوئی ہے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس اجمال کی تھوڑی تفصیل بھی کی ہے، اس کا ذکر

کرتے ہوئے کہ

"نکاح ثانی بیوگان کو ایسا برا اور سخت عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا، اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا تو مارنے مرنے کو مستعد ہو جاتے تھے۔"

ان ہی حالات میں ان کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے استاذ اور بزرگوں کے نقش قدم پر اس سلسلہ میں جدوجہد شروع کی، مواعظ و خطبات میں مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانے لگے، لکھا ہے کہ

"اوّل اوّل لوگوں کے کانوں میں جو نئی بات پڑی، تو چونکے، اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"اور بعض بعض نے خلاف میں منصوبے گانٹھے۔"

واللہ اعلم بالصواب یہ کون لوگ تھے اور اضلاع سہارنپور و مظفر نگر کے کن مقامات کے رہنے والے تھے، بظاہر دیوبند اور نانوتہ ہی کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر باوجود ان منصوبوں کے حضرت والا نے پوری استقامت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مردوں کو سیدنا الامام الکبیر نے چمکار چمکار کر مانوس بنایا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مردوں کے خیال میں تبدیلی پیدا بھی ہوئی تو کیا۔ رسم و رواج کی غیر معمولی تاثیری قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ مردوں سے زیادہ خود عورتوں میں "عقد ثانی" کا خیال عفت و ناموس کے لئے داغ بن چکا تھا، کسی عورت کے لئے اس کا سوچنا بھی اس کے نزدیک گناہ اور پاپ بنا ہوا تھا، مردوں کے بعد ضرورت تھی کہ عورتوں کے اندر رسم و رواج کے پیدا کئے ہوئے غلط جذبات اور جھوٹے احساسات کا قلع قمع کیا جائے، اور یہی حکیمانہ تدبیر حضرت والا نے اختیار کی۔ مردوں کے مجالس کی تقریروں کے بعد اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے، اور بیواؤں کے کانوں تک

مضامین نکاح ثانی پہنچنے لگے"
اور اس سلسلہ میں جدوجہد آپ کی اس نقطہ تک بقول ان کے پہنچ گئی کہ
"کوئی بیوہ اور وارث بیوہ ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے فضائل نہ پہنچے ہوں"
الغرض آپ کی تبلیغ کا جو میدان تھا' اس میں اندر ہو یا باہر اپنی آواز آپ نے پہنچا دی' اور یہ کوشش تو قول اور گفتار کے سلسلہ میں تھی' لیکن آپ سن چکے کہ کہنے سے پہلے جس کی عادت بھی تھی کہ جو بات دوسروں سے کہی جائے' پہلے خود کرکے دکھلا دی جائے خصوصاً اس مسئلہ میں نفسیاتی طور پر اس کی زیادہ ضرورت تھی' سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ
"جب مولانا نے اول اس کام کا بیڑا اٹھایا' تو کسی کو اس کی امید نہ تھی کہ یہ کام چل نکلے گا"
پھر یہی اطلاع دیتے ہیں کہ چل نکلنے کے لئے ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ وہی دیوان جی حاجی محمد یسین مرحوم حضرت والا جن کو اپنا ہاتھ پاؤں کہتے تھے' اور علاوہ برادری کے غیر معمولی محبت و اخلاص نے جنہیں آپ کے گھر کا رکن خصوصی بنا دیا تھا۔ ان کی ایک بیوہ بہن تھیں حضرت نے ان ہی کو آمادہ کیا کہ اپنی بہن کا عقد ثانی کر دیں۔ لکھا ہے کہ
"اول میاں محمد یسین صاحب کی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح ثانی ہوا"
اور صرف ہمشیرہ ہی نہیں بلکہ دوسری جگہ وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حاجی یسین مرحوم کی
"ایک بھاوج بیوہ کا نکاح ثانی بھی کرایا"
سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ حاجی محمد یسین مرحوم
"چونکہ اپنی قوم میں عالی نسب ہیں' اس لئے ان کا یہ فعل زیادہ مؤثر ہوا"
اور دیوان جی ہی کے پیش کئے ہوئے عملی نمونوں کو کافی قرار نہیں دیا گیا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب عقد بیوگان کی تحریک زور شور کے ساتھ

جاری تھی، یہ اتفاقی واقعہ پیش آیا کہ سیدنا الامام الکبیر کی

"ہمشیرہ اسی عرصہ میں بیوہ ہو گئیں"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ آپ کی یہ بیوہ ہو جانے والی ہمشیرہ صاحبہ حالانکہ اولاد والی تھیں لیکن قدرت کی طرف سے اپنے گھر کی طرف سے ایک عملی مثال کے پیش کرنے کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا۔ اور ٹھیک جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی بہن کا عقد کرکے قول کو فعل کے مطابق کرکے دکھایا تھا، سیدنا الامام الکبیر نے بھی جو کچھ دوسروں سے فرما رہے تھے خود کرکے دکھایا اور آل واولاد رکھنے والی اپنی بہن کو عقد ثانی کرنے پر آپ نے راضی فرمالیا' اور ان کا نکاح ہو گیا'[1]

---

[1] اس کا تفصیلی واقعہ جو میں نے اپنے بزرگوں سے بکرات ومرات سنا ہے بعینہ اسی انداز کا ہے جو حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دیوان میں نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے تھے، اثنار وعظ میں شیوخ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت انداز سے سمجھ گئے کہ وہ بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کریں گے۔ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھیریں مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہکر حضرت وعظ کی جگہ سے اٹھے اور گھر میں تشریف لے گئے مجلس اپنی جگہ جمی رہی۔ گھر میں پہنچ کر اپنی بیوہ بہن سے جو عمر میں بڑی تھیں اور کافی ضعیف ہو چکی تھیں پیر پکڑ کر منت سماجت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اور میں احیار سنت کے قابل ہو سکتا ہوں۔ بہن نے گھبرا کر کہا کہ بھائی ایسی کیا بات ہے میرے پیر تو چھوڑ دو میں کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسول کے احیاء کا سبب بنوں؟ فرمایا کہ آپ نکاح فرمالیں' اس پر بہن نے کہا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہو چکی ہوں سر سفید ہو چکا ہے نکاح کی عمر نہیں ہے۔ فرمایا یہ سب صحیح ہے مگر یہ نکاح محض عقد بیوگان کی سنت کے احیار کے لئے ہوگا کسی طبعی ضرورت کی بنار پر نہیں۔ بس اس پر بہن راضی ہو گئیں اسی وقت گھر ہی میں حضرت نے نکاح پڑھا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے۔ مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی۔ حضرت نے بقیہ وعظ شروع فرمایا۔ وہ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہی ہوئے تھے پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ تو نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہوئی ہے؟ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ بیٹھی ہیں ان کے نکاح کے گواہ تو اس مجلس میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح تو ہماری موجودگی میں ہوا ہے اس پر تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے اور پھر یہ تحریک نہایت قوت سے آگے چلی۔ محمد طیب غفرلہ

ظاہر ہے کہ جہاں گفتار کردار کا قالب ان شکلوں میں اختیار کر رہا تھا، وہاں اگر یہ صورت پیش آئی ہو، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ

"پھر تو اس دھوم دھام سے نکاح (ثانی) ہونے لگے، جیسے کنواری لڑکیوں کے۔"

ہمارے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو یہ خبر دی تھی کہ "عقد بیوگان کی عام اشاعت ان ہی کی بدولت ہوئی" اس کا مطلب یہی تھا، کہ عزت و ناموس کے منافی بیوہ عورتوں کے عقد کو جو عموماً سمجھا جاتا تھا، اس غلط نا رواخیال کا ازالہ ہو گیا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

"یہ تو نہیں کہ سب بیواؤں کا نکاح ہو گیا، مگر جو روگ دل کے اندر تھا کہ نکاح ثانی کو ننگ کٹی اور شرافت کے خلاف سمجھتے تھے وہ دور ہو گیا اور عیب نہ رہا۔" ص۱۲

اس میں شک نہیں کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے، زیادہ تر اس کا تعلق اسی علاقہ کے مسلمانوں سے ہے۔ جس میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی تحریک جاری کی تھی، لیکن دارالعلوم دیوبند کے قائم ہو جانے کے بعد سارے ہندوستان میں پڑھ پڑھ کر علماء جو پھیلے، آگے ان کی اور ان کے زیر اثر شخصیتوں کی بدولت ہمارے زمانے تک عقد بیوگان کے رواج میں کافی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔[1]

---

[1] میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس رسم بد کے ازالہ میں جو کچھ کام ہوا، براہ راست دارالعلوم دیوبند اور ان کے ہم خیالوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بلکہ حضرت سید شہید کے ماننے والوں میں ایک طبقہ اہل حدیث کا جو پیدا ہو گیا تھا، اس کی طرف سے بھی کافی جد و جہد ہوئی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم بیوہ کی مناجات وغیرہ کا بھی کافی اثر پڑا، عجیب بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان پچھلے دنوں خود ہندوؤں میں بعض لوگ "بدھوا بواہ" کی تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے اور گو مسلمانوں کی جیسی کامیابی تو ان کو نہیں ہوئی ہے لیکن قدرت کا پھر بھی یہ تماشا ہی ہے کہ جن کو دیکھ کر مسلمان اس مسئلہ میں بگڑے تھے، خود ان ہی میں اس ظالمانہ رسم کے خلاف تجویزیں سوچی جانے لگیں، اور تھوڑا بہت عمل بھی ہونے لگا۔ بہر حال اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر حلقوں کا بھی اس اصلاح میں غیر معمولی حصہ ہے۔ بہار کے جس علاقہ میں خاکسار کا وطن ہے، یعنی ضلع پٹنہ کا مشرقی علاقہ جسے مگدیا مگدھ بھی کہتے ہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں اس علاقہ کی سادات برادری میں سب سے پہلے موضع دسنہ جو مولانا سید سلیمان ندوی کا مولد و منشاء ہے، اسی گاؤں کے ایک بزرگ حافظ تجمل حسین مرحوم نے (باقی صفحہ ۱۶ پر)

کچھ بھی ہو، آج "حقوقِ نسواں" کے نام نہاد مغالطی عنوان کی راہوں سے احترام و اکرام کے پیدائشی حقوق سے صنفِ نازک کی محرومی کا جو عام کاروبار جاری و ساری ہے، جن نسوانی خصوصیتوں کا ذکر بھی انسانی مجالس میں عورتوں کے ناموس و عزت پر ناپاک حملہ سمجھا جاتا تھا، شریف گھرانوں میں جن کا تصور بھی گناہ بن جاتا تھا۔ آج تصویروں اور مجسموں میں ان ہی کو نمایاں کر کر کے بازاروں میں چیزیں فروخت ہو رہی ہیں، تجارت کی گرم بازاری کا واحد ذریعہ زراندوزی کا عام طریقہ صرف یہی رہ گیا ہے کہ اپنی ماؤں بہنوں، بیٹیوں، کی عریانیوں کا تماشا دکھا دکھا کر خریداروں کی توجہ مال کی طرف پھیری جائے۔ صابن کی ایک ٹکیہ کے بیچنے کے لئے، نسوانی عزت و ناموس کو داؤ پر چڑھانے والے چڑھا رہے ہیں۔

حریمِ عفاف کا ایک ایک سرمایہ لٹ رہا ہے، لٹایا جا رہا ہے، لیکن رسوائیوں ہی کو سمجھایا جا رہا ہے کہ عورتوں کی آبرو و احترام کی ضمانت پوشیدہ ہے، جو چیز بجز کثافتوں کے اور کچھ نہیں ہے باور کرایا جا رہا ہے کہ اُسی سے جنسِ لطیف کی لطافتوں میں لطافتوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اور نوعِ انسانی کی پیدائش، نشوونما کا سارا بار جو تنہا اٹھائے ہوئی تھی، اسی غریب عورت پر شاید یہ بھی چاہا جا رہا ہے کہ معاشی جدوجہد کا بوجھ بھی اسی پر لاد دیا جائے۔ مردوں کا بے غیرت طبقہ معاش کی ہلکی ذمہ داری کو بھی چاہتا ہے کہ اپنی پیٹھ سے جھٹک کر الگ ہو جائے۔

(گذشتہ صفحہ سے) عقد بیوگان کا عملی نمونہ اپنی بیوہ لڑکی کا عقد کر کے پیش کیا، اور حافظ صاحب مرحوم سیدنا الامام الکبیر کے خاص وابستوں میں تھے۔ ابتدا میں جیسا کہ اپنی کتاب کمالات رحمانی میں انہوں نے لکھا بھی ہے، حضرت والا ہی سے شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہوا تھا، بعد کو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بھی مستفید ہوئے۔ اگرچہ حافظ صاحب مرحوم کا عملی نمونہ بھی اقدامی جرأت کے لئے کافی نہ ہوا، لیکن آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے برادری کے ایک سربرآوردہ وکیل مولوی محمد حسین مرحوم جو حکومت بہار میں وزارت تعلیم کے عہدے سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی جوان بیوہ لڑکی کا عقد کر کے دوسروں کے لئے راستہ صاف کر دیا، اور اب الحمد للہ کسی قسم کا تعصب اس علاقہ کے مسلمانوں میں عقد بیوگان کی طرف سے باقی نہیں رہا ہے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وقتاً فوقتاً اس کی مثالیں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا کا قانون ہر منزل پر کام کرنے والوں کو انشاء اللہ کام دے گا۔ ۱۲

خدا ہی جانتا ہے کہ حق کے لباس میں "باطل" کا یہ طوفان بنی آدم کے گھرانوں میں جو کھلبلی مچائے ہوئے ہے اس کا آخری انجام کیا ہوگا؟

لیکن عورتوں ہی کے حقوق کا ایک پہلو یہ بھی تھا، جو نا معلوم زمانہ سے سرزمین ہند میں انتہائی ظالمانہ پامالیوں کا شکار رہا ہوا تھا، کسی شور اور ہنگامہ کے بغیر اس بے زبان طبقہ کے حقیقی بہی خواہوں نے چیرہ دستیوں کے آتشیں سمندر سے ان کو نکال لینے میں کامیابی حاصل کی، سچ پوچھئے تو عورتوں کے حقوق کے احیاء اور حفاظت کا صحیح طریقہ یا اسی قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جنس نسوانی کے نجات دہندوں میں ہمارے سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ العزیز کا وجود بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان آبرو باختوں کا غوغائی شیوہ تو آپ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا، جو عورتوں، عورتوں کے حقوق کی چیخوں سے کانوں کو بہرا بنائے ہوئے ہیں لیکن قدرت کے عطا کئے ہوئے حقوق جن کا ہر طبقہ جائز طور پر حقدار تھا، ان کی پامالی آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی "عقد بیوگان" کے مذکورہ بالا کارنامہ کے سوا آپ کو یاد ہوگا، کسی موقعہ پر اس کا ذکر کر چکا ہوں، جلال آباد جو ضلع مظفر نگر کا مشہور قصبہ تھانہ بھون کے نواح میں ہے، اسی قصبہ کے مسلمان باشندوں کی اس بری رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

"وہاں لڑکیوں کا حق نہیں دیا جاتا"

سیدنا الامام الکبیر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کے مسلمانوں کی جائداد کا خریدنا اسی لئے جائز نہ ہوگا، یہ روایت حضرت مرشد تھانوی کی قصص الاکابر میں پائی جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے، حضرت والا کے اس فتوے کی بدولت اپنے شرعی حصہ کے پانے میں کتنی غریب لڑکیاں کامیاب ہوئی ہوں گی جہاں تک میں جانتا ہوں، کم از کم مظفر نگر سہارنپور وغیرہ روہیلکھنڈ کے عام اضلاع کی اسلامی بستیاں اس باغیانہ طرز عمل کی آلودگیوں سے پاک ہو چکی ہیں اور یہ دعویٰ مشکل ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے نقطۂ نظر کو تطہیر کے اس عمل میں دخل نہ تھا، عرض کر چکا ہوں کہ وراثت کے مسئلہ میں بھی جب وہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کر کے آپ دکھا چکے تھے، جسے مسلمانوں کی زندگی میں آپ دیکھنا چاہتے تھے،

تو جیسے "عقد بیوگان" کے قولی و عقلی کے ساتھ آپ کا عملی نمونہ اثر انداز ہوا - اسی طرح وراثت کے باب میں بھی آپ کے طریقہ عمل کی پیروی لوگ کیوں نہ کرتے۔

بہرحال داخلی اصلاحات کے سلسلے میں جیسے عقد بیوگان کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر خانوادہ ولی اللّٰہی کے تقاضے سے متاثر تھے اور ولی اللّٰہی طریقہ کے بزرگوں ہی کے کام کی آپ نے تکمیل فرمائی تھی، اسی طرح جیسا کہ چاہئے بھی تھا دوسرے شعبوں میں بھی اسی خاندان کے دینی احساسات سے آپ کی اثر پذیری ایک قدرتی بات تھی، اسی خاندان کے تعلیم یافتہ بزرگوں کے حلقہ میں آپ کی علمی اور عملی صلاحیتیں بروے کار آئی تھیں، قلب مبارک خانوادۂ ولی اللّٰہی کے اکابر کی عظمت و احترام سے معمور تھا خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کا اور آپ کے تینوں صاحبزادوں، مولانا شاہ عبدالعزیز مولانا شاہ عبدالقادر مولانا رفیع الدین کا ذکر جس غیر معمولی عقیدت و ادب کے ساتھ آپ کیا کرتے تھے - اسی سے آپ کے دل کی کیفیتوں کا اندازہ ہوتا ہے - اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا نام جہاں کہیں آپ نے لیا ہے، وہاں

"حجۃ اللہ فی العالمین، خاتم المحدثین والمفسرین عمدۃ المتکلمین، زبدۃ الناظرین مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ" ص۱۲

یا قریب قریب اسی قسم کے الفاظ بے ساختہ آپ کے قلم سے نکلتے چلے گئے ہیں اور یہی حال ان کا دوسرے بھائیوں کے متعلق تھا - بقول امیر شاہ خان مرحوم جیسا کہ ارواح ثلاثہ میں ہے واقعہ یہ ہے کہ

"ولی اللّٰہی خاندان کے ایک ایک فرد سے محبت اور فدائیت تھی" ص۱۲۱

لیکن ان ولی اللّٰہی بزرگوں میں آپ کی خصوصی محبت و عقیدت کا مرکزی محور جیسا کہ دیکھنے والوں نے نقل کیا ہے، حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک ہستی تھی "امیر شاہ خان مرحوم تو کہا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

"مولانا شہید سے عشق تھا" ص۱۲۱

اور مشہور قاعدہ من احب شیئاً اکثر ذکرہ (جس چیز سے آدمی کو محبت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی وہ زیادہ کرتا ہے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے عشق کے اس دعوے کے ثبوت میں خان صاحب مرحوم حضرت والا کی اس عادت کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ حضرت نانوتوی کا حال یہ تھا کہ مولانا اسماعیل شہید کا آپ کی مجلس میں

"کسی نے تذکرہ چھیڑا تو اس کی بات کاٹ کر خود ان کا تذکرہ شروع کر دیتے تھے"

سچ پوچھئے تو مولانا شہید کی علمی و عملی خصوصیات کے سوا اس غیر معمولی تعلق میں جہاں تک میرا خیال ہے

قاعدہ ہے کہ الجنس الی الجنس یمیل

کا قانون بھی کارفرما تھا۔ سیدنا الامام الکبیر کی ابتدائی زندگی کے حالات میں پڑھ چکے کہ ایک مدت زیادہ بزرگوں کو ایام طالب علمی ہی میں نظر آ گیا تھا کہ جو سیدنا الامام الکبیر کے طالع جبین میں چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ خود آپ کے استاد مولانا مملوک علی ہمارے اسی تعلق کی نسبت سے ان بزرگوں کی باہمی مناسبت اور فطری قرابت کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں مسلمانان ہند کے داخلی اصلاحات کی فہرست دونوں بزرگوں کی اگر ایک ہو تو یہی ہونا بھی چاہئے تھا اور عام طور پر یہی کہا بھی جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جن نئے حالات اور مؤثرات نے جہاں تک میرا خیال ہے اس مسئلہ کو سیدنا الامام الکبیر کے عہد میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار بنا دیا تھا تفصیل کا تو موقع نہیں ہے لیکن اجمالاً اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ غیر اسلامی عناصر چپکے چپکے مسلمانوں کی دینی زندگی میں صدیوں سے جذب ہوتے چلے جا رہے تھے، تا آنکہ ہندوستان میں پہنچ کر وہی مکروہ و معیوب قالب سامنے آ چکا تھا جسے دیکھ کر بے ساختہ سیدنا الامام الکبیر یہ فرمانے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ

"کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں" (مشمولہ فیوض قاسمیہ)

دراصل یہی مسئلہ "سنت و بدعت" کا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ | آگاہ ہو کہ اللہ ہی کے لئے ہے دین خالص

کے قرآنی نصب العین کی طرف واپس لے جانے کے لئے بیرونی آلائشوں سے مسلمانوں کے دین کو پاک کرنے کا سلسلہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے جو شروع ہوا تھا۔ تطہیر و تزکیہ کا یہ کاروبار بہ تدریج آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا حضرت مجدد کے بعد خانوادہ ولی اللہی نے اس راہ میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ تا اینکہ حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنے شیخ طریقت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اس تحریک کو "ہمہ گیر تحریک" بنا دیا۔ سنت و بدعت کی کشمکش کے ان ہی دنوں میں یورپ کی ایک ایسی عیسائی قوم کی حکومت ملک پر قائم ہو گئی، جو صلیبی دین کے قدیم کلیسائی نظام کی تقلید کا جوا اپنی گردن سے اتار چکی تھی، بلکہ ایک طبقہ ان کا مذہبی مسلمات کے متعلق غیر معمولی طور پر بے باک ہو چکا تھا۔ اسی زمانہ میں مسلمانوں کے بعض ممالک میں بھی یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اگلی نسلوں کے دین پر اعتماد کر کے پچھلی نسلیں جن باتوں کو مانتی چلی آ رہی ہیں ضرورت ہے کہ ان پر تنقید کی جائے۔ خصوصاً عرب جو مسلمانوں کا دینی مرکز ہے اس تحریک کا وزن اسی کے بعض خاص علاقوں پر غیر معمولی طور پر پڑ رہا تھا۔ نجد کے باشندے، اور اسی علاقہ کے ایک عالم محمد بن عبدالوہاب اس تحریک کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔

یہی پیچ در پیچ تاثیری اسباب تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہید جس جماعت کو چھوڑ کر "احیاء عمل، بعہد بوذقون" کی قدسی صف میں شریک ہوئے تھے۔ اس جماعت کے بعض افراد تطہیر و تزکیہ کے اس عمل میں حدود سے تجاوز کرنے لگے۔ سڑے ہوئے گوشت کے ساتھ زندہ گوشت پر بھی عمل جراحی کرنے لگے، بے احتیاطیاں اس حد تک ترقی کر کے پہنچ چکی تھیں کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی شرائین اور شہ رگ تک کو نشتر زنی کی دھمکیاں دی گئی تھیں، اور بقول سیدنا الامام الکبیر

"علماء و فقراء جن کو خلاصہ امت کہئے" مکہ فیوض قاسمیہ

اسی خلاصہ امت کو اپنے عمل جراحی کا تختہ مشق ان لوگوں نے بنا کر بنا لیا جائے گویا اصلاح

کی سیزدہ سالہ دینی وعلمی تاریخ کے سارے اوراق ہی کو چاہتے تھے کہ بے دردی کے ساتھ پھاڑ دیا جائے۔

الغرض بدعت کے ساتھ ساتھ ایسی بے شمار چیزوں کو وہ بدعت ٹھہرانے لگے، جن کے بدعت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہی دشواری اور پیچیدگی تھی جس سے سیدنا الامام الکبیر کو دو چار ہونا پڑا، ایک طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ "اسلامی دین" کو غیر اسلامی آلودگیوں سے پاک کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے لیکن اسی کے ساتھ ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی، جب دیکھتے تھے کہ بے تمیزیوں سے کام لے کر نوچنے والے ان چیزوں کو بھی نوچ کھسوٹ رہے ہیں جن کے بغیر مسلمانوں کی دینی زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائیگا، اپنی کتاب توثیق الکلام میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے مسلمان نمازوں میں امام ابوحنیفہ کی تحقیق پر بھروسہ کرتے ہوئے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ جو نہیں پڑھتے ہیں، اُن کے اس طرزِ عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ٹھہرا کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو موردِ طعن جو بنایا جا رہا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے قلم سے اسی موقعہ پر یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

"اس پر بھی امام ابوحنیفہ پر طعن کئے جائیں، اور تارکان قرأت پر عدم جواز صلوٰۃ کا الزام ہوا کرے تو کیا کیجئے، زبان قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں، دیوار نہیں، پہاڑ نہیں۔"

توثیق الکلام صلا

اسی سے ان کے ذہنی اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں چند سطروں کے بعد ارقام فرماتے ہیں، :-

"جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے، دل جل کر خاک ہو جاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں پر آ جائیں، اور دو چار ہم بھی سنائیں، پر آیۂ اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما، واذا مروا باللغو

مورد اکرام" اور احادیث منع نزاع واقع ہیں" الخ۔

حلم و تحمل صبر و ثبات کے جبلی جذبات کا سیدنا الامام الکبیر کے خیال کیجئے اور پھر سوچئے کہ دماغی کوفت کی وہ کیا کیفیت ہوئی جس نے ان الفاظ کے لکھنے پر آپ کو مجبور کیا۔

اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عثمانی مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہم کی زبانی اسی سلسلہ میں بعض لطیفے حضرت والا کے فقیر نے سنے ہیں، جن میں ایک مشہور لطیفہ یہ بھی ہے جو فرقہ اہلحدیث کے سرگرم رکن مولوی محمد حسین بٹالوی کے سوال کے جواب میں حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے۔ بہرحال لطیفہ یہ سننے میں آیا ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب نے (حضرت والا کو لکھا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا کوئی شاگرد بھی وہاں موجود نہ ہو۔ حضرت نے منظور فرما کر جواب تحریر فرمایا کہ تشریف لے آئیں۔ (خطیب) چنانچہ مولانا موصوف حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہی عرض کیا کہ تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں اجازت دے دی گئی،

جہاں تک یاد پڑتا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ بات فقیر نے سنی تھی، فرماتے تھے کہ حجرہ بند کر دیا گیا، ہم طلبہ باہر تھے۔ دونوں میں گفتگو ہونے لگی، ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ اس گفتگو کو کسی طرح سننا چاہئے (میں اسی دروازہ سے لگ کر بیٹھ گیا جس کے متصل ہی اندر یہ حضرات بیٹھے تھے) حضرت والا نے مولانا سے فرمایا کہ دیکھئے جس مسئلہ میں بھی گفتگو فرمانی ہو اس میں دو باتوں کا خیال رکھئے۔ ایک یہ کہ مسئلہ زیر بحث میں حنفیہ کا مذہب بیان فرمانا آپ کا کام ہوگا اور دلائل بیان کرنا میرا کام ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں، اس لئے میرے مقابلہ میں آپ جو قول بھی بطور معارضہ پیش کریں وہ امام ہی کا ہونا چاہئے۔ یہ بات مجھ پر حجت نہ ہوگی کہ شامی نے یہ لکھا ہے اور صاحب درمختار نے یہ فرمایا ہے، میں ان کا مقلد نہیں۔ چنانچہ فاتحہ خلف الامام، رفع یدین آمین بالجہر وغیرہ بہت سے مختلف فیہ مسائل زیر گفتگو آئے اور حسب شرائط طے شدہ مولانا محمد حسین صاحب مذہب احناف

بیان فرماتے اور حضرت والا دلائل سے اسے ثابت کرتے حضرت کی تقریروں کے درمیان مولانا محمد حسین صاحب جھوم جھوم جاتے اور بعض اوقات تو جوش میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے کہتے کھڑے ہونے کے قریب ہوجاتے جب گفتگو ختم ہوچکی تو "محمد طیب" مولوی محمد حسین صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

"مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور مقلد ہو (یعنی بایں زور علم و فراست و قوت استنباط تقلید کے کیا معنی ؟)"

جواب میں حضرت شیخ الہند کہتے تھے میں نے سنا حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں،

"اور مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور غیر مقلد ہو (یعنی مدعی اجتہاد ہو)"

اسی طرح "خلاصہ است" کے دوسرے رکن "فقرا" کے طرز عمل اور طریق زندگی ان کے خاص مشاغل اور احساسات و وجدانات، جن کی اجمالی تعبیر "تصوف" سے کی جاتی ہے، بیباکوں کی یہ ٹولی اس طبقہ پر جن حرفگیریوں اور نکتہ چینیوں سے کام لیکر غلط کے ساتھ صحیح عناصر کو بھی ملیامیٹ کرنے پر تلی ہوئی تھی، گھن کے ساتھ گیہوں کو بھی دینی بصیرت سے محرومی کی وجہ سے پیس رہی تھی۔ گویا دین کی روح ہی کے قبض کرنے کی فکر میں مشغول تھی، سیدنا الامام الکبیر اس طبقہ کے ان رجحانات سے بھی غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ اپنی بعض تحریروں میں بڑی دلسوزیوں کے ساتھ اسی سلسلہ میں "سنت و بدعت" کی صحیح حدود کو سمجھانے کی آپ نے کوشش کی ہے حکیم ضیاء الدین مرحوم (رامپور منیہاران والے) کے نام مطبوعہ مکتوب فیوض قاسمیہ کے مجموعہ میں جو شریک ہے، یہ تو چند صفحات ہی کا یہ خط لیکن "سنت و بدعت" کے متعلق جتنی بڑی چھوٹی کتابیں کم از کم فقیر کی نظر سے گذری ہیں، میرا احساس تو یہی ہے کہ شاید اتنی "جامعیت" کے ساتھ مسئلہ کا تصفیہ کسی ایک کتاب میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ اسی میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ سمجھاتے ہوئے کہ

"علاج میں بعض ایسے امور ہوتے ہیں، بعض اوقات وہ ضمناً اور عرضاً مامور بہ ہوتے ہیں

پر لکھنے یا کہنے میں نہیں آتے، کیونکہ عاقل اور بے وقوف سب ان کے مامور بہ ہونے کو سمجھ جاتے ہیں۔"

پھر مطلب کو مثال سے ذہن نشین فرماتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"جیسے شربت بنفشہ کہ بعض اوقات پنساری کی دوکان وغیرہ پر تیار نہیں ملتا اس صورت میں اس کی ترکیب کا دریافت کرنا پھر اس کے اجزا کا مثل بنفشہ وشکر وپانی وغیرہ اور اس کے سامان کا مثل دیگچی وآتشدان، وغیرہ فراہم کرنا بھی مامور بہ ہوتا ہے، اور اس مامور بہ کو لکھا پڑھا ہر کس وناکس سمجھتا ہے۔"

ص۲۱ فیوض قاسمیہ

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مریض یا مریض کے تیمار دار پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تم نے دیگچی میں دواؤں کو کیوں ڈالا، دیگچی کو چولہے پر کیوں چڑھایا چولہے کے لئے ایندھن کا بندوبست کیوں کیا۔ طبیب نے تو صرف "شربت بنفشہ" کے پینے کا حکم دیا تھا، اور یہ سارا کاروبار شربت پینے کے سلسلے میں جو تم نے انجام دیا ہے اس سے طبیب کے منشار کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ تو بجز جنون کے اور بھی کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔

سیدنا الامام الکبیر نے اسی طبی تمثیل کو پیش کرکے سمجھایا ہے کہ

"ایسے ہی علاج قلبی میں بہت سے امور ہوتے ہیں کہ وہ صراحۃً مامور بہ نہیں ہوتے، ضمناً وعرضاً مامور بہ ہوتے ہیں، اس وجہ سے ظاہر میں وہ بدعت معلوم ہوتے ہیں، حقیقت میں بدعت نہیں۔" ص۲۵

حقیقت یہ ہے کہ حضرات صوفیاء کرام کے بعض مشاغل جن کا حقیقی مقصد "تصفیۂ باطن اور تصحیح نسبت" کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ان کے متعلق یہ شبہ کہ کتاب وسنت میں ان کا ذکر نہیں ملتا، انصاف سے اگر کام لیا جائے تو بآسانی اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، ہاں! بجائے وسیلے کے ان مشاغل اور مقدمات کو دین کے حقیقی مطالبات میں ان کو شریک کرنا، یہ خیال

یا یہ عقیدہ بلاشبہ بدعت بن جائے گا خود سیدنا الامام الکبیر نے یہی لکھا ہے کہ

"اگر ان امور کو کوئی مقصود بالذات سمجھ بیٹھے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت ان کی بجا آوری بوجہ ذریعہ ہونے امور مسنونہ کے نہیں، تو اس وقت میں یہی امور ما مور بہ نہ رہیں گے"

اسی کے بعد فرماتے ہیں کہ

"تو اب لاریب یہ سب امور بدعت ہو جائیں گے"

اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ شرعی مطالبات کی تکمیل کی صورت اگر ان امور کے بغیر کسی وجہ سے کسی کے لئے ممکن ہو جائے تو فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یہ ہوگی کہ

"شربت بنفشہ کہیں تیار مل جائے تو پھر وہ امور جن کو ذریعہ تحصیل شربت بنفشہ قرار دیا ہے، مامور بہ نہ رہے"

اور جیسے صوفیہ کے بعض مشاغل جن کا صراحۃً ذکر کتاب و سنت میں نہیں ملتا، لیکن امور مطلوبہ جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ مثلاً

"توجہ الی اللہ، اور تحصیل محبت خداوندی، اور قلع قمع محبت دنیا اور اہل دنیا اور تہذیب اخلاق و ازالہ خصائل ناشائستہ"

ان امور کے حصول میں ان مشاغل سے مدد ملتی ہے، اور بقول ان ہی کے

اہل عقل و تجربہ کاروں پر پوشیدہ نہیں کہ امور مذکورۃ الصدر کو بیشک ان مقاصد کے حصول میں مداخلت تام ہے۔ اس لئے ضمناً اور عرضاً مامور بہ ہوگئے"

اسی طرح ابتدا مکتوب میں اس قسم کی چیزوں کا مثالاً آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ

"کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ کلام اللہ اس طرح من اولہ الی آخرہ اوراق میں لکھا ہوا تھا، نہ اس میں اس زمانہ تک زیر و زبر ثبت یا حزم ایجاد ہوئے تھے، نہ کتب احادیث یوں تصنیف ہوئیں، نہ تدوین کتب فقہ و اصول فقہ

اور تفسیر کا دستور تھا۔"

طبقۂ علماء کی مذکورہ بالا خدمات یا اسی نوعیت کی جو دوسری چیزیں ہیں سب کو آپ نے اسی مد میں شمار فرمایا ہے جو نصاً اور نصاً مامور بہ ہیں یعنی شریعت کے مطالبات کی تکمیل میں معاون و ممد ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک حکیمانہ فیصلہ سیدنا الامام الکبیر کا وہ بھی ہے، جسے آپ کی کتابوں میں تو میں نے نہیں پایا ہے[1]، لیکن آپ کے خلف رشید مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حیدر آباد کی ایک مجلس میں اس کا تذکرہ فرمایا تھا، خاکسار بھی اس مجلس میں شریک تھا، جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں درج کردوں۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ شرعی مطالبات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ایک حصہ تو ان مطالبات کا ایسا ہے، جس کی روح اور قالب یا معنی اور صورت دونوں ہی کو شریعت نے متعین کر دیا ہے۔ مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ روح اس کی ذکر اللہ ہے۔ اقم الصلوٰۃ لذکری (قائم کرو نماز کو میری یاد کیلئے) شریعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے، اور اسی کے ساتھ نماز کے قالب اور ظاہری صورت کو بھی متعین کر دیا ہے، یعنی ہر رکعت میں قیام کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے کہ ایک رکوع دو سجدے ہوں، وغیرہ وغیرہ، پس اس قسم کے مطالبات میں تو روح اور معنی کے ساتھ شرعی مطالبات کی ظاہری شکل و صورت میں بھی کسی قسم کی ترمیم یا اضافہ کا حق کسی کو نہیں ہے، اسی کے مقابلہ میں شرعی مطالبات ہی کی ایک قسم ایسی بھی ہے، کہ اصل مقصد اور روح کا مطالبہ کر کے قالب اور شکل و صورت کے متعلق آزادی بخشی گئی ہے۔ مثلاً جہاد ہی کے حکم کو لیجئے، اعلاء کلمۃ اللہ اور کفر کی شوکت و قوت کا ازالہ اس حکم کی روح ہے، لیکن شریعت نے اس کا پابند لوگوں کو نہیں بنایا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کا فلاں قالب کیا اختیار کیا جائے، عہد نبوت میں صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہاد کے فرض کو

---

[1] سنت و بدعت کے بارہ میں اس حکیمانہ فیصلہ کی تفصیلات اور نہایت لطیف مباحث مصباح التراویح میں موجود ہیں جو شوق رکھتے ہوں اس میں مطالعہ فرمائیں۔ محمد طیب غفرلہ

اور برچھے، ڈھال، تیر و کمان وغیرہ آلات کے ذرائع کو اختیار کر کے ادا کرتے تھے، لیکن موجودہ زمانہ میں جنگ کے آلات بدل گئے ہیں، آج کل توپ بندوق نئے آلات حرب استعمال ہونے لگے ہیں، پس جہاد کے حکم کی تعمیل کی سعادت ان جدید آلات حرب کو استعمال کر کے جو حاصل کرنے کا یقیناً شریعت ہی کے مطالبہ کی وہ تعمیل کر رہا ہے، اس پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ جہاد میں خلاف مسنون چیزوں کا استعمال کر رہا ہے، اور بجائے سنت کے وہ بدعت کا مرتکب ہے۔

برسوں کی سنی ہوئی بات ہے، جہاں تک حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے بات سمجھ میں آئی تھی، اپنے الفاظ میں میں نے اس کو ادا کر دیا ہے۔ کچھ بھی ہو جو بھی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہے، وہ حضرت والا کی مذکورہ بالا تقسیم کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جہاد کا جو حال ہے، تقریباً کچھ یہی صورت ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ذکر اللہ کی بھی نظر آتی ہے۔ قیاماً وقعوداً و علیٰ جنوبھم (یعنی کھڑے بیٹھے لیٹے) ہر حال میں ذکر اللہ کو مشغلہ بنانے والوں کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، اللہ کے ذکر کا حکم بھی دیا گیا ہے، اذکر اسم اللّٰہ سے ذکر کا مطالبہ بھی قرآن ہی میں پایا جاتا ہے، لیکن ان ذکری مطالبات کی تعمیل کا کوئی خاص قالب نماز وغیرہ مطالبات کی طرح شریعت نے مقرر نہیں کیا ہے، پس جہاد کے حکم کی تعمیل حالات و روقت زمانہ کے لحاظ سے جس شکل میں بھی کی جائے گی، جیسے وہ شرعی مطالبہ ہی کی تعمیل ہے، اسی طرح صوفیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے حالات کے لحاظ سے جو قالب اور جو شکل بھی ذکر اللہ کے لئے جس زمانہ میں بھی اختیار کی ان کے اس طرز عمل کے متعلق یہ سوال کہ شریعت میں ان خاص طریقوں کا پتہ نہیں چلتا، خود ہی سوچئے کہ کیا صحیح دینی بصیرت کا یہی تقاضا ہے؟

بہرحال سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے مسلمانوں کی دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ کا کام تحریک سوئی سے انجام پا رہا تھا، مقابلہ میں صرف وہی طبقہ تھا جو

ما وجدنا علیہ آباءنا الاولین | ہم نے اپنے پچھلے باپ دادوں کو اس پر نہیں پایا

کو حق و باطل کا معیار ٹھہراتے ہوئے اسی پر اصرار کر رہا تھا، لیکن تطہیر و تزکیہ کے اس اصلاحی

میدان میں سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں اترے تو دوسری ٹولی مسلمانوں میں ان لوگوں کی پیدا ہو چکی تھی جو

ان ھذا الا اساطیر الاولین	یہ تو صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں

کا حربہ بے دردی کے ساتھ ہر اس چیز پر بے محابا چلا رہی تھی جو اگلی نسلوں سے منتقل ہو کر پچھلی نسلوں تک پہنچی تھی، فقہ و تصوف کا سارا سرمایہ ان کے نزدیک

ان ھذا الا افک قدیم	یہ محض وہی پہلی بہتان بندی ہے۔

سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ واقعی معیار حق و باطل کا نہ آبائیت ہی کا اول الذکر مسلک ہے اور نہ انکیت کا آخر الذکر طریقہ، ایسی صورت میں اس شخص کا کام قدرتاً بہت زیادہ دشوار ہو جاتا ہے، جو ان دونوں مختلف ذہنیتوں کے اثر سے آزاد ہو کر حق و باطل کے واقعی معیار پر چیزوں کو پرکھنا چاہتا ہو، سچ پوچھئے تو کچھ اسی قسم کی صورت حال سے مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر دوچار تھے، ان کی دینی بصیرت پارہی تھی کہ ان دونوں متخالف ذہنیتوں کے نتائج میں سچ کے ساتھ کچھ جھوٹ اور جھوٹ کے ساتھ کچھ سچ بھی شریک ہے، جھگڑوں رگڑوں کے اس طوفانی ہنگامہ میں حق و باطل کے انبارے اصل حقیقت کو کھینچ کر باہر لانا، اور آدمی خود جو کچھ دیکھ رہا ہو دوسروں کو بھی دکھانا، خود سوچئے کہ یہ کتنا نازک کام ہے، لیکن اسی حد سے زیادہ نازک کام کو جہاں تک آپ کے امکان میں تھا کمال حزم اور غائت احتیاط کے ساتھ آپ انجام دیتے رہے، اسی سنت و بدعت والے مسئلہ میں یہ سمجھانے کے بعد کہ بہت سی باتیں جو بدعت نہیں ہیں،

"ان کو بدعت کہنا اپنا قصور فہم ہے"

لیکن احتیاط دیکھئے کہ صاف لفظوں میں ان امور پر "سنت" کے لفظ کے اطلاق کو بھی آپ پسند نہیں فرماتے، بلکہ مذکورہ بالا تفہیمی کوششوں کے بعد آخر میں لکھتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ

"ہاں بسبب اس کے کہ ظاہر شرع میں یہ مامور بہ نہیں، اس وجہ سے ان کو اگر

سنت نہ کہا جائے اور ملحق بالسنت کہا جائے تو مضائقہ نہیں" صلا فیوض قاسمیہ

اسی زمانہ میں لوگوں نے "سماع موتی" کے پرانے مسئلہ کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنا چاہا تھا، عام مسلمانوں کے قبری کاروبار کے ان قصوں کو دیکھ کر جن کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا یہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ "کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں" بعضوں نے چاہا کہ موتی کے سماع ہی کا انکار کر دیا جائے مطلب ان لوگوں کا یہ تھا کہ بنیادی اڈے ہی کو اڑا دیا جائے۔ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔

پوچھنے والے نے سیدنا الامام الکبیر سے بھی اسی مسئلہ کو دریافت کیا حضرت والا نے چند اوراق میں سوال کا جواب دیا ہے اور "جمال قاسمی" نامی مجموعہ مکاتیب میں یہ جواب شریک ہے، حاصل یہی ہے کہ سماع موتی کا آپ نے انکار نہیں فرمایا، لکھا ہے کہ جب

"قبرستان میں گذرے تو سلام سے دریغ نہ کرے، اور من پڑھے تو ہدیہ مناسب وقت بھی پیش کرے، ورنہ سخت بے مروتی ہے، جو یوں آنکھیں چرائے چلا جائے" صلا

اور یہ تو خیر قول ہے آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں آپ کے مسلک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہ

"بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے، دعا کر کے چلے آتے"

آگے صراحۃً اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے کہ

"سماع اولیاء اللہ کے قائل تھے"

اور قائل ہی نہیں بلکہ آگے لکھتے ہیں کہ

"اگر اکیلے کسی مزار پر جاتے اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا، تو آواز سے عرض کرتے کہ آپ میرے واسطے دعا کریں" صلا ۱۹۲

اسی سلسلہ میں حکیم صاحب مرحوم نے مکمل شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے مزار واقع مرادآباد کے اس قصہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، جسے شاید کسی جگہ میں درج کر چکا ہوں، خلاصہ یہی ہے کہ

مکمل شاہ صاحب کے مزار کے پاس ایک دفعہ حکیم صاحب نے دیکھا کہ سیدنا الامام الکبیر تشریف فرما ہیں۔ حکیم صاحب بھی مزار کے قریب پہنچے اور بے خیالی میں ان کا پاؤں مزار شریف سے چھو گیا۔ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ حضرت والا کو دیکھا کہ بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں کو پکڑے ہوئے مزار سے الگ کر رہے ہیں۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر تو لرزہ طاری ہو گیا اور زمانہ تک اپنی اس جرأت بے جا پر دل نادم رہا۔

اور ایک حکیم صاحب ہی نہیں، مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی یادداشت میں ارقام فرمایا ہے کہ حضرت نانوتوی

"اپنے بزرگوں سے میں نے یہ سنا ہے کہ کلیر شریف لے جاتے تو رڑکی سے پیدل، ننگے پاؤں ہو لیتے، اور شب کو روضہ میں داخل ہو کر کواڑ بند کر دیتے تھے، اور تمام رات حضرت صابر صاحب کے مزار پر تنہائی میں گذارتے تھے۔"

اسی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے مولانا منظور نعمانی مدیر الفرقان (لکھنؤ) کے حوالہ سے روایت بھی درج کی ہے کہ سنبھل سے مرادآباد جاتے ہوئے راستہ میں ایک جھاڑی کے اندر اینٹوں کا ڈھیر سا نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ سیدنا الامام الکبیر اسی راہ سے بیل تانگے پر گذر رہے تھے، جوں ہی کہ تانگہ اس جھاڑی کے سامنے پہنچا، تانگہ کو رک جانے کا حکم دیا، اور اتر کر اینٹوں کے اس ڈھیر کے قریب پہنچے، مراقب ہو گئے، مراقبہ سے فارغ ہو کر تانگہ کی طرف جا رہے تھے اور زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے۔

"اللہ اکبر بہت ہی جلالی آدمی ہیں۔"

مولانا منظور صاحب نے سنبھل کے رئیس نواب عاشق حسین صاحب سے یہ روایت سنی تھی، اس سفر میں حضرت والا کے ساتھ خود نواب صاحب موصوف اور ان کے ماموں منشی حمید الدین مرحوم تھے، جن کا شمار سیدنا الامام الکبیر کے عشاق میں ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے جس شخص کے متعلق اس قسم کے مشاہدات، مکاشفات متواترہ تک

پہنچے ہوئے ہوں۔ مثلاً امروہہ میں سادات کا جو خاندان شیخ آتن کی اولاد میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن "شیخ" کے لفظ کی وجہ سے آتن صاحب کی سیادت پر لوگ شک کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان ہی شیخ آتن کے مزار پر سیدنا الامام الکبیر مولانا احمد حسن امروہوی کے ساتھ تشریف لے گئے جن کا نسبی تعلق شیخ آتن سے تھا۔ مزار پر مراقبہ کے بعد سر اٹھا کر مولانا احمد حسن کو خطاب کر کے حضرت والا[1] فرمانے لگے، کہ

"مولوی احمد حسن اب شبہ نہ کرو اپنی سیادت میں!"

یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں لوگ جو نقل کرتے ہیں' ان کو دیکھتے ہوئے "سماع موتیٰ" کے مسئلہ میں حضرت والا نے جس پہلو کو ترجیح دی ہے' ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور دکر ہی کیا سکتے تھے۔ کیا اپنے مشاہدے کا انکار کرتے؟ لیکن بایں ہمہ اسی مشہور مکتوب میں جس میں "سماع موتیٰ" کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو نقلی و عقلی وجوہ کی روشنی میں پیش فرمایا ہے' اسی میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"عوام اپنے خیال خام میں اولیاء کو قادر اور متصرف یعنی "غنی محتاج الیہ" سمجھتے ہیں' تو اگر اس زمانہ میں اس امکان استماع کا بھی چرچا کیا جائے تو اس خلل سے نفع دینی تو کچھ متصور نہیں' البتہ تقویۃ مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے۔"

اس لئے مصلحت کا تقاضا آپ نے یہی قرار دیا ہے کہ

"مناسب ہے کہ عوام کو فقط طریقہ مسنونہ زیارت قبور کا تعلیم کیا جائے اور اس سے زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دے۔" ص۱۰ جمال قاسمی

یہی آپ کا خیال بھی تھا' دیکھنے والوں کا بیان بھی یہی ہے' کہ اسی کے مطابق آپ کا عمل بھی تھا'

---

[1] اس مکاشفہ کا تذکرہ مولوی اظہار الحق نجیبی عباسی امروہوی نے اپنے خط میں کیا ہے' اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے بعد کو تاریخ امروہہ کتاب لکھی' جس میں شاہی وثائق اور پرانے کاغذات پیش کئے ہیں جن سے شیخ اتن کی سیادت کی تاریخی شہادت بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے ۱۲

حکیم منصور علی خاں نے بزرگان دین کے مزاروں کی حاضری کے متعلق مذکورہ بالا دستور کا جہاں ذکر کیا ہے کہ یہ دستور تو اس وقت تک تھا جب آپ تنہا ہوتے، لیکن بجائے تنہائی کے حکیم صاحب ہی کا بیان ہے کہ

"ہمراہیوں کے ساتھ آہستہ دعا، اور سورتیں پڑھ کر چلے آتے" ص ۱۹۲ مذہب منصور

"زیارت قبور کے طریقہ مسنونہ" سے غرض یہی تھی کہ سلام والی دعا کرکے قرآن پڑھ کر ثواب اس کا صاحب مزار کو پہنچا دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف عام مسلمانوں کے غلط رجحانات کی تصحیح بھی کرنا چاہتے تھے، اور جہاں تک ممکن تھا مصالح کے اقتضاؤں کی بھی رعایت فرماتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ اپنے نزدیک جس چیز کو حق جانتے تھے، اس کو چھپاتے بھی نہ تھے، مصلحت کا مطلب آپ کے یہاں یہ نہیں تھا کہ کسی حقیقت اور واقعہ کا انکار کر دیا جائے خود اس کی مثال دین میں موجود تھی، اسلام سے پہلے شرک کی گرم بازاریوں میں جیسا کہ دنیا جانتی ہے، ملائکہ کے عقیدے کو بہت زیادہ دخل تھا، یہ بات کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کے علاوہ بھی ایسی نادیدہ مخلوق زندہ ہستیاں ہیں جن کے ساتھ نظام عالم کے مختلف شعبوں کی تنظیم و نگرانی متعلق ہے۔ بعض ان میں پانی کے، بعض ہوا کے بعض پہاڑ کے بعض موت کے بعض حیات کے، فرشتے ہیں، اور قدرت ان ہی کو ذریعہ بنا کر کائنات کے سلسلے کاروبار کو انجام دے رہی ہے، سمجھا جاتا ہے کہ فرشتوں یا دیوتاؤں کی پوجا پاٹ اور عبادت کا رواج اسی عقیدے کے غلط استعمال کی پیداوار ہے۔ ایسی صورت میں شرک کے قلع قمع کی یہ ایک کارگر تدبیر ہو سکتی تھی کہ "الملائکہ" کے عقیدے ہی کو دین سے خارج کر دیا جائے۔ مصالح کی وجہ سے اگر کتمان حق جائز ہوتا تو "الملائکہ" کا عقیدہ سب سے زیادہ کتمان کا مستحق تھا۔ لیکن اس عقیدے سے خاموشی تو بڑی بات ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دینی دائرے میں داخل ہونے کے لئے جن امور پر ایمان لانے کا مطالبہ سب سے پہلے کیا جاتا ہے، اسی مطالبہ میں اٰمنت باللّٰہ کے بعد ہی وملائکتہ کا جزء بھی شریک ہے، اللہ بھیجا یہی گیا ہے کہ "الملائکہ" کو منوا کر اس عقیدے

کے استعمال کا جو غلط اور مہلک طریقہ ہے اس سے لوگوں کو روکا جائے۔ اسلام کی تاریخ موجود ہے
مسلمان ملائکہ کے وجود کو بھی اپنے دینی عقیدے میں شریک کئے ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں
جانتا ہوں شرک کی دوسری قسموں میں چاہے مسلمان کتنی ہی تباہیوں کے شکار ہوئے ہوں لیکن
"ملائکہ" یا دیوتاؤں کی عبادت کا رواج شاید ان میں کبھی واپس نہ ہوا، ایسی صورت میں سوچنا چاہئے
کہ "قبری کاروبار" رد کرنے کے لئے قطعی طور پر "سماع موتیٰ" کا انکار اور اسی کو دینی مصلحت کا اقتضا
قرار دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے

یہ دوسری بات ہے کہ شرعی نصوص کا نتیجہ ہی کسی کے نزدیک سماع موتیٰ نہ ہو۔ لیکن یہ جانتے
ہوئے کہ سماع موتیٰ ہی شرعی نصوص کا اگرچہ اقتضاء ہے، لیکن مصلحت کی بنیاد پر اس کا انکار کرنا
چاہئے میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کی بات ہے، جسے قرآن میں

ولاتلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون	حق و باطل کو مت رلاؤ اور جانتے بوجھتے حق کو مت چھپاؤ۔

کے الفاظ میں یہود کا شیوہ قرار دیا گیا ہے، زیادہ سے زیادہ مصالح کی رعایت جائز بھی ہو سکتی ہے
تو اسی حد تک جیسا کہ سیدنا الامام الکبیر نے ارقام فرمایا ہے، کہ زیادہ چرچا اس مسئلہ کا عوام
میں مناسب نہ ہوگا، ان کو بس قبروں کی زیارت مسنونہ کا طریقہ بتا دیا جائے۔

بہرحال جہاں تک سیدنا الامام الکبیر کے اقوال و افعال ہم تک پہنچے ہیں، ان سے یہی معلوم
ہوتا ہے کہ ایک طرف خالق کائنات کے ساتھ آپ چاہتے تھے کہ عبدیت خالصہ، اور کامل بندگی
کا رشتہ اسلام نے جو قائم کیا ہے، اس میں کسی قسم کی لچک پیدا نہ ہو، مسلمانوں کے قدم ٹھیک ایاک
نعبد وایاک نستعین پر پوری قوت کے ساتھ جمے رہیں، تو دوسری طرف پوری نگرانی اس
کی بھی فرماتے رہے کہ اللہ کے انعام یافتہ بندوں کے ساتھ بھی مسلمانوں کا احترامی ربط مضمحل نہ ہو

لہ مکتوبات حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ میں حضرت ممدوح نے بھی اپنے ایک مکتوب میں تصریح فرمائی
ہے کہ ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا یہی مسلک ہے کہ سماع موتیٰ ثابت ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ

صراط الذین انعمت علیہم — اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا

پر قائم و دائم رہنے کی جو آرزو قرآن ہی نے مسلمانوں میں پیدا کی ہے، چاہتے تھے کہ اس آرزو کا زور بھی ان کے دلوں میں کم نہ ہو، ارواح ثلاثہ میں امیر شاہ خان مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت جو نقل کی گئی ہے کہ

"کسی[1] عامی نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت یہ جو بزرگوں کے قریب دفن ہونے کی تمنا کرتے ہیں اس سے کیا فائدہ؟ جب کہ نہ کسی کی برائی کسی پر پڑے گی، نہ کسی کی نیکی کسی کے کام آئے گی۔"[2]

شرکانہ آلودگیوں کے متعلق جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پیدائش میں بزرگوں کے احترامی جذبات کی حوصلہ افزائیوں کو زیادہ دخل ہے۔ ان کے لئے بڑا اچھا موقعہ تھا کہ اس عامی کے عامیانہ خیال کی تائید کرتے ہوئے کہہ دیتے کہ ہاں تم سچ کہتے ہو، لیکن امیر شاہ خاں مرحوم کا بیان ہے، کہ

---

[1] یہ سائل الہ دین نامی قصائی تھا جو دیوبند کا باشندہ تھا اس نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا دور اپنی ابتدائی عمر میں پایا تھا۔ بعد میں حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بیعت ہوا۔ اس نے یہ واقعہ مجھ سے بھی بیان کیا تھا۔ محمد طیب غفرلہٗ

[2] میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے قرآنی نصوص مثلاً لیس للانسان الا ما سعی (نہیں ہے آدمی کیلئے مگر وہی جو کچھ اس نے خود کوشش کی) یا لا تزر وازرۃ وزر اخری (ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا) کو پیش نظر رکھ کر اس قسم کا فیصلہ کر نہ شفاعت ہی سے کوئی مستفید ہو سکتا ہے اور خواہ مالی ہو یا بدنی کسی قسم کی عبادت کا ثواب دوسروں تک نہیں پہنچایا جا سکتا، ظاہر ہے کہ عامیانہ فیصلہ سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، کیونکہ شفاعت کا قانون ہو، یا ایصال ثواب کا ان سب کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ آدمی پہلے ایمانی دائرے میں اپنے آپ کو داخل کر چکا ہو، ورنہ جو مومن نہیں ہے یقیناً نہ اسکے لئے شفاعت ہی مفید ہو سکتی ہے اور نہ ایصال ثواب کے قانون سے وہ مستفید ہو سکتا ہے، پس معلوم ہوا کہ ان امور سے بھی فائدہ ایمانی دائرے میں داخل ہونے کی سعی اور کوشش ہی سے آدمی کو پہنچتا ہے، پس ان صورتوں میں بھی یہی بات صادق آتی ہے کہ اپنی سعی اور کوشش ہی سے وہ مستفید ہوا۔ اگر مومن ہونے کی سعی اور کوشش اس کی طرف سے نہ ہوتی تو یقیناً وہ ان قوانین سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے برعکس اس عامی کے اس غلط احساس کا ازالہ کرنا چاہا، چونکہ بے چارا عامی آدمی تھا، عالمانہ طریقہ سے فہمائش مناسب معلوم نہ ہوئی، بلکہ اس وقت وہ جس کام میں مشغول تھا، یعنی حضرت والا کو پنکھا جھل رہا تھا پنکھا بڑا تھا حضرت کے سوا اور بھی جو اس مجلس میں شریک تھے۔ پنکھے کی ہوا سے مستفید ہو رہے تھے۔ سامنے کی اسی مثال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھنے والے سے دریافت فرمایا کہ "بھائی! تم اس مجمع میں پنکھا کس کو جھل رہے ہو؟" اس نے عرض کیا کہ "حضرت آپ کو" آپ نے پوچھا کہ "ہوا اوروں کو بھی لگ رہی ہے" اس نے کہا کہ ہاں۔ تب یہ کہتے ہوئے کہ "یہ جواب ہے تمہارے سوال کا" اس کو یہ سمجھانے لگے کہ

"حق تعالیٰ کی طرف سے جب رحمت و مغفرت کی ہوائیں چلتی ہیں، تو مقصود وہی بزرگ ہوتے ہیں، مگر حسب قرب و بعد پہنچتی ہیں، سب آس پاس والوں کو بھی۔" ص۱۸۱

کسی مولوی کے چپ ہونے کے لئے خواہ سامنے کی یہ مثال کافی ہو یا ناکافی، لیکن پوچھنے والا غریب عامی آدمی تھا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تسلی اسی مثال سے ہو گئی، اب مسئلہ کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، جس پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں ہے[1]۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مشرکانہ آلودگیوں کے خطرات سے جو خود بھی چوکنا رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ

---

[1] مسئلہ کی اصل علمی حقیقت وہی ہے جس کی طرف اپنے نوٹ میں خاکسار نے اشارہ کیا ہے، بزرگوں کے مکانی جوار سے بھی فائدہ مومن ہی کو پہنچ سکتا ہے، ورنہ ابوجہل خواہ مکہ ہی میں دفن ہوتا، اس غریب کو زمین کی پاکی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ آخر دفن ہونے میں بزرگوں کے جوار اور قرب مکانی کا کوئی فائدہ اگر نہ ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روضہ پاک میں دفن ہونے کی آرزو کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیوں قرار دیتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امیر شاہ خان کی اس روایت پر ایک حاشیہ بھی ارقام فرمایا ہے، جس میں مشہور حدیث هم القوم لا يشقى جليسهم (اللہ والے لوگ ایسی قوم کے لوگ ہیں جن کا ہم نشین ناکام نہیں ہو سکتا) کی عمومیت سے بھی مسلمانوں کے اس خیال کی تائیدی شہادت پیدا کی ہے کہ بزرگوں کے قریب دفن ہونا مردے کے لئے فائدہ بخش ہے، ایک ضعیف روایت کا بھی اس سلسلہ میں لوگ تذکرہ کرتے ہیں جس میں صالحین کے مقبرہ میں دفن ہونے کی ہدایت کی گئی ہے اگرچہ محدثین کو اس روایت کی سند پر اعتماد نہیں ہے (باقی ص۳۶ پر)

اللہ کے معاملہ میں مسلمانوں کی پوری پوری نگرانی کی جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی اللہ والوں کی رفاقت و معیت کے عقیدے کی حفاظت میں کتنی غیر معمولی بیدار دماغی سے کام لے رہا ہے مرنے کے بعد بھی جسمانی رفاقت اور مکانی معیت کی قدر و قیمت کے احساس کی کمی جس کے لئے ناقابل برداشت تھی، سمجھا جا سکتا ہے، کہ ان ہی بزرگوں کے معنوی حسن رفاقت کی قرآنی آرزو کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کیا ہوگی یا کیا ہو سکتی ہے۔[1]

سچ پوچھئے تو "کج دار و مریز"[2] کا یہی مسلک جس میں جام شریعت کے ساتھ سندانِ عشق دونوں ہی کے حقوق اور اقتضاؤں کی تکمیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے، عملی طور پر اس کو نباہنا اور کرکے دکھا دینا، مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کا اپنے عہد خاص میں ایک ایسا کارنامہ ہے، جس سے جیسا کہ چاہئے تھا، مسلمانوں کا نہ تو وہ رجعت پسند آبائی طبقہ ہی مانوس ہو رہا تھا۔ جو حق و باطل کی شناخت میں ہمیشہ یہ دیکھنے کا عادی تھا کہ ان کے والد مرحوم کا خیال کیا تھا، اور نہ بیباکوں کا وہ گروہ اس مسلک کو پسند کرتا تھا، جو مسلمانوں کی دینی تاریخ کے دباؤ سے آزاد ہو کر من مانے فیصلوں پر جری ہو گیا تھا۔ کچھ دن غیر معمولی کشمکش کی

(بسلسلہ ص ۳۵) علامہ سخاوی جنہوں نے مقاصد حسنہ میں اس روایت کا ذکر کرکے محدثین کی تنقید کو نقل کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال ہمیشہ مقبول رہا ہے ولم یزل عمل السلف والخلف علی ھذا "اللہ والوں کے جوار میں دفن ہونے کو اچھا سمجھتے رہے ہیں۔ ۱۲

[1] واقعہ یہ ہے کہ جیسے بلیغ پیرایہ میں ان دونوں تعلقات کا ذکر یعنی اللہ اور اللہ والوں کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ تعلق کی تربیت کیا جانا چاہئے سورہ فاتحہ میں کر دیا گیا ہے شاید دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ خالق کائنات اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے احساس کو پیدا کرنے کے بعد آگے حکم دیا گیا ہے کہ "انعمت علیہم" (جن لوگوں پر خدا نے انعام کیا) ان کے صراط پر مجھے چڑھا دیا جائے اسی کی دعا کی جائے اور سب جانتے ہیں کہ انعمت علیہم اللہ والوں کا گروہ ہے جس کی تفصیل اولٰئک الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولٰئک رفیقا میں فرمائی گئی ہے ۱۲

ع٥ بر من حجابے اور پانی گرنے نہ دے۔ محمد طیب

[2] اشارہ ہے اس شعر کی طرف :۔ در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ✧ ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

مقصد اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو علم و عشق شریعت و طریقت اور حال و قال دونوں کا جامع ہو یعنی عالم بامر اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہو جسے عارف کہتے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

صورتیں دونوں کے ساتھ پیش آئیں لیکن بتدریج آبائی جمود کا زنگ بھی اترتا چلا گیا، اور حد سے گذری ہوئی آزاد خیالی میں آہستہ آہستہ اعتدال کا رنگ پیدا ہوا، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہند کی اکثریت پھر پھر کر دانستہ یا نادانستہ اسی کو مسلمانوں کی صحیح دینی زندگی سمجھنے یا ماننے لگی ہے۔ جسے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے احباب و اصحاب نے قولاً وعملاً اپنے اپنے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا یا آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ اور ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرہ حضرت قطب گنگوہی مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی گرانمایہ خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، امام ربانی حضرت گنگوہی کو مختلف وجوہ سے اس راہ میں کام کرنے کے مواقع بہت زیادہ میسر آئے، اجمالی طور پر مسلمانوں کی دینی زندگی کے اس قالب کی عام تعبیر "دیوبندیت" سے کی جاتی ہے۔ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقی تقلید اور اتباع سنت کے ساتھ صوفیانہ زندگی، اس جماعت کے اہل علم کی خصوصیت ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے مجلدات کی ضرورت ہے، سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں نے حضرت والا کے عقائد اور طریقۂ عمل کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے اور حضرت امام اعظم اور حضرت شیخ محی الدین ابن عربی اور حضرت مجدد الف ثانی کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے علوم کو سب بزرگان دین کے علوم سے اعلیٰ و افضل بتلاتے تھے۔" صـ۱۹۲

اسی کے بعد حکیم صاحب نے اولیاء اللہ کے مزاروں کے ساتھ حضرت والا کے طریقۂ عمل کو بیان کرتے ہوئے مکمل شاہ صاحب مرادآبادی کے مزار والے اس قصہ کا تذکرہ کیا ہے، جسے نقل کر چکا ہوں، حاصل ان کے بیان کا بھی وہی ہے، جو فقیر نے عرض کیا۔

تاہم "مسلمانوں کی داخلی اصلاحات" کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر کے طریقہ کار کے متعلق اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنی اصلاحی کوششوں کو چاہتے تھے کہ حتی الوسع فتنہ و فساد کی کدورتوں سے پاک رہے۔ "فیوض قاسمیہ" میں ایک فارسی مکتوب مولوی عبداللطیف نامی کسی صاحب کے نام ہے، اس زمانہ میں لوگوں نے "علم غیب" کے عنوان سے ایک مسئلہ مسلمانوں میں چھیڑ دیا تھا، یعنی حق سبحانہ و تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف علم غیب کے لفظ کا انتساب شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ مولوی عبداللطیف صاحب نے حضرت سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا تھا، اصل مسئلہ کی تحقیق آپ نے جو کی ہے۔ اس کا ذکر تو انشاء اللہ آپ کے علمی و فکری تنزیات کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ یہاں تو باہمی مشاجرات و منازعات کے متعلق حضرت کے رجحان طبع کو پیش کرنا چاہتا ہوں

جواب کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے ہوئے کہ

"عنایت نامہ رسید اما باعث ملال گردید"

پھر اس قسم کے لاحاصل مباحث کے جھگڑوں رگڑوں کے متعلق آپ کے دلی جذبات کا جو رنگ تھا اس کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

"یارب ایں زمانہ چہ پرشور است کہ بجائے محبت و اخوت اسلامی، عداوتہا برخاستند دراں مسائل کہ متفق علیہا بودند، اختلاف پدید آمد" ص۲۲

اسی قسم کے ایک دوسرے نزاعی مسئلہ کے متعلق اپنے ایک اردو گرامی نامہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے، اور اتفاق پیدا ہو جائے۔ ہاں! بالعموم ابنائے روزگار میں فہم و انصاف ہوتا تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے، مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعداء ہیں کہ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تفریق دگر ہے، کوئی کسی کی

نہیں سنتا اور بے سمجھے دوسروں کی رسم وراہ کو غلط سمجھتا ہے " ص۳۳

الغرض نئے نئے عنوانات سے معمولی معمولی جزئی باتوں کا مسلمانوں میں چرچا کر کے افتراق وشقاق پیدا کرنے کی عام مولویانہ عادت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فطرۃً کارہ تھے، اور اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے، اسی طرح فرعیات میں ایسے اختلافی مسائل جن میں سلفاً عن خلف نقاط نظر کا اختلاف علماء میں رہا ہے ان کے متعلق آپ کا خیال تھا، اور کتنا پاکیزہ خیال تھا، اس قسم کے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ

"طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں"

اور اپنے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہ

"اگر ایک طرف ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے گا"

آگے ارقام فرماتے ہیں۔

"اسلئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں" ص۹ جمال قاسمی

آپ کا ایک طرز عمل اس نوعیت کے مسائل میں عموماً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ان پر بمشکل قلم اٹھاتے تھے، بلا پوچھے اور دریافت کرنے پر کسی نے زیادہ اصرار کیا، تب مجبوراً جو ترجیحی نقطۂ نظر اس خاص مسئلہ میں آپ کا ہوتا اس کو ظاہر تو کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں تقریباً بالالتزام اس قسم کے الفاظ فرماتے چلے گئے ہیں، مثلاً جمعہ کی نماز کے متعلق علماء اہل السنت والجماعت کا ایک قدیم "خلافیہ" یہ چلا آرہا ہے کہ دیہاتی آبادیوں میں اقامت جمعہ جائز ہے یا نہیں۔ میر محمد صادق نے جو غالباً سہارنپور کے رہنے والے تھے اپنے خط کے ساتھ حکیم عبدالسلام صاحب کا اسی مسئلہ کے متعلق ایک سوال بھی بھیجا تھا، اسی کا جواب دیا گیا ہے، "فیوض قاسمیہ" میں یہ بھی شریک ہے، جواب میں جن اجتہادی پہلوؤں کا اظہار فرمایا گیا ہے، ان کا ذکر تو اپنی جگہ پر کیا جائے گا، مگر ان کے سوا

مختلف عبرت آموز اجزاء پر یہ مکتوب مشتمل ہے۔ حکیم عبدالسلام کا ذکر باوجود "معاصرت" کے سنئے
کن الفاظ میں فرماتے ہیں،

"مجمع البحرین شریعت و طریقت، مخدوم و مطاع خاص و عام جناب مخدومنا مولنٰا
سید عبدالسلام صاحب دام برکاتہ"۔"

واللہ اعلم بالصواب یہ مولوی عبدالسلام کون صاحب ہیں، کوئی بھی ہوں۔ لیکن پچھلی نسلوں میں ہم
نے ان کی شہرت نہیں سنی ہے لیکن دیکھ رہے ہیں حضرت والا کن غیر معمولی القاب و آداب کے
ساتھ ان کا ذکر فرما رہے ہیں۔ اسی خط میں کتابوں کی کمی کے سوا اس قسم کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں،
یہ فرماتے ہوئے کہ

"ہیچ مدانی، و این بے سرو سامانی نہ جرأت ہم چو کارہا بدل آمدنہ دل بدست کار
فرماند"۔

آگے لکھتے ہیں

"ذخیرہ ام ہمیں خیالات پراگندہ من اند کہ کیے را اگر بدل می نشیند دگراں را از جملہ
مضامین شعریہ می بیند"۔

پھر یہ لکھ کر کہ حکم کی تعمیل کو ضروری خیال کر کے جواب تو دے رہا ہوں ارقام فرماتے ہیں۔

"اگر پسند خاطر خدام والا مقام افتادہ فہو المراد، ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند، نامۂ خود
را باز خواہم گرفت"۔

یہ فقرے تو خط کی ابتدائی تمہید کے ہیں، مضمون کو ختم کر کے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"ایں است آنچہ ذہن نارسائے من بداں می رسد"

اور خود اپنے متعلق اس مصرعہ کو یعنی

نہ فاضلیم نہ فقیہم نہ مفتیم نہ امام

کو استعمال کر کے لکھا ہے کہ اجتہاد کا حق مجھے حاصل نہیں ہے۔ اسلئے خلق اللہ کو اپنے خیالات کے

ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا اور یہ لکھ کر کہ

"اگر دیگراں ہم صفیر من شوند فبہا"

اسی کے بعد تمہید والے فقرے کا اعادہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

"ورنہ کالائے زبوں برریش خاوند این دفتر بے معنی را برسرِ من زنند"

اور یہ تو اپنے متعلق ہوا' لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی ہے' علم کا باطل زعم دلوں میں تنگی نگاہوں میں کوتاہی کے امراض کو جو پیدا کر دیتا ہے' ان امراض کے علاج کے لئے پڑھنے والوں کو چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ان الفاظ پر غور کریں۔ یہ فرمانے کے بعد کہ "میرے خیالات کو تو میرے سر پر مار دیجئے" بغیر کسی دغدغہ کے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"ہر چہ مناسب وقت دانند' موافق اشارات علماء ربانی کہ از اتباع قرآن وحدیث در نگذرند' اختیار فرمائند"

یہی نہیں آگے یہ بھی ہے کہ

"وایں نیازمند راہم مطلع فرمائند"

اطلاع بخشی کی یہ درخواست کس لئے کی گئی ہے؟ کیا اعتراض وتنقید کے لئے؟ نہیں' سنئے فرماتے ہیں

"تا پیروئ جم غفیر من ہم سرِ خود ہم' ودرپے تفرق کلمہ نشوم" ص۲۹

اور یہ مضمون کسی ایک جگہ آپ کے قلم سے اتفاقاً نہیں نکلا ہے۔ قاسم العلوم کے ایک مقالہ میں بھی یہی ارقام فرمایا گیا ہے۔

"ہر چہ بدل می ریزند بر صفحہ می گذارم اگر راست است آید از انطرف ست' ورنہ من خود بر ہیچ مدانی و نادانی خود گواہم"

حضرت والا کے مضامین اور کتابوں میں بہ کثرت اس کی مثالیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیگی۔

لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ دوست تو دوست' دشمن بھی سیدنا الامام الکبیر کا نام جب لیتے ہیں تو

احترام ہی سے لیتے ہیں مشکل ہی سے اس کی نظیر پیش ہو سکتی ہے کہ مخالفوں نے بھی حضرت والا کی شان میں ان نا ملائم اور ناشائستہ الفاظ کو استعمال کیا ہو' جن کے استعمال کرنے کے عادی اس زمانے کے مناظرہ باز مولوی عموماً ہو گئے تھے ؟

مگر مجھے اس پر اس لئے تعجب نہیں ہوتا کہ حضرت والا نے جس طرزِ عمل کو اختیار فرمایا تھا یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا' قرآن ہی میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا یہ قدرتی طریقہ ہے' مگر ہر ہوسناک کا یہ کام نہیں ہے۔

وما یلقّٰها الا الذین صبروا وما یلقّٰها الا ذو حظ عظیم	اور یہ مقام نہیں عطا کیا جاتا مگر انہیں کو جو صابر و بردبار ہیں اور نہیں دیا جاتا مگر انہیں کو جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔

یعنی ہر دل کو یہ وسعت اور ہر آنکھ کو فراخی کی یہ دولت کب نصیب ہوتی ہے ؟

خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی دینی تربیت و اصلاح کا جو کام بھی آپ کرتے رہے' اس میں دل آزاری یا دوسروں کی تحقیر و توہین سے بچنے کی ممکنہ کوششوں میں بھی ہم آپ کو مشغول پاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ "مداہنت" یا بے جا اغماض و چشم پوشی بھی آپ کی عادت نہ تھی۔ اس کی متعدد مثالیں گذر چکیں کہ ادنیٰ درجے کے عامی آدمیوں کی دعوت بھی سیدنا الامام الکبیر رد نہیں کرتے تھے' اور شاید کر نہیں سکتے تھے۔ دیوبند کے نورباف اللہ دیا کا قصہ گذر چکا ہے کہ برستے ہوئے پانی میں کمل کا جوتا باندھ کر اس غریب کے گھر اندھیری رات میں آپ پہنچے' اور ماش کی روٹی' ماش کی دال جو اس نے پیش کی' یہ جانتے ہوئے کہ انہضام اس کا دشوار ہوگا۔ محض اس کی دل دہی کے لئے نوش جان فرمایا۔ لیکن اسی کے ساتھ دعوتوں ہی کے سلسلے میں مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ کلی دستور تھا کہ

"جاہلوں کی نذر و نیاز کا کھانا کبھی نہیں کھاتے تھے" ص ۱۹۲ مذہب منصور

یہ "نذر و نیاز" کا قصہ جو ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کا کسی زمانہ میں تقریباً کچھ لازمی جزو کی

حیثیت اختیار کر چکا تھا جس کا افسانہ طویل ہے، خانوادہ ولی اللہی کے مصنفین کی کتابوں میں خصوصاً حضرت شاہ عبد العزیز اور مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما کی طرف خودوں کی کتابیں جو منسوب ہیں ان میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر آپ کو سیر حاصل بحثیں ملیں گی۔ اس زمانہ میں شیخ سدو کے نام کے بکرے، اور سید احمد کبیر و حضرت بو علی قلندر کے نام کے گاؤ، حضرت شیخ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی کے نام مرغ، کے چھوڑنے الا آخر میں ان کو ہار پھول پہنا کر ذبح کر کے دعوتوں کے اڑانے کا عام ذوق پھیلا ہوا تھا۔ مشکل ہی سے مسلمانوں کی کوئی آبادی شمالی و جنوبی ہند میں ہوگی، جس میں نذر کئے ہوئے مذکورہ بالا جانور گھومتے پھرتے نہ نظر آتے ہوں، اب تو بجز پیران پیر کے مرغ کے دوسرے قصے کم از کم شمالی ہند میں ختم ہو چکے ہیں[1]۔ اسی خاندان کے بزرگوں کی جد و جہد سے تطہیر و تزکیہ کا یہ کام پورا ہوا۔ شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے نذر کئے ہوئے تمام جانوروں کو ما اھل بہ لغیر اللہ کے تحت داخل کر کے فتوی دیا تھا کہ ان کے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہے جس پر بڑے ہنگامے برپا ہوئے۔ سیدنا الامام الکبیر نے بھی ایک مضمون حضرت شاہ صاحب کے فتوے کی تائید میں ارقام فرمایا تھا، جو قاسم العلوم نامی "مجموعہ مکاتیب" میں شریک ہے، ان شاء اللہ کتاب کے اگلے حصہ میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا، یہاں یہ کہنا ہے کہ خود حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتوے پر طوفان برپا ہوا تھا، وہی زندہ جانوروں کے متعلق جہاں اس پر مصر تھے کہ خدا ہی کے نام پر ان کو کیوں نہ ذبح کیا جائے، جب بھی ان کے گوشت کا کھانا درست نہ ہوگا۔ وہیں یہ فتوی ان ہی کی طرف ان کے مجموعہ فتاوی میں منسوب کیا گیا ہے کہ حیوانی نہیں بلکہ مالیدہ، شیر برنج (کھیر) پلاؤ وغیرہ جیسے کھانے پر اگر فاتحہ دیا گیا ہو تو ان کا حکم کیا ہے، کسی نے دریافت کیا، جواب میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ارقام فرمایا کہ

"اگر فاتحہ بنام بزرگے دادہ شد پس اغنیا را ہم خوردن ازان جائز ست"[2] ص ۴۱

---

[1] یہ مرغ شمالی ہند سے بالکل پرواز کر چکا ہے، یہاں اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا محمد طیب غفرلہ [2] (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

میرے سامنے مسئلہ کی تفصیل نہیں ہے، حاشیہ میں حضرت شاہ رفیع الدین کے جن فتووں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تفصیل کے لئے ان کو پڑھنا چاہئے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی طرف یہ فتویٰ حالانکہ منسوب تھا لیکن باوجود اس کے آپ دیکھ رہے ہیں اس احتیاط کو کہ سیدنا الامام الکبیر اس قسم کے مشتبہ کھانوں سے بھی پرہیز ہی فرماتے رہے، اور دعوت کرنے والوں کی دل شکنی کی پرواہ بھی اس راہ میں نہیں کی جاتی تھی حالانکہ آپ کی افتادِ طبع کے لحاظ سے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ چیز ناقابل برداشت تھی۔

مگر عملی احتیاط کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی دینی کمزوریوں خصوصاً ان کی دینی زندگی کی بیرونی آلائشوں یعنی "بدعات" کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے نقطۂ نظر کا صحیح اندازہ اس حکیمانہ تقسیم سے ہوسکتا ہے جسے اس مسئلہ میں آپ نے اختیار فرمایا ہے، یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ جو حیثیت کسی جاہل مریض کی طبیب کامل کے مقابلہ میں ہوتی ہے، یہی حیثیت امت کے عام افراد کی اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ہے، یہی نہیں بلکہ اسی کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ

"طبیب کامل اور بیمار جاہل میں اتنا فرق نہیں، جتنا خدا و رسول، اور امت میں فرق

(متعلقہ صفحہ گذشتہ) کلام میں نے شاہ صاحب کے اس فتوے کے نقل کرنے میں قصداً تحریفی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف بزرگوں سے کان میں یہ بات پڑی ہے کہ فتاویٰ کا جو مجموعہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں کچھ تصرفات بھی ہوئے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ مطبع مجتبائی کے مطبوعہ نسخے سے مذکورہ بالا الفاظ نقل کئے ہیں چند خاص فتوے شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کے علماء کو خصوصیت کے ساتھ ان جوابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ الفاظ جو ہندوستان میں جو استعمال ہوتے ہیں "نذر بمعنی شرعی است کہ ایجاب غیر واجب است از جنس عبادات مقصودہ بطریق تقرب الی اللہ" فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ان الفاظ کا استعمال بمعنی عرفی است چہ عرف آن است کہ آنچہ پیش بزرگان می برند نذر و نیاز گویند" لکھا ہے کہ شرعی معنی جو نذر کے ہیں "برائے اولیاء اللہ حرام است" اسی طرح فاتحہ میں بھی شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ بتوں اور شیاطین کے آگے بھینٹ چڑھانے کی جو نوعیت ہوتی ہے اگر فاتحہ دلانے والے کی نیت میں بھی کچھ اسی قسم کی باتیں شریک ہیں تو شرک کی حد میں فاتحہ داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایصال ثواب کا مطلب ہے تو جائز ہے۔ مسلمانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ چڑھاوے یا بھینٹ کا اعتقاد اگر رکھتے ہوں تو اس کو اپنے اندر سے نکالیں۔ ۱۲

ہے۔" (فیوض قاسمیہ ملکیم)

یہی حقیقت کی صحیح اور واقعی تعبیر ہے، اور یہ مان لینے کے بعد جیساکہ وہی ارقام فرماتے ہیں، خود بخود یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ

"جیسے بیمار جاہل کو اطبار متقدمین کے قواعد طب اور اطبار زمانہ کے نسخہ جات میں کمی وبیشی یا تغیر و تبدل نا روا ہے اور کرے تو اطبار سے دھتکار ملے، اور تمام خویش واقربا دوست آشنا کی بوچھاڑ پڑے۔"

اسی طرح حضرت والا فرماتے ہیں کہ

"تمام امت (کے لوگ) کو عالم ہوں، یا جاہل، حقیر یا صفا ہوں، یا دنیا دار، خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں عقائد ہوں یا اعمال، قواعد کلیہ ہوں، یا صور جزئیہ، تبدل و تغیر کمی و بیشی کا اختیار نہیں، اور کریں تو خداوند تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغضوب اور خلائق کے نزدیک بحکم عقل مغلوب ہونگے۔"

اس تمثیلی بیان کے بعد ارقام فرمایا گیا ہے کہ دین میں

"اسی تغیر و تبدل اور کمی و بیشی ہی کا نام بدعت ہے۔"

بدعت کی اسی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ "تمام بدعات" کی نوعیت ایک ہی جیسی نہیں ہے اپنی حکیمانہ تقسیم کو ان الفاظ میں پیش فرماتے ہوئے کہ

"عقائد کے تغیر و تبدل کو ہم راس البدعات کہتے ہیں، اور قواعد کلیہ کے تغیر و تبدل کو ہم "بدعت کبریٰ" قرار دیتے ہیں۔"

بدعت کی ان دونوں اہم شکلوں کے ساتھ آخری شکل اسی کی یہ ٹھہراتے ہوئے کہ

"اعمال جزئیہ کی کمی و بیشی کو ہم "بدعت صغریٰ" کہتے ہیں۔"

بعض تشریحی اشاروں کے بعد اپنے اس فیصلہ کو جو قلم بند فرمایا گیا ہے، کہ

"بالجملہ ہم، تغیر و تبدیل عقائد کو جیسے تشیع و خوارج و معتزلہ کیا "راس البدعات"

اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیہ و ماتم داری کو بدعت کبریٰ، اور کمی و بیشی صور جزئیہ کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں "

اور لکھا ہے کہ

"برائی کی کمی و زیادتی بدعات میں بقدر بڑائی و چھوٹائی بدعات کے سمجھتے ہیں "

حاصل یہی ہے، کہ بدعت چھوٹی ہو، یا بڑی، بدعت ہی ہے، اور گمراہی و ضلالت کے سوا وہ اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ لیکن ایک ہی لاٹھی سے بدعت کی ہر قسم کو ہانکنا "شرعی حقائق" کی صحیح یافت سے محرومی کی دلیل ہے، اوروں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس باب میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنے احساس کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے کہ

"وہ بدعتیں جن کو کبریٰ کہئے، بیشتر فرقہائے باطلہ مثل شیعہ و خوارج میں پائے جاتے ہیں اور کمتر بعض جماعات اہل سنت میں نظر آتے ہیں "

اور "اہل سنت کے بعض جماعات" جن میں "بدعت کبریٰ کی بعض قسموں کی نشاندہی حضرت والا نے فرمائی ہے، سمجھا آپ نے یہ کون لوگ ہیں؟ الحمد للہ کہ اب ہندوستان میں ان کا پتہ نہیں ہے سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں یہ لکھ رہے تھے، اس وقت تک ان لوگوں سے ملک پاک نہیں ہوا تھا، یہ بے قید فقیروں کی مختلف ٹولیاں تھیں، جن میں بعض رسول شاہی بعض امام شاہی، بعض نوشاہی، بعض خلیفہ شاہی، وغیرہ وغیرہ بیسیوں ناموں سے نکل پڑی تھیں[1]۔ بہر حال حضرت والا نے بھی "اہل سنت کے ان بعض جماعات" جن کی بدعات کو آپ نے "بدعات کبریٰ" کے ذیل میں شمار کیا ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی موقعہ پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

---

[1] اس زمانہ کے اباحیہ اور بے قید فقیروں کی تاریخ آپ کو کچھ تو امیر شاہ خان مرحوم کے ملفوظات (ارواح ثلاثہ) میں ملے گی، خاکسار نے بھی جو کتاب "اطلاقی تصوف" کے نام سے لکھی ہے، مقالات کی شکل میں اس کا کثیر بیشتر حصہ "الحق" نامی حیدرآباد کے ایک ماہوار رسالہ میں شائع بھی ہو چکا ہے اس میں بھی کچھ ان ٹولیوں کے حالات مل سکتے ہیں، "مناقب العارفین" صوفیہ ہند کا ایک تذکرہ رامپور کے ایک مصنف نے لکھا ہے، اس میں بھی کچھ چیزیں یہ درج ہو گئی ہیں ۱۲

"ان کو اہل سنت والجماعت کہنا محض تکلف و مجاز ہے، فقط باعتبار اشتراک بعض علامات اہل سنت جن کے سبب سے اہل سنت فرقہائے باطلہ مشہورہ سے متمیز ہیں ان کو اہل سنت کہتے ہیں، ورنہ یہ لوگ بھی مثل دیگر فرقہائے باطلہ ایک مذہب باطل رکھتے ہیں۔"

آگے مزار پر فقیروں کے ساتھ مثلاً رسول شاہی فقیروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ کہ

"ان کے یہاں وضو، نماز اور حرمت شراب و بھنگ وغیرہ سے بالکل دست برداری اختیار کی گئی ہے تو سب اصحاب اور ماتم و تعزیہ داری وغیرہ میں شیعہ و خوارج کو متمیز ہیں۔" ص۱۳

بہرحال اس قسم کے دین باختہ طبقات کے سوا مسلمانوں کی عمومیت اور سواد اعظم سنی مسلمانوں کی جو ہے، ان کی بدعات کو "راس البدعات" یا "بدعات کبریٰ" کے مقابلہ میں حضرت والا نے بدعت کی آخری قسم یعنی "بدعت صغریٰ" ہی کے ذیل میں عموماً داخل فرمایا ہے، جن کی برائی بدعت کی دونوں اہم قسموں کے مقابلہ میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے۔ حضرت والا کی نگاہ میں اتنی زیادہ سخت نہ تھی، جتنی شدت بدعت کی ان دو قسموں میں پائی جاتی ہے۔ آپ نے مثلاً بدعت صغریٰ کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جیسے اکثر اہل اسلام میں بعض مواقع پر رسم سلام مسنون موقوف ہو گئی، اور حضرت سلامت وغیرہ الفاظ نو احداث شائع ہو گئے۔"

یہی رسم بدعام مسلمانوں میں جو مروج ہو گئی تھی، حتیٰ کہ عوام سے منتقل ہو کر، خواص کی مجلسوں تک اس کا اثر اس زمانہ میں پھیل گیا تھا، اس کا ذکر کر کے حضرت والا نے لکھا ہے کہ

"سو یہ صورت جزئیہ کی کمی و بیشی ہے۔" ص۱۲

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں میں جو بدعتیں پھیلی ہوئی تھیں ان کو بدعت تو آپ ضرور قرار دیتے ہیں، اور خود عملی حیثیت سے آپ کا اصرار اس باب میں جتنا شدید اور سخت تھا اس کا

پتہ اسی سے چلتا ہے، کہ جاہلوں کے نذر و نیاز کا کھانا خود کبھی نہیں کھاتے، مگر نظری و قولی حیثیت سے ان کی نوعیت بدعت ہونے میں ان امور کے مانند نہ تھی، جنھیں "بدعات کبریٰ" "دراصل ابتداً" آپ سمجھتے تھے۔ علمی حیثیت سے اس سلسلہ میں حضرت والا کی تنقیحات کے تفصیلی جائزہ کا تو یہاں موقعہ نہیں ہے، اس کے لئے تو اگلے حصہ ہی کا انتظار کرنا پڑے گا، یہاں تو عام مسلمانوں یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت یا سنی مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں آپ کے رویہ اور طریقہ عمل کا تذکرہ مقصود تھا، انشاء اللہ اس کے سمجھنے کے لئے اتنی بحث اس مسئلہ پر کافی ہو سکتی ہے۔

اصلاحی دائرے میں "عقد بیوگان" کے مسئلہ کے بعد دوسری چیز تطہیر و تزکیہ کا بھی کام تھا خانوادہ ولی اللّٰہی سے اس تحریک کی ابتدا ہوئی تھی، حضرت مولانا اسماعیل شہید کے زمانہ میں پروان چڑھی، اور ولی اللّٰہی خدمات کا جائزہ قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء کرام کے سپرد ہوا، تو ان بزرگوں نے بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا، لیکن جہاں تک حضرت والا کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے عام مولویوں کی طرح اصلاح کے اس خاص پہلو کو نہ آپ سب کچھ خیال کرتے تھے اور نہ جیسا کہ آپ نے دیکھا بدعت کی تمام قسموں کی نوعیت بھی آپ کی نظر مبارک میں ایک ہی جیسی تھی، اور نہ اہمیت ہی میں سب کا درجہ مساوی تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے حضرت والا کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"مولانا کی نظر اصول پر تھی، نہ فروع پر"

آگے جو یہ لکھا ہے کہ

"خود تو مستحبات بھی ترک نہ کرتے تھے، اور مکروہات سے پرہیز فرماتے تھے، مگر اوروں (یعنی عام مسلمانوں) کے ترک و اختیار سے کچھ پروانہ کرتے مگر فرض و واجب کے تارک پر صبر نہ کرتے اور اس کے روگ کو کمال حکمت سے دور فرماتے" ص ۲۹

یہ بڑے پتہ کی بات ہے، اور قرآن وقیاسات، روایات و حکایات کی امداد سے فقیر جس نتیجہ تک پہنچا ہے اسی نتیجہ تک معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دیدہ مشاہدات اور عملی تجربات سے وہ بھی پہنچے تھے حاصل وہی ہے کہ "فرق مراتب" کی جو قدرتی کیفیت شرعی مطالبات و منہیات میں پائی جاتی ہے، مسلمانوں کی "داخلی اصلاح" کے معاملہ میں یہ نکتہ حضرت والا کی حکیمانہ نظر سے کبھی اوجھل نہ ہوا، چاہتے تو آپ بھی یہی تھے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی غیر دینی آلائشوں سے پاک ہو کر صحیح اسلامی قالب میں ڈھل جائے لیکن بنی آدم کی فطری کمزوریوں کی بھی رعایت فرماتے، فرض و واجب کی حدود میں جو چیزیں داخل نہیں ہیں، ان کے متعلق بہ نسبت قول کے عملی درس آپ کے نزدیک بار آوری کا زیادہ ضامن تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جو یہ لکھا ہے کہ "مستحبات و مکروہات کے ترک و اختیار سے کچھ پرواہ نہ کرتے" اس بے پروائی کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبان مبارک سے ٹوک ٹاک کے عادی اس نوعیت کے امور میں آپ نہ تھے۔ اس باب میں کر کے دکھانا اسی کو کافی خیال فرماتے تھے۔ آپ کے قلمی مآثر میں ان کی ساخت کی بھی جو محترمی ہوتی ہے، جن کا تعلق آپ ہی کی اصطلاح کی رو سے "بدعات غیر مؤکدہ" سے ہے اس کا راز بھی یہی ہے۔ قلم کا درجہ تو زبان کے بعد ہے، زبانی ارشاد سے ان امور میں جو احتیاط سے کام لیتا ہو، سمجھا جا سکتا ہے کہ وہی ان پر قلم اٹھانے کو کس حد تک مفید خیال کر سکتا تھا، کاش اہل قلم کی عمومیت میں بھی شرعی مطالبات و ممنوعات کے "فرق مراتب" کی یہ تمیز پیدا ہو جائے، تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھگڑنے بلکہ لڑنے کے الزام میں مولویوں کی رسوائیاں اس حد تک نہ پہنچتیں، جہاں تک وہ پہنچ کر رہیں۔ مستحبات و مکروہات کے سلسلے کے ایک ایک جزئیہ پر طومار تیار کر دیا گیا ہے، اور علمی مباحث سے زیادہ بسا اوقات پھکڑ بازیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی،

عفر اللہ لنا ولہم فتلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت

لیکن اسی کے ساتھ سوانح مخطوطہ کے مصنف کے بیان سے ایک نئی آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے یعنی اخذ و ترک یا کرنا نہ کرنا جن باتوں کا استحباب و کراہت کی حدود سے تجاوز نہ کرنا

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو حضرت والا کی اصطلاح کی رو سے کہہ سکتے ہیں کہ "بدعات صغیرہ" کے متعلق جہاں آپ کا یہ طرز عمل تھا، وہیں ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اصلاحی نظام نامہ میں علاوہ ان کے اس قسم کی چیزیں بھی شریک تھیں جن پر بدعت کے اصطلاحی لفظ کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا تھا، لیکن امتداد زمانہ سے بدعت کا رنگ ان میں پیدا ہو چلا تھا، یا بجائے بدعت کے اسلامی تعلیمات کے دوسرے واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کی طرف بھی توجہ کی جائے[1]۔

---

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ اخروی ثواب و عقاب کے نتائج کن اعمال و افعال پر مرتب ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف وحی و نبوت ہے، اسی لئے کسی قول و عمل حرکت و سکون پر یہ حکم لگانا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے یا ناخوش، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ اسی لئے بدعت نام ہے اسی اضافہ کا جس کے متعلق اخروی ثواب و عقاب یا حق تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا خیال شریعت کے توسط کے بغیر قائم کر لیا جائے۔ ورنہ اس خیال کے بغیر کسی قسم کا کام اگر کیا جائے تو محض اس لئے کہ عہد نبوت و قرون مشہود لہا بالخیر میں اس کا پتہ نہیں چلتا، ہم اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ الدین کے اس مجموعہ میں اضافہ نہیں ہے جس کے ساتھ خدا کی رضامندی و نارضامندی کا تعلق ہوتا ہے۔ من احدث فی امرنا هذا (جس نے ہمارے اس کام میں نئی بات کا اضافہ کیا) بدعت کی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اشارہ فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ دین میں اضافہ یہی بدعت ہے، حضرت الاستاذ الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ اسی بنیاد پر فرمایا کرتے تھے کہ شادی بیاہ وغیرہ جیسی تقریبوں میں جن رسوم کا اضافہ مسلمانوں نے کر لیا ہے۔ مثلاً گشت کرانا، روشنی اور بھی واہی تباہی باتیں تو ان رسوم کو بدعت کی مد میں ہم اس لئے داخل نہیں کر سکتے کہ ان اعمال و افعال سے ثواب و عقاب کا مسلمانوں کے نزدیک تعلق نہیں ہے، اس کوئی نہیں سمجھتا کہ دولہا کو گھوڑے پر بٹھا کر شہر میں گشت اگر نہ کرایا جائے گا تو گناہ ہوگا یا کرنے پر ثواب ملے گا، فرماتے تھے کہ ان رسوم کو بجائے بدعت کے اسراف فضول خرچی لغو یعنی اعمال وغیرہ کی مدوں میں ہم داخل کر سکتے ہیں کہ شریعت ان امور کو بھی پسند نہیں کرتی بلکہ چاہئے تو اس کو اطبی و حماقت کی مد میں شریک کر دیجئے۔ اپنے آپ کو احمق بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا یہ بھی غیر شرعی فعل ہے۔ اسی طرح فرماتے تھے کہ میت کے متعلق رسوم کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ موت کا تعلق عالم آخرت سے ہے، کرنے والے ثواب و عقاب کے خیال سے نہ بھی کریں لیکن موت کی خصوصی کیفیت میں اس کی صلاحیت ہے کہ رفتہ رفتہ اس خیال کو عوام میں پیدا کر دے کہ فلاں رسم کے کرنے سے مردے کو آرام و سکون ملتا ہے نہ کیا جائے گا تو دکھ ہوگا، پھر یہی ثواب و عقاب کا خود تراشیدہ عقیدہ ہے جو اعمال و افعال میں بدعت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

دیوبند کے مسلمانوں نے باہمی معاہدے کی شکل میں حضرت والا کے سامنے ایک اصلاحی وثیقہ پر دستخط کئے تھے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی وثیقہ کا ذکر کرتے ہوئے، اس کے دوسرے مندرجات و مشتملات کے ساتھ لکھا ہے کہ حسب ذیل امور بھی اس میں تھے یعنی بیاہ شادی میں جو مسرفانہ فضول رسوم مقرر ہیں، اور ان کی پابندی سے بہت تکلیف اور زیر باری اٹھانی پڑتی ہے، بالکل موقوف کر دیئے جائیں گے، اسی طرح عیادت (بیمار پرسی) کے سلسلے میں رسوم بڑھاتے ہوئے لوگوں نے اس نوبت تک ان کو پہنچا دیا تھا کہ علاج و معالجہ کے ناگہانی مصارف کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مالی مصیبت اس خاندان پر ٹوٹ پڑتی تھی جس میں اتفاقاً کوئی بے چارا مرض کا شکار ہو جاتا تھا۔ خصوصاً مستورات ڈولوں میں کس کس کر یکے بعد دیگرے بیمار کے گھر پر یلغار کر دیتی تھیں۔ ان کی خاطر و مدارات سواری شکاری کے قصوں سے لوگوں کا ناک میں دم آگیا تھا، لیکن رسوم کی انہیں زنجیروں کا توڑنا آسان نہ تھا۔ دیوبند کے مسلمانوں کو اس پر راضی کر لیا گیا تھا کہ "مستورات جو مریض کی عیادت کو جاتی ہیں، اور اس میں بیمار، اور تیمار دار دونوں کو تکلیف ہوتی ہے" اس رسمی دستور کو ترک کر دیں گے۔ مطلب یہی تھا کہ عیادت کے مسنون طریقہ پر مزید اضافے جو باعث گرانی بن گئے ہیں، وہ چھوڑ دیئے جائیں گے

عیادت کے بعد پھر تعزیت اور پرسہ کے مراسم کے طول طویل قصے تھے۔ مرنے والے کے مرنے کے بعد پھر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے معاشی موت کی کش مکش میں پس ماندوں کو مبتلا ہونا پڑتا تھا، سوم، چہارم، دہم، چہلم، چھماسی، برسی کے نہ ختم ہونے والے دعوتی مطالبات

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) بدعت کی یہی روح جو اسے افترا علی اللہ والرسول کی حد میں داخل کر دیتی ہے۔ وہ مادہ ہے جس کی وجہ سے مذہب نے اس کو غیر معمولی قرار دیا ہے۔ ۱۲ (حاشیہ کا مضمون بالکل حق ہے لیکن اگر اس کی تعبیر اس طرح کی جاوے کہ شادی بیاہ میں جو لایعنی امور انجام دیئے جاتے ہیں انہیں تو رسوم سے تعبیر کیا جائے اور غمی میں جو فضولیات و خرافات برتی جاتی ہیں انہیں بدعات کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے حضرت گنگوہی کی یہی اصطلاح تھی کہ رسوم کی دو قسمیں ہیں کہ ایک بدعت ہو اور ایک مباحات۔ مثلاً امور لایعنی دو قسمیں ہیں ایک رسوم اور ایک بدعات یہ اصطلاح زیادہ واضح رہے گی حضرت الاستاذ الکشمیری قدس سرہ حضرت گنگوہی کی اصطلاح کی تفصیل و تشریح فرمایا کرتے تھے جس کا مصنف محترم نے حاشیہ میں حوالہ دیا ہے) محمد طیب غفرلہ

تھے، جو برادری والوں کی طرف سے مرنے والے کے پس ماندوں پر عائد ہو جاتے تھے، اور جس راہ سے بھی ہو، برادری کے ان مطالبات کی تکمیل پر غریب مجبور تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ تعزیت کے سلسلے میں بھی ساری غیر شرعی رسوم کو ختم کر دیا جائے گا، اسی کے ساتھ ایک دفعہ اسی "باہمی معاہدے" کے وثیقہ میں یہ بھی تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف کے بجنسہ الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں کہ،

"مستورات کے لباس میں جو اسراف ہو رہا ہے اس کی اصلاح کی جاوے"۔

یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ مولویوں کے عام طبقہ کی نظر زیادہ تر ان ہی امور پر مرکوز ہوتی ہے جنہیں اصطلاحاً "بدعات" کہتے ہیں۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں سیدنا الامام الکبیر کے اس اصلاحی نظام نامہ کی مذکورہ بالا دفعات کو، جیسا کہ میں نے عرض کیا ان میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں، جن میں حالاً یا مآلاً "بدعت" بن جانے کی صلاحیت تھی، مگر اسی کے ساتھ ہم ان ہی میں ان اجزاء کو بھی پاتے ہیں، جن کے انسداد کی طرف اسی کی توجہ ہو سکتی ہے جس کی نظر میں معاد کے ساتھ مسلمانوں کے معاش اور معاشی مشکلات کو بھی کافی اہمیت ہو۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھوکوں کو کھانے پر اور پیاسوں کو پینے پر آمادہ کرنے کے لئے آج کل ترقی و عروج وغیرہ کے عنوانوں پر وعظ فرمائیوں کا رواج عموماً جو جاری ہے اور انسانی جبلت جو نظرتاً شح (لالچ) اور ہلوعیت (بے صبری) کے تقاضوں کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ اسی کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ جس حد تک اس جذبہ کا بھڑکانا ممکن ہو، کوشش کا دقیقہ اس میں اٹھا نہ رکھا جائے لالچی بنو اور لالچی بنتے چلے جاؤ۔ حریص بنو اور بنتے چلے جاؤ، ان ہی عنوانوں پر دھواں دھار تقریریں کی جاتی ہیں، خطبے دئیے جاتے ہیں، منبر اور کرسیوں کے ساتھ ساتھ اب تو محراب و منبر تک حرص و آز کے ان ہی مواعظ سے ہل رہے ہیں۔ العیاذ باللہ شاید میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ سیدنا الامام الکبیر کا بھی کوئی حصہ وعظ و پند کے اس عجیب و غریب حصے میں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کے عہد مبارک ہی میں دعاۃ و ہداۃ کا ایک بڑا طبقہ حکومت مسلط کے زیر اثر مسلمانوں کو اسی قسم کے وعظ سنانے لگا تھا۔

خوردہ تا تھا اور دوسروں کو رلاتا تھا۔ چھاتیاں پیٹی جارہی تھیں۔ کپڑے پھاڑے جارہے تھے۔ مخاطب قوم تھی، اور نصب العین ترقی "ترقی" کا لفظ تھا۔ اکبر مرحوم جسے دیکھ دیکھ کہا کرتے تھے۔

ترقی کے بجتے کیا کیجئے
کمیٹی میں چندے دیا کیجئے

ظاہر ہے کہ جس لاہوتی دانش اور ملکوتی فرزانگی سے سیدنا الامام الکبیر فطرتاً سرفراز تھے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کے انتساب کی جرأت کون کرسکتا ہے۔ میرا خیال تو ہے کہ ان نئے عنوانوں پر وعظ کہنے والے غریبوں کو شاید خود بھی اس کا شعور نہ تھا کہ حقیقی مضمون ان عنوانوں کا بالآخر کیا ٹھہرتا ہے "دنیا کے جس حد تک لالچی بن سکتے ہو، بنتے چلے جاؤ" انسانیت کا یہی سب سے بڑا کمال اور نقطۂ عروج ہے۔ بھلا کوئی سنجیدہ آدمی اس موضوع پر وعظ کہنے کے لئے بہ ثبات عقل و ہوش ایک لمحہ کے لئے بھی آمادہ ہوسکتا ہے، مگر لفظی دل آویزیوں نے معانی سے ان کی توجہ پھیر لی تھی۔ اپنے نزدیک وہ یہی سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کے آگے کسی بڑے نصب العین کو پیش کر رہے ہیں۔ اسی لئے میں ان بزرگوں کو قابل معافی سمجھتا ہوں جنہوں نے دنیا طلبی کے مواعظ سے مسلمانوں کے کانوں کو بہرا بنا دیا تھا۔ غفر اللہ لہم۔ نیت بہر حال ان کی اچھی تھی اور اب بھی ترقی و تعلی کی ان ہی پرانی لکیروں کو جو پیٹے چلے جارہے ہیں، بجز اس کے کہ ان کی عقلوں پر ترس کھایا جائے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض یہ کر رہا تھا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کے بیان کے مطابق دیوبند کے مسلمانوں کے راضی نامہ کے مذکورہ بالا دفعات کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے، کہ حکومت کے دور میں اپنی حاکمیت کے زمانہ کے رواجوں، اور دستوروں کے نباہنے کا جذبہ مسلمانوں پر جو مسلط تھا، جلنے کے بعد بھی رسی کی اینٹھن باقی تھی۔ اسی کی گرفت سے دل تو سب ہی بے کل اور بے چین تھے۔ لیکن زبان سے اپنی زبوں حالیوں کے اقرار پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ حمیت اور غیرت کا مسلمانوں کے شاید یہی تقاضا تھا۔ مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا،

جو کچھ دلوں میں تھا' جرأت کر کے سیدنا الامام الکبیر نے چاہا کہ عمل میں بھی اس کو داخل کر کے پھیلاؤ کو چادر کی وسعت کے مطابق کر دیا جائے اور گو بظاہر اصلاح کے ان شعبوں کا تعلق ' اگرچہ معاش ہی سے تھا لیکن عرض کر چکا ہوں کہ اسراف و تبذیر وغیرہ کے قوانین کو نافذ کر کے اسلام نے گویا اس حد تک مسلمانوں کی دنیا کو بھی دین اور دین کا ایسا جزء بنا دیا ہے۔ جس کی خلاف ورزی سے معاش کے ساتھ مسلمانوں کا معاد بھی متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض دفعات اسی راضی نامہ کی ایسی بھی ہیں' جن میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' دین میں خود تراشیدہ اضافہ بن جانے کی بھی کافی صلاحیت تھی' ایسی صلاحیت کہ دین کا کوئی سچا ہمدرد اور خادم صادق اس سے قطع نظر نہیں کر سکتا' جیسا کہ میت کے متعلقہ رسوم وغیرہ کے حال سے ظاہر ہے'

خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی داخلی اصلاح کے سلسلہ میں بیان کرنے والوں نے یہ اور اسی قسم کی باتیں نقل کی ہیں' یہ راضی نامہ جو دیوبند کے مسلمانوں کے درمیان حضرت والا کی تحریک سے طے ہوا تھا' سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس کا تذکرہ کر کے یہ اطلاع بھی دی ہے' کہ صرف "کاغذی راضی نامہ" بن کر نہیں رہ گیا تھا' بلکہ وہی لکھتے ہیں کہ اسی کی بدولت'

"شادیوں میں بھی فضول خرچی اکثر موقوف ہو گئی' اور رسوم کی پابندی بالکل نہ رہی"

اسی طرح مسلمانان ہندپر خاندان کے کسی رکن کی موت جس نہ ختم ہونے والی مالی مصیبت کے طوفانی دہانے کو کھول دیتی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے وہی خبر دیتے ہیں کہ

"میت کے رسوم بہت کم ہو گئے' اکثر جگہ سے سیوم و دہم و بستم و چہلم موقوف ہو گیا"

لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ عمل کی دنیا سے منقطع ہونے والوں کو شرعاً عملی دنیا کے رہنے والوں سے جو امداد مل سکتی تھی فیض کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا تھا' بدقسمتی سے رسوم کے انسداد کے بعد بسا اوقات کچھ اسی قسم کی صورت حال پیش بھی آجاتی ہے' اگرچہ رسمی قالب میں مرنے والوں کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ چونکہ زیادہ تر سوسائٹی کے دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے عموماً

مروجہ رسوم سے بھی سچ پوچھئے تو مرنے والے کی روح کو مستفید ہونے کا موقعہ نہیں ملتا تھا،
بہرحال سیدنا الامام الکبیر کی تحریک سے ایک طرف رواجی دستور کی زنجیریں جہاں کاٹی اور توڑی جارہی
تھیں، وہیں دوسری طرف جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے لکھا ہے کہ

"ایصال ثواب میت کا پورا پورا طریقہ شرع شریف کے موافق ہوگیا"

یعنی رسمی قیود سے آزاد ہوکر مرنے والوں کے نام جن مالی اور بدنی عبادات کی راہوں سے
ثواب پہنچانے کی شرعاً گنجائش تھی، اس کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ باقی رکھنے کی
کوشش کی گئی اور آج تک بحمد اللہ اس کا سلسلہ باقی ہے، چاہئے بھی یہی کہ ان طریقوں کو شرعی
حدود کی پابندی کرتے ہوئے باقی رکھا جائے۔ عمل کی دنیا سے رخصت ہوجانے والوں کے ساتھ
حسن سلوک کی بھی ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور اسی تدبیر سے زندوں اور مردوں کے درمیان گونہ
ایک قسم کا تعلق بھی قائم رہتا ہے، بہرحال اہل السنت والجماعت یا سنی مسلمانوں میں ایسے رسوم
اور رواج جن کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی، ان سے تو سنیوں کی دینی زندگی کو پاک و صاف کرنے میں
جرأت اور کامل عزم و ارادہ کا اظہار آپ کی طرف سے ہوتا تھا، لیکن ایسے مسائل جن میں علماء
اہل السنت والجماعت میں علمی اختلافات تھے۔ یعنی اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ہر فریق کتاب و
سنت ہی کے شواہد پیش کیا کرتا تھا، سیدنا الامام الکبیر ان مسائل میں اگرچہ خود اپنی ترجیحی رائے
بھی رکھتے تھے۔ پوچھنے والے پوچھتے تو وجوہ کے ساتھ اپنی رائے سے لوگوں کو آگاہ بھی کردیا
کرتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ آپ کا اصولی مسلک اس قسم کے اختلافی مسائل میں یہ بھی تھا جس کا
ذکر اپنے بعض مکتوبات میں فرمایا ہے۔ یعنی امت کے اکابر اور سربرآوردہ علماء جن مسائل میں باہم
مختلف ہیں ان کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ

"اگر ایک طرف بالکل ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے گا"

اپنے منشاء کا اظہار حضرت والا نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں" صفحہ جمال قاسمی

اور یہی ہے بڑے پتے کی بات، جس کی پروا مناظرہ اور مباحثہ کی مناقشتوں میں مبتلا ہو کر لوگ بالکل نہیں کرتے، آخر جن بزرگوں کے ساتھ حسن ظن کا تعلق ان کے علم و عمل کی وجہ سے امت قائم کر چکی ہے، ان کو اچھا بھی سمجھنا اور پھر ان ہی کی طرف یہ بھی منسوب کرنا، کہ کتاب و سنت کے اقتضاؤں سے بے پروا ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا، خود ہی سوچئے کہ ذہنی تناقض کے سوا اور کیا ہے؟ اور جہاں ان اختلافی مسائل کے متعلق آپ کا یہ مشورہ تھا کہ "خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں، کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں"۔ اسی طرح تکفیر مسلمانوں پر کفر کا فتوی لگانے کا جو رجحان مولویوں میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے متعلق حضرت والا کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، اپنے ایک فارسی مکتوب میں خاص مسئلہ جو اس زمانہ میں چھڑا ہوا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ

"در مسلمانان کیست کہ قرآن دین و ایمان او نباشد" صفحہ ۱۴

اور اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر عام مشورہ آپ نے یہی دیا ہے کہ

"بناءِ علیہ تا مقدور کسے را کافر نباید دانست" صفحہ ۱۴ فیوض قاسمیہ

خلاصہ یہ ہے کہ رائے میں اختلاف کی آزادی کے فطری حق کو محفوظ کرتے ہوئے اہل علم کو مذکورہ بالا نوعیت کے مسائل میں ایک ایسے اسلم و احکم طریقہ کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہے جس کی اگر پابندی کی جائے تو ایک بہترین شائستہ با ادب ماحول نزاعی مسائل کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مقصد بہر حال یہ تھا کہ حتی الوسع لڑنے جھگڑنے میں مولویوں کا طبقہ عموماً اس زمانہ میں بہت زیادہ بدنام اور رسوا ہو رہا تھا۔ اس بدنامی اور رسوائی کو کم کیا جائے۔ اپنے بعض مکاتیب میں حضرت والا نے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ

"یارب ایں زمانہ چہ پر شور است کہ بجائے محبت و اخوت اسلامی عداوتہا برخاستند"

اور یہ عداوتیں، جو محبت واخوت کی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، فرماتے ہیں کہ بڑے اہم مسائل سے ان کا تعلق نہیں ہے، بلکہ

"دراں مسائل کہ متفق علیہا بود ند اختلاف پدید آمد" ص۱۲ فیوض قاسمیہ

اور ایک دوسرے خط میں جس کی زبان اردو ہے، بڑے اندوہناک لہجہ میں ارقام فرماتے ہیں،

"یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تفریق دگر ہے"۔ ص۳۸

فرماتے تھے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنا ہی بے معنی ہے، تیرہ سو سال سے امت جو کچھ مانتی چلی آرہی ہے خواہ مخواہ اس میں شاخسانے نکالے ہی کیوں جائیں، اور اختلاف کسی وجہ سے اٹھ کھڑا ہی ہو تو اختلاف سے عداوت کیوں پیدا ہو، باہمی منافرت کے بغیر بھی کیا مسائل کی علمی تحقیقات ممکن نہیں،

بڑی مایوسی کے لہجہ میں اپنے اردو زبان والے خط میں ارقام فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں ہر توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے"۔

پھر مرض کے سبب کی تشخیص خود ہی یہ فرمائی ہے کہ

"ابنا روزگار میں فہم وانصاف ہوتا، تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے"۔ ص۳۸

اور سچ پوچھئے تو ہماری یہ ساری رسوائیاں جو غیر قوموں کے سامنے ہوتی رہتی ہیں، "فہم وانصاف کی کمی" ہی کے نتائج ہیں، بلکہ فہم اور سمجھ لوگوں کی درست ہوتی، تو انصاف کا جذبہ خود بخود ابھر آتا مگر کیا کیجے، بقول سعدی

گر از بسیط زمیں عقل منعدم گردد
بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

اس زمانہ میں ہندوستان پر حاکمانہ اقتدار جس قوم نے اپنا قائم کر رکھا تھا، علمی تحقیقات کے سلسلے میں اس قوم کی عام روش اور طریقہ کا چرچا بھی یہاں پہنچنے لگا تھا، بظاہر میرا خیال ہے شاید اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اردو زبان والے اسی خط میں حضرت والا کی نوک قلم

سے یہ الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے۔

"مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں (فہم وانصاف) نصیب اعدا ہیں۔" ص۲

بہر حال باوجود ان مایوسیوں کے آپ کی طرف سے کوشش اسی کی جاری تھی کہ مسلمانوں میں جہاں تک ممکن ہو اختلافات کی ناگوار اور مکروہ شکل اگر کلی طور پر ختم نہ ہو تو ممکنہ حد تک ان کے دائرے کو کم کیا جائے۔

اسی قسم کے ایک مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی رائے کو درج کرنے کے بعد فارسی زبان کے ایک مکتوب میں مکتوب الیہ سے اس کی فرمائش کرتے ہوئے کہ دوسرے معتبر اہل علم وتقویٰ سے بھی استمزاج کر لیجئے۔ اور جو کچھ ان سے معلوم ہو' مجھے بھی اس سے مطلع کیجئے کس لئے مطلع کیجئے؟ کیا اس لئے کہ پھر جواب الجواب تیار کر کے بھیجوں؟ نہیں ان ہی سے سنئے' ارقام فرماتے ہیں۔

"ایں نیاز مند را ہم اطلاع فرمائند تا بہ پیروی جم غفیر کنم ہم سر وہم دور پے تفرق کلمہ نشوم۔" ص۲۳ فیوض قاسمیہ

لیکن اپنی ذات کی حد تک ان ترجموں کے باوجود' اصل دین کے ساتھ آپ کی سرگرمیوں کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے' کہ ایک مسئلہ کے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ شرعی[1] اصطلاحات

[1] قرآن مجید میں ایک سے زیادہ جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "الغیب" کا علم حق تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے فقل انما الغیب للہ (یونس) ان اللہ یعلم غیب السماوات والارض (حجرات) لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی میں ہے کہ اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے مطلع فرماتا ہے وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء (آل عمران) اب سوال یہی ہے کہ غیر اللہ کو غیب کا علم جو عطا ہوتا ہے اس پر بھی "علم الغیب" کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے کہ عام مسلمانوں میں یہی خیال پھیل گیا ہے کہ بالذات اور بالغیر غیب کے علم کی ان دونوں قسموں کو علم بالغیب کہتے ہیں۔ پس غیر اللہ کی طرف علم غیب کو منسوب کرنے کا یہ مطلب کوئی نہیں سمجھتا کہ بالذات غیب کا علم ان کو حاصل ہے بلکہ یہی سمجھتے ہیں کہ غیب کے اس علم سے حق تعالیٰ نے ان کو سرفراز کیا ہے' ظاہر ہے کہ اسی صورت میں مسئلہ علم غیب کا اختلاف لفظی نزاع کی صورت اختیار کر لیتا ہے' تفصیل کے لئے دیکھئے فیوض قاسمیہ ص۱۴

سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو عوام کے احساسات کو پیش نظر رکھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ

"ایں نزاع لفظی بر باشد"

یعنی لفظی ہیر پھیر سے زیادہ مسئلہ کی نوعیت اور کچھ باقی نہیں رہتی۔ مگر باوجود اس کے فرماتے ہیں کہ،

"اگرچہ بمعنی مخترع عوام باشد بر اہل ایمان، ہمچو اطلاق دیگر کفریات اگرچہ بہ تاویل حسن باشد گراں باشد" ؎۴۹

مطلب یہ ہے کہ شرعی اصطلاحات کا خواہ کوئی عامیانہ مطلب کیوں نہ تراش لیا جائے اور اس عامیانہ مطلب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بظاہر کسی قسم کا سقم بھی محسوس نہ ہو، لیکن اس دلچسپ مثال کو پیش کرتے ہوئے، یعنی

"اگر کسے نام فرزند خود اللہ یا رسول اللہ بہ نہد"

سیدنا الامام الکبیر نے پوچھا ہے کہ نام رکھ لینے والے کو اجازت دے دی جائے گی کہ اپنے بچہ کو اللہ کے نام سے پکارے، یا رسول اللہ کے نام سے مخاطب کرے؟ ظاہر ہے جیسا کہ ارقام فرماتے ہیں

"اہل ایمان و ایقان و اہل عقل و نقل را گوارا نتواں شد"

آپ نے اسی کے بعد اس مسئلہ کی طرف بھی اسی سلسلہ میں توجہ دلائی ہے کہ گالی یا دشنام میں جن الفاظ کو لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ واقعہ نہیں ہوتا۔ لیکن لفظ میں بھی قوت ہوتی ہے تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ ردعمل گالیوں کا کیا ہوتا ہے۔ پس عوام اپنے باہمی تعلقات میں الفاظ کے لفظی تقاضوں کو بھی جب برداشت نہیں کر سکتے، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ کتنا گزند، اور کتنی تکلیف ان الفاظ سے بھی ایمان والوں کو پہنچ سکتی ہے، جن کا مطلب خواہ وہ نہ ہو، جو ان الفاظ سے بظاہر سمجھ میں آتا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف رسولوں کو فہمائش کی جا رہی ہے کہ اپنے آپ کو جو مسلمان۔

کہتا ہو، اس کو خواہ مخواہ یہ کہنا کہ تم مسلمان نہیں بلکہ کافر ہو، یا مسلمان ہونے کے باوجود یہ باور کرنا کہ قرآن کو خدا کا کلام نہیں سمجھتا، جیسے حضرت والا چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں مولویوں کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اسی طرح عوام کو سمجھایا جا رہا ہے کہ جن الفاظ اور محاوروں کا ایک شرعی مطلب مقرر ہو چکا ہے، اس مطلب سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ معنی یا مطلب کو ان ہی الفاظ کی طرف منسوب کر کے ان کو استعمال کرنے سے، چاہئے کہ اہل ایمان و ایقان کو گزند پہنچائیں، آخر کوئی بدبخت مسلمان اپنے بچے کا نام "رسول اللہ" اگر رکھ[1] لے اور کہے مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ اس لڑکا اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے، بلکہ سب نام جیسے رکھے جاتے ہیں، اسی طرح یہ نام میں نے رکھ دیا ہے، تو خود سوچنا چاہئے کہ ایمانی جذبات کو وہ کتنی آزمائش میں ڈال دے گا

یہ تھے سیدنا الامام الکبیر کی ان خدمات کے نمونے جن کا تعلق مسلمانان ہند کی اکثریت یعنی اہل سنت والجماعت کی عموماً دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ سے تھا، جب تک زندہ رہے تحریراً و تقریراً آپ مسلمانوں کو ان اصلاحی امور کی طرف متوجہ کرتے رہے، آپ کے بعد آپ کے تلامذہ اور آپ کے قائم کردہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء نے ملک کے طول و عرض میں آئندہ بھی اسی سلسلہ میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا، خدا کا شکر ہے کہ اب تک وہ جاری ہے۔

ان کے بعد باشندگان ہند میں جو طبقہ شیعوں کا آباد ہے۔ اہل السنت والجماعت کے بعد قدرتاً بہ نسبت دوسری قوموں کے وہی سامنے آسکتے تھے۔ مقدمہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مغل حکومت کے آخری دور میں ملک پر زیادہ تر شیعوں ہی کا سیاسی اقتدار مختلف وجوہ کر قائم ہو گیا تھا۔

---

[1] اور کیا کہا جائے مسلمان تو یہ بھی کر گذرے، ہندوستان کے ایک مشہور پر سٹر آگرہ میں مسٹر نبی اللہ نامی رہتے تھے، اور رسول خاں، نبی خان تو گویا عام اعلام مسلمانوں میں مروج ہو گئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ فقیر دارالعلوم دیوبند میں جن دنوں پڑھتا تھا، صوبہ سرحد کے ایک مولوی صاحب مدرسہ میں مدرس ہو کر تشریف لائے تھے۔ جن کا نام مولوی رسول خان تھا۔ ۱۲

اکثر صوبوں کے بھی وہی مطلق العنان حکمران بن گئے تھے۔ اور مرکز بھی ان ہی کے زیر تسلط ہو چکا تھا، اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کے بعد تخت پر جن نام نہاد بادشاہوں کو ہم پاتے ہیں، ان میں بعض تو علانیہ شیعہ عقائد اختیار کر چکے تھے۔ براہ راست عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ اول آپ سن چکے کہ علماء اہل سنت والجماعت کو دربار شاہی میں بلا بلا کر خود مناظرہ کر کے تشیع کی پشت پناہی کر رہا تھا، جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے خلفاء ثلثہ کے اسماء گرامی کو خارج کرنے کا فرمان بھی اس نے صادر کیا تھا، اور مغل حکومت کے ان شاہان شطرنج میں جو بظاہر شیعہ نہ تھے، بلکہ نام کی حد تک اپنے آپ کو سنی ہی کہتے اور سنی ہی سمجھتے بھی تھے۔ لیکن عملاً ان کی دینی زندگی میں بھی تشیع کے عناصر واجزاء کچھ اس طرح گھل مل چکے تھے کہ ان میں اور شیعوں میں بہت کم فرق باقی رہا تھا۔[1] حکومت کے اسی رنگ میں بتا چکا ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی رنگ چکی تھی۔ خصوصاً سیدنا الامام الکبیر نے جس علاقہ میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں، مختلف شہادتیں پیش کر چکا ہوں، کہ اس علاقہ میں جو شیعہ نہیں بھی تھے، ان کی دینی زندگی بھی تقریباً تشیع کی زندگی بن چکی تھی۔ سنیوں اور شیعوں میں شادی بیاہ کے تعلقات چونکہ قائم تھے، اس لئے سیاسی اقتدار

---

[1] عالمگیر کے بعد لال قلعہ کا رنگ بدلتے ہوئے کہاں تک پہنچا تھا ایک چشم دید شہادت اس کی "بزم آخر" نامی کتاب ہے، جس کے مصنف کی زندگی کا بڑا حصہ لال قلعہ میں گذرا تھا، منجملہ دوسری باتوں کے اسی کتاب میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے۔ اکثر سلاطین (شاہی خاندان کے افراد) قلعہ میں تعزیہ داری کرتے تھے، تعزیہ بیک بنتے تھے کوئی نشان بھی کوئی نقیب بنتا تھا، کوئی تاشہ کوئی ڈھول، کوئی جھانجھ، تعزیوں کے آگے بجاتا تھا، کوئی مرثیے پڑھتا تھا، مرثیے خوانوں کو درگاہ میں چار چار طشتریاں، چکنی ڈلیاں، بھنے ہوئے خربوزے کے بیج اور دھنئے کی ملا کرتی تھیں۔ بڑی دھوم سے علم اٹھاتے تھے ص ۷۲ یہ حال تو مغل شاہزادوں کا تھا، باقی خود بادشاہ سلامت سو اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "بادشاہ حضرت امام حسن حسین کے فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے، گلے میں سبز کفنی جھولی ڈالتے" بادشاہ کے گلے میں زنجیریں ڈال کر سید کھینچتے تھے اور حضرت عباس علمدار کے سقے بھی بادشاہ بنتے تھے۔ لال کھاروے کی ایک لنگی باندھے، شربت کی بھری ہوئی ایک مشک کندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلایا کرتے تھے ص ۷۳ الغرض عشرہ محرم میں جو کچھ شیعوں کے یہاں ہوتا تھا۔ لال قلعہ کے سنی بادشاہوں کے یہاں بھی ہر ایک کی نقل ہوتی تھی" ۱۲

باہرے اور معاشرتی تعلقات اندر سے اس رنگ کو پختہ سے پختہ تر کرتے چلے جارہے تھے
پانی جب سر سے اونچا ہو چکا تھا، تب خانوادہ ولی اللہی کو اس مسئلہ کی طرف توجہ ہوئی،
حضرت مولانا گنگوہی کے حوالے سے تذکرۃ الرشید میں یہ تاریخی بیان درج کیا گیا ہے، فرماتے
تھے کہ شیعوں کے متعلق

"ہمارے اساتذہ تو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے برابر تکفیر ہی
کے قائل ہیں، بعضوں نے اہل کتاب کا حکم دیا ہے اور بعضوں نے مرتد کا۔" ص۲۸۹

خود سیدنا الامام الکبیر نے اپنے ایک مکتوب میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی
مالابد منہ فارسی کے فقہی، متن کے مشہور مصنف نے کوئی "سیف مسلول" نامی ایک کتاب بھی
لکھی تھی، جس میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں اور سنیوں میں ازدواجی تعلقات کا جو
عام رواج تھا، اس کی مخالفت کی گئی تھی، (فیوض قاسمیہ ص۔) ظاہر ہے کہ قاضی صاحب رحمۃ
اللہ علیہ جو حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بالکل آخر زمانہ میں مفاسد
کی شدت کو دیکھ کر یہ کتاب تصنیف فرمائی ہوگی، خود میری نظر سے یہ کتاب قاضی صاحب
کی نہیں گذری ہے۔

بہرحال حد سے زیادہ جو فتنہ بڑھ چکا تھا، اور سچ پوچھئے تو فتنے کی اسی آگ میں وہ سب
کچھ جل گیا جس کا جلنا مسلمانوں کے لئے اس ملک میں مقدر ہو چکا تھا۔ درد کی یہ داستان
طویل ہے اور ہندوستان کیا واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کا یہ جاں گداز حادثہ ہے
اب اس قصے کو تو چھوڑئیے، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گو تشیع کے ساتھ سختی اور تشدد کا یہ
برتاؤ ابتداء میں مناسب معلوم ہوا، لیکن اشتباہ و التباس کا جو غبار حق پر چھایا ہوا تھا گو وہ
ہٹ گیا، تسنن و تشیع میں جو فرق تھا، وہ عوام کے سامنے بھی آگیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ
تشدد میں قدرتاً نرمی پیدا ہوگئی، اور شیعہ جو بہرحال ہندوستان کی اسلامی آبادی ہی کے
اجزاء تھے اور ہیں ان کے متعلق اور تو اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو فتویٰ منسوب

کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر شیعوں میں جو اصرار کرتے ہیں کہ قرآن
اصلی قرآن نہیں ہے، بلکہ (العیاذ باللہ) یہ بیاض عثمانی ہے، اور یوں دین کی پہلی بنیاد الکتاب
ہی کو مشکوک ٹھہرا رہے ہیں، اور صحابہ کی اکثریت جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
السنت مسلمانوں تک پہنچی ہے، ان ہی کو ناقابل اعتماد ٹھہرا کر دین کی دوسری بنیاد السنت کو
مسترد کر دینے کے مجرم ہیں۔ زیادہ تر اس قسم کے خیالات اور عقائد بجائے عوام کے چونکہ
شیعوں کے خواص یعنی علماء ہی میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ان کی حد تک تو شاہ
عبدالعزیز اور ان کے بعد کے علماء کے فتوے کو برقرار رکھتے ہوئے، حضرت گنگوہی فرمایا
کرتے تھے کہ ان کے (یعنی شیعوں کے)

"جہلا فاسق ہیں" ص۲۵

اور یہ بڑے پتے کی بات ہے، کہ جاہل مسلمان، خواہ سنی ہو، یا شیعہ، مسلمان ہونے کی وجہ سے
قرآن کو بہرحال اللہ کی کتاب ہی مانتا ہے۔ اس غریب کو ان واہی تباہی قصوں سے کیا سروکار۔
جو شیعہ علماء کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

فیوض قاسمیہ نامی والے مجموعہ مکاتیب میں سیدنا الامام الکبیر کا بھی ایک خط پایا جاتا ہے،
جس میں شیعوں کے متعلق بعض دل چسپ حکیمانہ نکات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والا نے شیعوں کے
دین کو برزخی دین قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں،

"بلحاظ آں کہ کلمہ شہادت برزبان و در جنان ست، و صوم و صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ وغیرہا اعمال
اسلامیان کہ اعمال دین اسلام باشند"

یعنی نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ اسلامی اعمال کے ساتھ شیعہ بھی

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کی تصدیق کرتے ہیں، دل سے بھی مانتے ہیں، اور زبان سے بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں، یہ پہلو تو
شیعوں کا اسلامی ہے، اور اسی کے ساتھ

"منجملہ اعمال و افعال شاں و عقائد باطلہ و اہواء زائغہ شعار شاں است و بدعات شنیعہ و معمولات قبیحہ کردار شاں"

ایک پہلو شیعوں کی دینی زندگی کا یہ بھی ہے کہ اس قسم کی باتیں چونکہ

"از آثار کفر چہ انجام کفر ہمیں مخالفت قرآن و حدیث باشد"

ان ہی وجوہ کی بنیاد پر آپ نے لکھا ہے کہ شیعوں کا دین کفر و اسلام کے درمیان ایک قسم کا برزخی دین ہے کہ

"برزخ ہمان ست کہ از ہر طرف اثرے بخود کشد و مظہر آثار اطراف خود گردد" ص ۲

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام کے مقابلہ میں شیعوں کی مذکورہ بالا امتیازی خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنیوں کے بعد شیعہ ہی اس کے مستحق تھے کہ ان کی طرف توجہ کی جائے اور اس سلسلہ میں بھی جو کچھ آپ سے ہو سکتا تھا، کرتے رہے، تصنیفی سلسلہ میں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، ساڑھے تین سو صفحات سے زائد اوراق میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ تقطیع متوسط اور لکھائی بھی اس کی گھٹی ہوئی ہے۔ اپنے عام طریقہ تصنیف کے خلاف اس کتاب میں بکثرت دوسری کتابوں کے حوالوں کو بھی آپ نے پیش کیا ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی، اس کا نام "ہدیۃ الشیعہ" ہے، کتاب کے خصوصی نقاط نظر کا ذکر تو انشاء اللہ اگلی جلد میں کیا جائے گا یہاں حضرت والا کی "داخلی خدمات" کی دوسری منزل کا صرف تذکرہ مقصود ہے۔ بڑے درد ناک لہجہ میں کتاب کو ختم کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ شیعوں کو چاہئے کہ

"اس عقیدہ بد سے باز آ کر توبہ و استغفار سے تدارک مافات کریں آئندہ ان کو وہ جانیں" ص ۹۰

ما نصیحت بجائے خود کردیم — روزگارے درمیں بسر بردیم

ور نیاید بگوش اندر کس — بر رسولاں بلاغ باشد و بس

ایک یہی کتاب نہیں، آپ کے خطوط میں بھی جو شائع ہو سکے ہیں، شیعوں کے متعلق مباحث و مسائل ہی کو ہم زیادہ پاتے ہیں، آپ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ پہلے بھی کہیں ذکر گذر چکا ہے کہ شیعوں میں وقت کے مشہور مجتہد[1] مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی تھے۔ اپنی شان اور اپنے مقام کا خیال کئے بغیر سیدنا الامام الکبیر ان کے پاس پہنچ گئے، جس منزل میں پہنچے تھے[2] اس کا ذکر اپنے ایک خط میں جو مولوی حکیم ضیاء الدین رامپوری کے نام ہے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"بے عمامہ در دمال چنانکہ عادت من ست بہ مکانے کہ مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی شیعی ..... فرو کش بود ند رفتم"

واللہ اعلم بالصواب صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ یہ خیال کہ لکھنؤ پہنچکر مولوی حامد حسین صاحب سے حضرت والا نے ملاقات کی تھی، بظاہر کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا، زیادہ قرینہ اسی کا ہے کہ میرٹھ یا سہارنپور یا ممکن ہے دہلی کسی وجہ سے مولوی حامد حسین آئے تھے، اور حضرت والا ان کے پاس پہنچے۔ اس سلسلہ میں کچھ مناظرہ اور مکالمہ کی صورت بھی پیش آئی، اور مولوی حامد حسین صاحب کو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ مولانا محمد قاسم صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں، اسی موقعہ پر بجائے مشہور نام کے تاریخی نام خورشید حسن آپ نے اپنا بتایا تھا، تحفہ اثنا عشریہ میں بھی شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنا تاریخی نام غلام حلیم ہی درج کیا ہے۔ اضطراراً بزرگوں کی سنت کی پیروی کی سعادت سمجھنا چاہیے کہ آپ کو حاصل ہو گئی۔

اور مجھ ہی سے یاد ہوگا آپ یہ سن چکے ہیں کہ شیعوں کی طرف سے یہ مطالبہ پور قاضی نامی قصبہ میں جب پیش ہوا کہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اگر مولوی محمد قاسم ہم لوگوں کو

---

[1] مولوی حامد حسین کے نام کے ساتھ مجتہد کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ شیعوں میں غیر معمولی امتیاز ان کو حاصل تھا حضرت والا نے بھی ان کا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "در جواب منتہی الکلام کتابے مبسوط مسمی باستقصاء الافحام نوشتہ اند و بزعم شیعیات درمیان زمین و آسمان نظیر ندارند و آفتاب وقت و بدر منیر و بے نظیر اند" ص۶۱

[2] یہ واقعہ میرٹھ میں نواب محمد علی خاں کے مکان پر پیش آتا ہے۔ محمد طیب

کرا دیں تو ہم تشیع سے توبہ کرلیں گے، توخلاف دستور حضرت کو جوش آگیا، اور ان کے مطالبے کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے، مگر مطالبہ کرنے والے ہی بھاگ گئے۔

اسی پورقاضی ہی کے شیعوں کے متعلق مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں پورقاضی پہنچے تھے تو اتفاقاً یہ محرم کا مہینہ تھا، حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر پورقاضی کے شیعوں کو ہوئی تو ایک وفد ان کے سر برآوردوں کا خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہو کر پورقاضی کے شیعوں کو ممنون فرمایا جائے۔ خلاف توقع بجائے انکار کے حضرت نے فرمایا کہ میری ایک شرط بھی منظور کی جائے تو میں اس مجلس میں شریک ہو سکتا ہوں، جو شرط پیش کی گئی اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا! شرط یہ تھی کہ اسی مجلس میں

جو کچھ عرض کروں، اسے سن لیں؟

وفد نے اس شرط کو تو منظور کر لیا، مگر اسی کے ساتھ ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے

"پہلے مجلس ہوگی، اس میں حلوا بھی تقسیم ہوتا ہے، وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑیگا"

آپ نے اس اضافہ کو بھی مان لیا اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر بھی ہوئے، حلوا جو دیا گیا اسے بھی لے لیا، جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہو گئیں، تب ماتم کی اسی مجلس میں حضرت والا نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور وصیت

ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی	میں تم میں دو بھاری چیزوں کو چھوڑتا ہوں، اللہ کی کتاب، اور اپنی اولاد

پر ایک مفصل و مبسوط تقریر فرمائی، سننے والے خلاصہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت والا نے فرمایا علم و عمل دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ علم کے لئے تو اللہ کی کتاب ہے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت پاک میں نسلی مناسبت کی وجہ سے عمل کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہونی چاہیئے۔

الغرض ماتم کی اس مجلس میں اسی اجمال کی تفصیل کچھ ایسے رنگ میں کی گئی کہ بجائے ماتم کے وہ تبلیغ کی مجلس بن گئی، روایت کے آخر میں مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ

"اس وعظ کے بعد بہت سے لوگوں نے توبہ کی"

بظاہر اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ شیعی عقائد سے تائب ہو کر لوگ سنی بن گئے۔

اس میں شک نہیں کہ علمی وقار و عظمت کے رکھ رکھاؤ کے لئے عموماً مولویوں نے جن پابندیوں کی رعایت کو ضروری ٹھہرالیا ہے۔ فطرتاً سیدنا الامام الکبیر کی نظر میں ان کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی مولوی حامد حسین مجتہد شیعہ کے گھر میں جس شان سے آپ تشریف لے گئے، خود اس واقعہ سے بھی آپ کی افتاد طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک موقعہ پر ہدیۃ الشیعہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یعنی خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کی اشاعت و نشر میں چونکہ غیر معمولی حصہ تھا، گویا قرآن کے معلم اور استاد ہونے کی حیثیت ان کو حاصل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ شیعہ باوجود غیر معمولی کد و کاوش کے قرآن کو زبانی یاد کرنے میں عموماً کامیاب نہیں ہوتے، یہ دلیل ہے کہ استاد کے باطنی فیض سے وہ محروم ہیں، اسی عام مشہور تجربہ کی تائید اپنے چشم دید مشاہدہ سے فرماتے ہوئے آپ نے شیعوں کے ایک عالم جن کا نام مولوی جعفر علی تھا، اور شیعوں کے دتی میں پیش امام تھے۔ اپنے زمانہ میں ان کی ہستی دلی کے شیعوں کی مرجع بنی ہوئی تھی، اور مشہور تھا کہ مولوی جعفر علی صاحب قرآن کے حافظ ہیں۔ ان ہی کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے لکھا ہے کہ

"ان کے حفظ کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں غدر سے پہلے بچشم خود اس احقر نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خاں کی مسجد میں ہوا کرتا

تھا، مثل دیگر حضار شیعہ مذہب حمائل میں دیکھ دیکھ پڑھتے تھے۔ نیں پر بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے۔ ہدیۃ الشیعہ

ظاہر ہے کہ حامد علی خاں کی مسجد میں یہ جلسہ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے خاص شیعوں کی طرف سے منعقد ہوتا تھا۔ اور گویہ واقعہ غدر سے پہلے کا ہے، مگر حضرت والا کی زیادہ نہ ہوگی، ممکن ہے طالب علمی کے دنوں کی بات ہو۔ لیکن اس زمانہ میں خانوادہ ولی اللٰہی کی وجہ سے شیعوں اور سنیوں کی باہمی کش مکش جس حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے لحاظ سے میں تو اس کو بھی حضرت والا کی طبعی وارستہ مزاجی ہی کا نتیجہ سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پورقاضی کے شیعوں کی ماتمی مجلس میں آپ کی شرکت اور اسی مجلس میں حلوے کا قبول فرمانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ پورقاضی کے سنیوں میں معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے کافی کھلبلی مچ گئی۔ عام سنی مسلمانوں پر علماء اہل السنت والجماعت کی وجہ سے اس زمانہ میں تو دغن تھا کہ شیعوں کی ماتمی مجالس میں شرکت سے بھی پرہیز کریں اور ان مجالس میں جو چیزیں تقسیم ہوتی ہیں ان کو نہ لیا کریں۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ حضرت والا سے پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو پہلے کچھ اعراض فرمایا گیا۔ لیکن جب زیادہ اصرار اس کی طرف سے بڑھا تب لکھا ہے کہ واقعہ کو سمجھاتے ہوئے فرمایا گیا کہ

"بھائی اگر کوئی قوی آدمی تھوڑا سا زہر کھالے تو اس کے حق میں وہ نقصان نہیں کرتا۔ لیکن اسی زہر کو ضعیف اگر کھا جائے تو مر جائے۔"

اور اسی کے بعد دل کی جو بات تھی اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا کہ ان کی مجلس میں شریک ہو کر

"اگر میں نے حلوا[1] لیا اور قبول کر لیا تو ان کی مجلس میں کلمۂ حق بھی تو پہنچا دیا۔"

---

[1] حلوہ لینا ثابت ہے۔ کھانا ثابت نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا جو ذرا سے مشتبہ مال سے بھی اجتناب کر لینے کے عادی تھے وہ اس حلوہ کو کیسے کھا سکتے تھے۔ یہ قبول حلوہ محض تبلیغ کلمۂ حق کی ضرورت سے کیا گیا۔ جب کہ شیعوں نے کلمۂ حق سننے میں قبول حلوہ کی شرط لگا دی تھی۔ یعنی اس کے بغیر وہ کلمۂ حق سننا نہیں چاہتے تھے۔ پس حضرت نے اس قبول حلوہ کو ادائے فرض کے مقدمہ کی حیثیت سے گوارا فرمایا۔ محمد طیب غفرلہ

روایت جس طریقہ سے ہم تک پہنچی ہے، اعتماد کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتی ہے، اور گو یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن تبلیغی فرائض سے صحیح معنوں میں سبک دوشی کی اثر آفریں اور نتیجہ خیز راہ بھی ہو سکتی ہے، اگر شرط اول اس راہ میں یہی ہے، کہ جبہ و دستار کے خود تراشیدہ احترامی وساوس سے دل و دماغ کو پاک کر کے فرض کے حقیقی احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کیا جائے۔

ایک مشہور و معروف بزرگ نے لکھنؤ میں فقیر سے ایک دفعہ کہا تھا، ان کی بات یاد آتی ہے، ذکر شیعہ اور سنی مباحثوں اور مناظروں کا ہو رہا تھا۔ اسی آسمان کے ایک نجم ثاقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کے اسی بندے نے مجھ سے پوچھا کہ نصف صدی کی تحریری و تقریری کوششوں کا نتیجہ ان کے کیا ہوا؟ کیا تم نے سنا کہ کوئی شیعہ سنی ہو گیا ہو؟ اپنی معلومات کی حد تک نفی کے سوا خاکسار اور اس کا جواب کیا دے سکتا تھا۔ پھر بعض واقعات اپنے سنائے، اور بتایا کہ فلاں فلاں آدمی کٹر شیعہ تھے لیکن تقریر و تحریر کی ہنگامہ آرائیوں کے بغیر مجددانہ اسلام کی صادق اور سچی روح کے پانے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

خود سیدنا الامام الکبیر بھی تقریری و تحریری کاروبار کی لاحاصلی سے واقف تھے۔ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ایک پہلو افادیت کا مولویوں کے اس کاروبار کا بھی آپ نے پیدا فرمایا ہے۔ یعنی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ حقیقی مخاطب تو اس رسالہ کے وہی لوگ ہیں، جو شیعی عقائد رکھتے ہیں، اور بقول آپ کے یہ رسالہ شیعوں کے لئے

"اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصول ایمان ہے"

لیکن اسی کے ساتھ آپ نے لکھا ہے کہ سنیوں کے لئے بھی ان مضامین کو غیر مفید نہ سمجھنا چاہئے، بلکہ حضرت والا کے الفاظ میں ان کا

"یہ فائدہ ہے کہ کچوں کے لئے مفید یقین اور پکوں کے لئے باعث اطمینان ہے" ص۳

اور کوئی شبہ نہیں کہ فائدہ کا یہ پہلو جس کا آئے دن تجربہ ہوتا رہتا ہے، کچھ کم قیمتی نہیں ہے، اسی لئے حضرت والا کی زندگی میں قصبہ پور قاضی کے واقعہ کی مثالیں جہاں ملتی ہیں، وہیں آپ اس کی کوشش بھی فرماتے رہتے تھے کہ ملک اور حکومت کے خاص حالات کے تحت خود سنیوں کی دینی زندگی جو شیعی عقائد و اعمال کے جراثیم سے مسموم ہو گئی ہے۔ اس زہر کو بھی جس طرح ممکن ہو، نکالا جائے۔

خود شیعوں کے تائب ہونے کی مثالیں تو بجز پور قاضی کے اس قصہ کے اور مجھ تک نہیں پہنچی ہیں[1] لیکن سنیوں میں جو کچے تھے، ان کے شکوک کو مشاہدین کی روشنی پیدا کی گئی، اور جو

[1] اس سلسلہ میں مجھ تک جو واقعہ پہنچا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ مجھ سے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاوڑ ضلع میرٹھ نے بیان کیا اور انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن پھلاودہ ضلع میرٹھ سے سنا جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں ایک زبردست عالم تھے اور آخر میں قوت نسبت و مناسبت سے اس حد پر پہنچ گئے تھے کہ چال ڈھال اور انداز گفتگو تک حضرت والا جیسا ہی ہو گیا تھا۔ حضرت کے دیکھنے والے بعد سے انہیں دیکھ کر حضرت نانوتوی کا شبہ کرنے لگتے تھے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اگر اپنے استاد کے تقریرات میں سے کسی چیز میں الجھ جاتے تھے تو بعض اوقات سفر کر کے پھلاودہ جاتے اور مولانا عبد الغنی صاحب مرحوم سے فرماتے۔ راقم الحروف کا تاریخی نام "خورشید قاسم" انہوں نے ہی ایک نظم کے ساتھ لکھ کر بھیجا تھا۔ جس میں حضرت نانوتوی کے نام و اسم تاریخی دونوں کے اجزاء جمع کر دیئے گئے۔ حضرت مولانا عبد الغنی صاحب نے فرمایا کہ جب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ شاہجہانپور کیلئے روانہ ہوئے تو شاہجہانپور کے قریب کسی گاؤں کے چند غریب سنیوں نے جو وہاں شیعوں کے اثرات میں دبے ہوئے بے بس تھے، کیونکہ زمیندار شیعوں ہی کا تھا، حضرت کو لکھا کہ جاتے یا آتے حضرت والا اس گاؤں کو اپنے قدوم سے عزت بخشیں اور ہمیں کچھ پند و نصیحت فرما دیں۔ تاکہ ہمارے لئے صلاح و فلاح اور تقویت کا باعث ہو۔ حضرت والا نے بخوشدلی ان کی دعوت منظور فرمالی۔ جیسا کہ غرباء کی دعوت و پیشکش بطوع و رغبت قبول فرمانے کی عادت تھی۔ اور جاتے یا آتے ہوئے اس گاؤں میں اترے۔ شیعوں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔ فکر یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے وعظ کا اثر شیعوں پر ہو جائے اور شیعہ دباؤ کی تنظیم ٹوٹ جائے تو انہوں نے غالباً متوقعہ اثرات کی کاٹ کے لئے لکھنؤ سے چار شیعہ مجتہد تاریخ مقررہ پر بلا لئے اور پروگرام یہ طے پایا کہ مجلس وعظ میں چاروں کونوں پر چاروں مجتہد بیٹھ جائیں اور چالیس اعتراضات منتخب کر کے دس دس اعتراض چاروں پر بانٹ دیئے گئے کہ اثنائے وعظ میں اس طرح کئے جائیں کہ اول فلاں کونے کا مجتہد دس اعتراض کرے، باقی آگے صفحہ پر

بیٹھے تھے ان کو اطمینان وسکینت کی خنکیوں سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے لئے تو اضلاع مظفر نگر و سہارنپور وغیرہ کے قصبات اور دیہات کے مسلمانوں کی دینی زندگی جہاں تک میرا خیال

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) اس سے حضرت نمٹیں تو دوسرے کو نہ کا اور پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کونہ کا۔ اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض وجواب میں مبتلا کر کے وقت ختم کر دیا جائے۔ سب غیبی مدد اور حضرت والا کی کرامت کا حال سنئے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا۔ جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات لے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے گردن اٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے ان مقررہ شبہات کے مکمل حل سے گاؤں کے شیعہ اس قدر مطمئن اور منشرح ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کر لی اور سنی ہو گئے۔

مجتہدین اور مقامی شیعہ چودھریوں کو اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو انہوں نے حرکت مذبوحی کے طور پر اس شرمندگی کو مٹانے اور حضرت والا کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک نوجوان لڑکے کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے آکر عرض کیا کہ حضرت نماز جنازہ آپ پڑھا دیں۔ پروگرام یہ تھا کہ جب حضرت دو تکبیریں کہہ لیں تو صاحب جنازہ ایک دم اٹھ کھڑا ہو، اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کیا جائے۔ حضرت والا نے معذرت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور میں سنی۔ اصول نماز الگ الگ ہیں۔ آپ کے جنازہ کی نماز مجھ سے پڑھوانے میں جائز کب ہوگی؟ شیعوں نے کہا کہ حضرت بزرگ ہر قوم کا بزرگ ہی ہوتا ہے۔ آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔ حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرما لیا۔ اور جنازہ پر پہنچ گئے۔ مجمع تھا۔ حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھے گئے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور انقباض چہرہ سے ظاہر تھا۔ نماز کے لئے عرض کیا گیا تو آگے بڑھے اور نماز شروع کی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے "ہونہہ" کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی شہ دی۔ مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے اسی غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ "اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔" دیکھا گیا تو مردہ تھا۔ شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا۔ اور بجائے حضرت والا کی سبکی کے خود ان کی سبکی اور سبکی ہی نہیں بلکہ موت آگئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر باقی ماندہ شیعوں میں سے بھی بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے۔

محمد طیب غفرلہٗ

ہے، زندہ شہادت کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ مغل حکومت کے آخری دور میں بارہہ کے جن سادات نے کنگ میکر (بادشاہ گر) ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی وہ اسی اطراف و جوانب کے رہنے والے تھے جن کا اثر پھیلنا قدرتی تھا۔ ان کے سوا دوسرے[1] اسباب بھی تھے، کہ اور تو اور ضلع سہارنپور کا یہی قصبہ دیوبند جو آج سنیوں کا سارے ہندوستان میں ماویٰ و ملجا بنا ہوا ہے۔ کسی موقعہ پر بشیر شاہ خان مرحوم کی اس اطلاع کا ذکر کر چکا ہوں کہ میرٹھ، ہاپوڑ، گلاوٹھی، بلند شہر کے ساتھ ساتھ وہی کہتے تھے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ

"دیوبند میں بھی سب تفضیلی تھے" ملخصاً ارواح ثلاثہ

اسی موقعہ پر اگرچہ خاں صاحب کا یہ بیان بھی درج ہے کہ حضرت سید شہید کی کوششوں سے ابتداءً اس علاقے کے مسلمانوں کے تفضیلی رجحانات کے ازالہ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی، لیکن صدیوں سے لوگوں میں جو زہر سرایت کئے ہوئے تھا۔ اس کا کلی استیصال ظاہر ہے کہ اچانک نہیں ہو سکتا تھا۔ سیدنا الامام الکبیر جن دنوں میں دیوبند کو وطن بنا کر یہاں مقیم ہو چکے تھے۔ اسی زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر لوگ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دیوبند کے اچھے اچھے ممتاز گھرانوں میں تفضیل کا اثر موجود تھا، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف

---

[1] لیکن جہاں ان کنگ میکروں نے شیعیت کو اپنے اثر و اقتدار سے رواج دیا، وہاں حضرت والا کی تاثیری قوت خود ان کنگ میکروں پر بھی اپنا کام کر گئی۔ ان سادات بارہہ میں سے خانجہاں پور، رتھیڑی، اور منصور پور کے خاندان حضرت ہی کے ہاتھ پر تائب ہوئے، اور سنی بنے اور اس قدر گرویدہ اور محب بن گئے کہ ان کی دیوبند کی آمد و رفت مثل اہل بیت کی آمد و رفت کے ہو گئی ہے۔ احقر کے یہاں جب پہلی لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام فاطمہ ہے (سلمہا) تو سید نور الحسن صاحب رئیس رتھیڑی اس کے لئے کپڑوں کے جوڑے اور بچگانہ زیور اسی انداز سے بنوا کر لائے، جیسے اپنے خاندان میں کسی قریبی عزیز کے یہاں ولادت ہونے پر یہ چیزیں لائی جاتی ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹہ جاتے وقت اپنے قبیلہ و عائلہ کو ہدایت فرما کر گئے تھے کہ مشکلات کے وقت مولوی سید محمد نبیہ صاحب رئیس خان جہان پور کی طرف رجوع کریں۔ یہ خاندان بحمد اللہ پکے سنی اور ریاستوں کے باوجود نہایت متدین اور متشرع ہیں۔

محمد طیب غفرلہٗ

لے بجائے تفصیل کے لکھا ہے کہ

"مادہ نفس کا غالب تھا"۔ ص۳۲

اسی وجہ سے آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے ساتھ کش مکش کی صورت اسی دیوبند میں جو پیش آئی' وہ سننے کے قابل ہے' اس کا ذکر سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی کیا ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی مولانا محمد طیب الحفید کے مراسلہ سے معلوم ہوئی۔

واقعہ یہ ہے' یاد ہوگا کہ دیوبند میں سیدنا الامام الکبیر کے گھر کی عام ضرورتوں کی سربراہی کا تعلق دیوان جی محمد یٰسین[1] صاحب سے تھا' حضرت والا کے فدائیوں میں تھے' ان ہی کا قصہ ہے' کہ مرید ہونے کی خواہش سیدنا الامام الکبیر سے ظاہر کی۔ لیکن آپ نے حضرت گنگوہی سے مرید ہوجانے کا حکم دیا۔ اسی وقت گنگوہ جاکر حکم کی تعمیل کرکے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوکر پھر مستدعی ہوئے کہ اب تو مجھے اپنا مرید بنالیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم تو مرید ہوچکے' بولے مرید کہاں ہوا۔ صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی سعادت سے سرفراز ہوا ہوں۔ عرض کا یہ طریقہ تھا

[1] دیوان جی کے کچھ حالات کا ذکر پہلے کرچکا ہوں' دریافت کرنے پر مولانا محمد طیب صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ یٰسین نام کے دو صاحبوں کا خصوصی تعلق سیدنا الامام الکبیر سے تھا' جن میں ایک تو یہی دیوان جی دیوبند کے رہنے والے تھے اور بقول مولانا طیب صاحب دیوبند میں حضرت والا کی خانگی اور ذاتی امور کا تعلق ان ہی سے تھا' لکھا ہے کہ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اپنے زنانہ مکان کے حجرے میں ذکر کرتے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں کشفی حالت دیوان جی کی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ باہر سڑک پر آنے جانے والے نظر آتے رہتے تھے۔ در و دیوار کا حجاب اُن کے درمیان ذکر کے وقت باقی نہیں رہتا تھا' ان ہی دیوان جی کے ایک مکاشفہ کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مثالی عالم میں ان پر منکشف ہوا کہ دارالعلوم کے چاروں طرف ایک سُرخ دھواں اٹھا ہے' اپنے اس کشفی مشاہدہ کی تعبیر خود یہ کیا کرتے تھے کہ نصرانیت اور تجدد و آزادی کے آثار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں نمایاں ہوں گے۔ دارالعلوم کے کتب خانہ کے سب سے پہلے محرر بھی یہی دیوان جی تھے۔ بقول مولانا حبیب الرحمن دارالعلوم کا یہ وہ زمانہ تھا کہ دربان سے لے کر مہتمم تک سب کے سب صاحب نسبت تھے۔ دیوان جی بڑے تند و تُرش کے آدمی تھے۔ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس میں باہر سے آنے والوں کو اکثر یہ دھوکا ہوتا کہ یہی حضرت نانوتوی ہیں۔ دوسرے صاحب اسی نام کے نانوتہ کے رہنے والے تھے۔ اور عجیب بات ہے کہ جب تک وطن کا تعلق نانوتہ سے حضرت کا رہا یہاں کے تمام خانگی کاموں کے متکفل یہی تھے۔

ایسا تھا کہ منظوری کے سوا دوسری صورت ہی کیا ہو سکتی تھی۔

بہر حال قصہ ان ہی دیوبند کے حاجی محمد یٰسین دیوان جی کا ہے، شمار اُن کا دیوبند کے سربرآوردہ شیوخ میں تھا، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کے ننہیالی رشتہ داروں میں تھے۔ مگر خاندان میں دیوان جی کے جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"ان کے ہاں کی تعزیہ داری مشہور تھی" ص۲۲

اور خاندان پر جب رفض کا رنگ چڑھا ہوا تھا، تو تعزیہ داری نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی

بہر حال سیدنا الامام الکبیر کے فیض صحبت کی اثر پذیری نے اس فیصلہ پر جب دیوان جی کو مجبور کیا، کہ اپنے اقتداری دائرے میں تعزیہ داری کی رسم کو ختم کر کے رہوں گا، تو دیوبند کی "تاریخ کا وہ ایک اہم واقعہ بن گیا۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"محل کی مسجد جس میں آج کل مولانا حسین احمد صدر دارالعلوم دیوبند پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔

یہی مسجد دیوان جی کے محلہ کی مسجد تھی۔ تعزیہ اس مسجد میں بھی رکھا جاتا تھا اور محرم میں اسی مسجد سے وہ تعزیہ اٹھتا تھا، مولانا طیب صاحب نے اطلاع دی ہے کہ

"اٹھانے والے سنی ہوتے تھے، کچھ شیعہ گھرانے بھی اس جگہ تھے"

دیوان جی نے سب سے پہلے اپنے محلہ کی اسی مسجد کو تعزیہ کے قصہ سے پاک کرنے کا ارادہ کیا اور بروایت مولانا طیب صاحب

"اعلان کر دیا کہ اس سال اس مسجد سے تعزیہ نہیں اٹھے گا"

یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا، دیوبند کی شیعہ آبادی ہی میں نہیں بلکہ تعزیہ پرست سنیوں میں بھی اس اعلان سے کھلبلی مچ گئی۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ پہلے تو

"اس محلہ کے شیوخ بگڑ گئے، اور کہا کہ سر قلم ہو جائیں گے، مگر تعزیہ اٹھے گا"

یہ سن کر دیوان جی کی زبان سے بھی بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

"اگر گذرا تو میری لاش پر سے گذرے گا۔"

اور بتدریج محلہ سے آگے بڑھ کر فتنہ کی آگ سارے قصبہ میں پھیل گئی۔ بقول مولانا طیب صاحب قصبہ دیوبند کی

"شیوخ کی برادری دیوان جی کے خلاف متحد ہوگئی۔"

ظاہر ہے کہ یہ معمولی فتنہ نہ تھا، اس وقت دیوبند کے شیوخ کی برادری میں کافی ہیکڑی والے لوگ تھے۔ استعمال غلط ہو لیکن اس وقت مسلمانوں کے عزم و ارادہ میں کافی قوت تھی، دیوان جی کے خلاف قصبہ کے شیوخ برادری کے اس اتحاد کو کافی اہمیت حاصل ہوگئی، اندر ہی اندر جو کھچڑی پک رہی تھی، اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر تک بھی پہنچی، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) کے علم میں جب یہ آیا، اور معلوم ہوا کہ موقعہ پر شہر میں عظیم ترین ہنگامہ بپا ہونے کا خطرہ ہے۔

تو ایک دن جب دیوان جی حضرت والا کی مجلس مبارک میں حاضر تھے، اور بقول مولنا طیب صاحب اسی مجلس میں

"شہر کے اکابر شیوخ اور دوسری برادریوں کے بڑے موجود تھے۔"

سیدنا الامام الکبیر دیوان جی کو مخاطب بنا کر فرمانے لگے کہ

"بندۂ خدا اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم مجھ سے ذکر تو کر لیا ہوتا۔"

یہ بات تو دیوان جی سے کہی گئی، اور اس کے بعد اسی بھری مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی عام اعلان فرما دیا گیا کہ

"لیکن خیر اب اگر ایسا کہہ دیا گیا ہے، تو دوسرا سر قاسم کا لگا ہوا ہے۔"

مطلب یہ تھا کہ اپنی لاش پر دیوان جی نے اعلان کیا تھا کہ تعزیہ گذرے گا" اسی

لاش کے ساتھ دوسری لاش جسے تعزیہ لے جانے والے اپنے قدموں کے نیچے پائیں گے' وہ محمد قاسم کی لاش ہوگی۔

بھری مجلس کے اس خونی اعلان کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا' وہی سامنے آیا۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"جب یہ جملہ (یعنی قاسم کا سر بھی لگا ہوا ہوگا) شہر میں مشہور ہوا' تو پیشہ ور برادریاں متحد ہو کر تیار ہو گئیں' کہ اگر شیوخ نے دیوان محمد یٰسین صاحب کے ساتھ کوئی نازیبا برتاؤ کیا' تو یہ ساری برادریاں ان شیوخ کے مدمقابل ہو جائیں گی۔"

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں' علاوہ عثمانی شیوخ کے دیوبند کے مسلمانوں کی آبادی مختلف پیشہ وروں مثلاً پارچہ بافوں' روغنگروں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ پیشہ وروں کی یہ ساری برادریاں حضرت والا سے غیر معمولی عقیدت کا تعلق رکھتی تھیں' یہ سننے کے ساتھ ہی کہ دیوان جی کے سر کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے سر مبارک کو بھی باندھ دیا ہے۔ اس وقت اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا اثر ان عقیدت مند مخلص مسلمانوں پر کیا مرتب ہوا ہوگا۔ اور بات کچھ ان ہی پیشہ ور برادریوں تک محدود نہ رہی' بلکہ بقول مولانا طیب صاحب'

"خود شیوخ میں بھی دو گروہ ہو گئے' بڑا گروہ حضرت (نانوتوی) کی حمایت پر تل گیا۔"

اور یوں واقعہ اس رنگ میں لوگوں کے سامنے آگیا کہ مولانا طیب کے بیان کے مطابق'

"گویا پورا شہر ان شیوخ کے مقابلہ کیلئے تیار ہو گیا۔"

یوں بجائے ایک سر کے دیوان جی کے سر کے ساتھ دیکھا گیا کہ بے شمار سر لگے ہوئے ہیں' یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ اگر مولانا طیب صاحب یہ خبر نہ بھی دیتے کہ

"اس ایک جملہ ہی سے معاملہ ختم ہو گیا۔"

تو خود بخود اسی نتیجہ تک عقل بھی پہنچتی ، سارے شہر کے مسلمانوں سے مقابلہ کی ہمت آخر مخالفوں کا گروہ کیسے کر سکتا تھا، یوں ایک بڑے فتنہ کا بھی قلع قمع ہو گیا، باہمی خون ریزی سے دیوبند والے بچ گئے، اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف بقول مولانا طیب صاحب

"مسجد محل سے تعزیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا"

اور جب ایک جگہ سے یہ قدیم رسم اٹھ گئی، تو ان ہی کی روایت ہے کہ

"شہر کی جن جن سنی مسجدوں میں سے تعزیئے اٹھتے تھے وہ سب ختم ہو گئے"

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی جن کے سامنے یہ سارے قصے گذرے تھے، لکھا ہے کہ

"انہوں نے (دیوان جی نے) اس کا (تعزیہ داری کا) استیصال کامل کر دیا ہے

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو " ص۲۲

ان کی اسی ہمت مردانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے بھی لکھا ہے کہ،

"یہ واقعہ دیوان جی مرحوم کے حسنات میں سے ایک بہترین حسنہ بلکہ سنت حسنہ ثابت ہوا"

کوئی شبہ نہیں کہ دیوان جی کی ہمت مردانہ یقیناً مستحق تحسین و آفریں ہے۔ لیکن طوطی کے ساتھ آئینہ کے پیچھے چھپے ہوئے سکھانے والے استاد پر جب نظر پڑتی ہے، تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ طوطی کی ساری گفتگو طوطی کی نہیں، بلکہ اس کی تھی، جو آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو کر رہا تھا،

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

خلاصہ یہ ہے کہ شیعی عقائد سے تائب ہو کر جو واقعی شیعہ تھے، وہ سنی ہوئے یا نہ ہوئے لیکن سنیوں میں جو کچے تھے، ان کے پکے بننے میں اور جو پکے تھے ان کو زیادہ پختہ بنانے میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جو عملی اقدامات ہوتے رہے، ان کا اندازہ اسی قسم کی

متاثر ہوتا ہے۔ گویا خانوادہ ولی اللٰہی کی ساری محوری خدمات کو آگے بڑھانے اور ان کے دائرے کی وسعت میں ممکنہ حد تک جتنا آپ کے بس میں تھا' آخر عمر تک جدوجہد' سعی وکوشش کا سلسلہ آپ کی طرف سے مسلسل جاری رہا' اور قلب وقالب دونوں کی حساب سے اسلامی دین کو آلائشوں سے پاک کر کے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں نے مسلمانان ہند کے آگے پیش کیا تھا' عملاً وتقریراً وتحریراً اسی کی طرف آپ عام مسلمانوں کو بھی دعوت دیتے رہے' اور درس وبیعت کی راہ سے چند چیدہ وبرگزیدہ نفوس عالیہ کی تربیت وتعلیم خاص توجہ سے فرمائی' جو آپ کے بعد اسی نصب العین کے زیادہ کام کرتے رہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیب سے کچھ اسباب بھی ایسے پیش آتے رہے' کہ جتنا زیادہ حسن قبول ولی اللٰہی نصب العین کو سیدنا الامام الکبیر کے ذریعے سے حاصل ہوا' شاید یہ کیفیت ازل ہی سے آپ کے لئے مقدر تھی' بیوہ عورتوں کے عقد کا مسئلہ ہو' یا سنت وبدعت تقلیدیت وغیر مقلدیت' تصوف وتوہبیت[1] تشیع[2] وتسنن[3] وغیرہ کے قصے ہوں' ان سارے مسائل میں ولی اللٰہی مسلک اور نقطۂ نظر کو ہمہ گیر عمومیت جیسی آپ کی بدولت میسر آئی' بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام قدرت نے آپ ہی کی ذات بابرکات سے لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی زندگی کے ولی اللٰہی رنگ کا نام ہی اب دیوبندیت ہو گیا ہے' جو سچ پوچھئے تو "قاسمیت" ہی کے لفظ کی دوسری تعبیر ہے' رحمۃ اللہ علیہ ونور اللہ ضریحہ' اللھم ارزقنا اتباعہ واحشرنا فی زمرۃ احبائہ آمین۔

---

[1] وہابیت [2] شیعیت [3] سنیت

"دفاعی اقدامات"

سیدنا الامام الکبیر کی مذکورہ بالا اصلاحی خدمات جن کا تعلق خود مسلمانوں اور اُن کے مختلف طبقات کی دینی زندگی سے تھا۔ ان خدمات میں آپ کب سے مشغول ہوئے؟ صحیح طور پر اس کا متعین کرنا دشوار ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ دین کا علم حق و باطل راست و ناراست کی امتیازی قوت جیسے جیسے نشوونما پاتی جاتی تھی، اس قوت کے اقتضاؤں کی تعمیل و تکمیل کا ذوق بھی بڑھتا چلا گیا، اپنی موروثی جائداد کی تقسیم پر نظر ثانی غالباً اس راہ میں آپ کا پہلا نمایاں قدم تھا، گویا خود اپنے نفس سے چاہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اصلاح کی ابتدا ہوئی۔ اور عقد بیوگان کے مسئلہ کی نوعیت سمجھنا چاہئے،

وانذر عشیرتک الاقربین	(اے پیغمبر) اپنے قریب کے رشتہ داروں کو (عذاب الٰہی) سے ڈراؤ۔

کے ربانی فرمان کی تمثیلی شکل تھی، بتدریج یوں ہی دائرے میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، تاایں کہ سنیوں کے بعد اپنے احاطہ میں شیعوں کو بھی اس نے سمیٹ لیا۔ آپ نے جن بزرگوں سے تعلیم پائی تھی۔ خصوصاً حضرت مولانا مملوک العلی صاحب اپنے زمانہ میں خانوادہ ولی اللٰہی کے دلی میں واحد نمائندہ تھے، ان کے علمی و عملی رجحانات سے آپ کا متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی، مصنف امام کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ عقد بیوگان کی رواج پذیری میں مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی کافی حصہ تھا، لکھا تھا کہ

"والد مرحوم نے (یعنی مولانا مملوک علی نے) اس کا (عقد بیوگان کا) نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا" ص۳۱

ان کے ساتھ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی کوششوں کا ذکر کر کے مصنف امام نے یہ ارقام فرماکر کہ

"ان دونوں بزرگواروں کے قدم بقدم حضرت مولانا (نانوتوی) نے اس کو پورا شائع کیا۔" صـ۳۱

خود اس سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ علم کے ساتھ اپنے استاد مولانا مملوک العلی کے عملی ذوق سے بھی سیدنا الامام الکبیر غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ بہرحال اس کے یہی بات ہی ہے کہ آنکھیں حضرت والا نے جس ماحول میں کھولی تھیں، یہ سارا ماحول ہی حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کے اصلاحی ہنگاموں سے اس زمانہ میں گونج رہا تھا حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی، مولانا اسماعیل شہید اور ان بزرگوں کا جو تعلق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، خود سید شہید کی نانوتہ میں تشریف آوری، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزوں کا ذکر ابتدائی تمہید میں بھی اور دوسرے مقامات پر بھی گذر چکا ہے۔ ان معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کیسے بتایا جا سکتا ہے کہ اپنی زندگی کی کس منزل میں اصلاحی کاروبار کے اس سلسلہ کی باگ سیدنا الامام الکبیر کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔ بلکہ یہی سمجھنا چاہئے کہ ان امور سے دلچسپی لینے کی صلاحیت جب سے آپ میں پیدا ہوئی اس میں مشغول ہو گئے اور جب تک زندہ رہے، اس راہ میں جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے۔ آفتاب کے متعلق یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ کب سے چمکنے لگا۔ اور کب تک چمکتا رہا۔ آفتاب نام ہی اس کا ہے جو خود روشن ہو اور دوسروں کو روشنی تقسیم کر رہا ہے۔

لیکن آپ کی ان "داخلی خدمات" جن کے متعلق پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ کے ساتھ امتیازی خصوصیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، آپ کے ساتھ دوسرے اہل علم و دین کا بھی، ان خدمات میں کافی حصہ ہے، جن میں خود آپ کے رفقاء خصوصاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے،

لیکن "داخلی خدمات" کے مقابلہ میں "دفاعی اقدامات" کے زیر عنوان سیدنا الامام الکبیر کی جن مخلصانہ مساعی اور سرفروشانہ مجاہدات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، یہ عجیب بات ہے کہ عمر کی یہ منزل

جس میں داخل ہونے کے بعد کام لینے والے نے آپ سے یہ مہمات انجام دلائے۔ بمشکل
بیس تیس سال سے زیادہ مدت کی نہیں ہوتی۔ اسی محدود مدت میں حالات ہی کچھ ایسے پیش
آئے کہ پے در پے، یکے بعد دیگرے، ایسے مہمات کی سرانجامی کے لئے قدرت کی طرف
سے آپ کا انتخاب ہوا، جن کے آثار و نتائج، ثمرات و برکات سے نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل کی
کتنی صدیاں متاثر و مستفید ہوتی رہیں گی۔

تاریخ ہند میں ۵۷ء کے ہنگامہ کے نام سے جو واقعہ مشہور ہے، کہنے والے اسی ہنگامے
کو غدر کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، اور کچھ دنوں سے آزادی کی پہلی جد و جہد کے عنوان سے
بھی اب لوگ اس کا چرچا کرنے لگے ہیں۔ حساب سے سیدنا الامام الکبیر کی عمر اس وقت
۳۷ - اور ۳۸ سال کے درمیان ہونی چاہئے، جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک کم پچاس یعنی ۴۹
سال کی عمر میں پیمانۂ حیات آپ کا لبریز ہو گیا، اور یہ سارے کارنامے جن کی داستان اب
سنائی جائے گی، چونکہ ان سب کا تعلق ۵۷ء والے ہنگامہ اور اس کے بعد کے زمانہ سے
ہے، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے خود ان کارناموں کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن مدت اور زمانہ
جس میں یہ ساری باتیں آپ سے بن آئیں، اور لینے والے نے جو کام آپ سے لیا، وہ یہی دس
گیارہ سال کی محدود مدت اور محدود زمانہ ہے۔

قبل اس کے کہ کچھ آگے بڑھوں، بے ساختہ اس وقت بھی ظل میں اصل کی زندگی کا
عکس معلوم ہوتا ہے کہ جھانک رہا ہے۔ ۶۳ سال کی زندگی میں وہاں بھی دیکھا گیا تھا کہ
انسانی تاریخ کے رخ کو پھیر دینے والے واقعات مدنی زندگی کے دس سال کی محدود
مدت ہی میں پیش آئے تھے۔ گویا اسی دس سال میں قیام قیامت تک اسلام کی بلکہ کہنے
کو کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے مستقبل کی تاریخ پوشیدہ تھی، صلی اللہ علیہ وسلم کھونے والے جس
کی راہ میں اپنا سب کچھ کھوتے ہیں دیکھ رہے ہیں، کن کن راہوں سے وہ کیا کچھ نہیں پاتے۔[1]

[1] اختیاری اور اکتسابی امور میں جن کے لئے پیروئ سنت اور اتباع محبوب حقیقی کی دولت (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے بیرونی
اقتدار کے سیاسی تسلط کا جو واقعہ اس ملک میں پیش آیا تھا یعنی انگریزوں کی نئی حکومت اس
ملک میں جو قائم ہو گئی تھی، ان انگریزوں اور ان کی حکومت سے سیدنا الامام الکبیر کے احساسات کا

(گزشتہ صفحہ سے) مقدر ہوتی ہے ان کے لئے تکوینی اور غیر اختیاری امور میں بھی مطابقت و مشابہت کا دروازہ
پہلے ہی سے کھول دیا جاتا ہے، تاکہ ظل اور اصل میں خلقی اور اختیاری تطابق کی سعادت بہم پہنچادی جائے
اور اصل کا پورا پورا عکس ظل میں نمایاں ہو جائے۔ مثلاً تمہید میں حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ نے نانوتہ کی
جغرافیائی صورت کو کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ نانوتہ کو ڈھانپے ہوئے ہیں، مدینۃ النبی سے مشابہ دکھلائی
ہے۔ دیوبند کی حالت قبل از ورود حضرت والا صاحب سوانح مخطوطہ نے انتہائی ظلم و جہل کی دکھلائی ہے
جس کا تذکرہ تاسیس مدرسہ دیوبند کے ضمن میں آ رہا ہے، جو اشبہ ہے زمانۂ جاہلیت سے۔ پھر حضرت
والا کے ورود سے علم و عمل کا ماحول بن جانا اور کمال کی روشنی پھیل جانا دکھلایا ہے جو اشبہ ہے طلوع آفتاب
رسالت سے۔ یہاں حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ حضرت والا کی مدت اصلاح و تربیت دس سال دکھلا رہے
ہیں جو اشبہ ہے مدنی زندگی کے دس سال سے، اور حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب نے
حضرت والا کے ایک خاص قلبی حال (انتہائی ثقل و بوجھ سے زبان کے مثل رکی ہو جانے) پر حضرت والا
کو فرمایا کہ مبارک ہو، حق تعالیٰ آپ کو علوم نبوت سے سرفراز فرمائے گا جو حسب ارشاد حضرت حاجی صاحب
اشبہ ہے ثقل وحی سے، پھر صاحب سوانح مخطوطہ نے نور نبوت کے زیر سایہ حضرت والا اور ان کے تین ساتھیوں
مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا رفیع الدین صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب کو خلفاء اربعہ سے تشبیہ دیتے
ہوئے دینی اصلاح کے عناصر اربعہ سے تعبیر فرمایا اور لکھا کہ حضرت والا علم و کرم، رحمت و شفقت اور وفور علم میں نسبت
صدیقی سے سرفراز تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جلال و شدت میں نسبت فاروقی سے ممتاز تھے۔ مولانا رفیع الدین
صاحب انکسار نفس اور حیا میں نسبت عثمانی سے مشرف تھے اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب قوت فیصلہ اور
اصابت رائے میں نسبت مرتضوی رکھتے تھے، نور نبوت کی تربیت کے زیر سایہ و زیر سرکردگی حضرت والا حق تعالیٰ
نے انہی عناصر اربعہ سے تجدید و احیائے دین کا کام اس مدرسہ کے راستہ سے لیا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے ظل میں
اصل کا عکس ایک ہی جہت سے نہیں جہات متعددہ سے نمایاں فرمایا جو ثمرہ ہے عالم تکوین میں حضرت والا کے کمال اتباع سنت اور کمال
محبت نبوی کا، گویا اختیاری اتباع چونکہ آپ کی سرشت میں خلقۃً ودیعت کر دیا گیا تھا جسے نمایاں ہونا تھا اس لئے تکوینی طور پر حضرت والا کی
طبیعت و فطرت ہی نہیں بلکہ آپ سے متعلقہ زمان و مکان اور احوال و سوانح نے بھی اصل کے متعلقات زمان و مکان اور احوال و سوانح کے عکس اتارنے
کی سعادت پائی۔ کوئی جاہل یا معاند اس سے معاذ اللہ حضرت والا کیلئے نبوت کا اثبات یا عیاذاً باللہ نبی سے مساوات نہ سمجھے بلکہ نبوۃ کی انتہائی
غلامی کا ادنیٰ تکوینی و اختیاری اور تکوینی مشابہت صاحب تصنیف کو نصیب ہوئی ہے یہی برابری یا مساوات نہیں بلکہ انتہائی غلامی اور پیروی نبوت کی دلیل ہوتی ہے
محمد طیب غفرلہٗ

جو تعلق تھا، مختلف موقعوں پر اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں۔ بجائے بٹن کے گھنڈی اور تکمہ کی استعمال پر زندگی بھر جو اس لئے اصرار کرتا رہا کہ بٹن لگانے کا طریقہ انگریزوں کا رواج دیا ہوا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ انگریز اور انگریزیت کے متعلق اس کی نفرت کے جذبات کی شدت کا حال کیا ہوگا۔ اپنی کتاب ہدایت الشیعہ میں ایک موقعہ پر لوگوں کے طبعی رجحانات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اور یہ لکھ کر کہ مثلاً غذا میں

"کسی کو میٹھا بھاتا ہے، کسی کو نمکین، کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے، کسی کو نفرت"

بے ساختہ تمثیل کے لئے آپ کے سامنے جو مثال آئی ہے، وہ یہ ہے،

"انگریزوں کو عطر نفیس سے تنفر، اور مچھلی کے اچار سے جسے سونگھ بھی لیجئے، تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں، رغبت"

آگے اسی کے بعد آپ کے الفاظ ہیں۔

"پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خرم و شاد، عیش و آرام سے رہیں، اور خوشبو سونگھیں تو مر جائیں" صـ

اور یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں، مغل حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے انگریزوں کی طرف سے اس فیصلہ کا جب اعلان کیا گیا کہ لال قلعہ سے آل تیمور کا آئندہ کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہ رہے گا، اور بہادر شاہ مرحوم کے بعد شاہی خاندان کے لوگوں کو قلعہ سے نکال دیا جائے گا۔ حکم دیا گیا کہ آئندہ مہرولی میں بہادر شاہ کا بیٹا مسکن پذیر ہو۔ یہ فیصلہ ۱۸۵۲ء میں کیا گیا تھا۔ یاد ہوگا ٹھیک دس سال اسی دلی کے محلہ کوچہ چیلان کے ایک مکان میں جھلنگے پر سیدنا الامام الکبیر کو جس حال میں پایا گیا تھا، مصنف امام نے اپنے الفاظ میں اس زمانہ کی تصویر آپ کی جو کھینچی ہے۔ یعنی باوجود شگفتہ مزاج ہونے کے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ترش رو مغموم رہتے تھے بال بکھرے ہوئے کپڑے میلے کچیلے، جوئیں سر میں بھری ہوئیں نہ کھانے کی خبر نہ پہننے کی پروا

کئی کئی دن کی پکی ہوئی خشک روٹیوں کے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو بھگو کر چبا لینا، اور پھر اسی جھلنگے پر پڑ رہنا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے چشم دید مشاہدات مصنف امام کے جو نقل کر چکا ہوں، نیز اسی کے ساتھ انگریزی حکومت کی بغاوت کا الزام آپ پر مختلف موقعوں پر جو لگایا گیا۔ پھر آپ کے بعد انگریزی حکومت کے ساتھ آپ کے تلامذہ[1] اور خلفاء کے تعلق کی آئندہ مسلسل جو نوعیت رہی جس کے دیکھنے والے اور جاننے والے اس وقت بھی موجود ہیں۔ ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں انگریزوں کی حکومت

---

[1] حضرت اقدس کے تمام تلامذہ میں انگریزوں سے نفرت کا یہ جذبہ قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چونکہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اور آپ کے جذبات کا گہرا رنگ لئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ حضرت والا کے اس جذبہ نفرت کے بھی مظہر اتم تھے۔ مالٹہ سے واپسی پر جب ترک موالات کا استفتاء حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اپنے تین شاگردوں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں۔ ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں گے۔ فرمایا کہ مجھ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ شدت لئے ہوئے ہے۔ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا | کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل سے ہٹا نہ دے۔

اس لئے آپ ہی لوگ لکھیں۔ اس واقعہ سے جہاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احتیاطی تقویٰ و تدین نمایاں ہے، وہیں اس جذبہ کا غلبہ بھی واضح ہے۔ میرے بھائی مولانا محمد طاہر مرحوم نے اس زمانہ میں حضرت سے پوچھا کہ حضرت ان انگریزوں کی کوئی بات اچھی بھی ہے؟ فرمایا کہ ہاں ان کے کباب بہت اچھے ہوں گے۔ خود انگریز بھی اسے محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ سر جیمس میسٹن جو اس زمانہ میں یو۔پی کے گورنر تھے، ایک موقعہ پر انہوں نے کہا تھا کہ اگر اس شخص (مولانا محمود حسن) کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اڑے گی، جس میں کوئی انگریز ہوگا۔ نیز یہ بھی ان ہی کا مقولہ ہے کہ اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی۔ یہ درحقیقت وہی سیدنا الامام الکبیر کے جذبات تھے جو حضرت شیخ کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ جب مستفیدین کا یہ حال تھا تو اندازہ کر لیا جائے کہ اصل کا مقام کیا ہوگا۔ محمد طیب غفرلہ

کی طرف سے کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کر دیا تو خیر ختم ہی ہو چکی، لے دے کر بچا کھچا سرمایہ مسلمانوں کے پاس دین کا رہ گیا ہے۔ سو بقول اکبر مرحوم ؎

نئی نئی آنچیں لگ رہی ہیں، یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے
نہ مغربی ہے نہ مشرقی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

خواص ہی نہیں، غدر سے پہلے ہی جیسا کہ سرسید مرحوم نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں لکھا ہے،

"رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی، کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری، اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی"۔ ص۷۲ ضمیمہ حیات جاوید

"رعایا ہندوستان" کے عوام کے تاثرات کے متعلق سرسید مرحوم کی جب یہ شہادت ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ حال سے مستقبل کے نتائج تک پہنچنے کی جتنی زیادہ بصیرت جن لوگوں میں تھی، ان ارباب فکر و نظر کا حال کیا ہوگا، یوں بھی جب یہ سب کچھ دیکھا جا رہا تھا کہ اصلی اور مصنوعی (یعنی دیسی) پادریوں کا ٹڈی دل، ہندوؤں اور مسلمانوں کے دھرم اور دین کے چاٹ جانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ سرکاری حکام خفیہ اور بسا اوقات علانیہ بھی، دام سے درم سے قدم سے ان پادریوں کی ہمت افزائیوں میں مشغول و منہمک نظر آ رہے تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے دینی پیشواؤں کی تحقیر و توہین کا بازار ہر طرف گرم تھا، دین کے ان خطرات کے ساتھ ساتھ دنیا کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے راجہ اور والیان ملک نواب اور رئیس نان شبینہ کے محتاج بن کر گلی کوچوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ عوام کی غربت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ بقول سرسید مرحوم ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہر ہندوستانی اپنی گردن کٹوا لینے پر بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔ ص۱۲ (بغاوت ہند)

یہ اور اسی قسم کے واقعات و حالات جن سے عام طور پر لوگ واقف بھی ہیں اور موقعہ موقعہ سے اس کتاب کے مقدمہ میں بھی، اصل کتاب میں بھی، ان امور کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

اب اسی کے ساتھ جب ہم یہ سنتے ہیں، کہ فوج کی بغاوت عام کے بعد آگے پیچھے ہندوستان کے

مختلف علاقوں کے باشندے ہنگامہ غدر کی آگ میں جیسے کود پڑے تھے' اسی طرح سیدنا الامام الکبیر بھی عملاً اس میں شریک ہو گئے تھے۔ خود بھی شریک ہوئے اور آپ کے پیر و مرشد' حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ' نیز آپ کے رفیق الدنیا والآخرۃ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کش مکش میں حصہ لیا' تو بظاہر اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ دارالعلوم دیوبند کے متوسلین عموماً اپنی مجلسوں میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں

واقعات و حالات سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے' اور لکھنے والوں نے جو اس زمانہ میں موجود تھے' انہوں نے بھی لکھا ہے کہ کسی باضابطہ اسکیم' یا لائحہ عمل کے تحت غدر کا یہ ہنگامہ پیش نہیں آیا تھا' اور نہ ہندوستان کی کسی خاص قوم یا کسی خاص طبقہ نے بغاوت کیلئے' یا آزادی کی جد وجہد کا پروگرام بنایا تھا' بلکہ صحیح یہی ہے کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد' ہندوستان کی حکومت کا باضابطہ چارج لینے کا فیصلہ انگریزی قوم نے جب کر لیا اور سو سال کی طویل مدت میں ہندوستان کے باشندوں کو انگریزوں اور انگریزی حکومت کے طور و طریقہ' رنگ ڈھنگ' کے تجربہ سے ان کے باطنی ارادوں کا پتہ جو کچھ بھی چلا' مجموعی طور پر سب سے ملک کے باشندوں میں بے زاری کے جذبات پرورش پاتے چلے جا رہے تھے' اس عرصہ میں انگریزی حکومت کا دائرہ بھی وسعت کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ برہما سے سرحد کابل و قندھار' اور نیپال سے راس کماری تک کا کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا جس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریز قابض و دخیل نہ ہوں۔ فتوحات کی اس عجیب و غریب وسعت میں بجائے گوروں کی پلٹن کے ہندوستان کی کالی پلٹن کے اخلاص و جاں نثاری اور بہی خواہی کے ایسے حیرت انگیز تجربات انگریزوں کو ہوئے کہ گوری پلٹن کی گراں فوج کے مقابلہ میں کالی پلٹن کی ارزانی پر بھروسہ کر کے ہر فوج میں کالوں کو اکثریت حاصل ہو گئی' حتیٰ کہ جس سے گورے نا آشنا تھے۔ ہندوستانی فوج اسی نمک کی کان انگریزوں کو نظر آئی' دوسری طرف کالی پلٹن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ جنگ کے جدید حربی آلات کی جگہ یہ سمجھنے لگی کہ اپنی کثرت تعداد سے انگریزوں کو

ہم لوگوں نے اتنے ممالک فتح کر کے حوالہ کر دیئے ہیں، اور تو کچھ نہیں لیکن اس احساس نے کالی پلٹن کے ناز نخروں کے سمند پر تازیانہ کا کام کیا۔ کالی پلٹن کا یہ بھی ایک نخرہ تھا کہ چربی ملے ہوئے کارتوس کو دانتوں سے نہیں کاٹیں گے۔ وہ تو خریداروں پر اپنا ناز دکھا رہے تھے لیکن تقدیر نے اسی ناز کو نار بنا دیا۔ انگریز کچھ اڑ گئے، غرور تو کالوں کے دماغ میں بھر ہی گیا تھا اٹھ کھڑے ہوئے، اور وہی ہندوستانی فوج جو خود ماڑا یعنی بیچ پی کر اپنے گورے افسروں کو چاول کھلاتے پر اصرار کرتی تھی، انگریزوں ہی کو نہیں، بلکہ ان کے بچوں، اور ان کی عورتوں کو اس طریقے قتل کرنے لگی، کہ گویا وہ انسان نہ تھے۔ فوج جب باغی ہو گئی، تو ملک کے عام باشندے جو سو سال کے اس عرصہ میں انگریزی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کے سامنے بھی نجات کی ایک صورت آ گئی، مختلف علاقوں کے برباد اور تباہ ہونے والے خاندانوں میں بھی کچھ ابال آیا، کچھ غنڈوں شہدوں کو بھی لوٹ مار کا موقعہ مل گیا، یوں مل ملا کر وہ صورت پیش آئی، جسے چاہے آپ غدر و بغاوت کہئے، چاہے اس کا نام آزادی کی جدوجہد رکھ دیجئے۔ اس میں ہندو مسلمان اور دونوں قوموں کے چھوٹے بڑے عوام و خواص سب ہی طرح کے لوگ شریک تھے لیکن با ایں ہمہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جیسے پہلے کوئی لائحہ عمل لوگوں کے سامنے نہ تھا، بعد کو بھی ضبط و نظم کے قائم کرنے کا عام طور پر نہ لوگوں کو خیال ہی ہوا، اور وقتی طور پر کہیں کچھ کیا بھی گیا تو حد سے زیادہ بے جان مضمحل، گستہ و شکستہ تھا۔

جب سب سے بڑے مرکز، جسے فوجیوں نے بھی سب سے بڑا مرکز بنایا تھا۔ یعنی دلی یہاں کا نظم و ضبط جس کے دل و دماغ کے سپرد کیا گیا تھا۔ یعنی سراج الدین ظفر شاہ مرحوم سید احمد خاں ان کے دربار کے خطاب یافتہ درباری آدمی تھے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ ظفر شاہ کے متعلق ان کے قلم سے جو نکلے ہیں، بے بنیاد ہیں، لکھتے ہیں کہ

"ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کے ملکوں کی خبر لے آتا ہوں، اور اس بات کو اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا، اور درباریوں سے

تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے"[1] ص۱۹

یہی نہیں بلکہ وہی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"لوگ اس کے (ظفر شاہ) کے مرید ہوتے تھے کسی فائدہ کی نظر سے نہ بطور اعتقاد"

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی ابلہانہ معصومیت اس زمانہ میں سلاطین اور حکمرانوں کے کمالات میں شمار ہوتی تھی، خاکسار ٹونک میں جب پڑھتا تھا تو ریاست کے والی مرحوم ابراہیم علی خان خلیل کے متعلق بارہا اپنے استاد مولانا برکات احمد صاحب کی زبانی اس قسم کی باتیں سنا کرتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے نواب صاحب کو خیال ہو جاتا تھا کہ نگاہوں سے لوگوں کے پوشیدہ ہو گئے۔ دربار والے چونکہ جانتے تھے کہ اس وقت نواب صاحب اپنے غائب ہونے کے مالیخولیا میں مگن ہیں، ایک دوسرے کو اشاروں اشاروں میں پوچھتے کہ سرکار کیا ہوئے۔ دوسرا تعجب سے سر ہلاتا کہ خدا جانے کیا ہوئے۔ چند لمحہ بعد پھر نواب صاحب کا لکون کے بعد برآمد ہوتا اور درباری کہتے کہ سرکار کے ساتھ کیا صورت پیش آئی، پوچھتے کہ کیا ہوا، تب درباری باور کراتے کہ گدی سے اچانک حضور ناپید ہو گئے، مسکرا کر جواب دیتے کہ ان باتوں کا عوام سے چرچا نہ کرنا، حیدرآباد کے نواب افضل الدولہ مرحوم جو غدر کے زمانہ میں حیدرآباد کے حکمران تھے سنا ہے کہ شکار میں حیدرآباد سے دو تین میل نکل جانے کے بعد کہتے کہ تم لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہو۔ میں اپنے ملک سے باہر نہ جاؤں گا۔ لوگ کہتے کہ سرکار ابھی تو سیکڑوں میل تک آپ کا علاقہ ہے۔ تب بگڑ کر فرماتے کہ تم مجھے دھوکہ دے کر انگریزوں کے علاقہ میں داخل کر دینا چاہتے ہو۔ مرشدآباد کی مسند پر سراج الدولہ کے قتل ہو جانے کے بعد انگریزوں نے نجم الدولہ نامی خاندان کے کسی فرد کو بٹھایا۔ معاہدہ یہ طے پایا کہ بنگال بہار اڑیسہ تینوں صوبوں میں حکمرانی کا اقتدار انگریزوں کو حاصل ہوگا اور نجم الدولہ کو سالانہ پچاس لاکھ روپے بطور وظیفہ دیئے جا دیں گے مشہور لارڈ کلایو جس سے یہ معاہدہ طے ہوا تھا، اس نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ اس معاہدہ سے بہت مسرور تھا اور رخصت کے وقت کہنے لگا کہ خوب ہوا اب تو جتنے چاہیں گے محل بنائیں گے (تاریخ راجہ شیو پرشاد ص۲۲) نوعمر لڑکے تجربہ کار حکمرانوں کو نکال کر تخت پر قبضہ کرنے کے لئے عموماً اس زمانہ میں بے چین نظر آتے ہیں یہی بنگال کا سراج الدولہ جو ۲۲ سال کی عمر میں قتل ہی ہو گیا، اپنے حقیقی نانا علی وردی خان ناظم بنگال جس نے یتیم ہو جانے کی وجہ سے سراج الدولہ کو لڑکے کی طرح پالا تھا اور اپنے بعد باضابطہ ولی عہد بھی بنا دیا تھا لیکن سراج الدولہ کی عمر غالباً پندرہ سولہ کی ہوگی کہ مرشدآباد سے بھاگ کر پٹنہ عظیم آباد آ گیا، اور اپنے فدائی نانا کے مقابلہ میں اعلان جنگ دے کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت آصف جاہ والی دکن دلی کے وزیر اعظم ہو کر دکن سے تشریف لے گئے۔ دکن میں اپنی جگہ اپنے بیٹے ناصر جنگ کو نائب بنا دیا تھا لیکن وزارت چھوڑ کر پھر اپنے ملک کی طرف جب واپس ہونے لگے تو معلوم ہوا کہ صاحبزادہ والا تبار فوج لئے مقابلہ میں کھڑے ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

ان مریدوں میں ایک مرزا غالب بھی تھے جو چار شخص نسبتیں بادشاہ سے رکھتے تھے سید صاحب نے لکھا ہے کہ ظفر شاہ کو

"کوئی ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا' اس کے منہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے'
اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ ص۲۱"

اور یہ حال کچھ اسی غریب ظفر شاہ مرحوم کا نہ تھا' اس زمانہ میں ریاست و امارت کے لوازم میں منجملہ اور باتوں کے اس قسم کی اہلیاں بھی شریک تھیں۔

ایسی صورت میں عوام کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن خواص اور خواص میں بھی سیدنا الامام الکبیر جیسے فہم و فراست ' اور دینی ذمہ داریوں کے محسوس کرنے والی ہستیوں کے متعلق یہ دیکھتے ہوئے کہ آج کل فضل و کمال ' بڑائی اور بزرگی کا سب سے بڑا معیار یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ سیاسی کاروبار میں سب سے زیادہ حصہ جس نے لیا' وہی سب سے بڑا آدمی ہے ' اور دوسرے میدانوں میں خواہ کچھ ہی حال ہو کسی مقام کا مالک ہو' لیکن سیاست کے میدان کا جو اپنے آپ کو کھلاڑی ثابت نہ کر سکا ' وہ کچھ نہیں ہے۔ اسی عام سطحی معیار کو دیکھ کر بے دھڑک یہ مان لینا ' کہ غدر کے ہنگامہ میں سیدنا الامام الکبیر نے اسی طرح حصہ لیا تھا ' جیسے اس ملک کے عام باشندے اس کی آگ میں کود پڑے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر کی شان ہی کے مطابق اس قسم کا عاجلانہ فیصلہ درست ہو سکتا ہے ' اور نہ واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے جیسا کہ میں عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ یہ نئی قائم ہونے والی حکومت مسلسل اپنے اعلانیہ اور خفیہ طرز عمل سے ہندوستان کے باشندوں کو اپنی طرف سے بے زار اور حد سے زیادہ

(گزشتہ صفحہ سے) حضرت آصف جاہ کے بعد نظام علی خان دکن کے والی ہوئے' نظام سے بھی ان کے صاحبزادے عالی جاہ باغی ہو گئے' اور زمانہ تک ملک کے نظام کو درہم برہم کرتے رہے۔ لکھنؤ میں بھی اسی قسم کی افراتفری پھیلی ہوئی تھی' ان قصوں کو کوئی لکھے تو بڑی کتاب بن سکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ سکھوں کی تازہ دم قوم کے امراء کی ذہنیت جیسا کہ راجہ شیو پرشاد نے لکھا ہے یہ ہو گئی تھی کہ انگریزوں کے پنشن خوار بن جانے میں بجائے حکمرانی کے ان کو زیادہ سہولت محسوس ہوتی تھی ' تاریخ جہاں نما ص۹۶

سے بیزار بناتی چلی جا رہی تھی۔ جن لوگوں میں بصیرت ودانائی کی روشنی جتنی زیادہ تھی، اسی حد تک نفرت اور بیزاری کے جذبات بھی ان کے شدید سے شدید تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس باب میں سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک کی گرانیاں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، حد سے گذری ہوئی تھیں مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اتار کر براہ راست انگریزی قوم نے ہندوستان کی حکومت کا جائزہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی قیصر بنا کر دلی میں ملکہ کی تاج پوشی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا، اس زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام دہلی میں تھا۔ لیکن جوں ہی کہ اس جشن کے انعقاد کا ساز وسامان ہونے لگا، دیکھا گیا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب فرماتے ہیں۔

> "حضرت نانوتوی دہلی سے دیوبند چلے آئے، اور فرمایا کہ مجھ سے انکی (انگریزوں کی) شوکت نہیں دیکھی جاتی، اس لئے دہلی سے دیوبند چلا آیا کہ نہ دیکھوں گا، نہ کوفت ہوگی۔" (سیاسی یادداشت ص۲)

ظاہر ہے کہ کسی قوم اور حکومت کی طرف سے دل گرفتگی کی یہ آخری شکل ہو سکتی ہے لیکن اسی موقعہ پر آگے مولانا طیب صاحب کی اس روایت میں ایک اضافہ بھی ہے۔ اسی اضافہ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، لکھا ہے کہ

> "نیز فرمایا کہ الحمد للہ اتنی طاقت تو ہے کہ سارا دربار درہم برہم کر دوں لیکن سنبھالنے والے نظر نہیں آتے، اس لئے دہلی چھوڑ کر چلا آیا، کہ نہ ان کا کروفر دیکھوں گا، نہ کوفت وسوخت ہوگی۔" ص۲

حضرت والا کی طرف جس دعوے کو اس اطلاع میں منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ دربار کے درہم وبرہم کر دینے کے جس امکان اور طاقت کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کیا دعا وہمت کی روحانی اور باطنی قوت کے امکانات کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا گیا ہے؟

بظاہر اول دہلہ میں ممکن ہے ذہن اسی کی طرف منتقل ہو جائے۔ لیکن اس راہ میں ان کے تاثرات اور رسوخ الکبیر کے ستر و اخفا کی غیر معمولی کوششوں سے جو واقف ہیں، اگر سوچیں گے، تو یقیناً ان کے عجیب نہیں تو یہ بات خلاف دستور ضرور معلوم ہوگی، جہاں تک میں جانتا ہوں یا دوسروں سے سنا ہے، ناگزیر مجبوری کے بغیر اپنی زندگی کے اس باطنی پہلو کی ہوا بھی چاہتے تھے، کہ کسی کو نہ لگنے پائے۔

اسی لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں سر سید مرحوم نے انگریزوں کے دور از کار وسوسوں[1] کا ازالہ کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا جو اظہار کیا ہے، کہ

"میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا، کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے حاکموں پر جہاد کریں"

بلکہ خروج کے متعلق بھی اپنا ذاتی احساس انہوں نے ظاہر کیا ہے۔

" خروج میں بھی ہرگز مشورہ اور پہلے سے صلاح نہ تھی "

اور وہی جو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "جہاد کے فتوی" کے نام سے باغیوں نے جس فتوے کو مشہور کیا تھا، اس پر علماء کے دستخط زیادہ تر جعلی تھے حتی کہ وہی لکھتے ہیں کہ

" ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی گئی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا " ص۱۹

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مستند سوانح عمری تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں جو خبر

---

[1] ۵۷ء کے ہنگامہ کا تصہ جب سیدان کارزار سے نکل کر سرکاری تحقیقات کاروں اور کالج کے پروفیسروں استادوں کے سامنے آیا، تو کسی کو اس کی جڑ روس میں نظر آتی تھی۔ ایک صاحب کو ولی عہد ایران کے تحریر میں کاغذ مل گیا تھا، جس میں بیرونی تسلط کے مصائب کو بیان کرتے ہوئے ایرانیوں کو ہندوستان کے حال سے عبرت پذیر ہونے کی وصیت کی گئی تھی، اسی کاغذ کو بنیاد بنا کر بعض کہتے تھے کہ سرچشمہ بغاوت کا ایران میں تھا، خدا جانے ہندوستانیوں نے کسی وبا وغیرہ کے مقابلہ میں بطور ٹوٹکہ کے گاؤں گاؤں میں روٹیاں بانٹی تھیں، سمجھا گیا کہ ان روٹیوں پر بغاوت کا پیغام لکھا ہوا تھا۔ لوگ ان کو چٹ کر چکے تھے۔ یہ چپاتیاں ۱۸۵۷ء میں تقسیم ہوئی تھیں، اور بھی طرح طرح کی بدخوابیاں تھیں، جن میں مدتوں انگریز مبتلا رہے۔ تفصیل کے لئے غدر کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۲

دی گئی ہے کہ

"سنایا گیا ہے کہ ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا" ج اول ص۴۴

یہ یا اسی قسم کی باتیں کتابوں میں جو ملتی ہیں، ان کو محض وقتی مصلحت اندیشیوں کا نتیجہ قرار دے کر خواہ مخواہ اس پر اصرار کرنا کہ کسی باضابطہ پروگرام کو طے کر کے آزادی کی یہ جدوجہد ہندوستان میں شروع ہوئی تھی، شاید درست نہ ہوگا، بلکہ واقعہ کی صحیح نوعیت یہی معلوم ہوتی ہے کہ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے جیت لینے کے بعد سو سال تک انگریزی حکومت کے مسلسل تجربات ہندوستانیوں میں بے زاری کی آگ کو بھڑکاتی چلی جا رہی تھی، ایک اندرونی زخم تھا جو اندر ہی اندر شعوری و غیر شعوری طور پر پکتا چلا جا رہا تھا۔ تا اینکہ ٹھیک سو سال کے بعد ۱۸۵۷ء میں چربی ملے ہوئے کارتوسوں کا قصہ منہ بن گیا، زخم پھٹ گیا، دبے ہوئے شعلے بھڑک اٹھے، چونکہ کسی باضابطہ نظام کے تحت اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ افراتفری پھیل گئی۔ ایک علاقہ کی سن کر دوسرے علاقہ والوں میں تو چل میں چل کی کھلبلی مچ گئی، پھر جو کچھ ہونا تھا، ہوا۔ چاہیے اسے نوشتہ تقدیر کہیے، یا زشتی اعمال کا قدرتی نتیجہ قرار دیجیے۔ ایک ہندو مورخ راجہ شیو پرشاد نے اپنی آنکھوں سے دلی میں جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اور کتابوں میں "زشتی اعمال" کی نادری صورت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ دونوں ہی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"یہ سانحہ نادرشاہی سے بھی بڑھ کر ہو گیا"[۱] ص۱۲۷

خصوصاً روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں بجائے اس باطنی پہلو کے کافی گنجائش اس بات کی بھی

---

[۱] مگر عجیب بات ہے کہ نادری بے چارہ اب تک بدنام ہے، یوں بھی تو سوچنا چاہیے کہ قتل عام جو نادر کے حکم سے دلی میں ہوا، مورخین کا بیان ہے کہ نصف یوم سے آگے نہ بڑھا۔ سیر المتاخرین میں ہے "چوں نصف روز بگذشت، نادرشاہ ندا ئے امان لقیۃ السیف درداد و لشکریاں دست کوتاہ کردند" ص۴۸۵ ج۲ لیکن دلی پر قابض ہو جانے کے بعد ایام غدر میں شیو پرشاد کا بیان ہے کہ ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء یعنی چار دن تک مسلسل دلی کی گلی کوچوں میں قتل عام کا بازار انگریزوں کی طرف سے گرم رہا۔ آدھا دن کے قتل عام اور چار دن کے قتل عام میں خود سوچنا چاہیے کوئی نسبت ہو سکتی ہے ۱۲

ہے کہ اس امکان کو ظاہری اسباب پر محمول کیا جائے سیدنا الامام الکبیر اپنے اثر اور رسوخ کے لحاظ سے جو کچھ کر سکتے تھے "اس کو تو جانے دیجئے - اس قسم کے رنگ میں بھنگ جب مشاہدہ بتا رہا ہے کہ معمولی بم پھینکنے والے ہنگامی دہشت پسند بھی ڈال سکتے تھے ' اور لارڈ ہارڈنگ کے ساتھ اسی دلی میں جشن ہی کے موقعہ پر درہمی اور برہمی کے جس تماشے کو دیکھا گیا تھا 'اس کے دیکھنے والے تو اب بھی مل سکتے ہیں یوں بھی اصولاً تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے - بلکہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

"مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے"

خود یہ بھی بتا رہا ہے کہ اسباب و علل کے جس عمومی نظام کے تحت دنیا چل رہی ہے سیدنا الامام الکبیر کے سامنے اللہ کی یہی سنت اور قدرتی کارفرمائیوں کا یہی عام پہلو تھا' حاصل گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت مسلّطہ کے ختم کر دینے یا کم از کم اس کے نظام کو الٹ پلٹ دینے کے امکانات کو پاتے ہوئے بھی' سیدنا الامام الکبیر یہ محسوس فرماتے تھے کہ اس تخریب کے بعد تعمیر کی دشواریوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے عام سنت اللہ کی رو سے جن ناگزیر عناصر اور اسباب و شروط کی ضرورت ہے ان سے اس زمانہ کا ماحول خالی اور مفلس نظر آرہا تھا' اور یہی چیز تھی' جو تخریبی امکانات سے فائدہ اٹھانے میں مزاحم ہو جاتی تھی' ملک اس زمانہ میں جس حال میں تھا' عوام و خواص جس رنگ میں رنگین تھے جس نے حکیمانہ بصیرت کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہے' وہ اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے' ظفر شاہ اور اسی عہد کے بعض دوسرے حکمرانوں کے متعلق نوٹ میں جو معلومات درج کی گئی ہیں' کم از کم وہی اس دعوے کی توجیہ کے لئے کافی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا طیب صاحب کی یہ روایت اگر صحیح ہے' اور نہ صحیح ہونے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی' تو خود یہی اس بات کی واقعی شہادت ہے کہ ۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ کی شرکت کسی باضابطہ سوچے ہوئے لائحہ عمل کا

نتیجہ نہ تھی[۱] - بلکہ ۵۷ء سے پہلے تقریباً سو سال تک انگریزوں کے مقابلہ میں اصحاب علم و دین کی طرف سے جو خاموشی اختیار کی گئی، اور اسی کا یہ جواب کہ دینی ذمہ داریوں کا احساس علماء میں مردہ ہو چکا تھا کچھ عام حالات کے لحاظ سے ممکن ہے کہ کسی حد تک صحیح بھی ہو لیکن اسی زمانہ میں آخر سید شہید، مولانا شہید اور ان کے رواستیاز مخلص رفقاء کی جان بازیوں کو دیکھتے ہوئے پھر اس کا دعوٰی کیسے کیا جا سکتا ہے - ان بزرگوں کی جد و جہد کا رخ بھی بجائے انگریزوں اور انگریزی حکومت کے پنجاب کی سکھ طاقت کی ہی طرف اول سے آخر تک جو پھرا رہا، خود اس واقعہ کی توجیہ نیز ۵۷ء کے ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد مدت تک سکوت اور خاموشی کی فضا جو قائم رہی، اس حال کو دیکھ کر جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے یہ عاجلانہ فیصلہ اور بڑی بے باکی کی بات ہو گی کہ ایمانی زندگی سے عوام کے ساتھ خواص بھی کلیۃً محروم ہو چکے تھے، اور کفر ہی نہیں بلکہ ان میں ہر ایک بخوشی و رضا جاہلیت کی زندگی پر قانع ہو کر بیٹھ گیا تھا، آخر میں پوچھتا ہوں کہ ۵۷ء میں جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن اس طوفان کے اتر جانے کے بعد خود سیدنا الامام الکبیر کی خاموشی اور سکوت

---

[۱] کوئی شبہ نہیں کہ ۵۷ء کا فوجی ہنگامہ اور اس کی خبر پر انگریزوں کے تظلم سے تنگ آئے ہوئے ہندوستانیوں کا جگہ جگہ کھڑے ہو جانا ایک وقتی جذبہ تھا جو اپنے اسباب کے لحاظ سے تو وقتی نہ تھا مگر نہفتہ (اٹھ جانے) کے لحاظ سے وقتی تھا - لیکن ان بزرگوں کا اس میں کھڑا ہونا کسی وقتی جذبہ اور ہنگامی حرکت کا نتیجہ نہ تھا - بلکہ ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل کا ثمرہ تھا - حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کا مشن ہمہ وقت ان بزرگوں کے پیش نظر تھا، اس کے لئے یہ وقت اور وقت کا ہنگامہ انہیں سازگار نظر آیا تو اس متوارث مشن کی روشنی میں میدان میں اتر آئے - چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ مدرسہ دیوبند ۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا - جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آئیگی اس کی واضح دلیل ہے کہ کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل تھا - جس میں ۵۷ء میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے لئے دوسرا راستہ سوچا گیا، اور بقول حضرت مؤلف سوانح کہ یہ ہنگامہ اگر اس وقت کی زمین ہند پر ختم ہو گیا تھا تو ان بزرگوں کے دل و دماغ سے ختم نہ ہوا تھا جو برابر مستعد رہے اور آگے بڑھتے چلے گئے - اس ہنگامہ کی ناکامی پر سیدنا الامام الکبیر اور ان کے شیخ اور اس حلقہ کے دوسرے بزرگوں نے ان اسباب ناکامی کو تاڑ لیا تھا - ان ہی اسباب کا ازالہ اس دوسری صورت سے کرنا چاہتے تھے یہ اسکی واضح دلیل ہے کہ ان حضرات کی اس میں شرکت غیر شعوری یا جذباتی رنگ سے نہ تھی بلکہ ایک مقصد کی روشنی میں تھی - محمد طیب غفرلہٗ

یقیناً بے معنی اور بلا وجہ تھی۔ خدا جزا خیر دے مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو کہ

"مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے"

ان حقیقت افروز الفاظ پر مشتمل روایت کو بہت سی ذہنی الجھنوں کے سلجھانے کا سامان انہوں نے مہیا فرما دیا ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مصنف امام نے اسی غدر کے ہنگامہ کے متعلق اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ سرکار میں اس کی مخبری کی گئی تھی کہ حکومت سے بغاوت کے اس قصہ میں وہ بھی شریک تھے، آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"مولٰنا فسادوں سے کوسوں دور تھے، ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کہیں کے ڈپٹی، یا صدر الصدور ہوتے" ص۱۹

اسی طرح حضرت گنگوہی بھی غدر ہی کے جرموں میں ماخوذ ہوئے تھے اور کچھ دن جیل میں گذارنے کے بعد رہائی ہوئی تھی، اس واقعہ کی تفصیل کرتے ہوئے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید میں بجنسہ ان ہی الفاظ کا تقریباً اعادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے، ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کوئی کہیں کا ڈپٹی اور کوئی کسی جگہ کا صدر الصدور، کچہری کے عالی شان کمرے، اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والی حجروں اور کھرے بوریا کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے"

ج۱ ص۷۴ تذکرۃ الرشید

خصوصاً خط کشیدہ الفاظ دونوں حضرات کے ایک ہی ہیں۔ واقعات سے جو واقف ہیں، اور سچ پوچھئے، تو ان حضرات کی عملی شرکت کا واقعہ کوئی راز درون خانہ تھا بھی نہیں، "مخلبا" میں جو بات طے ہوئی ہو، اور کی گئی ہو، راز بن کر وہ کیسے رہ جاتی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ دونوں حضرات کے

اس بیان کو عموماً لوگ وقتی مصالح کا اقتضا قرار دے کر دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ واقعہ کی تعبیر میں "توریہ" کے اس طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے جس کی شرعاً و اخلاقاً سمجھا جاتا ہے کہ اجازت ہے، ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے، لیکن اگر غور کیجئے، تو واقعہ کی تعبیر کا عام پیرایہ بھی شاید یہی ہوسکتا تھا۔ سب سے زیادہ مستحق توجہ مذکورہ فقروں میں

"فسادوں"

کا لفظ ہے۔ دونوں حضرات انکار اس کا کر رہے ہیں کہ "فساد" کی شرکت سے دونوں حضرات بری تھے۔ آخر قرآن مجید ہی میں جب فرمایا گیا ہے کہ

تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا	یہ دار آخرت ہم ان ہی کیلئے رکھینگے جو زمین میں بگاڑ اور تکبر نہیں کرتے

اور ایک اسی ایک آیت میں کیا آپ قرآن پڑھئے، شروع سے آخر تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسی آیتیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیں گی، جن میں زمین پر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں اور ان کے مفسدانہ کاروبار پر زجر و توبیخ انتہائی سخت اور کرخت لہجوں میں کی گئی ہے۔

پس ایسے بدترین قرآنی جرم' سے برات کا دعویٰ اگر کیا گیا ہے، تو آپ خود سوچئے، کہ اس کے سوا اور کیا کیا جاتا، اسی لئے بجائے "توریہ" کے میرے نزدیک تو واقعہ کے اظہار کا یہ سیدھا سادہ طریقہ ہے، اور یہی سوچنے کی بات ہے، کہ "فساد" جس کی نفی کی گئی ہے، اس سے کیا مراد ہے۔ اور شرکت کا واقعہ جو یقیناً واقعہ ہے، اس کی صحیح نوعیت کیا تھی۔ اور اب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء خاص نے اس مہم میں یقیناً حصہ لیا تھا۔

اس سلسلہ میں آئندہ جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس سے پہلے ایک بات سن لی جائے جن معلومات کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچنے اور پہنچانے کی کوشش کروں گا، ان کا بڑا حصہ ایسی

کتابوں سے ماخوذ ہے جو شور رستخیز "دارو گیر" کی اس قیامت کے بعد لکھی گئی ہیں، جسے غدر کے بعد انگریزی قوم کے مجنونانہ انتقامی جذبات نے اس ملک میں برپا کر رکھا تھا۔ ع

بات پر یاں زبان کٹتی ہے

صرف شاعری نہیں، بلکہ اس عہد میں واقعہ بھی یہی گذر رہا تھا۔ اس روح فرسا جاں گداز حادثہ کا جس پر بیس اکیس سال بھی نہیں گذرے تھے جب ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب مرتب فرمائی تھی، ان کے بعد مولانا عاشق الٰہی صاحب مرحوم نے حضرت گنگوہی کی سوانح عمری مدون کی، اب قصہ کافی پرانا ہو چکا تھا، اسی لئے بہت سی باتیں جو مصنف امام کی کتاب میں مجمل تھیں، مولانا عاشق الٰہی کی کتاب میں ان کی تفصیل کا موقعہ میسر آیا، سوانح مخطوطہ کے نام سے سیدنا الامام الکبیر کی جس غیر مطبوعہ ناقص سوانح عمری کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں، صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف امام سے پہلے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ یا اس کے بعد تصنیف ہوئی[1]۔ تاہم اتنا یقینی ہے کہ بزن وبکش، زدوبرد، دھر پکڑ، کنیج سیاہ، کا سلسلہ حکومت کی طرف سے ختم نہیں ہوا تھا، بظاہر اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں سرے سے اس واقعہ کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے[2]، صرف ایک موقعہ پر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے تذکرے میں

---

[1] سوانح مخطوطہ ۱۲۹۸ھ میں لکھی گئی ہے۔ جبکہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات پر ایک سال گذر چکا تھا۔ چنانچہ بنا مدرسہ دیوبند کے سلسلہ میں خود سوانح مخطوطہ سے ہی یہ اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا، اور مصنف امام کی سوانح اس سے مقدم ہے جو سیدنا الامام الکبیر کے سن وفات ۱۲۹۷ھ ہی میں لکھی گئی ہے جیسا کہ اس سوانح کے اس قدیم نسخہ کے ٹائیٹل سے معلوم ہوتا ہے، جو مطبع صادق الانوار بھاولپور میں طبع ہوا، اس نسخہ کے ابتدائی بوسیدہ اور دیدہ اوراق میرے پاس محفوظ ہیں۔ محمد طیب

[2] جہاں تک احقر کا اندازہ ہے سوانح مخطوطہ میں اس مسئلہ سے خاموشی اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ صراحۃً وکنایۃً اس کا تذکرہ بھرپور الفاظ میں کیا گیا ہے۔ مگر اتفاقاً جن اوراق میں حضرت والا کے مجاہدانہ کارناموں اور غزا کا ذکر ہے وہ اوراق غائب ہیں۔ مگر فہرست مضامین میں اس کا مستقل عنوان رکھ کر ان اوراق اور اس تذکرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جسے سکوت نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اس اقتباس میں بھی جو حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ نے فرمایا ہے۔ یہ تذکرہ مثل صراحت کے ہے۔ کیونکہ اس اقتباس سے تاسیس مدرسہ کا زمانہ ہندوستان کی اس قیامت کبریٰ کا زمانہ ہے۔ جس میں ہنگامہ ۵۷ء کے پس منظر کے طور پر داروگیر اور زن وکش کے حوادث رونما تھے اور خود حضرت مؤلف سوانح ہی کا بیان آگے آ رہا ہے (مسئلہ بنا دارالعلوم کے سلسلہ میں باقی اگلے صفحہ پر)

یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہ وہ زمانہ ہے، جس میں ملک ہندوستان میں ایک ہنگامہ سخت برپا ہوا تھا، جس کو عوام الناس غدر کہتے ہیں"۔

ضمناً اتنی بات ان کے قلم سے بھی نکل پڑی ہے۔

"اور یہ وہ معرکہ تھا، جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل ہو گئی تھی، اور مغلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی، اور کارخانہ اسلام کا تہ وبالا ہو گیا تھا۔ مسلمان ہونا ہی جرم ہو گیا تھا۔ اکابر دین کا خاتمہ ہو گیا تھا، ہر مسلمان سراسیمہ حال تھا، ہر مؤمن شکستہ بال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی، نہ ہیں تجھ نہ توجہ کا حال تھا، یا نفسی نفسی کا مقال تھا۔ جتنا جو بڑا تھا، اتنا ہی بڑا اس پر صدمہ تھا۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے، اور بعض بعض جو پنجۂ اجل سے بچے، اس ملک سے ہجرت فرما گئے، ہندوستان میں اسلام پر قریب اسی کے صدمۂ عظیم واقع ہوا تھا، جیسے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر کل اسلام پر، مسلمانوں کی قلت کفار کی کثرت، کفر کی شدت بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین نسیاً منسیا ہو جائے گا"۔ ص۶۲

اس میں شک نہیں کہ جس زمانہ میں وہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت اتنا بھی لکھ دینا غیر معمولی ایمانی قوت، اور اسلامی حمیت کے بغیر آسان نہ تھا۔ مگر یہ بات کہ جس شخص کی سوانح نگاری کا

(گذشتہ صفحہ کا) ان سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مدرسہ دیوبند کو استاد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا محض تعلیم کے لئے قائم کیا تھا؟ نہیں، بلکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کی تلافی کے لئے جس سے حضرت کا ان واقعات میں دخل نمایاں ہے۔ بہرحال سوانح مخطوطہ کی فہرست میں حضرت کے جہاد کا عنوان اور واقعات جہاد کی سرخیاں اور اس اقتباس میں ۱۸۵۷ء کا لیس منظر اور اس میں تاسیس دارالعلوم کی صورت سے حضرت والا کا عزم و قصد اسی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں کہ حضرت والا کی شرکت بھی اس میں اپنے مقاصد کے تحت ہوئی اور سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس کے اظہار و اندراج سے سکوت و اغماض بھی نہیں کیا۔

محمد طیب غفرلہٗ

فرض وہ انجام دے سے ہیں۔ اس کا بھی نفیاً یا اثباتاً اس ہنگامہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا یا نہیں، نہ یہ سوال ہی اٹھایا گیا ہے، اور نہ صراحۃً یا کنایۃً جواب ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ البتہ ایک جگہ سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے عالم عابد حافظ حاجی وغیرہ عنوانوں کے ساتھ

"غازی" بھی

کے عنوان کو بھی ہم پاتے ہیں، لیکن غزا کے اس فرض کو کب کہاں، کس شکل میں، کن حالات میں انجام دے کر "غازی" کے اس لقب کے آپ حقدار ہوئے۔ کتاب کا جتنا حصہ میرے پاس ہے۔ اس میں تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

بہرحال مصنف امام کی کتاب، اور حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید جسے مولانا عاشق الٰہی نے مرتب فرما کر جماعت دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کی، اور کافی تنقیح و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی، اس وقت تک کسی قسم کی تنقید اس کتاب کی روایتوں پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے، ان دو مطبوعہ کتابوں کے سوا مولانا طیب صاحب، اور مولانا طاہر صاحب سیدنا الامام الکبیر کے دونوں سعید و رشید ثقہ پوتوں کی قلمی یادداشتوں کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر اس سلسلہ میں واقعات کی جو ترتیب میری سمجھ میں آئی ہے اسے قلم بند کرتا ہوں[1]، واللہ ہو الملہم للصواب والیہ المرجع والمآب تمہیداً آغاز غدر کے بعض اجمالی پہلوؤں کا ذکر مناسب ہوگا۔

---

[1] ۱۹۳۹ء میں مولانا طیب صاحب نے کابل کا مشہور سفر جب کیا تھا اور شاہ کابل ظاہر شاہ انار اللہ برہانہ کی ملاقات بلکہ مصافحہ اور معانقہ کے بعد ہم کلامی کا موقعہ بھی مولانا کو میسر آیا تھا، بڑے بڑے وزرائے شہستان فارس کے چشم و چراغ کو اپنے سروں اور آنکھوں پر بٹھایا۔ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ مرحوم کے پاس سیدنا الامام الکبیر کی ایک ٹوپی بطور تبرک محفوظ تھی۔ یہ ٹوپی ان کے یہاں اس وقت پہنچی تھی جب ان کا خاندان ہندوستان ہی میں مقیم تھا، دستور تھا اور شاید اب تک ہے کہ اس شاہی خانوادہ میں کوئی جب بیمار پڑ جاتا ہے تو شفا کی نیت سے یہ ٹوپی اسے پہنائی جاتی ہے۔ غالباً نادر شاہ کی والدہ یا دادی نے (باقی اگلے صفحہ پر)

پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ۱۷۵۷ء کے ٹھیک سو سال بعد جوں ہی کہ ۱۸۵۷ء کا سال شروع ہوا، جنوری کا پہلا مہینہ تھا کہ کلکتہ کی چھاؤنی ڈم ڈم میں پہلی دفعہ کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی کے قصہ کا آغاز ہوا۔ وہی قصہ بڑھتا رہا، کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کی تعمیل سے جن ہندستانی سپاہیوں نے سرتابی کی تھی، ان کی پلٹن ہی کو گورنر جنرل نے برخاست کر دیا۔ جس سے کالی پلٹن میں کافی خوف و ہراس اور آزردگی کے جذبات پیدا ہوئے، بارکپور (کلکتہ) کی چھاؤنی میں اسی کا ردعمل اس شکل میں ہوا کہ ایک سپاہی نے افسر پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس سپاہی کی گرفتاری میں دوسرے ہندوستانی سپاہیوں نے کوئی دلچسپی نہ لی، اسی کو جرم قرار دے کر بارک پور کی ساتوں پلٹنوں کی موقوفی کے ساتھ ساتھ گورنر جنرل نے ایک جمعدار اور ایک سپاہی کو تو پھانسی پر چڑھا دیا، اور دو کو کالے پانی کی سزا حبس دوام کی شکل میں دی گئی۔ جرم کے مقابلہ میں سزا کی سختی ہندوستانی فوجیوں کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی، جہاں جہاں کنٹونمنٹ اور فوجی چھاؤنیاں تھیں، اندر ہی اندر سلگتے ہوئے

(گذشتہ صفحہ سے) خاص طور پر عرض کر کے سیدنا الامام الکبیر سے یہ ٹوپی حاصل کی تھی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ کابل میں مولانا طیب صاحب کو اپنے پھوپی زاد بھائی سیدنا الامام الکبیر کے نواسے مولانا محمد میاں جو عام طور پر منصور انصاری مہاجر کابلی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے گھر میں قیام کا موقعہ ملا، منجملہ بہت سی باتوں کے ان ہی مولانا منصور انصاری نے اس مہم میں سیدنا الامام الکبیر کے عملی اشتراک کی متعلقہ روایتوں کو ایسے ذریعہ سے مولانا طیب صاحب تک پہنچایا تھا کہ ان روایتوں کو چشم دید شہادتوں کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔ یاد ہوگا کہ بچپن کے خاص رفقاء میں سیدنا الامام الکبیر کے ایک صاحب مولانا منیر نانوتوی بھی تھے۔ اس مہم میں اول سے آخر تک وہ شریک تھے اور شریک ہی نہ تھے بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو حکم دے رکھا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ساتھ رہیں اور اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ کسی خطرے میں مولانا اپنے آپ کو نڈر ہونے کی وجہ سے نہ ڈال دیں۔ اس حکم کی تعمیل کی وجہ سے واقعہ کے ایک بہترین گواہ وہ بن گئے تھے۔ ان ہی مولانا محمد منیر صاحب سے مولانا منصور انصاری تک معلومات پہنچی تھیں۔ یہ ساری باتیں خود مولانا محمد طیب صاحب کی یادداشت میں درج ہیں۔ اسی طرح مولانا محمد طاہر مدظلہ کی یادداشت کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ براہ راست اپنے والد مرحوم مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی روایتوں کو انہوں نے قلم بند کر لیا تھا۔ ۱۲

یہ آگ پہنچتی رہی، تا اینکہ ۵ رمئی ۱۸۵۷ء یعنی ۱۰ رمضان ۱۲۷۳ھ کو میرٹھ کی چھاؤنی میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ گوروں کی تعداد میرٹھ کی اس چھاؤنی میں دو ہزار دو سو سے زائد نہ تھی، اس کے مقابلہ میں کالی پلٹن والوں یعنی ہندوستانی فوجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی، پھر غیر فوجی عملہ جو صرف ہندوستانی تھا، مزید برآں۔ فوج کے چاروں طرف آبادی ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں ہی ہندوستانیوں کی تھی، جیل خانہ بھی توڑ دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہوا، لیکن میں آگ لگا دی گئی، اور گورے چمڑے کا جو آدمی بھی سامنے آیا، مرد ہو یا عورت، بچے ہوں، یا جوان بلا امتیاز سب کا صفایا شروع ہو گیا۔

انگریزی افسروں نے روک تھام کی کوشش کی، لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی، اتوار کا دن مئی کی دس حساب سے رمضان کی پندرہ ہوتی ہے۔ واقعہ اپنے انتہائی حدود کو پہنچ گیا۔ اتوار کا دن گذار کر کالی پلٹن والے کھلی ہوئی چاندنی میں دلی چل پڑے۔ دلی میں پہنچ کر لال قلعہ پر قبضہ کیا گیا، اور ظفر شاہ بے چارے کو فوج نے مجبور کیا کہ فرضی نہیں بلکہ واقعی ہندوستان کے بادشاہ بن جائیں۔ دلی میں اس کے بعد جو کچھ بھی گذر رہی ہو، لیکن باہر ملک کے طول و عرض میں قدرتاً یہ خیال پھیل گیا کہ بجائے کلکتہ کے پھر دلی ہی ہندوستان کا پایہ تخت ہو گیا، اور ہندوستان کی حکومت پھر ہندوستانیوں ہی کے ہاتھ میں آ گئی۔ یوں ہر ہر علاقہ کو انگریزوں سے پاک و صاف کرنے کا ارادہ کر لیا گیا صوبجات متحدہ اودھ کے ساتھ ساتھ بندیل کھنڈ، اور صوبہ بہار کے بعض حصوں تک بغاوت کہئے، یا آزادی کی یہ تحریک پھیل گئی، دور دور کی چھاؤنیاں، مثلاً مئو، نیمچ، نصیر آباد کے علاوہ بعض بڑی ریاستیں مثلاً سندھیا (گوالیار)، ہلکر اندور وغیرہ بھی اسی لپیٹ میں آ گئیں۔

ظاہر ہے میرٹھ جہاں سے یہ آگ اٹھی تھی، روہیل کھنڈ کے سارے اہم مقامات اسی کے اردگرد چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے نہ متاثر ہونے کی آخر وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، ظاہر ہے کہ اتنے طویل و عریض رقبہ کی بغاوت کا فرو کرنا آسان نہ تھا اور نہ جھٹ پٹ سنگنی پٹ بیاہ کی صورت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ انگریز بھی جی جان چھوڑ کر مقابلہ کے میدان میں اتر آئے بعض

ہندوستانی طبقات کی طرف سے بھی کافی پشت پناہی کی گئی۔ آخر مئی ۱۸۵۷ء میں جو شرارہ اڑا تھا، جلتے اور جلاتے ہوئے بقول راجہ شیو پرشاد

"۱۸۵۸ء کے آخر ہوتے ہوتے جہاں کا تہاں خیر ہو گیا۔"

(تاریخ جام جہاں نما حصہ ۱۲۹)

اپنے موضوع سے ہٹ کر اجمالاً جو کچھ اس واقعہ کے متعلق مجھے عرض کرنا پڑا اس کی غرض بھی یہی تھی، کہ اس مدت کے بارہ میں پڑھنے والوں کو آسانی ہو، جس میں یہ واقعہ ہندوستان میں گذر رہا تھا۔ یعنی مئی ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۵۸ء تک۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے، کہ ڈیڑھ سال سے دو سال تک کم و بیش ملک اس ہنگامہ کا شکار رہا۔ خبریں جن کا کوئی باضابطہ نظام تو نہ تھا۔ لیکن بہر حال صحیح یا غلط خبریں پھیلتی ہی رہتی تھیں۔ مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ،

"خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں۔"

مثلاً کبھی معلوم ہوتا تھا کہ فلاں مقام پر ہندوستان کا پلّہ انگریزوں کے مقابلہ میں بھاری ہو گیا ہے۔ اڑانے والے زیادہ تر مزید دماغی اضافوں کے ساتھ اس قسم کی افواہیں زیادہ اڑایا کرتے تھے۔ اور کبھی یہ ماننے پر بھی لوگوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ انگریز غالب آ گئے، عوام تو خیر لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، ملک کے ارباب فکر و بصیرت کی نظر زیادہ تر دلی پر اور دلی کے بعد تازہ مردہ حکومت کے پایہ تخت لکھنؤ[1] پر جمی ہوئی تھی، راجہ شیو پرشاد جو اسی زمانہ کے آدمی ہیں

[1] اختر پیا کی اختر نگری بھرٹیلوں والا شہر لکھنؤ واجد علی شاہ سے خالی ہو جانے کے بعد بن چکا تھا لیکن شاہ مرحوم کی جلاوطنی پر سال بھر کا زمانہ بھی نہیں گذرا تھا، یعنی ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزی حکومت کی طرف سے ملک اودھ کی ضبطی کا اشتہار جاری ہوا اور ۱۸۵۷ء کی جنوری میں فوج کی ٹولیاں بدلنے لگی، مئی تک فوج اور فوج کے ساتھ ملک باغی ہو گیا۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ جانعالم جیوٹ والے سنجلوں سے لکھنؤ کی طبیعت خالی نہ ہو پایا تھا، غدر کے بعد شہزادہ برجیس قدر کو لوگوں نے واجد علی کی مسند پر بٹھا دیا۔ برجیس نو عمر تھا۔ اس کی ماں بیگم ثانی نے حکومت کی باگ سنبھالی، انگریزوں کو لکھنؤ میں کافی دشواری پیش آئی۔ اگر نیپال کی امداد سات آٹھ ہزار فوج کی شکل میں دبانے کو

ان کی تاریخ کے اس فقرے کا یعنی

"دہلی اور لکھنؤ کے ٹوٹتے ہی باغیوں کی کمر ٹوٹ گئی" ص ۱۲۹ جام جہاں نما

جس کا مطلب بھی یہی ہے۔

یہ اتفاق کی بات تھی کہ مقابلہ سب سے زیادہ ان ہی دونوں مقامات میں ہوا، اور کشمکش بھی سب سے زیادہ طویل ان ہی دونوں مقامات کی تھی۔ کافی وقفہ اسی لئے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا ان لوگوں کو مل گیا۔ جو عوام کے بھیڑیا دھسان میں ابتدا ہی سے شریک نہیں ہوئے تھے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامہ میں شریک ہونے والوں میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا، جن کے لئے "ہُو" کی آواز بس تھی، ہندو اور مسلمان دونوں ہی طرح کے مورخین کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں جو ملتی ہیں۔ مثلاً راجہ شیو پرشاد نے لکھا ہے کہ

"اس عرصہ میں ہزار ہا قیدی چھٹے، اور انہوں نے شہر اور چھاؤنی کے لچے بدمعاش

(گذشتہ صفحہ سے) وقت پر انگریزوں کو مسرت آتی تو کہنے والے کہتے ہیں کہ لکھنؤ کا سقوط آسان نہ تھا۔ ریذیڈنسی کی کوٹھی بیلی گارڈ کے در و دیوار میں بھی جد و جہد کرنے والوں کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ اس موقعہ پر بے ساختہ جی چاہ رہا ہے کہ ایک سنی ہوئی بات کا ذکر کر دوں، اگرچہ اب نہ ان باتوں کے سننے والے ہی رہ گئے ہیں اور نہ ماننے والے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہ سے ایک دفعہ نہیں مختلف موقعوں پر یہ بات فقیر نے سنی تھی کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے، ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ بھی تھے۔ اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چودھری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں۔ نواب صاحب ہی دوسرے واقعہ کا ذکر بھی فرماتے تھے کہ غدر کے بعد جب گنج مرادآباد کی ویران مسجد میں حضرت مولانا جا کر مقیم ہوئے تو اتفاقاً اسی راستے سے جس کے کنارے مسجد تھی کسی وجہ سے انگریزی فوج گذر رہی تھی، مولانا مسجد سے دیکھ رہے تھے، اچانک مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس سے جو بائیں ڈور گھوڑے وغیرہ گھوڑے کا لئے ہوئے تھا، کچھ باتیں کر کے پھر مسجد واپس آ گئے، اب یاد نہیں ہا کہ پوچھنے پر یا خود بخود فرمانے لگے کہ سائیس جس سے میں گفتگو کر رہا تھا، یہ خضر تھے، میں نے پوچھا کہ یہ کیا حال ہے تو جواب میں کہا کہ حکم یہی ہوا ہے۔ یہ روایت نواب صاحب سے سنی ہوئی ہے، باقی خود خضر کا مطلب کیا ہے؟ نصرت حق کی خاص شکل ہی جو اس نام کی ظاہر ہوتی ہے تفصیل کیلئے شاہ ولی اللہ وغیرہ کی کتابیں پڑھئے گویا جو کچھ دیکھا جا رہا تھا اسی کے باطنی پہلو کا یہ مکاشفہ تھا۔ ۱۲

قصاب، ڈوم چمار فقیر بھک منگے، بھتر، سائیس گھسیارے، خدمت گار خانساماں اور جملہ کمین اور رذیل سے جو چپراس باندھ کر برقندازی کرتے تھے، خواہ بڑا بڑا چھاپا تلک لگا کر گھنٹوں تک گھنٹہ بجایا کرتے تھے شامل ہوئے ؛ ص۱۲ جام جہاں نما یا سرسید کے رسالہ میں ہے کہ شریک ہونے والوں میں

"ایسے خراب، اور بدرویہ، اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا" ص۱۹ ضمیمہ حیات جاوید

ممکن ہے کہ حکومت کو خوش کرنے اور ہندوستان کے عام باشندوں کے جرم کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے بھی اس قسم کی باتیں لکھی گئی ہوں۔ لیکن اس کا انکار مشکل ہے کہ جن لوگوں نے ہنگامہ میں حصہ لیا تھا، ان میں کافی تعداد اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، اسی ہنگامہ میں کیا ہر ہنگامہ میں اس قماش کے لوگوں کا پل پڑنا، ایک عام بات ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی قطعاً غلط ہوگا کہ سنجیدہ، وفہمیدہ طبقات کے افراد بھی اس میں شریک نہ تھے۔ یہ حقائق اور واقعات کی تکذیب ہے، البتہ فرق دونوں گروہوں میں یہ تھا کہ عوام کا بے قید طبقہ تو "ہو" کے ساتھ کود پڑا، اور وہ یوں ہی کود پڑنے کا عموماً عادی بھی ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بڑی غرض ہوتی بھی نہیں، بے آئینی کے منافع سے فوری طور پر مستفید ہونا، کچھ پا کر نکل جانا، ان چھچھورے مقاصد کے سوا مشکل ہی سے ان کا قدم کسی بلند نصب العین کے لئے اٹھتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ عقل وفراست اور اس سے بھی زیادہ دین کی عائد کی ہوئی ذمہ داریاں جن کی زندگی تھی، بلکہ دین ہی کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جو اٹھے تھے ان کے متعلق ایک لمحہ کے لئے کسی حیثیت سے بھی یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اس عامیانہ "ہو" پر دوڑ پڑے ما لکم کیف تحکمون

اوروں پر بحث کرنے کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کے متعلق محض حسن ظن ہی کی بنیاد پر میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ معلومات کا جو سرمایہ معتبر ذرائع سے مجھ تک پہنچا ہے،

جو بھی ان سے واقف ہو گا، وہ میری ہمنوائی پر انشاء اللہ اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔ اب خاص ترتیب سے اپنی ان معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

۱

آپ مجھ سے یہ سن چکے کہ میرٹھ میں کارروائی کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ۱۰ مئی سے ہوا۔ رمضان[1] کی دسویں تاریخ تھی۔ اسی لئے لکھا ہے کہ کھلی چاندنی میں لوگ میرٹھ سے دہلی روانہ ہوئے۔ خیر یہ بات تو تاریخ بتاتی ہے۔ اب سنئے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"اسی عرصہ میں غدر ہو گیا"۔ ص۳۶

آگے وہی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ اطلاع دیتے ہیں۔

"بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے، اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا" ص۳۶

جس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) غدر کے زمانہ میں ہمارے مصنف امام اپنے وطن نانوتہ میں نہیں بلکہ سہارنپور میں تھے۔

(۲) لیکن سیدنا الامام الکبیر (بجائے دلی یا میرٹھ کے) معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ ہی میں قیام فرما تھے

(۳) یہ رمضان جس کا مصنف امام نے اس موقع پر ذکر کیا ہے، یقیناً رمضان کا وہی مہینہ ہے، جس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرٹھ کی فوج باغی ہوئی، اور باغی ہو کر دلی پہنچی۔ قدرتی طور پر دلی سے جو علاقے زیادہ متصل تھے جیسے مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ سب ڈکیتی کے عام آثار سے رمضان ہی میں متاثر ہو چکے تھے۔ راستہ کا امن وامان ختم ہو چکا تھا۔ اب خواہ عوام نے خود قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، یہ اس کا نتیجہ ہو، یا جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ

"گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا۔ اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی کہ اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے"۔ ص۷۴ تذکرۃ الرشید ج ۱

---

[1] جیسا کہ جنتری صد سالہ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ مرتبہ مولانا ابو الحسنات قطب الدین احمد صاحب لکھنوی سے واضح ہے ۱۲

اس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہو۔

(۳) سیدنا الامام الکبیر کی جلادت اور جُرأت دلی (بہادری) کی شہادت کے ساتھ ساتھ مصنف امام کے مذکورہ بالا بیان کا کھلا ہوا اقتضا یہ ہے کہ غدر کے شروع ہونے کے ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر قطعاً اس ہنگامہ میں شریک نہ ہوئے۔ بلکہ نانوتہ سے سہارنپور آنے کے بعد بجائے اس کے کہ جن میدانوں میں مقابلہ ہو رہا تھا، ان میں سے کسی میدان کی طرف چلے جاتے، اپنے ساتھ مصنف امام کو لے کر وطن نانوتہ ہی تشریف لے آئے۔

یہ بدیہی نتائج ہیں جو مصنف امام کی مذکورہ بالا اطلاع سے پیدا ہوتے ہیں۔ آگے یہ سوال کہ نانوتہ میں آپ کا کب تک قیام ایام غدر میں رہا؟ قطعی طور پر تو اس کا جواب دینا مشکل ہے لیکن مصنف امام اسی سلسلہ میں جب سہارنپور سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ نانوتہ پہنچے، اور ان دونوں بزرگوں کا قیام اسی قصبہ میں تھا۔ آگے جو یہ لکھا ہے کہ

"جب احقر وطن (نانوتہ) پہنچا، چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی" ص ۳۳

بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خود نانوتہ پر بھی لوٹ مار کرنے والے غارتگروں نے حملہ کیا، اور قصبہ والوں کے ساتھ مل کر ان کی مدافعت میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی امتیازی حصہ لیا۔ ایک نہیں بلکہ "چند ہنگامہ کے پیش آنے" کے لئے چاہئے تو یہی کہ "کافی عرصہ" تک مانا جائے کہ نانوتہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام رہا، افسوس ہے کہ ان ہنگاموں کی تفصیلات کے جاننے کی کوئی صورت باقی نہ رہی، یہ کون لوگ تھے، اور نانوتہ پر بار بار حملہ کیوں کرتے تھے، ان سوالوں کا کیا جواب دیا جائے۔

شاید ان ہی ہنگاموں کی وجہ سے بھی، اور جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ حفاظت کی ذمہ داری حکومت نے اپنے سر سے اتار کر خود ہندوستان کے باشندوں کے سر ڈال دی تھی کچھ اس وجہ سے بھی، یا یہ کہ مستقبل میں کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ کچھ اس کے امکانات کو بھی

سوچ کر مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اس زمانہ میں (یعنی جب ملک میں غدر برپا تھا اور ان کا قیام نانوتہ میں تھا) ہمارے بھائی ہم عمر، اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ نانوتہ میں شیوخ کی جو عام برادری تھی، اس میں نشانہ بازی وغیرہ جیسے جنگی مشاغل کی مشق کا غیر معمولی ذوق اور شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید آئندہ شریک ہونے اور شریک کرانے کی یہ تمہید ہو۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے۔ مصنف امام ہی نے اسی کے بعد جو کچھ لکھا ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ ان جنگی مشغلوں سے کم از کم ذاتی طور پر سیدنا الامام الکبیر کا نہ کوئی تعلق تھا، اور نہ کسی خاص قسم کی دلچسپی ہی معلوم ہوتی ہے، کہ ان مشاغل سے آپ لیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں نانوتہ کے نوجوان چاندماری کی مشق کر رہے تھے، کہ

"ایک دن آپ (سیدنا الامام الکبیر) مسجد سے آئے، ہم گولیاں لگا رہے تھے، اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا، قریب سے بندوق لگاتے تھے۔ گولیاں مٹی کی تھیں۔"

جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاندماری میں مٹی کی گولیوں کے استعمال کرنے کا طریقہ ہندوستان میں مروج تھا۔ یا قلت سرمایہ کا یہ نتیجہ ہو، بہرحال وہی کہتے ہیں کہ مسجد سے نشانہ بازی کے اسی مقام پر پہنچ کر

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں، مجھے بھی دکھلاؤ۔" صفحہ ۲

اس کے سوا اور مطلب اس کا کیا سمجھا جائے کہ غدر کے ہنگاموں میں کافی زور جس زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ بندوق کیونکر لگاتے ہیں؟ پہلی دفعہ اپنی پوری زندگی میں بندوق چلانے والوں سے یہ پہلا سوال آپ کی طرف سے شاید

پیش ہوا۔ اب یہ آپ کی عبقریت اور فطرت فائقہ کا نتیجہ تھا جیسا کہ مصنف امام لکھتے ہیں کہ دریافت فرمانے پر

"کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا" ص۳۶

گویا کر کے بھی دکھایا' اور نشانہ پر گولی مارنے کا جو طریقہ ہے' اسے بھی زبانی بتا دیا۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ بس ایک دفعہ دیکھ اور سن لینے کے بعد دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر نے'

"تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی" ص۳۶

لوگ نشانہ کی طرف دوڑے وہی لکھتے ہیں کہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ

"صاف گولی نشانہ پر لگی" ص۳۶

اس کے بعد مصنف امام نے اس قسم کی باتوں کا ذکر کر کے کہ نانوتہ کے دوسرے نوجوان جو زمانہ سے نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے اور نیم کے پتہ کی جگہ اس دائرے میں گولی کو پہنچا دینے کو کامیابی سمجھتے تھے جو پتہ کے اردگرد کھینچ دیا جاتا تھا' ان کے مقابلہ میں بغیر کسی سابقہ مشق کے محض ایک دفعہ دیکھ لینے اور سن لینے کے بعد پہلے فیر ہی میں ٹھیک نشانہ یعنی نیم کے پتہ کو اپنی گولی سے سیدنا الامام الکبیر نے جو اڑا دیا تھا' ممکن ہے کہ اس کو "بر ہدف زند تیرے" کا اتفاقی واقعہ سمجھا جائے۔ مگر اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر اس خیال کی تردید کرتے ہوئے وہی لکھتے ہیں' کہ

"یہ بات اتفاقی نہ تھی' اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادہ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ نہ ہوئی۔ تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں" ص۳۷

اور جو بھی سیدنا الامام الکبیر کی فطرت فائقہ کی خصوصیتوں سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ وہ مصنف امام کی رائے کی تائید ہی کرے گا۔ مگر مجھے اس موقعہ پر مصنف امام کے بیان کی روشنی میں یہ کہنا ہے کہ مقابلہ اور مقاتلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ سیدنا الامام الکبیر اگر پہلے سے کئے ہوئے ہوتے' تو اس زمانہ تک آپ کا جنگی آلات کم از کم بندوق کے استعمال سے اس درجہ بیگانہ رہ جانا کیا ممکن تھا'

کچھ بھی ہو، اتنی بات بہرحال یقینی ہے اور ان ناقابل انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا ہوا اقتضاء ہے کہ
مالی خولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ غدر کے ہنگامہ کے برپا کرانے میں
دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے علمی و دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ
وہی ہے جو مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولنا فسادوں سے کوسوں دور تھے"

آخر حسب روایت مولنا طیب صاحب جب سنبھالنے والے حضرت والا کو نظر نہیں آرہے تھے
تو تعمیر سے پہلے تخریب کی یا خروج سے پہلے دلوج کا خیال ممکن ہے حامیوں کے نزدیک ضروری
نہ ہو لیکن سیدنا الامام الکبیر جیسے دین کی مثالی شخصیتوں کے متعلق اس قسم کے خود تراشیدہ اوہام خواہشوں
کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں ؟ -

سیاست، جن لوگوں کے نزدیک صرف مار دھاڑ، اکھاڑ پچھاڑ کا نام ہے، وہ تو جو چاہے
سوچیں، سوچ سکتے ہیں جو چاہے کریں کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کو جس قلب سلیم،
ذہن سلیم، دماغ سلیم، فکر سلیم کا مالک بنا رہتا ہے ان لوگوں سے غوغائیوں اور خوشیوں کی ہنگم
حرکات کی توقع دلیل ہے اس بات کی کہ توقع کرنے والے اسلام کی روح سے قطعاً بیگانہ ہیں،
ایک صحیح اسلامی وجود، امن کی حالت میں ہو یا جنگ کی حالت میں، کسی وقت اور کسی حال میں کسی کے
لئے نہ وہ دھوکا ہے اور نہ فریب، ہر حال میں آئین اور اصول کی پابندی ہی مسلمان کی زندگی کا سب
سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ اسی لئے اپنے ماحول میں رہنے والوں کے لئے امن و عافیت، طمانیت
و سکینت، سلامتی اور خوش باشی کی وہ مجسم ضمانت ہوتا ہے۔ دوست تو دوست دشمن بھی اسی بھروسہ کو
اپنے دل میں پاتے ہیں اور یہی ان کو پانا بھی چاہئے کہ غیر آئینی طریقے اختیار کر کے مسلمان کسی کے
لئے کسی زمانہ میں کسی جگہ خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس امتیازی خصوصیت سے جو جتنا زیادہ دور ہے،
سمجھنا چاہئے کہ اسی حد تک وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی روح سے دور ہے۔

۲

بہرحال فسادوں سے قطعی دور ہونے کے باوجود پھر یہ سوال کہ آخر اس واقعہ کی صحیح نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے "کہ ۵۷ء والے ہنگامہ میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی عملی حصہ لیا تھا جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آرہا ہوں، اصل واقعہ کا انکار تو واقعہ کا انکار ہوگا، ایسے سارے ذرائع جن سے غیر مشتبہ یقین کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ پہلی نسلوں سے آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ لڑے بھی، زخمی بھی ہوئے الغرض سوانح مخطوطہ کے مصنف کے لفظ "غازی" کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان سب کے حاصل کرنے کے مواقع قدرت کی طرف سے آپ کے لئے آسان کئے گئے تھے۔

ایک چیز یعنی تاریخ وار تو ساری کڑیوں کا مرتب کر کے پیش کرنا مشکل کیا میرے لئے تو ناممکن ہے۔ جن وثائق اور کتابوں سے معلومات کی فراہمی میں مدد ملی ہے سب کے سب تاریخ کے ذکر سے خالی ہیں۔ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کب کس مہینہ میں مہینہ کی کس تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔ تاہم ان ہی بزرگوں کا صدقہ ہے کہ تاریخ کی تعیین کے بغیر ہی سہی لیکن واقعات تو بحمداللہ معلوم ہو گئے۔

غدر کا ہنگامہ ملک کے طول و عرض میں برپا تھا۔ اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کافی عرصہ تک اس زمانہ میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے آبائی وطن نانوتہ ہی میں مقیم رہے۔ نانوتہ کے قیام کے ان دنوں میں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ پر شورش پسند غوغائیوں کی طرف سے متعدد بار حملے ہوئے، باشندگان قصبہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر بھی مدافعت میں حصہ لیتے رہے۔ بقول مصنف امام

"جس میں مولانا کی کمال جرأت وہمت ظاہر ہوئی"

مدافعت کی ان کارروائیوں کو بھی غدری ہنگامہ کی شرکت قرار دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس حد تک قیام نانوتہ ہی کے زمانہ میں گویا آپ شریک ہو چکے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ

شرکت آپ کی تو فرمان نبوی

من قتل دون ماله فهو شهید و من قتل دون عرضه فهو شهید الحدیث	جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے اور جو اپنی آبرو بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے الخ

کی تعمیلی شکل تھی

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے باہر کی جس قوم نے اس ملک پر سیاسی اقتدار اپنا قائم کر لیا تھا۔ باہر سے مسلط ہو جانے والے اس بیرونی اقتدار کے ساتھ تصادم اور مقابلہ کی صورت کہاں اور کیوں پیش آئی، کیونکہ مقصود اس مسئلہ میں مقابلہ اور مقاتلہ کا یہی پہلو ہے۔

اس پر غور کرنے کے لئے اس مقدس جماعت کی تاریخ اعلاء کلمۃ اللہ کو سامنے رکھ لینا چاہئے۔ یہ تو ہندوستان سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو کر ایک بدیسی کے اقتدار کے سامنے آجانے کا مسئلہ تھا۔ ان حضرات کے سید الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تو خود مسلم اقتدار میں بھی ہر مذہبی اور سیاسی باطل کے خلاف علم جہاد بلند رکھا، تو ان کے تربیت یافتہ کفر کی شوکت کے زمانہ میں اعلاء کلمۃ الحق کے مقصد سے کیسے دست بردار ہو سکتے تھے اس لئے ان حضرات کے سامنے سب سے پہلے تو یہ اعلاء کلمۃ الحق کا مقصد سامنے تھا۔ ساتھ ہی قومی طور پر ہندوستان کی بسنے والی اقوام میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو انگریزوں کے ابتدائی طرز عمل اور مظالم سے تنگ آئی ہوئی نہ ہو، جس میں مسلمان خصوصیت سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے ان بزرگوں کے سامنے اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ عام ہندوستانی اقوام کی بہبودی اور فلاح کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔ جس کا حل اس کے سوا دوسرا نہ تھا کہ انگریزوں کا اقتدار اس ملک میں باقی نہ رہے۔

ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر کے ان اکابر حضرت سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہما اللہ کا قریبی اسوہ بھی پیش نظر تھا۔ ان چند در چند وجوہات کے تحت ان اکابر میں یہ جذبہ بطور قدر مشترک کے موجزن تھا کہ اس ملک کی بہبود و فلاح انگریزوں کے قیام اور راج میں نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں سے ہٹنے اور باہر ہو جانے میں ہے۔ البتہ اس جذبہ کے ساتھ جس طاقت کی

ضرورت تھی، وہ مسلمانوں میں باقی نہ تھی اگر وہ ہوتی تو ملک ہی ہاتھ سے کیوں جاتا۔ اس لئے رات دن ان بزرگوں میں اس کا ذکر و فکر رہتا تھا کہ یہ بھاری پتھر اس ملک کے سر سے کیسے اٹھایا جائے۔

اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ جب تک اس ہنگامہ کی صورت ایک غدر اور بلوہ کی رہی۔ ان بزرگوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جب کہ اس نے طول کھینچکر ملک کی رعایا کو راعی کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اور اب سوال ہندوستانی اور انگریز کا پیدا ہو گیا جس میں اس کے امکانات نظر آنے لگے کہ انگریز کا پنجۂ استبداد ڈھیلا پڑ جائے یا اس کے پیر ہی اکھڑ جائیں تو یقیناً اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا ان بزرگوں کے اصلی اور بنیادی نصب العین میں ممد ہو سکتا تھا اس لئے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ انگریزوں کے مظالم جو اس سلسلہ کے محرک تھے آخرکار اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے تو اب کون سی چیز رہ گئی تھی جو ان بزرگوں کے ارادوں میں حرکت پیدا نہ کرتی اور سیدنا الامام الکبیر کو جو اس سلسلہ کو بہت پہلے سے بچشم بصیرت و عبرت دیکھ رہے تھے اس میدان میں آنے سے روکتی۔

بہر حال جذبۂ اعلاء کلمۃ اللہ، مذہبی حمیت ملی غیرت اور برادران ملک کی مظلومیت عامہ کے پیش نظر ان کے استخلاص کا جذبہ وغیرہ اصل بواعث تھے جنہوں نے ان بزرگوں کو خاک و خون کے تماشوں میں لا کھڑا کیا۔

اس سلسلہ میں انگریزی مظالم کے بعض ناگفتہ حوادث بھی ایسے پیش آئے جس سے ان بزرگوں کے عزائم میں جلد حرکت ہو گئی اور خود ان حوادث میں بھی بعض شرعی پہلو ایسے تھے کہ ان کی بنا پر ان کے عزائم کو جلد متحرک ہو جانا چاہئے تھا جس میں سے مثلاً ایک یہ بھی ہے جس سے انگریزوں کی معاہدہ شکنی اور غداری کھلے طور پر واضح ہوتی ہے کہ

سب سے پہلے اس باب میں ایک اطلاع مولانا عاشق الٰہی مرحوم کی کتاب تذکرۃ الرشید میں ملتی ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ تھانہ بھون جو سیدنا الامام الکبیر کے پیر و مرشد

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا وطن پاک تھا۔ اسی تھانہ بھون کے قصبہ میں قاضیوں کا ایک اچھا خاصہ خوش حال رئیس خاندان بھی رہتا تھا۔ قاضیوں کے اس خاندان کے ٹوٹے پھوٹے مکانات خستہ اور بوسیدہ حال میں اب بھی تھانہ بھون میں موجود ہیں۔ سرسری نظر اس پر خاکسار کی بھی پڑ چکی ہے۔ مکانات کیا محل سراؤں کی شان ان سے اب بھی نمایاں ہے۔ بظاہر کافی آمدنی والی جاگیر حکومت مغلیہ سے قاضیوں کے اس خاندان کو ملی ہوئی تھی۔ جس زمانہ میں غدر کا فتنہ ملک میں شروع ہوا، قاضیوں کے اس خاندان کے رئیس قاضی عنایت علی خاں نامی تھے۔ مولانا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ وہ

"تھانہ بھون کے نیک دل سرکاری خیر خواہ زمیندار" تذکرۃ الرشید ص۷۴ ج۱

تھے۔

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عام بغاوت کے پھوٹ پڑنے کے بعد بھی سرکار یعنی حکومت مسلط کے ساتھ بہی خواہی اور مصالحت پسندی کا رشتہ جن لوگوں نے قائم کر رکھا تھا ان میں تھانہ بھون کے قاضیوں کا یہ رئیس خاندان بھی تھا۔ نیز تھانہ بھون کی شورش کے آغاز کے متعلق تذکرۃ الرشید ہی کے حاشیہ پر جو فقرہ درج کیا گیا ہے کہ

"اسی گھٹا ٹوپ اندھیاؤ میں جب کہ کئی جگہ غدر پڑ چکا تھا، اور دہلی اس کا آشیانہ تھا" ص۷۴

اس میں تو اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ عام بغاوت کی آگ ملک میں پھیل چکی تھی، اور میرٹھ وغیرہ چھاؤنیوں سے منتقل ہو کر دلی کو اپنی جد و جہد اور کش مکش کا مرکز جب لوگ بنا چکے تھے، تب کچھ دن بعد خلفشار کی ابتدا تھانہ بھون میں ہوئی۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن جس قصبہ میں بتایا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے عملی حصہ لیا تھا، ظہور غدر کے کافی عرصہ کے بعد اس قصبہ کی ابتدا ہوئی۔

بہر حال مولانا عاشق الٰہی مرحوم کی روداد کے مطابق ہوا یہ کہ تھانہ بھون کے ان ہی قاضی عنایت علی کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے، جن کا نام عبد الرحیم تھا۔ لکھا ہے کہ ریاست کے

بست وکشاد ونظم وانتظام کا تعلق تو قاضی عنایت علی بڑے بھائی کے سپرد تھا، اور قاضی عبدالرحیم چھوٹے بھائی، جن کو قاضی صاحب گویا بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ صرف امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اب بچھ میں نہیں آتا کہ ایسے زمانہ میں جب ملک میں عام بدامنی پھیلی ہوئی تھی "بقول) مولوی عاشق الٰہی صاحب مرحوم

"باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے اور مدتہائے دراز کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا، جدھر دیکھو مارپیٹ، اور جس محل پر نظر پڑے معرکہ آرائی و جنگ" حاشیے

اس علاقہ روہیلکھنڈ میں جب سرسید احمد خاں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ بجنور جہاں وہ حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی بجنور سے میرٹھ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن باہر قدم نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی بہ مشکل بجنور سے ہلدور نامی مقام تک ڈپٹی رحمت خاں کی معیت میں پہنچ پائے۔ سادات کو ہلدور سے پیادہ پا میرٹھ کے ارادہ پر نکلے کر موضع پلانہ کی سرحد پر بقول مولٰنا حالی

"دو ہزار گنوار مسلح ان کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادہ سے دوڑے"

سید صاحب کی زندگی باقی تھی، بخشی نامی ایک پٹھان نے جان بخشی کرائی، پلانہ سے گرتے پڑتے چاند پور پہنچے، چاند پور میں بھی

"کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں سے ان کو گھیر لیا"

یہاں بھی چاند پور کے رئیس میر صادق علی خاں فرشتہ رحمت بن کر آڑے آگئے اور سید صاحب کی جان بچ گئی۔ چاند پور پھراؤں ہوتے ہوئے بہ ہزار خرابی افتاں وخیزاں جس وقت میرٹھ تک پہنچنے میں سید صاحب کامیاب ہوئے تو مولوی حالی صاحب نے لکھا ہے کہ

"ان کے (سید صاحب) کے پاس چھ پیسے اور اس پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا" حیات جاوید

الغرض حالات تو ایسے گذر رہے تھے۔ لیکن قاضی عبدالرحیم قاضی عنایت علی خاں کے چھوٹے بھائی کو خدا ہی جانتا ہے ہاتھیوں کے خریدنے کا سودا دماغ میں کیوں سمایا؟ سہارنپور ہی اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا، وہیں اس شوق کی تکمیل کا امکان تھا، مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ ہاتھیوں کی خریداری کے شوق میں تھانہ بھون سے

"مع چند احباب کے سہارنپور گئے۔ اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے"

یہاں تک تو بات عام رنگ میں رہا۔ اب آگے تقدیر تدبیر کے جس پیچیدہ رنگ میں پیش ہوئی اور شرارہ کوہ آتش فشاں بن گیا، اس کی تفصیل سنئے، بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور کا یا تو غدر کے قصوں میں کوئی حصہ ہی نہ تھا، یا کچھ تھا بھی تو بات دب دبا چکی تھی، بنکی صاحب نامی کوئی انگریز افسر بقول مولانا عاشق الٰہی

"باغیوں کی سرکوبی کے لئے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظاماً ضلع سہارنپور میں متعین کیا گیا تھا" ص۳۱

اتفاق کی بات کہ ایک بنیا جس کا نام تو معلوم نہ ہو سکا لیکن مولوی عاشق الٰہی صاحب کے ان الفاظ سے کہ سہارنپور میں وہی بنیا

"کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا"

قیاس یہی چاہتا ہے کہ سہارنپور کا باشندہ نہ تھا، اب خواہ تھانہ بھون کا ہو، یا تھانہ بھون کے قریب کسی جگہ کا، تھانہ بھون کے قاضیوں کے اس خاندان سے وہ صرف واقف ہی نہ تھا بلکہ کسی وجہ سے وہ ان لوگوں سے کھنچا ہوا تھا، مولوی عاشق الٰہی نے جو یہ لکھا ہے کہ

"زمینداری قصوں میں آدمی کے دشمن بہتیرے ہو جاتے ہیں"

اسی نوعیت کے کسی قصہ میں وہ قاضیوں کے اس خاندان کا دشمن بن گیا تھا۔ ایسے فتنہ اور فساد کے زمانہ میں تھانہ چھوڑ کر قاضی عبدالرحیم کا سہارنپور آنا اور یہ شہرت کہ ہاتھی خریدنے کے لئے آئے ہیں بات ہی ایسی تھی کہ انتقام کا منتقم موقع ملنے کے محسوس ہوا کہ سامنے آگیا ہے۔ بیچارے بنیے نے بھی ہمت کی

کوٹھی پر پہنچ گیا اور یہ اُلٹی ہوئی بات اس انگریز کے کان میں پھونک دی کہ قاضی عبدالرحیم تھانہ بھون سے،

"دہلی کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے۔"

بنئے کے ذریعہ بھی یہ خبر سپنکی صاحب تک پہنچی، نیز مولوی عاشق الٰہی صاحب کے حاشیہ والے بیان میں یہ فقرہ جو پایا جاتا ہے کہ

"ادھر دشمنوں نے گلی کوچوں میں اس افواہ کو پھیلا دیا۔"

جس کا بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کمک بھیجنے کے لئے قاضی عبدالرحیم تھانہ سے سہارنپور ہاتھی کی خریداری کے سلسلہ میں آئے ہیں، یہ افواہ شہر میں عام طور پر کسی نہ کسی طرح پھیل گئی یا پھیلا دی گئی تھی، نتیجہ ان ساری باتوں کا جو ہو سکتا تھا وہ ہوا، لکھا ہے کہ سپنکی صاحب نے فوراً حکم دیا اور

"ایک گارد سرائے روانہ کیا گیا، اور عبدالرحیم خاں مع ہمراہیاں بالزام بغاوت جیل خانہ بھیج دیئے گئے۔" ص۳۴

کوئی شبہ نہیں کہ غلط ہو یا صحیح۔ لیکن واقعہ جس رنگ میں خود بنئے کے ذریعہ اور شہر کی افواہ کی راہ سے سپنکی تک پہنچا تھا، اس کے لحاظ سے اس حد تک سپنکی کی کارروائی شاید چنداں قابل اعتراض نہ ہو سکتی تھی، بقول مولوی عاشق الٰہی،

"زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا۔" ص۳۴

یہاں تک سپنکی نے جو کچھ کیا تھا، کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت کے لحاظ سے احتیاط کا تقاضا بھی شاید یہی ہو سکتا تھا۔

لیکن بات اسی حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی، انگریزوں کا دماغ بوکھلایا ہوا تھا، اور حد سے زیادہ اختیار بھی قدرۃً آدمی کو بدمست بنا دیتا ہے۔ سپنکی نے جیل کے بعد نہ صبری سے کام لیا اور نہ اصل واقعہ ہی کی تلاش، جستجو، تفتیش و تحقیق کی زحمت گوارا کی اور اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ

مولنا عاشق الٰہی کے حاشیہ والے بیان میں ہے کہ بعد کو حکومت نے بنکی کے فیصلہ کو غلط ٹھہراتے ہوئے اقرار بھی کیا تھا کہ

"غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو گئی" صلہ

جانتے ہیں حکومت کی یہ اعترافی غلطی جس کا مرتکب حکومت کا نمائندہ بنکی صاحب ہوا کیا تھی؟ بصد بے کسی و بے بسی ایک آدمی نہیں بلکہ قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقاء جو تھانہ سے ان کے ساتھ آئے تھے، مولوی عاشق الٰہی کی اطلاع ہے کہ اس

"ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا"

ایک ایسا مجہول الحال بنیا جس کا نام آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ کیا تھا، کہاں کا تھا، کس رتبہ کا آدمی تھا اس کی خبر اور بازاری افواہ کی بنیاد پر یہی سوچنے کی بات ہے کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ ایک پوری امن پسند آئینی زندگی بسر کرنے والی جماعت کو صرف قید و بند ہی کی سزا نہیں بلکہ سب کو کسی تحقیق و تلاش کے بغیر پھانسی پر چڑھا دینا اور اس کا کچھ خیال نہ کرنا کہ جن لوگوں کو پھانسی دی جا رہی ہے، ان میں علاقہ کا ایک صاحب اقتدار رئیس بھی ہے، بنکی صاحب کا یہ مجرمانہ اقدام، اور قطعاً ظالمانہ فیصلہ قطع نظر اس سے کہ کتنا غیر مآل اندیشانہ تھا، سوچنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے آئین اور دستور کی بے حرمتی اور رسوائی کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی تھی، غدر کا لفظ جس کا انتساب اور اطلاق اس زمانہ کے ہندوستانیوں کے طرز عمل پر کیا جاتا ہے۔ خدا جانے بولنے والوں کی غرض کیا ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ وہی قانونی اصطلاح ہے، جو ہماری فقہ کی کتابوں میں مستعمل ہے تو مطلب اس کا جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں یہی ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے حکومت وقت سے یہ معاہدہ جو کیا تھا کہ اس کے نافذ کردہ آئین و دستور کی پابندی کریں گے، اس معاہدہ کو توڑ کر غدر یعنی قانون شکنی کے لوگ مرتکب ہوئے تھے۔

اگر غدر کا یہی مطلب ہے، تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہوا ہو[1]، لیکن

---

[1] پچھلے چند دنوں سے جیسا کہ شاید ذکر کر چکا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا ذکر ہندوستانیوں کی پہلی (باقی اگلے صفحہ پر)

ضلع سہارنپور میں غدر کے اس جرم کا مجرم انصاف سے بتایا جائے صحیح معنوں میں کون تھا، حکومت کے آئین کو کس نے توڑا۔ یقیناً جنکسن صاحب اس الزام کے ملزم ہیں، اور ان کی وجہ سے ہم غدر کے اس الزام کو اس حکومت پر بھی عائد کر سکتے ہیں جس کی نمائندگی سہارنپور میں جنکسن صاحب کرتے تھے۔

آئندہ حوادث و واقعات کے جلد جلد رونما ہونے میں بظاہر جنکسن صاحب اور جنکسن کی آمریت اور اس کی غدارانہ اور ظالمانہ چیرہ دستیوں کو بھی دخل تھا۔ اور قرآن کی سورۂ شوریٰ میں اہل ایمان کے امتیازی اوصاف کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے یعنی

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ	اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا کہنا مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی مشورہ سے تھا اور جو ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے تھے۔

آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ (پارہ ۲۵ سورۂ شوریٰ رکوع ۴)	اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم واقع ہوتا ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔

(گذشتہ صفحہ سے) جنگ آزادی وغیرہ کے عنوانوں سے لوگ کرنے لگے ہیں۔ غدر کے لفظ کا اطلاق اس واقعہ پر ان کے نزدیک درست نہیں ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ غدر کے لفظ کو باقی بھی رکھا جائے۔ جب بھی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غدر یعنی آئین شکنی کی ابتدا کس کی طرف سے ہوئی۔ باشندگان ہند کی طرف سے یا حکومت کی طرف سے؟ میرے لئے تفصیل کا موقع نہیں لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ کارتوسوں میں چربی لگانے اور دانت سے ان کو کٹوانے کا حکم حکومت کی طرف سے دیا گیا، اور غلط ہو یا صحیح لیکن جن کو حکم دیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ان کے دین اور دھرم میں صراحۃً دخل اندازی تھی۔ احتجاج ان کا قانونی حق تھا۔ جس پر بجز دستورِ امن کے قطعاً برخلاف گورنر جنرل نے احتجاج کرنے والے سپاہیوں میں سے بعضوں کو پھانسی اور بعضوں کو عبور دریائے شور کی سزا دے دی، بارک پور میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ میرٹھ میں بھی جو کچھ کیا گیا مارشل لا کے اعتبار سے بھی وہ درست نہ تھا۔ اسی طرح سہارنپور میں قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقاء کا فوراً پھانسی بھی قطعاً قانون شکنی اور غدر تھا۔ پس اگر غور کیا جائے تو غدر کی صورت ضرور پیش آئی لیکن ہندوستان کے باشندوں کے بجائے غدر یعنی معاہدہ کی خلاف ورزی اور آئین شکنی کی ابتداء جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے حکومت ہی کی طرف سے ہوئی۔ پس غدر کا کیوں انکار کیا جائے۔ انکار اس کا کرنا چاہئے کہ ہم ہندوستانیوں نے غدر نہیں کیا تھا۔ اس جرم کی مجرم خود حکومت تھی۔

اسی ایمانی اقتضا کی تکمیل و تعمیل کے لئے کیا گیا تھا، جو کچھ کیا گیا تھا۔

بہرحال اس سلسلہ میں اس نقطۂ نظر (انتصار) سے قدم اٹھانا بھی بہرحال واجبات شرعیہ میں سے ایک واجب تھا، جس کی پیروی سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء و اکابر نے اس موقعہ پر کی۔

عہد و میثاق کے اقتضاؤں سے لاپروا قطعاً لاپروا ہو کر توڑنے والوں نے آئین و دستور کو جو توڑا تھا، اور خود حکومت کے اعتراف و اقرار کے مطابق جو مجرم نہ تھے۔ ان کے ساتھ جبر و دستی اور زیادتی، یعنی دشمنوں کا برتاؤ جو کیا گیا تھا، اس کے مقابلہ میں "انتصار" اور داد خواہی کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، یہاں کامیابی اور ناکامی کے لئے، فتح و شکست ہار اور جیت کے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ "انتصار" کے لئے یعنی کی اس حالت میں جو کھڑے ہو گئے وہ کامیاب تھے، اور جس حد تک اس باب میں جتنا زیادہ پیچھے رہ گیا، اسی حد تک سمجھنا چاہئے کہ وہ ناکام ہوا۔

(۳)

حکومت وقت اور اس کے نمائندے کے غدر اور عہد شکنی کے اس فعل کے بعد یعنی جو مجرم نہ تھے، صرف جرم کے شبہ میں قطعاً خلاف آئین و دستور جن کو مجرم ٹھہرا کر موت کی آخری سزا جو کسی انسان کو کسی انسان کی طرف سے مل سکتی ہے دے دی گئی، اس بغی کی انتصاری شکلیں جو سامنے آئیں، اب ان کی تفصیل سنئے، اس تفصیل میں دیکھنے کی چیز صرف یہی ہے کہ دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں ہر ہر قدم پر کن کن نزاکتوں اور دقیقہ سنجیوں سے کام لینے والوں نے کام لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ناکردہ گنہگاروں کے اس "خون ناحق" کی خبر سہارنپور سے جب تھانہ بھون پہنچی اور معلوم ہوا کہ قاضی عبدالرحیم انسان کے ایک ایک رفیق کو پھانسی دے دی گئی تو جن کے اعزا و اقربا مارے گئے تھے ان پر جو اثر چاہئے تھا وہ تو ہوا ہی۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ سارے قصبہ ہی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لیکن قاضی عبدالرحیم کی بصد بے کسی، بخلاف توقع موت اور اچانک اس کی خبر جب قاضی عنایت علی بڑے بھائی، ریاست کے امیر کے کانوں میں پہنچی تو بقول مولانا عاشق الٰہی۔

"اس صدمہ سے قاضی عنایت علی پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے"

ریاست تو ریاست زندگی بھی بھائی کے پھانسی پا جانے کے بعد ان پر دو بھر ہو گئی اور جیسا کر کے بھی دکھا دیا، اب نہ ریاست ہی کا خیال ان کے دماغ میں تھا، نہ جان کی پروا اور نہ عزت و آبرو کا احساس ان میں باقی تھا۔ گویا جنون کی سی حالت ان پر طاری ہو گئی، مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"جوشِ حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہو گیا"

یہاں پہنچ کر مولانا عاشق الٰہی صاحب کا قلم خاص حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہے۔ بیان ان کا اتنا مجمل ہو کر رہ گیا ہے، کہ واقعات کی کڑیوں کے ملانے میں کافی دشواری پیدا ہو گئی۔ تاہم جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اور دوسرے بیانات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے سب کو سامنے رکھنے کے بعد واقعہ کی صحیح ترتیب میرے نزدیک حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

یہ عرض کر چکا ہوں کہ ۵۷ء کا ہنگامہ چند دنوں میں ختم نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ سال بھر کے تقریباً بارہ مہینوں تک کسی نہ کسی شکل میں اس کی آگ ملک کے مختلف گوشوں میں بلند ہوتی رہی، اور مرکزی مقامات دلی اور لکھنؤ میں تو کافی عرصہ تک مقابلہ و مقاتلہ کا بازار گرم رہا، صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ سہارنپور میں بے گناہوں کی پھانسی پانے کا واقعہ اس سال کے کس مہینہ میں پیش آیا۔ تاہم قرائن و قیاسات کا اقتضاء یہی ہے کہ آغاز غدر کے چند مہینوں کے بعد یہ صورت سہارنپور میں پیش آئی۔ خبر تھانہ بھون پہنچی۔ قاضی عنایت علی انتقام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی اور جو دن ان کا معاملہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا، انتصار اور داد طلبی کہئے، یا انتقام کے لئے تھانہ بھون اور تھانہ بھون کے اطراف و جوانب میں جو قصبات و قریٰ تھے۔ وہاں کے باشندوں کو بھی انہوں نے پکارا۔ نانوتہ بھی منجملہ دوسری بستیوں کے تھانہ بھون ہی کے نواح کی ایک اہم اور بڑی بستی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے نمائندے وہاں بھی پہنچے۔

اور نانوتہ تو خیر تھانہ سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ مولانا طیب صاحب نے اپنی

تھانہ بھون میں قاضی عنایت علی خاں کا محل جس کے صحن کے چوک میں جو سامنے ہے علم جہاد بلند کیا گیا تھا
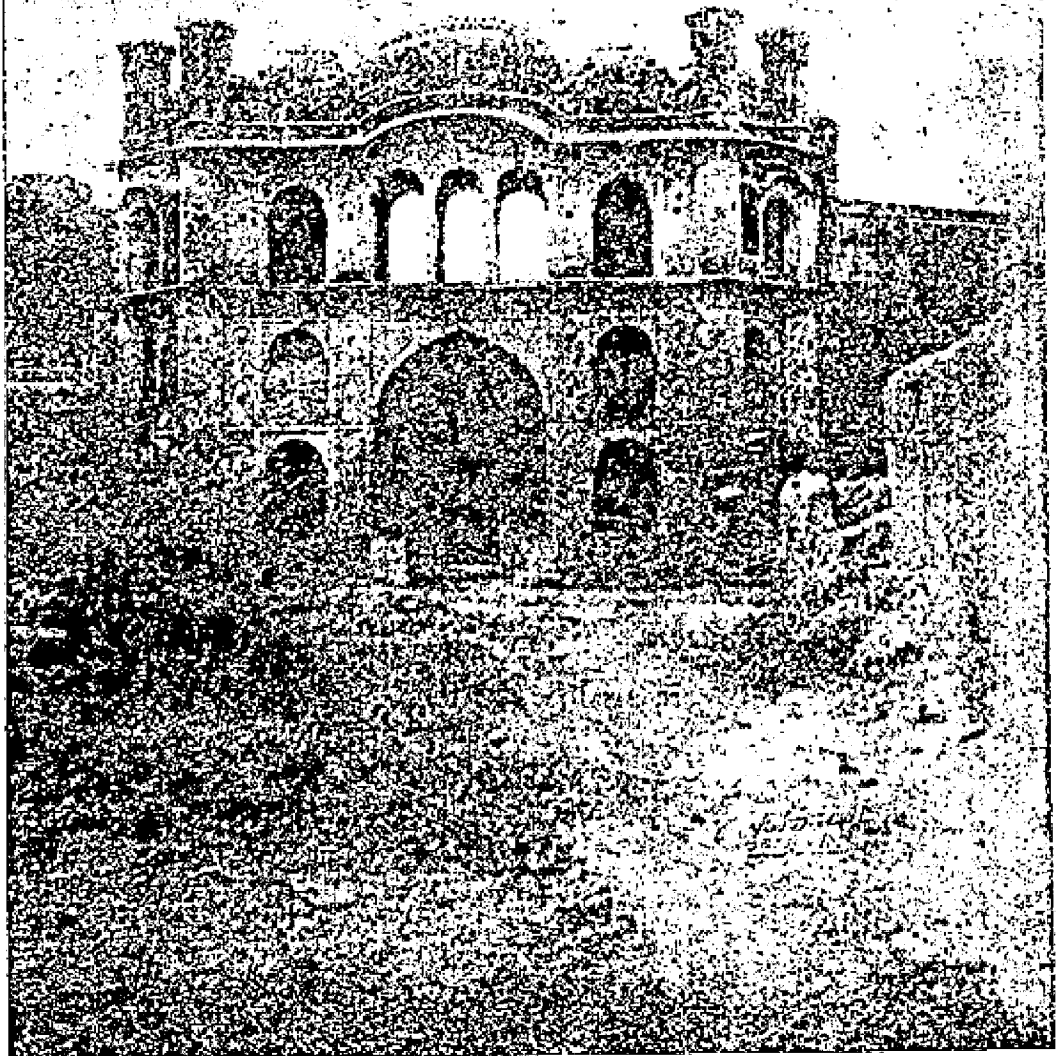
سیاسی یادداشت میں "تھانہ بھون" کی جس مجلس شوریٰ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابھی اس کا حال بیان کیا جائے گا۔ ہم اس مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا گنگوہی کو بھی پاتے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انتقام کا ارادہ جب پختہ ہو گیا تو گنگوہ تک لوگ بھیجے گئے اور جن جن سے انتصار کی اس مہم میں صحیح راہ نمائی کی توقع ہو سکتی تھی ان کو تھانہ طلب کیا گیا۔ ان دونوں بزرگوں کے مرشد برحق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو تھانہ وطن اور مستقر ہی تھا، ان کے سوا حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور مولانا شیخ محمد تھانوی بھی تھانہ ہی میں موجود تھے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرحیم کے پھانسی پانے کے بعد تھانہ بھون کے ردعمل پر چونکہ حکومت کی نظر بھی تھی، احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا اس لئے قاضی صاحب کی طرف سے جو انتصاری کیئے یا انتقامی کاروائیاں ہو رہی تھیں، ان کی خبر ان گو ٹنڈوں کے ذریعہ حکومت تک پہنچتی رہتی تھیں۔ شاید اسی زمانہ کی یہ بات ہے جس کا ذکر مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر کیا ہے، کہ قاضی عنایت علی کے پاس

"کمپنی کی طرف سے پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آجاؤ، اپنے بھائی کو صبر کرو غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو گئی ہے، اگر تم انتقام سے باز آگئے تو تم کو تھانہ کا نواب بنا دیا جائے گا" صلاح

مگر پیام کارگر ثابت نہ ہوا، جو بلائے گئے تھے۔ تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔

یہ بالکل ممکن تھا کہ جمع ہونے کے بعد قاضی عنایت علی صاحب کی منشاء کے مطابق جیسے ہر جگہ مار دھاڑ اکھاڑ پچھاڑ کی اندھا دھند کاروائیاں ہو رہی تھیں۔ تھانہ بھون میں اسی کو شروع کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں جہاں بغی کے بعد انتصار کو ایمانی زندگی کا امتیازی وصف قرار دیا گیا ہے۔ وہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

وامرھم شوریٰ بینھم	اور ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔

ایمانیوں کی شان ہے۔ مولانا طیب صاحب کی سیاسی یادداشت میں۔ ہے کہ تھانہ میں مجلس شوریٰ

قائم ہوئی،

"جس میں حضرت گنگوہی، اور دوسرے علماء شریک تھے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس مجلس میں

"باہم علمی گفتگو چھڑی"

سوال یہی تھا کہ واقعات جس رنگ میں پیش آچکے تھے، یعنی اپنے قانون کو توڑ کر حکومت اور حکومت کا نمائندہ غدر اور قانون شکنی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس بغی کے مقابلہ میں انتصار کے فرض کو محسوس کرتے ہوئے، جہاد و قتال پر آمادہ ہونے کا وقت کیا آگیا ہے؟ مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے، کہ

"اس موقعہ پر جہاد کے سب خلاف تھے، صرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مدعیانہ طریقہ پر اس میں پیش پیش تھے"

تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر مولانا عاشق الہٰی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"سنا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا۔ ج۱ ص۷۵"

اس سے بھی مولانا طیب صاحب ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مطلب ان کا بھی یہی ہے کہ ابتداء میں اس قاہرہ حکومت کے خلاف بغیر مؤثر اسباب جہاد کیلئے کھڑے ہونے کو مجلس شوریٰ کے ارکان کی اکثریت نامناسب ہی قرار دیتی رہی۔ واللہ اعلم بالصواب مخالفت کرنے والوں کی طرف سے جو نقاط نظر پیش کئے گئے تھے، وہ کیا تھے۔ مولانا طیب صاحب نے اجمالاً بس اتنا لکھا ہے کہ،

"سب نے جو حجتیں خلاف میں پیش کیں، حضرت (نانوتوی) نے جوش کے ساتھ سب کا مسکت جواب دیا"

میرے سامنے نہ مخالفت کرنے والوں کی حجتیں ہیں اور ان حجتوں کا جو مسکت جواب دیا گیا تھا،

اس کے علم سے بھی محروم ہوں۔ بظاہر یہی خیال گذرتا ہے، کہ مخالفت کرنے والوں کے سامنے قوت وضعف کا سوال ہوگا، مقابلہ میں ناکامی اور شکست کے سوا جیسا کہ ظاہر ہے اسباب کا اقتضاء تھا، کسی دوسرے احتمال کی شکل ہی سے گنجائش پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ بغی کے بعد "انتصار" کو مومن کی شان قرآن قرار دے چکا تھا۔ اس کا جواب خود ہی سوچئے کیا دیا جاسکتا تھا۔

بہرحال تھانہ بھون کی اس "مجلس شوریٰ" کے مکالمہ ومباحثہ میں جو کچھ بھی کیا گیا ہو لیکن آخری نتیجہ سامنے یہی آیا، کہ جس بات کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سے اعراض وقعود کی کوئی وجہ وجیہ ارکان کی طرف سے پیش نہ ہوسکی۔ صرف مجلس کے ایک رکن حضرت مولنا شیخ محمد صاحب تھانوی جو حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، اور سیدنا الامام الکبیر سے عمر میں بہت زیادہ بڑے تھے۔ مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے، کہ انہوں نے آخری عذر یہ پیش کیا، کہ

"اگر آپ کی حجتیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے۔"

سوال بالکل اسلامی روح کے عین مطابق تھا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اسی روح کا خیال کم کیا جاتا تھا۔ "ہو" کے ساتھ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے، کثرت جب تک وحدت کے نظام میں جکڑی نہیں جاتی۔ صحیح نتائج کی امید مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے دین اور دنیا کے سارے اجتماعی کاروبار میں اسلام کو اس اصول پر جتنا اصرار ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ نماز جو ظاہر ہے کہ بندے اور خدا کے دعائی وعبادتی تعلق کا مظہر ہے۔ لیکن اس میں بھی کثرت کو وحدت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے امام بنایا گیا ہے۔ سفر میں بھی چند آدمی ساتھ ہوں تو حکم دیا گیا ہے کہ امامت اور امارت کا نظم اس میں بھی قائم کر دیا جائے۔

حدیثوں میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ غیروں کے مقابلہ میں چاہئے کہ مسلمان کید واحدہ (ایک ہاتھ کی شکل میں) اپنے آپ کو پیش کریں، یا دیوار سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان کی

حیثیت اس دیوار کی اینٹوں کی سی تھی جس میں ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا لے رہی ہو۔ بہرحال "جہاد" جیسے اہم اجتماعی اقدام کے لئے امارت و امامت کا مسئلہ بدیہی ہے۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا شیخ محمد صاحب کی طرف سے یہ سوال جو اٹھایا گیا تھا، اس کا صحیح مقصد کیا تھا؟ جس لب و لہجہ میں ان کا بیان ہم تک پہنچا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ تھانوی غالباً یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ تھانہ بھون جیسے مقام میں اس شرط کی تکمیل آسان نہ ہوگی۔ بظاہر قاضی عنایت علی قصبہ کے رئیس بھی تھے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ سارا ہنگامہ ان ہی کے انتقامی جوش اور دعوت انتصار کی بنیاد پر برپا ہوا تھا، میں صحیح طور پر ان کے شخصی حالات سے واقف نہیں ہوں، لیکن مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت سے محروم کر دینے کا فیصلہ قدرت جس زمانہ میں کر چکی تھی، اس زمانہ کے عام حالات کی بنیاد پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ

"قاضی عنایت علی خاں پسر نجابت علی خاں رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون ضلع مظفرنگر" ص۲۳

کے الفاظ میں مولنا عاشق الٰہی صاحب اس زمانہ کی جس ہستی کو روشناس کراتے ہوں، وہ رئیس اعظم و زمیندار ہی ہو کر رہ گئے تھے، یا قاضی ہونے کے لئے جن صفات اور خصوصیات کی ضرورت ہے، ان کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ عام حالت تو اس زمانہ کی یہی تھی، کہ خاندان کی کسی پشت میں قاضی کا عہدہ جس کو بھی کبھی میسر آگیا تھا، وہ خاندان قاضیوں کا خاندان بن جاتا تھا، گویا سید و شیخ پٹھان وغیرہ جیسے خانوادوں کے ساتھ ساتھ اس ملک میں قاضیوں کی بھی ایک نسل ہی پیدا ہو گئی تھی، اور سید شیخ کے الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کی اس نسل کے افراد اپنے نام کے آگے قاضی کے لفظ کے استعمال کو اپنا خاندانی حق تصور کرتے تھے۔ خواہ قضا و افتاء سے ان کو دور کا بھی تعلق نہ ہو، اب چاہے دل چسپ لطیفہ ہو یا دل گداز سانحہ جو چاہے سمجھئے۔ مگر واقعہ کی صورت یہی ہو گئی تھی۔ کہ یا جج یا ڈپٹی وغیرہ کی ملازمت حاصل کرنے کے بعد اس زمانہ میں ججوں یا ڈپٹیوں کی نسل جیسے پیدا ہو جائے کچھ اسی قسم کے مغالطہ کی شکل تھی۔ سرکاری عہدوں، اور مناصب کے پشتینی ہو جانے کی مصیبت جس کا شکار مغل حکومت اپنے ایام سکرات میں ہو گئی تھی۔ شاید اس قسم کی بعض نسلوں کے

پیدا کرنے میں اسی قطعاً غیر شرعی بلکہ غیر انسانی رواج کو زیادہ دخل تھا۔

کچھ بھی ہو، قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ قاضی عنایت علی صاحب بن شیخ تھانوی یا رہے ہوں گے کہ امامت کی شرعی شروط نہیں پائی جاتیں۔ امام یا امیر ہو سکتے تھے تو وہی ہو سکتے تھے۔ خیال یہی ہوگا کہ شرط کے مفقود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مشروط یعنی جہاد کی فرضیت کا مطالبہ بھی مفقود ہو جائیگا۔ مجلس شوریٰ کی اکثریت کی جو رائے تھی وہی پاس ہو جائے گی، لیکن اچانک دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر جواب میں فرما رہے ہیں کہ

"نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے"

گویا ایسا معلوم ہوا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک یہ مسئلہ سوچ بچار کا بھی مستحق نہ تھا، شاید لوگ سوچ ہی رہے ہوں گے کہ حضرت والا آخر کیا کہنا چاہتے ہیں اور اتنا دشوار مسئلہ اچانک اتنا سہل و آسان کیسے بن جائے گا کون جانتا تھا کہ جس کے متعلق تصور بھی کسی کا کیا نہ ہوگا کہ جہاد کی امارت قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیں گے، اسی کی طرف ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے سنا جا رہا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں، (مولنا طیب کی روایت کے الفاظ ہیں)

"حضرت مرشد برحق حاجی صاحب موجود ہیں، ان ہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے"

مسجد میر محمود صاحب کے حجرے میں رہنے والے ایک فقیر بے نوا سیدنا و سید الکل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات مراد تھی۔ اس کے سوا کہ مجلس پر اس تجویز کے پیش کرنے کے ساتھ ہی سناٹا چھا جائے اور دوسری صورت ہی کیا تھی، کس کی مجال تھی کہ امامت کی تمام شرطوں کو پورا کرنے والی شخصیت کاملہ پر قدح کی ہمت کرتا، کلام اور فقہ کی کتابوں میں امام کے لئے جو شرطیں ضروری قرار دی گئی ہیں، وہی نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مستحبات اور اولیٰ ہونے کی حیثیت جن امور کو حاصل ہے۔ حاجی صاحب کا وجود باجود سب ہی کا جامع تھا۔ مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اسی لئے

"سب ساکت ہو گئے اور متفقہ طور پر سب نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی"

مولنا عاشق الٰہی مرحوم نے بھی تذکرۃ الرشید میں اسی واقعہ کا ذکر کرنا چاہا ہے، لیکن جس زمانہ میں اپنی کتاب وہ لکھ رہے تھے، ظاہر ہے کہ اتنے کھلے الفاظ میں واقعہ کا تذکرہ نہ کر سکتے تھے، اور نہ ایسا کرنا مناسب تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ "لوگ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گذران دشوار ہے، اور یہ معروضہ پیش کیا کہ

"آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قضئے چکا دیا کریں" ملکے

یہی مقام ہے، جہاں مولنا عاشق الٰہی کے پیرایۂ بیان میں توریہ کا رنگ پایا جاتا ہے، کہنا وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ حاجی صاحب کے دست مبارک پر جہاد کی بیعت کرنے کا ارادہ لوگوں نے پیش کیا، اور اطلاع دیتے ہیں، کہ

"اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا" ملکے

مطلب وہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی تجویز پیش کی لوگ راضی ہو گئے، اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تجویز کو قبول کر لیا، یوں وہ اس علاقہ کے مسلمانوں کے "امیر المؤمنین" اور دینی امام ہونے کے ساتھ "سیاسی امام" بھی بن گئے، گویا کثرت منتشرہ کو شرعی حکم کے تحت پہلے وحدت کا قالب امام و امیر کا انتخاب کر کے کیا گیا، اب سارے پراگندہ افراد ایک شیرازے میں منسلک ہو گئے، اور قصہ صرف اسی سرسری تنظیم کی حد تک ختم نہیں کر دیا گیا، بلکہ مولنا طیب صاحب نے مولنا منصور انصاری کے حوالے سے سیدنا الامام الکبیر کے رفیق مولنا منیر صاحب کی زبانی جو روداد سنائی ہے، اس سے مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گویا اجتماعی حیثیت جو ایک وحدانی جسد کے پیکر میں تشکیل پذیر ہو چکی تھی، چاہا گیا کہ اس کے

رئیس و مرؤ ست اعضاء کو متعین کر کے ہر ہر عضو کا خاص خاص وظیفہ بھی مقرر کر دیا جائے، سچ تو یہ ہے کہ کسی تنظیم کو مکمل کرنے کے لئے جو کچھ بھی اس وقت کرنا چاہئے تھا، سب کچھ کر لیا گیا تھا۔ مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"حضرت اقدس مولنا حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مرکز بیعت جہاد تھے اور حضرت اقدس مولنا حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے علم بردار جہاد تھے، حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جامع مجاہدین تھے کہ وعظ و پند ترغیب و ترہیب سے مجاہدین کو مختلف مواقع دیہات و قصبات سے جمع کر کر کے میدان میں لائیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ امیر عسکر تھے۔"

مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ کابل میں مولنا منصور انصاری مولنا محمد منیر صاحب کی اس روایت کو نقل کرتے ہوئے، اسلامی ممالک خصوصاً کابل کی عصری اصطلاحوں میں تنظیم کے ان ہی پہلوؤں کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے تھے یعنی حاجی صاحب قبلہ کی حیثیت تو خیر امیر المؤمنین کی تھی، ان کے سوا:

"حضرت حافظ ضامن شہید، امیر جہاد گویا صدر مجلس جنگ تھے، مولنا محمد قاسم صاحب امیر الافواج چیف کمانڈر مولنا محمد منیر صاحب مولنا نانوتوی کے یاد حربی، فوجی سکریٹری حضرت مولنا گنگوہی وزیر لام بندی تھے۔"

الغرض تھانہ بھون میں جہاد کی اس انتصاری مہم کے لئے شرعی تنظیم کے مطابق جو کچھ بھی کرنا چاہئے تھا، وہ سب کچھ جب کر لیا گیا، اور گو قاضی عنایت علی صاحب کو کوئی خاص عہدہ تنظیم کی اس اجتماعی ہیئت میں نہیں دیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ علاقے کے وہ رئیس تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالی امداد کا بار زیادہ تر ان ہی پر ڈالا گیا ہوگا، اور جب اپنا سب کچھ اس راہ میں قربان کرنے کیلئے وہ تیار ہو چکے تھے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس ذمہ داری کو بخوشی وہ قبول نہ کرتے، مجاہدوں کے طعام و قیام آلات حرب کی فراہمی، اور از قبیل دوسرے جہادی مصارف کے متکفل جہاں تک میں سمجھتا ہوں،

تھانہ بھون کی اس مہم میں قاضی عنایت علی ہی کو ہونا چاہئے تھا، اگرچہ اس باب میں کوئی صریح شہادت مجھے نہیں مل سکی ہے۔

خیر جہاد کی شرعی تنظیم کا مسئلہ تو طے ہوگیا لیکن شرکت جہاد کے بعض ذیلی شرائط کی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا، مطلب یہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ والدین یا ان میں کوئی ایک اگر زندہ ہو تو ان سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت بھی شرعاً ضروری ہے۔ ففیھما فجاھد (ان دونوں یعنی والدین کی خدمت گذاری میں جہاد کرو) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کو حکم دیا تھا، جن کے والدین زندہ تھے، اور جہاد میں شریک ہونے کی آرزو دربار نبوت میں پیش کی تھی۔

اس باب میں نہ اوروں کا حال ہی مجھے معلوم ہے، اور نہ اس کتاب میں ان کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ اس شرعی شرط کی تکمیل میں جو صورت پیش آئی، مختلف یادداشتوں میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرعی تنظیم کے بعد جب طے ہوگیا کہ رزم کا بازار گرم ہو کر رہے گا اور ظلم کرنے والوں سے بدلہ بہرحال لیا جائے گا، تو سیدنا الامام الکبیر جن کے والدین اس زمانہ تک زندہ تھے، آپ کے دل میں یہ دینی تقاضا پیدا ہوا کہ والدین سے اجازت کے مرحلہ کو بھی طے کر لیا جائے اسی تقاضے کے زیر اثر تھانہ سے آپ نانوتہ تشریف فرما ہوئے۔ مولوی طاہر صاحب سلمہ نے اپنی یادداشت میں اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ،

"۵۷ء میں جب اس پر اتفاق ہوگیا کہ اس وقت جہاد فرض ہے، تو حضرت اپنے مکان (نانوتہ) تشریف لے گئے، چونکہ اپنی والدہ کے بہت ہی مطیع اور فرماں بردار تھے، روزانہ دونوں وقت پاؤں دبانا ان کا معمول تھا۔"

اس معمول کے مطابق ابھی بھی جیسا کہ آگے بیان کیا گیا ہے،

"اپنی والدہ ماجدہ کے پاؤں دباتے ہوئے (ماں کو مخاطب کرکے) فرمانے لگے کہ خدا کی

راہ میں جان اور مال کو فدا کر دینا ایسا ہے' اور جو خوشی سے اپنی جان خدا کے حوالہ کر دیتا ہے' اس کا ایسا درجہ ہے وغیرہ "

مطلب یہ ہے کہ اظہار مدعا سے پہلے جہاد اور راہ حق کی جان فروشیوں' قربانیوں کے متعلق قرآن و حدیث میں جو فضائل بیان کئے گئے ہیں' پہلے اپنی اماں جان رحمۃ اللہ علیہا کو سمجھاتے رہے' روایت میں اس کے بعد ہے کہ

" اس قسم کی پر اثر تمہید بیان کرکے عرض کیا کہ جہاد فرض ہو چکا ہے "

اس سے مطلع کرنے کے بعد اپنے عزم راسخ کا اظہار والدہ ماجدہ کی خدمت میں بایں الفاظ فرمانے لگے کہ دین کا

" یہ مسئلہ ہے کہ اطاعت خالق میں والدین کی اطاعت اگر معارض ہو تو وہ ساقط ہو جاتی ہے "

مقصد مبارک یہی تھا کہ والدین کو میری ذاتی خدمات کی ضرورت نہیں' نہ ذاتی خدمات کی حاجت تھی' نہ مالی امداد کی' ایسی صورت میں خدائی مطالبہ کی تعمیل میں بلا وجہ رکاوٹ اگر والدین کی طرف سے بھی ڈالی جائے گی تو شرعاً اس قسم کی بے بنیاد رکاوٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ والدہ ماجدہ سے یہ بھی فرمایا کہ

" میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دیں' تاکہ آپ کو بھی اجر ملے "

حافظ محمد احمد صاحب نے ان الفاظ کے بعد روایت کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی تفصیل براہ راست اپنے والد ماجد سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی تھی' حافظ صاحب مرحوم کا بیان ہے'

" چنانچہ خود (سیدنا الامام الکبیر) فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ بڑی سمجھدار تھیں' فرمانے لگیں کہ بھائی تم اللہ ہی کی چیز ہو' میں خوشی سے تمہیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں "

الغرض اسی کے ساتھ ایمان و یقین کے گھرانے کی اس پردہ نشین خاتون نے اپنے اکلوتے جوان

بیٹے کو خطاب کر کے یہی فرمایا کہ

"اگر تم زندہ آ گئے تو میں تم سے مل لوں گی، نہیں تو آخرت میں انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی ملنا ہوگا"

عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ بی بی حبیبہ رحمۃ اللہ علیہا کو کتابی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا، جو کچھ بھی علم و معرفت کی روشنی ان کے اندر تھی، اپنے بزرگوں اور ماحول کی پیداوار تھی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، سکینت کی اس خنکی اور طمانیت کی اس ٹھنڈک کو کہ مشاہدہ والی زندگی، اور مرنے کے بعد آنے والی ایمانی زندگی، دونوں کی حیثیت میں بال برابر فرق ان کے احساس میں نہیں پایا جاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان نیک دل مومنہ خاتون کی نظر میں شہادت و غیب دونوں ایک ہیں، سب سے زیادہ حیرت تو مجھے اس فقرے کے لفظ "جلد ہی" پر ہے، جس کی یافت بآسانی بڑے بڑے صاحب علم و بصیرت کیلئے بھی دشوار ہے۔ عام خیال قیامت اور آخرت کے متعلق "تاخیر اور درنگی ہی کا ہے۔ کون جانے کہ کروڑوں برس بعد آخرت کا میدان سامنے آئے گا، یا لاکھوں برس بعد۔ لیکن یہ تاخیر اور درنگی صرف ان ہی لوگوں کے لئے ہے، جنہوں نے اب تک سمجھا ہی نہیں ہے کہ تاخیر اور درنگی کا موصوف یعنی خود زمانہ کی اصل حقیقت کیا ہے[1]۔ لیکن

---

[1] جنہوں نے قدیم یا جدید فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، ممکن ہے ان کے لئے یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہو، لیکن تھوڑی بہت بھی نظر فلسفہ میں جو رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زمانہ جو عوام کے نزدیک سب سے زیادہ سمجھی بوجھی چیز ہے لیکن کہتے ہیں کہ ارسطو کے سامنے زمانہ کا مسئلہ جب آیا تو سوچ بچار کے بعد اس کو اعلان کرنا پڑا کہ اس سے زیادہ غریب فی الفطرۃ کوئی حقیقت مجھے معلوم نہیں ہوتی۔ یعنی جتنا زیادہ سوچئے اسی قدر وہ چیستان بنتی چلی جاتی ہے۔ زمانہ یعنی سال و ماہ اور گھنٹے منٹ دقیقے پر جسے ہم تقسیم کرتے ہیں، ذرا سوچئے تو یہی کہ حواس میں سے کسی حاسہ کا اس سے تعلق ہے، میں پوچھتا ہوں کہ جمعہ یا جمعرات کے دن کی خاص نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ کوئی رنگین لال پیلی چیز ہے جسے ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا چھو کر چکھ کر، سونگھ کر، سن کر ہم نے ان کو جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں کے سوا اس کا جواب اور کیا ہو سکتا ہے، پھر زمانہ کے جاننے کا دعویٰ آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی زمانہ کو ہم اپنی مذہبی معلومات میں شمار کرتے ہیں اصل یہ ہے کہ زمانہ کی حقیقت جب تک واضح نہ ہو دیر اور سویر یا تاخیر و تعجیل کے متعلق ہمارے احساس کی بنیاد صحیح واقعہ پر قائم نہ ہوگی تفصیل کیلئے فلسفیانہ معلومات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ مگر یہ سیدنا الامام الکبیر کے نظریات کے سلسلے میں کتاب کے دوسرے حصے تک یہ بحث

سمجھے سمجھائے اخیر ان کے قلب مؤمن کا فیصلہ تھا کہ آخرت والی یہ گھڑی جلد ہی آنے والی ہے۔
بہرحال جلد ہی کے اس لفظ کو ان جیسی مومنہ خاتون کی زبان کا شعوری لفظ سمجھئے یا غیر شعوری، لیکن اپنے اکلوتے لخت جگر کو بغیر کسی جزع فزع کے خندہ جبینی کے ساتھ رخصت کر دینا، یقیناً کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بالمیک شاعر رامائن کا تخیل خدا جانے اسکو کس چیز میں ادا کرتا۔[1]

سیدنا الامام الکبیر کے لئے ماں ہی کا مرحلہ سب سے بڑا مرحلہ تھا۔ لیکن آسان کرنے والے نے اس کو آسان بنا دیا۔ ان کے بعد دوسری منزل پدر مہربان شیخ اسد علی صاحب مرحوم کی اجازت کی تھی، مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں ہے

"اس کے بعد (یعنی والدہ ماجدہ کی رضامندی حاصل کر لینے کے بعد) حضرت (نانوتوی) اپنے والد کے پاس تشریف لے گئے"

آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب جیسا کہ مولوی طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ

"نانوتہ میں ہمارا جو جدی مکان ہے، اس میں ایک چبوترہ بھی تھا اور حضرت مرحوم (نانوتوی) کے والد مغفور چبوترے پر کھڑے تھے"

غالباً اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر کے عزم اور ارادہ کی خبر شیخ اسد علی صاحب کو نہ تھی، جہاں وہ کھڑے تھے، وہیں پہنچکر بیان کیا گیا ہے کہ

"نہایت عاجزی، اور نرمی کے ساتھ اپنے والد سے اس عزم کو ظاہر کیا"

شیخ اسد علی صاحب آپ کے والد ماجد جس رنگ کے آدمی تھے، اس پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں، مولوی طاہر صاحب نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ

"ہمارے پردادا (شیخ اسد علی صاحب) چونکہ پڑھے لکھے زیادہ نہ تھے، اس لئے

---

[1] ہمارے وطن ہندوستان کی مقامی روایات کا مجموعہ جو رامائن کے نام سے مشہور ہے۔ بالمیک اسی کتاب کے مصنف کا نام ہے، رام چندر جی روایت کے ہیرو اپنی ماں کوشلیا سے بن باس ہونے کے لئے جس وقت اجازت طلب ہوئے ہیں اور ماں سے بیٹا جس وقت رخصت ہونے لگا ہے۔ شاعر نے اس واقعہ کو جن ناک تعبیروں میں ادا کیا ہے۔ ان کی طرف میرا اشارہ ہے ۱۲

انہوں نے الکھڑتا ہوا جواب اس طرح دیا کہ حضرت کی والدہ سے کہا کہ ذرا میری پگڑی لے آؤ' وہ لے آئیں' اسے باندھا۔"

جہادی مہم میں اجازت طلبی کی درخواست کے جواب میں شیخ صاحب کا یہ طرزِ عمل یعنی پگڑی کا منگوانا اور اس کو باندھنا' ظاہر ہے کہ کچھ عجیب سی بات تھی' لکھا ہے کہ بجائے ہاں' انہیں کے شیخ صاحب کے اس طرز کو دیکھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا

"باداجی! یہ کیوں باندھ رہے ہیں"

تب اپنے دل کی کیفیت کا اظہار شیخ صاحب نے ان الفاظ میں کیا کہ

"تیرے ساتھ سر کٹانے آخر جاؤں گا بھی"

مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ اپنے والد ماجد کی زبان سے یہ سن کر سیدنا الامام الکبیر نے والد کو مخاطب کرتے ہوئے'

"کسی قدر آواز سے یہ فرمایا کہ آپ میری وجہ سے کیوں سر کٹاتے ہیں۔ اگر آپ کو سر کٹانا ہے تو اللہ کے لئے کٹائیے اور میرے ساتھ چلئے"

مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں روایت سوال و جواب کے ان ہی الفاظ پر مشتمل ہے' اسی کے ساتھ مولنا طیب صاحب کی یادداشت کی اطلاع کو بھی جب ہم پیش نظر رکھ لیتے ہیں' یعنی انہوں نے والد کی اجازت طلبی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"حاضری جہاد کی اجازت دینے میں کسی حد تک حضرت کے والد ماجد نے پس و پیش کیا تھا" (مقالہ۔ حضرت نانوتوی کا جوش جہاد)

اس سے ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ پگڑی طلب کر کے باندھنے اور اپنے سر کٹانے کا ذکر شیخ اسد علی صاحب نے جو فرمایا تھا' غالباً لب و لہجہ میں ان کے طنز کی آمیزش تھی۔ یا ایک خیال یہ بھی ہے کہ حکومت قائمہ مسلطہ افرنجیہ کی دار و گیر کے اندیشہ کو شیخ صاحب نے اس طریقہ سے ظاہر کیا۔ گویا بیٹے کو سمجھانے لگے کہ تیری وجہ سے میں پھانسی کے تختے پر چڑھایا جاؤں گا۔ قبل

اس کے کہ حکومت مجھے پکڑے، پگڑی باندھ کر خود پھانسی پر چڑھنے اور گردن کٹانے پر طنز یہ لہجہ میں اپنی آمادگی وہ ظاہر کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ جس چیز کی اجازت ان سے چاہی جا رہی تھی۔ اس سے وہ راضی نہ تھے۔ سیدنا الامام الکبیر کا یہ فرمانا کہ میرے لئے سر کیوں کٹا ئیے۔ اللہ کیلئے کٹا ئیے، اور میرے ساتھ چلئے" اس سے کچھ یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔

بہر حال حاصل وہی ہے۔ جیسا کہ مولوی طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اجازت دینے میں آپ کے والد صاحب نے پس و پیش سے کام لیا اور بقول ان ہی کے اس وقت

"حضرت نے لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (یعنی خدا کی نافرمانی کا جہاں اندیشہ ہو، وہاں مخلوق کی فرماں برداری کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ شریعت کے اس عام دستور) پر عمل فرمایا" صفحہ مقالہ مذکور

اس اجمال کی تفصیل مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں یہ ہے کہ والد نے مذکورہ بالا گفتگو فرمانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر ان ہی سے یہ کہتے ہوئے کہ

"بندہ رخصت ہوتا ہے"

"السلام علیکم" کے ساتھ اپنے والد ماجد کے سامنے سے رخصت ہو گئے، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد سے اجازت طلبی اور رضا مندی میں آپ کامیاب نہ ہو سکے لیکن ملا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

"مگر پھر والد بھی راضی ہو گئے"

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شیخ اسد علی نے شروع میں اپنے جس خیال یا احساس کا اظہار کیا، شاید وہ فوری جذبات کا نتیجہ تھا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے جب تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کا موقعہ ان کو ملا، خصوصاً بیوی سے ملنے کے بعد جب ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ باوجود عورت ہونے کے جب خوشی سے بیٹے کو اللہ کی راہ میں سرفروشی کی اجازت دے چکی ہیں، تو مرد ہونے کا اقتضاء جو کچھ ہونا چاہئے تھا، اس سے ان کا متاثر ہونا بعید نہیں ہے۔ اسی لئے مولوی طاہر صاحب نے واقعہ کی

توجیہ کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ "میرے پرداداصاحب زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے" گویا اجازت دینے میں پس وپیش کرنے کی وجہ مولوی طاہر صاحب کے نزدیک کم علمی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ شیخ صاحب کی تعلیمی وعملی زندگی کا ذکر کر چکا ہوں۔ کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اپنی اہلیہ محترمہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کے مقابلہ میں ان کی تعلیمی سطح بلند اور بہت زیادہ بلند تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی توفیق کا تعلق بجائے علم کے ایمان سے ہے' اور اس موقعہ پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عورت کا ایمان مرد سے زیادہ دزنی ثابت ہوا' اور یہ خدائی دین ہے' یوتیہ من یشآء

خیر جس طرح بھی ہو' آگے پیچھے والدین کی رضامندی کا قصہ ختم ہوا' اور سیدنا الامام الکبیر نانوتہ کی اپنے "جہادی مرکز" مستقر تھانہ بھون پہنچ گئے۔

اس کے بعد واقعات جس رنگ میں پیش آئے' ان کی کوئی تفصیلی روئداد میرے پاس نہیں ہے۔ تاہم جستہ جستہ مختلف وثائق میں جو چیزیں ملی ہیں' ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر دیتا ہوں۔

تھانہ بھون کے مستقر سے پہلا حملہ باغ شیر علی کی سڑک پر

اس واقعہ کا ذکر مولنا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں کیا ہے واقعہ کی ابتدا مولوی صاحب کے بیان کے مطابق یوں ہوئی کہ انگریزی فوج کے

"چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے" ص۷۵

یہ وہی زمانہ ہے کہ جہاد کا مسئلہ تھانہ بھون میں تمام منزلوں سے گذر کر فیصلہ کی آخری صورت اختیار کر چکا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی فوج کے سوار جنگی ذخیرے یعنی کارتوسوں کو لئے ہوئے سہارنپور سے کیرانہ جا رہے تھے۔

یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ جس کی طرف مجاہدوں کی توجہ کا منعطف ہو جانا ایک قدرتی بات تھی' اور

کون کہہ سکتا ہے کہ قریش کے تجارتی قافلہ بہ جو درحقیقت جنگی سرمایہ کے ساتھ شام سے واپس ہو رہا تھا، اس قافلہ کو روک لینے کا ارادہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر جو کیا گیا تھا، اسلامی تاریخ کے مرقع کی اسی تصویر کی جھلک تھانہ بھون کے مجاہدین کے سامنے نہ آگئی ہو گی، کچھ بھی ہو اس موقعہ کو مغتنم خیال کر کے قاضی عنایت علی (رئیس تھانہ بھون) کی سرکردگی میں ایک سریہ روانہ کر دیا گیا مولوی عاشق الٰہی صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ قاضی صاحب

"اپنے چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لیکر شیر علی کے باغ کی سمت کی سڑک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گذرے ان کا اسباب لوٹ لیا"

صرف اسباب ہی نہیں بلکہ آگے وہی جو یہ لکھتے ہیں کہ

"ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر سمت مشرق جنگل کو بھاگا، مگر تھوڑے فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مر گیا" صفحہ برحاشیہ تذکرہ۔

اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسباب کے ساتھ اسباب والے اور اسباب کے سارے محافظ بھی کام آئے، صرف ایک سوار بھاگنے میں کامیاب ہو سکا لیکن وہ بھی بالآخر گھوڑے سے گر کر لقمۂ اجل ہوا۔

تھانہ بھون کے مجاہدوں کی یہ پہلی حربی کامیابی تھی۔ افسوس ہے کہ مولوی صاحب نے قاضی عنایت علی کے "رفقاء" کے ناموں کی نشاندہی نہیں کی۔ اسی لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ سیدنا الامام الکبیر بھی اس پہلی جھڑپ میں بہ نفس نفیس شریک تھے یا نہ تھے۔ رجحان تو قلب کا اسی طرف ہے کہ اس "مقدس جنگ" کی بسم اللہ کی شرکت کی سعادت سے حق تعالیٰ نے ان کو محروم نہ رکھا ہو گا۔

جنگ شاملی

مولوی عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ شیر علی کی سڑک کی یہی مہم اس مشہور واقعہ کی تمہید بن گئی، جس نے "جہاد تھانہ بھون" کے سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس فساد (یعنی باغ شیر علی کی سڑک والے فساد) کی خبر مظفر نگر (مستقر ضلع) پہنچی تو

حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہوگیا "

مولانا عاشق الٰہی نے یہ اطلاع دی ہے، کہ حکومت کے اس ارادے سے یعنی تھانہ بھون پر فوج کشی کا فیصلہ ہوگیا ہے اس کی خبر جب تھانہ بھون پہنچی اور اسی کے ساتھ

"شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پاکر (تھانہ بھون میں) نقارہ بجا دیا گیا، اور جتھے کا جتھا شاملی پر چڑھ دوڑا، اور کیا جو کچھ کیا " ۱۲۵

شاملی جو آج کل سہارنپور سے دلی شاہدرہ جانے والی چھوٹی لائن کا ایک اسٹیشن ہے، اور مشہور مردم خیز قصبہ کاندھلہ کے قریب ہے، اس قصبہ میں ایک چھوٹی سی گڑھی بھی تھی جو شاید کسی شکل میں آج بھی موجود ہو، تھانہ بھون کے مجاہدوں نے اس گڑھی پر حملہ کیا، اور اس کو فتح کیا، اتنی بات تو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اس مہم میں سیدنا الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما بھی براہ راست شریک تھے لیکن اس واقعہ کی تفصیلات کیا ہیں؟ مولانا عاشق الٰہی صاحب کا بیان تو حد سے زیادہ مجمل ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے جو معلومات فراہم ہوسکی ہیں، ان کو میں پیش کردیتا ہوں۔

ممکن ہے کہ شاملی کی گڑھی پر حملہ کرنے کی ایک وجہ وہ بھی ہو، جو مولانا عاشق الٰہی نے بیان کی ہے لیکن اسی کے ساتھ مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے اس سے بھی زیادہ گہرے اسباب کا سراغ ملتا ہے۔ اسے اسی جہادی سلسلہ میں ارقام فرماتے ہوئے کہ

"حضرت (نانوتوی) کے شاگرد خاص نواب محی الدین خان مرادآبادی کے والد ماجد نواب شبیر علی خان، حضرت (نانوتوی) کے معتقد اور بادشاہ دہلی کے مصاحب خاص اور معتمد علیہ تھے "

بادشاہ دہلی سے مراد ابوظفر سراج الدین خادم السلاطین المغلیہ ہیں، نواب شبیر علی خان مرادآباد کے مشہور رئیسوں اور بڑے تعلقہ داروں میں شمار ہوتے تھے۔ عزت وجاہ کے جس مرتبہ پر تھے اس کے لحاظ سے شاہی دربار سے ان کا تعلق محل تعجب نہیں ہوسکتا۔ نواب شبیر علی مرادآبادی

اور سیّدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا عقیدت مندانہ تعلق کے ذکر کے بعد مولٰنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ:

"حضرت (نانوتوی) نے ان کی (یعنی نواب شبیر علی) کی معرفت بادشاہ دہلی کو جہاد اور استخلاص وطن وملت کی جنگ پر آمادہ فرمایا۔"

یہ بھی مولانا طیب صاحب ہی کا بیان ہے۔ کہ

"غرض یہ تھی کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کرکے دلی کو ان کے (انگریزوں سے) پاک کرنے کی سعی کریں، اور ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر صحیح اصول پر دو طرف سے یہ حملہ اور دنا ع عمل میں لے آیا گیا تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے۔" مقالہ جہاد

کن ذرائع سے اپنی اس روایت میں مولٰنا طیب صاحب مستفید ہوئے ہیں[1]، سردست میں نہیں بتا سکتا۔

---

[1] احقر نے یہ واقعہ مولٰنا منصور (مولٰنا محمد میاں صاحب مرحوم مہاجر کابل رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ) سے کابل میں سنا اور قلمبند کیا۔ مولٰنا مرحوم احقر کے حقیقی پھوپی زاد بھائی اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے نواسے تھے۔ تحریکات آزادیٔ ملک وملت کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند کے خاص صاحب سر اور معتمد علیہ تھے۔ انہوں نے جہاد تھانہ بھون کے سلسلہ میں بہت سے مفصل واقعات بروایت مولٰنا محمد منیر صاحب نانوتوی مرحوم مجھ سے بیان کئے، جو انہوں نے مولانا محمد منیر صاحب سے خود بلا واسطہ سنے۔ غالباً اس سے پہلے کسی موقعہ پر تذکرہ آچکا ہے کہ مولٰنا محمد منیر صاحب حضرت نانوتوی کے قریبی عزیز اور اُن کے فدائی تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ نے بحیثیت امام جہاد اُن ہی کو حضرت نانوتوی کے ساتھ لگا دیا تھا کہ وہ ان کی حفاظت اور نگرانی کرتے رہیں۔ کیونکہ حضرت نانوتوی اپنی قلبی شجاعت اور جوش جہاد میں جا بجا بے دھڑک صفوف میں گھس جاتے تھے اور اپنی جان کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اسی خاص حیثیت کی بناء پر مولانا محمد منیر صاحب کو حضرت نانوتوی کے جہاد کے واقعات بہت محفوظ تھے جو چشم دید تھے اور بہت سے ایسے واقعات ان کی روایت سے بھائی صاحب مرحوم سے میں نے سنے جو اوروں سے سننے میں نہیں آئے ہیں میں نے ان تمام واقعات کی ایک تفصیلی روداد قلمبند کرلی تھی لیکن واپسی کابل کے وقت سیصرین کا مشورہ یہ ہوا کہ اسے ساتھ نہ رکھا جاوے۔ اس لئے یہ یادداشت بھائی صاحب مرحوم کے پاس امانت چھوڑ دی گئی کہ وہ کسی مناسب موقعہ پر بھیجدیں۔ لیکن ہندوستان کی آزادی سے تقریباً چھ ماہ پیشتر ان کا وصال ہوگیا اور موجودہ حکومت ہند کے بعض ذمہ داروں نے جب کہ یہ ارادہ کرلیا تھا کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

لیکن بہر حال وہ صاحب البیت ہیں، اور ان لوگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، بلکہ ان ہی لوگوں میں پوسے پالے گئے۔ سن شعور و تمیز تک پہنچے۔ جو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے براہ راست صحبت یافتہ اور آپ کے حالات و واقعات کے امین تھے۔

میرا خیال یہ ہے، کہ تھانہ بھون میں تنظیم جہاد کے شرائط کی تکمیل کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے نواب شیر علی مراد آبادی کو اس مہم پر آمادہ فرمایا کہ بادشاہ کو وہ تیار کریں۔ اور ادھر تھانہ بھون سے ارادہ کیا گیا کہ اقدام کرتے ہوئے، شاہدرہ کی راہ سے دلی پایۂ تخت پہنچ جائیں۔ حملہ کے لئے شاملی کا انتخاب جہاں دوسرے وجوہ سے کیا گیا تھا، منجملہ ان کے ایک بڑی اہم وجہ یہ بھی تھی۔

"ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دلی کی طرف بڑھیں"

مولنا طیب کی یادداشت کے اس فقرے کا یہی کھلا ہوا اقتضاء ہے۔

باقی مولانا عاشق الٰہی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پاکر تھانہ بھون میں نقارہ جنگ بجا دیا گیا۔ اس میں "جھوٹی" کے لفظ کا صحیح مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ جس وقت شاملی کی گڑھی پر تھانہ بھون کے مجاہدوں پر حملہ کیا گیا۔ عام مشہور بلکہ متواتریات ہے، کہ اس وقت انگریزی فوج کے سپاہی اس گڑھی میں قلعہ بند تھے۔ پھر شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی خبر کو جھوٹی قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ ہاں! اگر یہ مراد ہو، کہ شاملی کی گڑھی میں انگریزوں کی فوج جو رہتی تھی۔ یا اس زمانہ میں متعین کی جا چکی تھی۔ اس کے سوا بھی انگریزوں نے تھانہ پر حملہ کرنے کے لئے مزید فوج شاملی کی طرف روانہ کی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ خبر جھوٹی ہو۔

(گذشتہ صفحہ سے) اس قسم کی مظلومانہ جلاوطنی کی زندگی گذار نے والوں کو (جو برطانیہ کی جابرانہ پالیسی کا شکار تھے) ہندوستان بلا لیا جائے، مرحوم اس سے پیشتر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے جس سے وہ یادداشت بھی تقریباً لاپتہ ہو گئی، چند چند جستہ جستہ واقعات جو احقر کے حافظہ میں محفوظ رہ گئے تھے، ہندوستان پہنچ کر انہیں قلمبند کر لیا گیا تھا جو حضرت مصنف سوانح نے جہادی مقالہ کے نام سے اسی یادداشت کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ میں نے اس یادداشت کا سلسلۂ سند اسلئے تفصیل سے نقل کر دیا کہ آئندہ حوالہ میں اس کی سند پیش نظر رہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

بہر حال ابتدائی اسباب کے لحاظ سے اگرچہ تھانہ بھون کی یہ جہادی تحریک جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، انتصار اور انتقام کی ایک مقامی تحریک تھی، حکومت نے ملک کے باشندوں سے جو امنی معاہدہ کیا تھا، اس معاہدہ کو توڑ کر وہ عہد شکنی اور غدر کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسی چیز نے اس علاقے کے باشندوں کو انتصار و انتقام کے قرآنی حکم کی تعمیل پر آمادہ کیا تھا۔ اسی طرح جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے بھی اس تحریک کا دائرہ جیسا کہ خدا کی مشیت تھی زیادہ وسعت حاصل نہ کر سکا، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے نواب شبیر علی صاحب مرادآبادی کے توسط سے اس تحریک کا ربط ہندوستان کے موروثی حکمران سراج الدین بہادر شاہ سے قائم کر دیا تھا، تو شاملی کی گڑھی پر تھانہ بھون کے مجاہدوں کا حملہ یہی سمجھنا چاہئے کہ شاملی کی گڑھی پر نہ تھا۔ بلکہ یہ اقدام درحقیقت پایۂ تخت دلی تک پہنچنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولنا طیب صاحب نے اپنی جہادی یادداشت میں لکھا ہے کہ

> "سرفروشان دین سروں کو ہتھیلیوں پر لیکر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کیلئے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کیا، جس کا نصب العین دہلی تھا۔" صہ۲ مقالہ جہادی

ظاہر ہے کہ ایسی صورت بجائے مقامی ہونے کے ایک ہمہ گیر تحریک کا قالب "تھانہ بھون کا جہاد" اختیار کر لیتا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن غیر معمولی، اولوالایدی والابصار شخصیتوں کے مبارک ہاتھوں میں تھانہ کی جنگی مہم کی باگ تھی۔ ان کے فلک گیر حوصلوں اور سیر پیادلوں کا اقتضا چاہئے تو کچھ بھی ہو، لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا، مجاہدوں کی یہ یورش شاملی کی گڑھی پر پہنچ کر ختم ہو گئی، ہم اس قصہ کو ان ہی معلومات کے ذکر پر ختم کر دینا چاہتے ہیں، جو شاملی کی گڑھی کی اس مجاہدانہ یورش کے متعلق ہمدست ہو چکے ہیں۔ کب، کس مہینے میں کتنے آدمیوں کے ساتھ شاملی کی گڑھی پر حملہ کیا گیا۔ حالات کے لحاظ سے ان تفصیلات کے قلم بند ہونے کی صورت ہی کیا تھی، بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ خود امیر المومنین یعنی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو تھانہ ہی کے قیام کا

بشورہ دیا گیا۔ اسی لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے غزوہ کے سریہ ہی کی شکل میں مجاہدوں کا فوجی دستہ شاملی کی طرف سے روانہ کیا گیا تھا۔

اسی سریہ کی تعبیر مولنا عاشق الٰہی صاحب نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

"جتھے کا جتھا تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا" صہ

تصریح تو نہیں کی ہے لیکن ان کے بیان کا اقتضاء ہے کہ تھانہ کے رئیس قاضی عنایت علی صاحب بھی اس جتھے میں کہئے یا سریہ میں شریک تھے۔ نیز تحصیل شاملی کی اس یورش کے متعلق منتشر طور پر کتابوں، اور یادداشتوں میں جو روایتیں پائی جاتی ہیں، اور شہرت بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حدود تک جو روایتیں پہنچی ہوئی ہیں، ان کی بنیاد پر اتنی بات بھی بہر حال یقینی ہے کہ دین کے یہ چار یار یعنی (۱) سیدنا الامام الکبیر مولنا محمد قاسم نانوتوی (۲) امام ربانی حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی، (۳) حضرت مولنا حافظ محمد ضامن شہید (۴) مولنا محمد منیر صاحب نانوتوی بہ نفس نفیس اس یورش میں عملاً شریک تھے، باقی ان ابطال رجال کے سوا اور کون کون تھے۔ ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتے کہ ان کی کافی تعداد تھی۔ "جتھے کا جتھا" کے الفاظ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جو استعمال کئے ہیں، ان کا اقتضاء بھی یہی ہے، کچھ بھی ہو، مجاہدوں کا یہ فوجی دستہ تھا اور تھا لا ان ہی آلات و اسلحہ کے ساتھ جو ان کے پاس تھے۔ یا باغ شیر علی کی سڑک کی غنیمت کی شکل میں قدرت نے ان تک پہنچا دیا تھا وہ شاملی کی طرف روانہ ہو گئے۔

تھانہ سے جس وقت یہ سریہ یا مجاہدوں کا دستہ شاملی کے ارادہ سے روانہ ہونے لگا، تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وقت اور مقام کے امیر المؤمنین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولنا محمد منیر صاحب جن کے متعلق مولنا منصور انصاری صاحب نزیل دفین کابل کے حوالہ سے عرض کر چکا ہوں کہ اس جہادی تنظیم میں "یاور حربی" کا عہدہ ان کو دیا گیا تھا، ان ہی مولنا محمد منیر سے سنی ہوئی یہ روایت نقل کی جاتی ہے۔ مولوی طیب صاحب کی یادداشت

شاملی کا میدان جہاد اور گنج شہیداں جس میں مجاہدین شاملی مدفون ہیں

ہیں ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے حاجی صاحب نے مجاہدوں کو رخصت کرتے ہوئے وصیت کی تھی۔

"مولانا (یعنی سیدنا الامام الکبیر) بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں، اس لئے آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں" ص

خاص کر مولانا محمد منیر صاحب ہی کو یہ وصیت اسلئے کی گئی تھی کہ بقول مولانا طیب

"شدت محبت سے ان کو بھی بغیر (مولانا نانوتوی) کے قرار نہ آتا تھا"

گویا کام ایسے آدمی کے سپرد کیا گیا جو یہی کرنا بھی چاہتا تھا۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا وصیت کا اقتضاء یہی ہے کہ حرب وضرب کر و فر کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کی افتاد طبع اور فطری رجحان کا تجربہ شاملی کی جنگ سے پہلے ہو چکا تھا، شیر علی کے باغ والی سڑک کی یورش میں سیدنا الامام الکبیر کی ذاتی شرکت کے دلائل میں ہم اسی امدادی وصیت کو بھی ایک دلیل قرار دے سکتے ہیں، آخر سیدنا الامام الکبیر کی ان فطری خصوصیتوں کے مشاہدے کا موقعہ اور کہاں مل سکتا تھا۔

چند میلوں سے زیادہ فاصلہ تحصیل شاملی اور تھانہ بھون میں نہ تھا۔ اب بھی ان دونوں مقاموں کے درمیان چند اسٹیشن پڑتے ہیں۔ مجاہدوں کے "جتھے کا جتھا" بآسانی وہاں پہنچ گیا۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"شاملی کے میدان میں رن پڑا، اور انگریزی فوج سے (مجاہدین کا) مقابلہ ہوا، مقابلہ میں مجاہدین ہی کو غلبہ نصیب ہوا"

اگرچہ یہ ایک اجمالی بیان ہے لیکن اس سے اس کا تو پتہ چلا، کہ جب شاملی تک مجاہدین پہنچ گئے، تو گڑھی میں جو انگریزی فوج کے سپاہی تھے، وہ مقابلہ کرنے کے لئے باہر نکل آئے۔ دونوں میں کافی کشمکش ہوئی۔ اس کشمکش میں کیا کیا صورتیں پیش آئیں۔ اب نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ اور سننے والے بھی ختم ہو چکے ہیں، مولانا منصور انصاری کی زبانی کابل میں مولانا طیب صاحب کو

جو باتیں معلوم ہوئیں۔ ان میں ایک ایمان افروز روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے، جسے مولانا منصور انصاری نے براہ راست مولانا محمد منیر صاحب سے سنا تھا۔ اپنے امیر المؤمنین پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کے مطابق مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کے

"پس پشت بطور محافظ اس طرح رہتا تھا کہ حضرت (نانوتوی) کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ ان کی محافظت اور نگرانی کر رہے ہیں۔"

رن پڑا ہوا تھا، دار و گیر بزن و بکش کا ہنگامہ رستخیز ہر طرف برپا تھا، مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ

"اس ہنگامہ محشر خیز میں حضرت (نانوتوی) میدان جنگ کے ایک کنارے پر دم لینے کے لئے کھڑے تھے کہ (انگریزی فوج) کا ایک سپاہی جو صورتاً سکھ (معلوم ہوتا) تھا، اور ڈیل ڈول میں اتنا طویل و عریض تھا، کہ حضرت (نانوتوی) کے جثہ کے آدمی اس جیسے تن و توش رکھنے والے سے چار بن سکتے تھے، (انگریزی فوج کے اسی سپاہی نے حضرت نانوتوی کو کنارے میدان کے کھڑا پاکر) دور سے تاکا، اور غصہ میں لپک کر اس طرف آیا۔"

اس کے بعد یہ الفاظ روایت میں اس کی طرف جو منسوب کئے گئے یعنی

"حضرت (نانوتوی) کو ڈانٹا، اور کہا کہ تم نے بہت سر ابھارا ہے۔"

جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ حرب و ضرب میں سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی سرباز انہ جد و جہد عظیم کی فوج میں کافی امتیاز حاصل کر چکی تھی، بہر حال مذکورہ بالا الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی فوج کے اسی دیو پیکر عفریت قالب سپاہی نے کہا کہ

"اب آ! میری ضرب کا جواب دے۔"

اسی کے ساتھ تلوار جو اس کے ہاتھ میں تھی اس کو بلند کرتے ہوئے چلایا کہ

"یہ تیغہ تیرے لئے موت کا پیغام ہے"

یہ فقرہ ابھی تمام نہیں ہوا تھا کہ دیکھا گیا

"دودھارا تیغہ پوری قوت سے اٹھا کر حضرت (نانوتوی) پر چلانا ہی چاہتا تھا"

کہ حضرت کی زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوئے، اسی فوجی گرد سے فرما رہے تھے کہ

"باتیں کیا بنا رہا ہے، اپنے پیچھے کی تو خبر لے"

کچھ ایسے لہجہ میں یہ بات اس کے کان میں ڈالی گئی، کہ

"اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا"

اس کا مڑنا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر بجلی کی طرح تڑپے، مڑنے کے بعد آپ کی طرف رخ کرنے کا موقعہ بھی اس کو نہ ملا کہ دیکھنے والوں کے سامنے یہ تماشا پیش تھا، مولانا محمد منیر کا بیان ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"جنیو کا ہاتھ اس کے داہنے کندھے پر مارا۔ وار اتنی قوت سے کیا گیا تھا کہ تلوار دائیں مونڈھے کو کاٹ کر گذرتی ہوئی بائیں پیر پر آ کر رکی"

دیکھا گیا، تو اس سپاہی کا عفریتی جسد اس طرح خاک پر پڑا ہوا تھا، کہ

"سر سے پیر تک دو پارہ ہو کر آدھا ادھر آدھا ادھر گرا ہوا تھا" صدق جیادی بعالہ

ھذا تنیو ھم بإحسان کے قرآنی وصف کی تعبیر، یوں ہی پوری ہوتی ہے، سعادت مندوں کو اسی قسم کی سعادت مندیوں سے نوازا جاتا ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہم شاملی کے میدان جنگ میں نہیں، بلکہ اس تاریخی خندق کے کنارے کھڑے ہیں۔ جہاں عرب کا سورما عمرو بن ود ٹھیک اسی شکل میں دو پارہ ہو کر تڑپ رہا تھا[1]۔ اس کا انجام تو یہ ہوا، اور سیدنا الامام الکبیر جو کچھ

---

[1] سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھنی چاہئے، اور یوں بھی واقعہ مشہور ہے، کہتے ہیں کہ عمرو بن ود سو پہلوانوں کے برابر قریش میں سمجھا جاتا تھا، جو زرہ پہنتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ سارے عرب میں ایسی زرہ کسی کے پاس نہ تھی، سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے باوجود نو عمر ہونے کے عرب کے اس مشہور سورما کو دو پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ زرہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اس کی لاش سے اتار کیوں نہ لی تو فرمانے لگے کہ قتل ہوتے ہوئے (باقی اگلے صفحہ پر)

ماندگی محسوس فرما رہے تھے۔ اس غیر معمولی کامیابی نے چستی اور چالاکی کی نئی قوت آپ میں بھردی لکھا ہے کہ

"اسی بے جان لاشے پر پاؤں رکھتے ہوئے پھر صف قتال میں آ گئے" صلا

نہیں کہا جا سکتا کہ شاملی کے میدان کی یہ جنگ کب تک اور کتنی دیر تک جاری رہی۔

مولنا طاہر صاحب کی یادداشت جس میں اپنے والد حافظ محمد احمد صاحب سے سنی ہوئی روایت اسی سلسلہ میں انہوں نے درج کی ہے، جس کے بعض اجزا کا ذکر متفرق طور پر کر چکا ہوں۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد شیخ اسد علی سے رخصت ہو کر سیدنا الامام الکبیر تھانہ آئے اور تھانہ کے بعد جب میدان جنگ میں (جو ظاہر ہے کہ شاملی ہی کا میدان جنگ ہو سکتا ہے) تشریف لے گئے، تو بیان کیا ہے، کہ تھانہ بھون میں میدان جنگ کی خبروں کے ساتھ ساتھ شہدا کی

"نعشیں بھی آتی رہتی تھیں"

اور تھانہ کے یہ قصے اطراف و جوانب کی آبادیوں میں پھیل جاتے تھے۔ لکھا ہے کہ

(گذشتہ صفحہ سے) اپنی شرمگاہ کو کھول کر میرے سامنے اس کا قرنے کر دیا۔ مجھے شرم آئی اور چھوڑ کر چلا آیا۔ اس مبارزے کے دوسرے اجزا کافی دلچسپ ہیں، خصوصاً حضرت علی اور عمرو کی باہمی گفتگو۔ اس موقعہ پر ایک سوال کے حل کا سامان بھی ملتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور خالد بن ولید انسان ہی جیسے نبرد آزما کشور کشا صحابیوں کی جنگی مہارتوں اور قتالی چابک دستیوں کا ذکر جس وقت کیا جاتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے، کہ جن غیر معمولی کرتبوں سے یہ کام لیتے تھے ان کی تعلیم ان بزرگوں نے کہاں اور کب اور کن لوگوں سے حاصل کی؟ تاریخ قوانً ان کے جواب سے ساکت ہے۔ اسوۃً آدمی یہی سوچ لیتا ہے کہ عرب ایک جنگجو قوم تھی اگرچہ کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم "کی قرآنی خبر سے اس کی بھی تصدیق نہیں ہوتی، لیکن مشہور یہی ہے۔ اسی بنیاد پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ عربوں میں جنگی فنون کے سیکھنے سکھانے کا عام رواج ہوگا۔ مگر سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ واقعہ کو سوچ کر اگر ذہن ادھر منتقل ہو کہ اللہ والوں کے ساتھ غیبی تائید جو ہوتی ہے۔ یہ اسی کے مظاہر و آثار ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ سیدنا الامام الکبیر کی پچھلی زندگی میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ شمشیر زنی، بنوٹ یا بانک وغیرہ چیزیں کبھی آپ نے سیکھی ہوں۔ بندوق تک کے متعلق آپ کا مصنف امام کی شہادت سن چکے کہ غدر کے ایام میں پہلی دفعہ نشانہ بازی کا موقعہ آپ کو ملا تھا ۱۲

"چونکہ تھانہ، نانوتہ سے زیادہ دور نہ تھا"

اس لئے نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ نانوتہ والوں کو میدان جنگ کی سرگذشتوں کے جاننے کا موقع مل رہا تھا، جن کو سن سن کر حضرت نانوتوی کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب جیسا کہ مولوی منا ہر صاحب نے لکھا ہے۔

"بہت روتے تھے اور فرماتے تھے کہو بھائی! میرا بیٹا کہاں ہے، میرا بیٹا کہاں ہے"

بہرحال اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شاملی کے میدان کی جہادی کشمکش ایک دو دن میں ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن پھر بھی وقت کی صحیح تعیین کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔ اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ فاش ہزیمت کے بعد انگریزی فوج کے آدمی شاملی کی گڑھی میں قلعہ بند ہو گئے، اور مجاہدوں نے گڑھی کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔

شاملی کی گڑھی کا محاصرہ اور تھانہ بھون کی جہادی تحریک کا خاتمہ

انگریزی فوج شاملی کی جس گڑھی میں پناہ گزیں ہو گئی تھی، اس کے صحیح محل وقوع کا اندازہ تو دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے، جس سے افسوس ہے کہ لکھنے والا محروم ہے، جی تو یہی چاہتا ہے کہ کاش! خود اپنی آنکھوں سے اس گڑھی اور اس کے ماحول کا مشاہدہ کر کے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، اسے لکھوں لیکن موجودہ حالات میں میرے لئے یہ آسان نہیں ہے، تاہم پھر بھی میری آرزو اب بھی یہی ہے کہ یہ گڑھی اگر اب بھی موجود ہو۔ تو اس کا فوٹو لے لیا جائے، اور اس کتاب کے ضمیموں میں اس فوٹو کو بھی شریک کر دیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر کی سیرت طیبہ سے اس گڑھی کا خاص تاریخی تعلق ہے۔ گڑھی کے چاروں طرف جو میدان تھا، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس حال میں اب بھی ہوگا لیکن کہنے والوں سے معلوم ہوا کہ اس میں رد و بدل نہیں ہوا ہے۔ یا کم ہوا ہے۔ تو فوٹو لینے والے کو چاہئے کہ کسی ایسے نقطے سے فوٹو لے جس میں کچھ نہ کچھ میدان کا حصہ بھی آ جائے۔

بہرحال کتابوں میں جو کچھ مل سکا ہے، اس کی مدد سے نیز براہ راست اس خاکسار نے سیدنا

الامام الکبیر کے فرزند سعید مولٰنا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حیدر آباد میں جو روایت اس سلسلہ میں سنی ہے' اس کو بھی پیش نظر رکھ کر تھانہ بھون کی جہادی تحریک کے اس دردناک خاتمہ کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔

حافظ صاحب مرحوم نے جن دنوں آپ سلطنت آصفیہ کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے رکن بحیثیت مفتی ہونے کے تھے۔ اسی زمانہ میں نواب عبد الباقر مرحوم کی کوٹھی حسینی علم میں ایک خانگی مجلس جس میں فقیر بھی شریک تھا' یہ بیان فرمایا تھا کہ شاملی کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی روپوش ہوئے تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی کہ گڑھی کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی' جسے گڑھی سے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں' الا یہ کہ ایک مختصر سی مسجد اسی سمت میں تھی' جس طرف گڑھی کا پھاٹک تھا۔ محصوروں نے گڑھی کے پھاٹک کو بند کر دیا تھا' اور "جتھے کا جتھا" تھانہ بھون کے مجاہدوں کا جو گڑھی کے باہر والے بے پناہ میدان میں ٹڈیوں کی طرح پھیلا ہوا تھا' ان پر بندوقوں سے گڑھی والے انگریزی فوج کے بند و نچی دیوار کی آڑ لے کر مسلسل فائر پر فائر کرتے چلے جاتے تھے۔ تابڑ توڑ گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ دیوار کے پیچھے محفوظ تھے۔ لیکن اس مختصر سی مسجد کے سوا جو میدان میں تھی غریب مجاہدوں کو گولیوں سے بچانے والی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

اسی کا نتیجہ تھا' جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ

"انگریزی فوج تحصیل شاملی میں قلعہ بند ہو گئی' اور ادھر سے مجاہدوں پر بندوقوں کی باڑھ ماری شروع کی' جس سے سینکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے۔"

یہ وقت بڑا افراتفری کا تھا' زحف (گھمسان والی جنگ) کی صورت باقی نہ رہی تھی' اس لئے بظاہر قرآنی حکم فلا تولوھم الادبار (پس نہ پھیرو تم پیٹھوں کو) کا مکلف بھی مجاہدین کا یہ سراسیمہ گروہ باقی نہ رہا تھا' لیکن پھر بھی میدان سے پیٹھ پھیر کر ایسا معلوم ہوتا ہے بھاگنے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ گولیاں ان کے جسم میں اترتی چلی جاتی تھیں۔ روحیں پرواز کر رہی تھیں' لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں' کسی نے

راہ گریز اختیار نہ کی، مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

"اس وقت پریشانی یہ تھی کہ انگریزی فوج قلعہ بند اور محفوظ تھی، اور مجاہدین ان کے سامنے کھلے میدان میں تھے، ان کا (یعنی انگریز فوج کی بندوقچیوں کا حملہ کارگر اور کامیاب ہوتا تھا، اور مجاہدین کے حملے غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے تھے۔"

ظاہر ہے کہ مجاہدین زیادہ سے زیادہ بندوقوں کا جواب بندوقوں سے دے سکتے تھے لیکن جو دیوار کی آڑ میں چھپے اور دبکے ہوئے تھے۔ ان پر دیوار کے باہر والوں کی بندوقوں کی گولیوں کا اثر ہی کیا مرتب ہو سکتا تھا، مولانا کا بیان ہے کہ

"اس طرح (یعنی یک طرفہ مار کی وجہ سے) مجاہدین کا کافی جانی نقصان ہوا"

تھانہ بھون میں لاشوں کے مسلسل پہنچنے کے جس قصہ کا ذکر گذر چکا ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر یہ صورت حال محاصرہ کے بعد ہی پیش آئی۔

بس لے دے کر وہی ایک مسجد تھی۔ گھوم پھر کر اسی مسجد میں مجاہدین دم لینے کے لئے آجاتے، لیکن اس مسجد کی پناہ سے نکلنے کے ساتھ ہی ان پر گولیاں برسنے لگتیں۔ تدبیریں سوچی جاتی تھیں لیکن کوئی تدبیر اس وقت مفید اور کار آمد نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت اپنے ہوش و حواس کے توازن کو قائم کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے ایک غیر معمولی جرأت آزما اقدام کا عزم بالجزم فرمالیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ مسجد اسی سمت میں واقع تھی، جس طرف گڑھی کا دروازہ تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

"اسی دروازہ کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی، جو غالباً محافظ سپاہیوں کے سایہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی،"

مسجد سے سیدنا الامام الکبیر کی نظر مبارک دروازے کے اس چھپر پر پڑی، اور اچانک ایک "حربی مکیدہ" یا "جنگی چال" کا گویا آپ کو الہام ہوا، سمجھ میں یہ آیا، کہ اس چھپریا تک پہنچنے کی صورت اگر کوئی نکل آئے، تو اس کو اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں پر رکھ دیا جائے۔ اور چھپریا میں آگ لگادی جائے جس سے

کواڑ بھی جل جائیں گے اور تحصیل کی گڑھی میں گھسنے کا موقعہ مجاہدین کے لئے بآسانی نکل آئے گا۔
لیکن ظاہر ہے کہ مسجد سے چھپر یا تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ بندوقیں چھتیائے انگریزی فوج کے سپاہی گڑھی کی دیواروں پر اور ان کی آڑ میں پوری نگرانی کر رہے تھے کہ گڑھی کے دروازے تک کوئی پہنچنے نہ پائے، نظر پڑتے ہی اس پر گولیاں برسانے لگتے تھے۔ چھپر یا تک پہنچنا، اس کو اکھاڑنا، اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں سے اس کا اتصال پیدا کر کے آگ لگانا، اتنا لمبا کام نہ تھا کہ بمشکل ہی اس کا موقعہ برستی ہوئی گولیوں کے درمیان نکالا جا سکتا تھا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اولوالعزموں کے عزم اور ارادے کا مظاہرہ ان ہی نازک مواقع پر ہوا کرتا ہے، تجویز بھی سیدنا الامام الکبیر کے دماغ میں آئی، اور تجویز پر عمل کرنے کا عزم بھی خدا نے آپ ہی کے نورانی قلب میں پیدا کیا۔ اس سلسلہ میں روایتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر اپنی اس "آتشیں تجویز" پر عمل کرنے کے لئے تنہا آمادہ ہو گئے۔ کسی رفیق کو بھی رفاقت کی تکلیف نہ دی، اور دیکھا گیا کہ کوندتی ہوئی بجلی کی طرح آپ گولیوں کی اسی بارش کے درمیان نکلتے ہوئے چھپر یا تک پہنچ گئے، اور حسب روایت مولنا طیب صاحب

"حضرت (نانوتوی) نے پھرتی سے بڑھ کر اس چھپر یا کو اپنی جگہ سے جلد جلد اکھاڑا اور اکھاڑ کر اسے تحصیل کے دروازے سے لا ملایا، اور اس میں آگ دے دی۔"

خدا ہی جانتا ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ سے نکلنے میں اور چھپر یا تک صحیح و سالم پہنچنے میں وہ کیسے کامیاب ہوئے۔ مگر دیکھا یہی گیا کہ چھپر یا میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد بقول مولنا طیب صاحب۔

"آگ کا لگنا تھا، کہ گڑھی کے پھاٹک کے کواڑ بھی جل اٹھے۔"

صورت حال کچھ ایسی پیش آئی، کہ ان جلتے ہوئے کواڑوں کی آگ بجھانے کی ہمت گڑھی کے محصور فوجیوں کو نہ ہوئی۔ بجائے لکڑی کے صرف کوئلہ اور راکھ کے کواڑ بن کر وہ رہ گئے، مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے، کہ یوں گڑھی کا

"بند دروازہ مجاہدین کے لئے وا ہو گیا، اور یلغار کرتے ہوئے تحصیل کے اندر مجاہدین جا گھسے۔"

اس وقت چارۂ کار ہی محصوروں کے لئے اس کے سوا اور کیا تھا کہ نیام سے تلواروں اور کرچوں کو نکال نکال کر مجاہدین کے سامنے آجائیں۔ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ مجاہدین اور

"قلعہ بند فوج سے دست بدست جنگ ہونے لگی۔"

گڑھی کے اندر تو یہ دست بدست جنگ ہو رہی تھی، مجاہدوں کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا کرایہ کے سپاہی ان کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسا کہ مولنا طیب صاحب نے لکھا بھی ہے کہ

"پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہوگئی، تحصیل شاملی پر مجاہدوں کا قبضہ ہوگیا۔"

لیکن پردہ غیب کی لاہوتی مصلحتوں کا تقاضا کچھ اور تھا، اس موقعہ پر روایات میں کچھ اتنا اجمال ہے کہ واقعہ کے بعض اجزاء کی ترتیب میں الجھن سی پیدا ہوگئی ہے۔ تاہم جو معلومات مجھ تک پہنچی ہیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے جو نقشہ میرے دماغ میں قائم ہوگیا ہے اسے پیش کر دیتا ہوں۔

مجاہدوں کا جو دستہ تحصیل شاملی پر حملہ کرنے کے لئے تھانہ بھون سے روانہ کیا گیا تھا، اس دستہ کے امیر الجیش جیسا کہ مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن چاریاروں کی شرکت شاملی کے اس وقت دھاوے میں قطعی طور پر ثابت ہے۔ عرض کر چکا ہوں، ان میں ایک یہ حافظ صاحب بھی ہیں، دیوبندی حلقہ کے واقف کاروں کیلئے تو کسی تعارف کی محتاج حضرت حافظ شہید کی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن جو نہیں جانتے ہیں ان کی رعایت بھی کرنی ہی چاہئے، حضرت حافظ شہید کا خاندانی تعلق تھانہ بھون کے فاروقی شیخ زادوں کے خانوادے سے تھا، ارواح ثلاثہ میں ان ہی کے متعلق جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ

"حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سپاہی منش تھے۔" ص ۱۵۵

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابتدائی زندگی سے آپ کو مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی سے مناسبت تھی، اور گو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی بیعت سے سرفراز ہو کر طریقہ صابریہ چشتیہ کے سیر و سلوک کی تکمیل میں کامیاب ہوئے، اور اس درجہ پر پہنچے کہ بقول مولانا طیب صاحب

"بوقت وفات حضرت میاں جی نور محمد صاحب نے حافظ صاحب کو وصیت فرمائی کہ دیکھنا اپنے چھوٹے بھائی امداد اللہ کا خیال رکھنا۔"

بہرحال آپ وقت کے خدا رسیدہ اور برگزیدہ لوگوں میں تھے۔ لیکن فطری طور پر حد سے زیادہ وارستہ مزاج تھے، لیکن مزاج کی وارستگی اور شگفتہ دلی کا حال یہ تھا کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد مرتے دم تک بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی یہ شگفتگی ان کی باقی رہی[1]، بڑے دلچسپ لطائف ان کی طرف منسوب ہیں، امیر شاہ خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ تھانہ بھون کی وہی مسجد جسے آخر میں حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام نے ہندوستان کا ایک مرکزی مقام بنا دیا تھا، اسی مسجد میں ایک وقت وہ بھی گذرا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شیخ محمد تھانوی، حافظ محمد ضامن شہید، ان تینوں بزرگوں کی بیٹھک قریب قریب ہی رہتی تھی۔ حضرت حاجی صاحب اسی مسجد کی متعلقہ سہ دری میں بیٹھتے تھے، اور مولانا شیخ محمد صاحب کی نشست بھی وہیں قریب تھی اور حافظ صاحب مسجد کے قریب پلکھن تلے بیٹھا کرتے تھے۔ آنے والے جب آتے تو لکھا ہے کہ حافظ صاحب اس کو مخاطب کر کے فرماتے کہ

"بھائی کوئی مسئلہ پوچھنا ہو، تو وہ (مولانا شیخ محمد تھانوی) بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لے، مرید ہونا ہے تو وہ (حاجی امداد اللہ) بیٹھے ہیں، ان سے مرید ہو جا، اور اگر حقہ پینا ہو، تو یاروں کے پاس بیٹھ جا۔" ص۱۵۶

قصص الاکابر، ارواح ثلاثہ وغیرہ میں حافظ صاحب شہید کے تفصیلی حالات پڑھئے، اس اجمالی

---

[1] ارواح ثلاثہ میں اس لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک صاحب کشف بزرگ حافظ ضامن شہید کے مزار پر جاتے بغیر کو کسی کی قبر ہے فاتحہ پڑھنے گئے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں سے پوچھنے لگے کہ بھائی یہ کون بزرگ ہیں بڑی دل لگی کی بات کی، میں جب فاتحہ پڑھنے لگا تو کہنے لگے جاؤ، فاتحہ کسی مردہ پر پڑھیو یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ ص۱۵۶ لوگوں نے یہ اطلاع دی کہ شہید ہیں۔ تب اس لطیفہ کا مطلب ان کی سمجھ میں آیا۔

تھانہ بھون میں ملکھن کا درخت جس کے نیچے حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ امام جہاد شاملی کی نشست رہتی تھی

تعارف کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاملی کی گڑھی کے کواڑ کو کوئلہ اور راکھ بنا کر گرادیا گیا' اور مجاہدین کو گڑھی میں گھس کر انگریزی فوج کے سپاہیوں سے دست بدست جنگ کرنے کا موقعہ ملا' تو جیسا کہ چاہئے تھا کہ ایسا ایجلیش ہونے کی حیثیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شہید کو اندر داخل ہونے والے مجاہدین اور جو باہر تھے' دونوں ہی کی نگرانی کی وجہ سے اندر سے کبھی باہر' اور باہر سے کبھی اندر مسلسل آمد و رفت جاری رکھنے پر مجبور ہونا پڑا' بیان کیا جاتا ہے' کہ آمد و شد کے اسی سلسلہ میں حافظ صاحب گڑھی کے باہر کھلے میدان میں گڑھی کی طرف رخ کئے کھڑے تھے۔ اب واللہ اعلم جان کر مجاہدین کا فوجی افسر یہی ہے یا بے جانے انگریزی فوج کے کسی سپاہی نے گڑھی کی فصیل کہئے یا دیوار پر سے تاک کر ایک ایسی گولی چلائی کہ بقول مولنا طیب صاحب

"گولی ناف پر پڑی"

مولنا عاشق الٰہی کی روایت میں ہے کہ "گولی زیر ناف" لگی تھی' بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سینے پر نشانہ لگایا گیا تھا۔ ٹھیک نشانہ پر تو گولی نہ بیٹھی۔ اور ناف یا زیر ناف پہنچکر حافظ شہید کے شکم مبارک میں اتر گئی۔ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ گولی لگنے کے ساتھ ہی (تذکرہ ص ۱۷)

"حضرت (حافظ شہید) اکدم اچھل کر زمین پر گرپڑے"

اتنا ہوش اس وقت بھی باقی تھا کہ گرتے ہوئے اس حد تک سنبھال لیا کہ دیکھنے والوں نے دیکھا' (جیسا کہ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ)

"بہ ہیئت تشہد زمین پر بیٹھے ہیں"

یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ اس وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ قبلہ رخ ہیں' جیسے کسی نے نماز کے قعدہ میں آپ کو بٹھا دیا ہے" صک جہادی مقالہ

آس پاس جو لوگ کھڑے تھے دوڑ پڑے۔ بیان کیا جاتا ہے' کہ اس وقت بھی اس زخم خوردہ بندۂ حق کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہی تھا کہ

"مجھے مسجد لے چلو' مسجد لے چلو"

نماز کے قعدہ کی ہیئت میں بیٹھے ہیں، اور آرزو صرف اس کی ہے کہ مسجد (سجدہ کی جگہ) تک پہنچا دو شاعر نے صرف شعر کہا تھا کہ

سر بوقت ذبح میرا ان کے زیر پائے ہے

لیکن کر کے دکھانے والا اسی کو آج کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے دل کی آخری تمنا صرف یہی ہے مولنا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ "حافظ شہید" نے حضرت مولانا گنگوہی کو شاملی کے جہاد کے موقعہ پر باصرار یہ وصیت کی تھی کہ

"میاں رشید میرا دم نکلے تو تم میرے پاس ضرور ہونا"

واللہ اعلم مولنا گنگوہی بھی ان لوگوں میں شریک تھے۔ جو حافظ شہید کے گولی کھانے کے بعد ان کی طرف دوڑ پڑے، یا امیر الجیش کے زخمی ہونے کی خبر آگ کی طرح مجاہدوں میں دوڑ گئی جب پھیلی اس وقت آپ مطلع ہوئے، کچھ بھی ہوا ہو، مگر جیسا کہ مولنا عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے "مسجد لے چلو، مسجد لے چلو" کے حکم کی تعمیل کا موقعہ سب سے پہلے مولنا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا، تذکرۃ الرشید میں ان کے الفاظ ہیں کہ

"حافظ صاحب کا زخم سے چور چور گرتا تھا، اور امام ربانی (حضرت گنگوہی) کا لپک کر تڑپتی نعش کو کاندھے پر اٹھانا، قریب کی مسجد میں لائے، اور حضرت (حافظ شہید) کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت (قرآن) میں (مولنا گنگوہی) مصروف ہو گئے" ۵۵

آگے ان ہی مولوی عاشق الٰہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ "دیکھنے والوں سے سنا ہے" آئندہ کی سرگذشت کو ان الفاظ میں جو درج کیا ہے کہ

"حضرت مولنا (گنگوہی) کی اس مردانگی پر تعجب تھا کہ کس اطمینان کے ساتھ سنسان مسجد میں تنہا بیٹھے ہوئے اپنے نور دیدہ چچا (پیر) کے سفر آخرت کا سامان دیکھ رہے ہیں اور اپنے عاشق اور محبوب کے نزع کا آخری وقت نظارہ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر کلام اللہ۔ یہاں تک کہ حافظ (شہید) رحمۃ اللہ علیہ کا آپ (یعنی مولنا گنگوہی) کے

زانو پہ سر رکھے رکھے وصال ہو گیا[۱] ۔

اس بیان میں "تنہا بیٹھے ہوئے" کے الفاظ کچھ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ امیر الجیش کا زخمی ہونا، یقیناً ایسا واقعہ نہیں ہو سکتا، جو آس پاس کے مجاہدوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہ کراتا، خود مولانا عاشق الٰہی صاحب کا یہ فرمانا کہ "دیکھنے والوں سے سنا ہے"۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے دیکھنے والے ایک سے یقیناً زیادہ افراد تھے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے دیکھنے والے مسلمان مجاہد تھے جن کا امیر زخموں سے چور ہے، خون میں شرابور ہے، لیکن وہ صرف دیکھتے رہے۔ اور اس کی توفیق کسی کو نہ ہوئی کہ جب حافظ شہید کے خستہ و نزار جسد مبارک کو حضرت گنگوہی اپنے کندھے پر اٹھا کر مسجد لے جا رہے تھے۔ ان کا ساتھ دیتے۔ حافظ شہید تو حافظ شہید ہی تھے جیش کے امیر بھی تھے۔ ایسے موقعہ پر عام انسانی فطرت ہے کہ لوگ دوڑ پڑتے ہیں۔ دیکھنے والوں کی یہ غیر فطری سنگدلی میری سمجھ میں نہیں آتی، اسی لئے میرا خیال ہے کہ مولانا عاشق الٰہی مرحوم سے بظاہر واقعہ کی تعبیر میں کچھ مسامحت ہوئی ہے، اور حافظ شہید جب مسجد میں لائے گئے ہیں۔ اس وقت کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت گنگوہی تنہا مسجد پہنچے ہوں۔ لیکن واقعہ کے ان "دیکھنے والوں" میں مسجد تک پہنچنے والے کون کون لوگ تھے، ان ناموں کی تفصیل کا تو مجھے علم نہ ہو سکا، تاہم اور کوئی جو یا نہ ہو یہ ماننا بہت دشوار ہے کہ امیر الجیش کے زخمی ہو کر گر پڑنے کی خبر جب مجاہدین میں پھیلی، تو اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر کے گوش مبارک تک نہ پہنچی، یا پہنچی، لیکن دوسرے دیکھنے والے تو خبر سننے کے ساتھ دیکھنے کے لئے دوڑ پڑے لیکن ٹھیک اسی ساعت فرخ وقت سعید میں جس میں واقعہ یہ ہے کہ جیش کے امیر کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو رہی تھی گویا ع

کہ یارے برخورد از وصل یارے

---

[۱] حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خود فقیر نے بھی سنا ہے اور قصص الاکابر میں بھی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی یہ روایت منسوب کی گئی ہے یعنی اپنے سیر و سلوک کی آخری (باقی اگلے صفحہ پر)

کا جان نواز، روح پرور تعددی نظارہ پیش ہو رہا تھا، عین اسی مبارک گھڑی میں حضرت گنگوہی کے رفیق الدنیا والآخرۃ سیدنا الامام الکبیر نے رفاقت سے بلا وجہ اعراض کیا۔ اور زندہ ہونے کے لئے جو مر رہا تھا، اسکے بالین شہادت پر حاضر نہ ہو سکے، یا للعجب

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

خیر اس قصے کو چھوڑیئے، مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو

"گولی کاری لگی، اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا" صلى تذکرۃ الرشید ج ا

فوارہ کی شکل میں خون جس کے اندر سے ابل رہا ہو۔ اس کا جو انجام ہو سکتا تھا، اسی مسجد میں وہ انجام پیش آیا۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ

"حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے (حضرت گنگوہی) کے زانو پر سر رکھے رکھے وصال ہو گیا" صلى

(گزشتہ صفحہ سے) منزلوں میں حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جس کی تعبیر خود وہی "تمنائے موت" سے کیا کرتے تھے۔ خود اس کی شرح ان الفاظ میں فرماتے کہ موت کی تمنا اس قدر غالب ہے کہ خوف ہے کہ میں خودکشی نہ کر لوں، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ "شوق شہادت کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے تھے کہ میرے قریب کوئی ہتھیار یا چھری چاقو نہ رہے۔ کہیں اپنی مغلوب الحالی میں خودکشی نہ کر لوں" صلى حافظ محمد احمد صاحب فرماتے تھے کہ رات کو جس حجرے میں ہمیشہ سوتے اور ذکر و فکر تہجد وغیرہ پڑھتے تھے۔ اس حجرے میں ممانعت تھی کہ کوئی آلہ جارحہ نہ رہ جائے۔ اندیشہ اسی کا تھا کہ غلبہ حال میں خدا جانے کیا کر بیٹھیں۔ حضرت حکیم الامت یہ بھی فرماتے تھے کہ اس حال پر "ولایت کی بشارت بھی حافظ شہید کو ملی تھی، جب انہوں نے خود اس حال کو خلاف سنت ٹھہراتے ہوئے خوف کا اظہار کیا تھا، سمجھایا گیا تھا کہ موت کی تمنا مصیبت اور تکلیف کے موقعہ پر ممنوع ہے۔ لیکن لقاء اللہ کی آرزو میں موت کی تمنا ولایت کی دلیل ہے، یہی اقتضاء النص ہے قرآنی آیت ان زعمتم انکم اولیاء للّٰہ من دون الناس فتمنوا الموت کا۔ خاکسار نے بھی حیدرآباد کے غیر مشہور بزرگ مولانا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا جن پر اسی "تمنائے موت" کی حالت طاری تھی۔ فرماتے تھے کہ خودکشی کے جواز کی کوئی شکل نکل آتی تو اپنا خاتمہ کر دیتا، اس فقرے کو اتنے جوش و خروش، انشاط و سرور سے معمور ہو کر ادا فرماتے، کہ تھوڑی دیر کے لئے سننے والوں میں بھی موت کی تمنائے مسرت افزا پیدا ہو جاتی تھی" ۱۲

یہ عجیب بات ہے کہ حافظ شہید کی شہادت کے بعد اسلامی دستور کے مطابق جیسا کہ چاہیے تھا کسی دوسرے امیر کا انتخاب مجاہدین کے جتھے سے کر لیا جاتا، خصوصاً جب مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے نقل بھی کر چکا ہوں کہ تحصیل کے کواڑ کو جلا دینے کے بعد مجاہدوں کو گڑھی کے اندر گھس کر دست بدست جنگ کا مغتنم موقعہ بھی میسر آ گیا تھا، اور بقول ان ہی کے اس دست بدست جنگ میں

"پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہوئی، تحصیل شمالی پر مجاہدوں کا قبضہ ہو گیا" ص

گو بظاہر صرف ایک آدمی خواہ وہ امیر الجیش ہی کیوں نہ ہو، اس کی شہادت کی وجہ سے اس جیتی ہوئی جنگ کے میدان کو چھوڑ کر مجاہدوں کے پراگندہ، یا تتر بتر ہونے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔

لیکن بیان کرنے والے جو کچھ بیان کرتے ہیں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے ساتھ ہی مجاہدوں کی ہمت یک چھوٹ گئی، ان میں فشل[1] اور بددلی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ "فوجی اَزَل" کے زوال سے اس زمانہ میں فوجیوں کی جس نفسیاتی کیفیت کی تعبیر کی جاتی تھی، گویا سمجھنا چاہئے کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی طاری ہو گیا۔ عموماً فوج کے کسی غیر معمولی افسر کے کام آ جانے کے بعد ہی یہ صورت پیش آتی ہے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ حافظ شہید کے وجود باجود کا مجاہدوں کے حوصلوں اور دلولوں سے بھی شاید کچھ اسی قسم کا تعلق تھا۔ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں جو یہ خبر دی ہے کہ

"اس خبر یعنی حافظ شہید کی شہادت کی خبر نے مجاہدوں کی کمر توڑ دی، اور وہ امید جو مجاہدوں کی مشعل راہ تھی ٹوٹ گئی جس سے قلوب میں سرد مہری کی کیفیات پیدا ہو گئیں" ص

ایسے موقعہ پر اپنے آدمیوں کو پراگندگی اور انتشار سے بچاتے ہوئے باہر نکال لینا ہی سب سے بڑا فوجی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حافظ شہید کے بعد مجاہدین کے اس جتھے کی ذمہ دار ہستیوں کے

---

[1] فشل کا یہ لفظ قرآن سے ماخوذ ہے، سورۃ الانفال میں یہ فرماتے ہوئے کہ جب مسلمانوں کی مٹ بھیڑ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے سامنے سب سے بڑا اہم سوال یہی ہوگا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، اس نازک موقعہ پر نزاکت کا صحیح اندازہ کیا گیا، جس طرح بھی ممکن ہوا شکستہ خاطر فاتح مجاہدوں کو کامیابی کے ساتھ باہر نکال لینے میں وہ کامیاب ہوئے۔ مولوی عاشق الٰہی نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ حافظ شہید کی آخری سانس جب ان کے زانو پر پوری ہوئی، تو لہو سے لت پت، خون سے شرابور جسد مبارک کو اپنے زانو سے ہٹا کر انہوں نے لکھا ہے کہ

"باطمینان اٹھ کھڑے ہوئے" ص۵۲

"اطمینان" کی کیفیت کا ایسے مواقع میں دلوں کے اندر باقی رہ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بہرحال کہنے والے اب خواہ کچھ ہی کہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ تحصیل شاملی کا یہ واقعہ جو اپنے قالب کے لحاظ سے مختصر اور معمولی معلوم ہوتا ہو۔ لیکن ہاتھی کی سونڈ کو جس نے نہیں دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ مچھر کے سونڈ کو دیکھ کر اس کا خیال جا سکتا ہے۔ ملاقات کے کمروں کی میز پر تاج محل کی عمارت کے نمونے آج کل جو رکھے جاتے ہیں۔ یقیناً وہ تاج محل تو نہیں ہوتے۔ لیکن نمائندگی تو تاج محل ہی کے روضہ کی کرتے ہیں، بہرحال دل میں جو بات ہے اسے کھل ہی کر کیوں نہ کہہ دوں۔ خواہ اسے میرا ذاتی مالیخولیا ہی کیوں نہ ٹھہرایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے جس مقدس دور کی نگینیوں میں جذب و فنا ہونے ہی کو جن لوگوں نے اپنی ہستی کا آخری نصب العین قرار دیا تھا، ان کو شاملی کے اس چھوٹے سے سریۃ میں اس عہد پاک کے اہم معرکوں کا خواہ کسی پیمانے پر سہی مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید مشاہدہ اور تجربہ کرایا گیا تھا، ذرا سوچئے گڈھی سے باہر والے میدان میں انگریزی فوج کے باضابطہ تعلیم یافتہ فوجیوں کے مقابلہ میں جو اس زمانہ کے جدید افرنگی اسلحہ سے لیس تھے، ان ہی کے مقابلہ میں جو کامیابی اور فتح کی مسرت ہوئی اگر بدر کے

(گذشتہ صفحہ سے) کسی جتھے سے ہو، تو ثبات و استقلال کے ساتھ ذکر اللہ میں مشغول ہیں۔ اسی کے بعد اطاعت اور ہم آہنگی کو کامیابی اور فتح کی کلید قرار دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ واطیعوا اللّٰہ والرسول ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم (اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ آپس میں جھگڑو مت، ورنہ بد دل ہو جاؤ گے اور ہوا تمہاری اکھڑ جائے گی۔)

تاریخی معرکہ کی تصویر اس میں جھلکتی ہو' اور قلعہ بند ہونے کے بعد احد کا نقشہ ان لوگوں کے سامنے پیش ہو گیا' جو کھلے میدان میں قلعہ بند سپاہیوں کی بندوقوں کی گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے۔ پھر گڑھی کا پھاٹک جب توڑا اور اکھاڑا گیا' اس وقت "خیبر" کے قلعہ کا دروازہ اکھاڑنے والوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ یا دیو پیکر انگریزی فوج کا سپاہی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' جب دو پارہ ہو کر گرا' تو دماغوں میں عرب کے اس سورما کا خیال اگر گھوم جائے جو کچھ اسی طرح دو ٹکڑے ہو کر خندق کے کنارے تڑپ رہا تھا۔ اب خواہ اسے خوش اعتقادی ہی کیوں نہ قرار دیا جائے لیکن جس رنگ میں واقعات پیش آئے۔ قدرتاً ذہنی انتقال ان ہی سے مدد مل رہی ہے۔ اپنے اس اضطراری احساس کا کیا کروں' آخری انجام مجاہدوں کی جد و جہد کا شاملی کے میدان میں جو ہوا۔ بظاہر ہزیمت شکست کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن عہد سعادت میں موتہ کے میدان میں جو واقعہ پیش آیا' یعنی یکے بعد دیگرے اسلامی لشکر کے افراد شہید ہوتے چلے جا رہے تھے' پہلے حضرت زید' پھر جعفر طیار' پھر عبد اللہ بن رواحہ شہید ہوئے۔ آخر میں خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھنڈا اٹھایا' مگر بایں ہمہ میدان جنگ کے چھوڑنے پر مسلمانوں کو مجبور ہونا پڑا تھا' گر باوجود پسپائی کے چونکہ ابتری و پراگندگی سے بچاتے ہوئے دشمنوں کے نرغہ سے ان مسلمانوں کو حضرت خالد باہر نکال لینے میں کامیاب ہو گئے تھے' ان کی اسی کامیابی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ففتح لہ (بخاری) | پس فتح خالد بن ولید کی ہوئی

جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی کبھی پسپائی بھی بجائے ہزیمت اور شکست کے "فتح و ظفر" قرار پانے کی مستحق ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے اسی نمونہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاملی کے میدان سے تھانہ بھون کے مجاہدوں کی واپسی میں جنگ موتہ کی پسپائی کی جھلک محسوس ہو' تو آخر اس احساس کو قطعاً بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

آخر خود سوچئے' مجاہدین کی امنگیں مردہ ہو چکی ہیں' ولولے پست ہو چکے ہیں' غنیم کی فوج

انتقامی جذبات میں بھری ہوئی۔ ان کے پیچھے ہے لیکن اس قیامت خیز وقت میں جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ شہید کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر

"یکے بعد دیگرے تھانہ میں سمت مغرب، زمین کی گود کے حوالہ کیا" ص۲۷

جس کا مطلب یہی ہوا کہ مجاہدین کی یہ واپسی اس شان میں ہو رہی تھی کہ اپنے شہید امیر الجیش کے جسد مبارک کو چارپائی پر ڈالے، تعاقب کرنے والے دشمنوں سے مقابلہ، مقاتلہ کرتے لڑتے بھڑتے تھانہ بھون تک پہنچ گئے، ایسی صورت میں مجاہدوں کی اس پسپائی کو بھی اگر فتح قرار دیا جائے، تو واقعہ جس رنگ میں پیش آیا ہے شاید اس کے لحاظ سے یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔

جو روایت حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی خاکسار تک پہنچی ہے، اسی میں یاد آتا ہے، کہ اسی واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے حافظ صاحب نے فرمایا تھا کہ جس وقت مجاہدین حافظ صاحب کے جنازے کو لے کر تھانہ کے قریب پہنچے، خبر ان کی شہادت کی تھانہ پہلے ہی سے آچکی تھی، ہر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، قصبہ سے باہر نکل کر جنازے کے استقبال کے لئے باچشم گریاں، وقلب بریاں حاجی امداد اللہ دوسروں کے ساتھ انتظار میں کھڑے تھے۔ عاشق کا جو جنازہ مجاہدین کے کندھوں پر دھوم سے چلا آرہا تھا، جوں ہی کہ حاجی صاحب کی نظر پڑی، بے ساختہ چیخ نکل گئی، اور اسی حال میں یہ فقرہ ان کی زبان پر جاری ہوا۔

"جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا، وہ بات پوری ہوگئی، دیکھنا قصہ بھی ختم ہوگیا"

صحیح الفاظ یاد نہیں رہے، بطور روایت بالمعنی کہہ سکتا ہوں کہ حاصل یہی تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں اسی موقعہ پر یہ فقرے جو پائے جاتے ہیں، یعنی مجاہدین کی اس آخری پسپائی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"پابندان اسباب و وسائل نے تو شکست پر محمول کیا۔ اور عارفین اور ارباب باطن نے اپنے غیبی ادراک سے بتایا کہ اس جہاد کا آخری نقطہ حافظ صاحب شہید کی شہادت تھی، تکمیل مقصد کے بعد مبادی کی گرم بازاری ختم ہوجاتی ہے، اس لئے حضرت شہید کی شہادت پر یہ سارا

ہنگامۂ رست و خیز ختم ہو گیا۔ مث

میری روایت کے اجمال کی گویا یہ تفصیل ہے۔

گویا تکوینی طور پر جہاد کے اختتام کا آخری نقطہ حضرت شہید کی شہادت تھی۔ جیسا کہ تشریعی اور اجتہادی طور پر اس جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔ وہ رہا اور اختتام جہاد پر بھی اس مقصد میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ امن و سکون اور انقلاب کے بعد بھی اعلائی جذبات دوسرے رنگ میں نمایاں ہوتے رہے۔

بہر حال حافظ صاحب مرحوم سے فقیر نے جو کچھ سنا اور مولانا طیب صاحب نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے مآل سب کا یہی ہے کہ عالم تدبیر[1] میں واقعہ خواہ جس رنگ اور اسباب و علل کے جن پردوں سے بھی گذر کر رونما ہوا ہو، لیکن عالم تقدیر کے جو محرم اسرار تھے ان پر کھولا گیا تھا کہ تمنائی موت کا جذبہ جس میں ابھارا گیا تھا، اسی کی تمنا نے تھانہ بھون کے اس طوفان کو پیدا کیا تھا۔ تمنا کرنے والے کی تمنا جب پوری ہو گئی تو طوفان بھی تھم گیا۔ یہی راز تھا جس کا افشا روفیدِ حزن و غم میں ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اسباب و علل کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہماری عقول کے لئے شاید اس قسم کی غیبی اطلاعیں چنداں قابل لحاظ نہ ہوں، مگر اسی سلسلہ میں ایک واقعہ جو تواتر کے رنگ میں اگلوں سے پچھلوں تک پہنچا ہے یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ "زد و برد" "بزن و بکش" کے ان ہنگاموں میں جو شاملی میں برپا تھے۔ سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی گولی لگی تھی، اپنی جہادی یادداشت میں مولنا طیب صاحب نے بھی لکھا ہے۔

---

[1] حضرت الاستاذ الامام الکشمیری عالم تدبیر و عالم تقدیر کے اس تعلق کو مثالوں سے سمجھایا کرتے تھے، فرماتے کہ مقصود مثلاً آم کا پھل ہوتا ہے۔ اسی تقدیری فیصلہ کو قدرت عالم تدبیر میں صرف ظاہر کرتی ہے کہ گٹھلی سے کلے پھوٹتے ہیں، جڑ نکلتی ہے، شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔ بالآخر ایک تناور درخت ہمارے سامنے آتا ہے۔ تنے ڈالیوں، شاخوں سے گذرتے ہوئے جو اصل مقصود تھا یعنی آم کا پھل نمودار ہوتا ہے۔ یا فرماتے کہ تقدیری فیصلہ ہو چکا تھا کہ زمین کا خلیفہ آدم علیہ السلام کو بنایا جائے گا لیکن ظہور اس فیصلہ کا اس رنگ میں ہوا کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کو دیا گیا۔ ابلیس نے انکار کیا ملعون ٹھہرایا گیا آدم کو حوا کے ساتھ جنت میں رہنے کا حکم اس شرط کے ساتھ دیا گیا کہ شجرہ (خاص قسم کے درخت) سے دور رہیں گے۔ مگر خدا کے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے تب حکم دیا گیا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ یوں خلافت کا تقدیری فیصلہ سامنے آیا۔

"اسی سلسلہ میں حضرت (نانوتوی) کو بھی گولی لگی تھی، اور وہ بھی کنپٹی پر، جو انتہائی نازک مقام ہوتا ہے، اس سے ڈاڑھی کے کچھ بال بھی جل گئے، لوگوں نے سمجھا کہ شہید ہو گئے، مگر ایک دم ہمت سے اٹھے، اور چہرے پر ہاتھ پھیرا، تو ایسا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں" ص۳

اسی واقعہ کا تذکرہ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں بایں الفاظ کیا ہے کہ

"حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، بعض نے دیکھا کہ کنپٹی میں گولی لگی، اور دماغ پار کر کے نکل گئی"

مزید اضافہ ان کے بیان میں یہ ہے کہ

اعلیٰ حضرت (مراد حضرت مولانا گنگوہی سے ہے) انہوں نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا، اور فرمایا "کیا ہوا میاں"

مولوی عاشق الٰہی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد

"عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر" ص۷۵

مولانا طیب اور مولانا عاشق الٰہی کی تو خیر سنی ہوئی روایت ہے لیکن ان سماعی روایتوں کے ساتھ ہم اپنے مصنف امام حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں بھی یہ پاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

"ایک بار گولی چل رہی تھی، یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے، پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا کہ سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر" ص۳۷

ہمارے مصنف امام نے جیسا کہ اس وقت کا اقتضاء تھا، اسکی تصریح تو نہیں کی ہے کہ یہ واقعہ کہاں کس موقعہ پر کیسے پیش آیا لیکن ظاہر ہے کہ شاملی کے میدان ہی کے اسی واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں، جس کا تذکرہ مولانا طیب اور مولوی عاشق الٰہی نے کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مصنف امام کی شہادت کے بعد،

واقعہ میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے، ان کے بیان میں "ایک بھائی" سے مراد حضرت مولانا گنگوہی ہیں۔ جن کے نام کی تصریح مولوی عاشق الٰہی نے کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا طیب اور مولانا عاشق الٰہی نے تو صرف ایک ہی واقعہ کی حد تک اپنے بیان کو اس سلسلہ میں محدود رکھا ہے۔ لیکن ہمارے مصنف امام نے اس واقعہ کے سوا یہ بھی لکھا ہے کہ

"انہیں دنوں ایک نے متعدد دفعہ بندوق ماری جس کے سینچنے سے ایک مونچھ اور داڑھی (مولانا نانوتوی) کی جل گئی، اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی، اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سینچنے ہی بس تھا، مگر حفاظت الٰہی برسر تھی کچھ اثر نہ ہوا"[۱] ص

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غدر ہی کے زمانہ میں یہ دوسرا حادثہ بھی سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پیش آیا تھا۔

بہرحال حاصل یہی ہے کہ گولی کھانے کے بعد جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔ یہی لوگوں کا مشاہدہ ہے، اب اس کی توجیہ کچھ بھی کی جائے۔ خواہ سیدنا الامام الکبیر کے باطنی تصرف کا نتیجہ اس کو ٹھہرایا جائے جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ یا حضرت مولانا گنگوہی کی توجہ کو اس میں دخیل مانا جائے، جس کی طرف مولانا عاشق الٰہی کے بیان میں ایما کیا گیا ہے۔ اب خواہ اسباب کچھ بھی ہوں۔ لیکن واقعہ بہرحال پیش آیا، سوال یہی ہوتا ہے، کہ حافظ شہید کے ساتھ بھی اسی طرز عمل یا معالجہ

[۱] گولی لگنے کے بعد حضرت والا کے محفوظ رہنے اور محض قدرے خون نکل آنے اور داڑھی مونچھ کے کچھ بال اڑ جانے پر بس ہو جانے کے ظاہری سبب کے بارہ میں مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف امام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گولی کا بے اثر ہو جانا خود حضرت شیخ الاسلام کی کرامت تھی۔ میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے حضرت والا کو وارفتہ مزاج آزاد اور جوش جہاد میں جان سے قطعاً بے پرواہ دیکھ کر جہاں مولانا محمد منیر صاحب کو ان کے پیچھے بطور محافظ رہنے پر مامور کیا، وہیں ایک تعویذ بھی دیا کہ اسے پگڑی میں رکھیں۔ بعض ثقات سے مسموع ہوا کہ حضرت حافظ صاحب شہید نے انگلی سے اپنا لعاب دہن پیشانی پر لگا دیا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے تصرف کی طرف ایما کیا ہے۔ بہرحال روایات مختلف ہیں۔ لیکن ان میں نہ تعارض ہے نہ ان میں سے کسی روایت کے انکار کی ضرورت۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت والا کے بڑے اور ہم عصر دوست سب ہی ان کی طرف متوجہ اور ان کی طرف سے فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ خصوصیت سے وہ محفوظ رہیں (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کی باطنی تدبیر کے اختیار کرنے میں کون سی چیز مانع تھی، جراحی یا دوسرے عام طبی ذرائع کی تو جہاں دین کے اس بے سروسامان بے نوا حضے کی طرف سے مہیا ہونے کی صورت ہی کیا تھی، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے متعلق دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا، حافظ شہید کے ساتھ بھی چاہا جاتا تو یہی کر کے دکھایا جا سکتا تھا، یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور شہید کے جنازے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ جس راز کا افشا حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ہو گیا اس کے سوا آپ ہی سوچئے کہ معقول جواب اس سوال کا اور کیا ہو سکتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مرنے ہی کے لئے جو تڑپ رہا تھا، برسوں سے تڑپ رہا تھا، موت ہی کو جو اپنا مطلوب بنا چکا تھا جب اپنی اسی تمنا اور آرزو سے ہم آغوشی کا موقعہ اس کے سامنے آیا تو شاید اس میں خلل اندازی اگر بد بختی نہیں، تو سوء ادبی ضرور تھی، اسی موقعہ پر نہیں، تاریخ کے مختلف قرون و ادوار میں اسی قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر حقیقت کی یافت سے لوگ محروم رہے ہیں[1]۔ خلاصہ یہ ہے کہ جینے کے لئے جو جیتے ہیں، اور مرنے کے لئے مرتے ہیں، ان کی حیات و موت کے قصوں کو مجرمانہ مغالطہ ہوگا، اگر ان لوگوں کی حیات و موت سے ناپا اور جانچا جائے، جو جیتے بھی ہیں،

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) کیونکہ ان کے علم و فضل اور قوت باطنی سے آئندہ کے بہت سے دینی و علمی مہمات کی تکمیل محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ہجرت فرمانے کے وقت جب یہ دونوں خلیفہ (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ) آخری طور پر ملنے کے لئے بچلاسہ (پنجاب) پہنچے اور اصرار شروع کیا کہ حضرت ہم بھی آپ کے ساتھ اس ملک سے ہجرت کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں بھی ساتھ ہی لے چلئے تو شیخ نے فرمایا کہ نہیں تم ہندوستان ہی میں رہو تم سے حق تعالیٰ کو بہت کچھ کام لینا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

[1] مثلاً کربلا کے تاریخی فاجعہ ہی کو دیکھئے۔ حق و باطل کی کشمکش میں بظاہر دیکھا گیا کہ باطل ہی کا سر اونچا ہوا، امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور یزیدی کامیاب ہوئے۔ لیکن اب یہ کون بتائے کہ ایک دفعہ نہیں، تین تین دفعہ کلی تخلیہ کر کر کے جو کچھ اس کے پاس تھا، اللہ کی راہ میں لٹا چکا تھا، کربلا میں رو کنے کے باوجود وہ کس آرزو اور تمنا کے ساتھ کس کے سامنے آیا تھا، ایمان والوں سے ان کے اموال و انفس جو خرید چکا ہے۔ اگر خریدنے والے کے سپرد اس کے خریدے ہوئے اموال و انفس کو بیچنے والے کر رہے ہوں تو خرید و فروخت کے معاملہ میں بتایا جائے کہ اندھیر تا ہی کیا ہے۔ بہرحال جن کے بڑوں نے کربلائی مشاہدات پیش کئے، ان ہی کے چھوٹوں کی طرف سے شاملی کے میدان میں جو کچھ دکھایا گیا اس پر تعجب کیوں کیا جائے۔ ۱۲

توکسی مقصد کے لئے، اور مرتے بھی ہیں، تو اس سے بھی کسی نصب العین ہی کی تکمیل مقصود ہوتی ہے، سیدنا الامام الکبیر زندہ رکھے گئے، کہ جس مقصد کے لئے ان کی زندگی تھی ابھی وہ سامنے نہیں آیا تھا، اور حافظ شہید اٹھا لئے گئے کہ جس لئے وہ جی رہے تھے ان کی وہی تمنا بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی تھی، میں بہت دور نکلا جا رہا ہوں، مجھے واقعہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

مولوی عاشق الٰہی کی اطلاع کے مطابق میدان کارزار سے دوش بدوش ادلتے بدلتے تھانہ بھون تک شہید کی لاش پہنچا دی گئی۔ شہید ہونے کی وجہ سے شرعاً نہ کفن ہی کا سوال تھا، اور نہ غسل کا[1] نماز پڑھ دی گئی اور قصبہ کے باہر غالباً جہاں پر حافظ شہید کا جنازہ اتارا گیا تھا، زمین کھود کر ان کو سپرد خاک کر دیا گیا، اب بھی بیری کے ایک درخت کے پاس خام قبر شہید کی موجود ہے جس پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت فقیر کو بھی حاصل ہوئی ہے۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ان کے لئے نہیں لوگ اپنے لئے ان پر فاتحہ پڑھنے کے عادی ہیں[1]۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ مولانا طیب صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ

> "ادھر حضرت (حافظ شہید) کی شہادت ہوئی، اور ادھر دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ دہلی گرفتار ہو گئے اور دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا!" مٹ

دلی کے آخری بادشاہ کی گرفتاری، اور زوال اقتدار کے بعد دلی پر انگریزوں کا دوبارہ انتقامی اقتدار و قبضہ کیا تھا، ہندوستان کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً قیام قیامت سے پہلے جاننے والے جانتے ہیں کہ گویا قیامت قائم ہو چکی تھی۔

ان ناقابل بیان، جاں گداز، روح فرسا، ہوش ربا واقعات کی تفصیل سے تاریخ کے خونیں اوراق

---

[1] کشف قبور رکھنے والے صاحب دل کے لطیفہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا شہداء کے متعلق کچھ اسی قسم کا نقطہ نظر تھا، اسی لئے جنازے کی نماز کی بھی شہید کے لئے ضرورت نہیں سمجھتے تھے لیکن حدیثوں میں جب آیا ہے کہ جنازہ کی نماز کا فائدہ پڑھنے والوں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مغفرت کی بشارت بعض جنازے کی نماز پڑھنے والوں کو دی گئی ہے اور پڑھنے والوں کیلئے اجر و ذخر صاحب جنازہ بنتا ہے۔ یہی میرا مطلب ہے کہ فاتحہ پڑھنے والوں کی غرض بھی کچھ یہی ہو سکتی ہے حنفی مذہب میں شہیدوں پر بھی جنازے کی نماز اسی لئے پڑھی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کا اس میں فائدہ ہے۔ ۱۲

لب ریز ہیں۔ کچھ نہیں اردوئے معلیٰ غالب مرحوم کے خطوط کا جو مشہور مجموعہ ہے۔ صرف اسی کتاب کے چند خطوط کے بعض فقروں کا پڑھ لینا کافی ہے۔ دلی میں بیٹھ کر شاہی خاندان کو جس حال میں غالب نے پایا تھا، اس کے ان فقروں کو نقل کرتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔ لکھا ہے کہ

"معزول بادشاہ کے جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں، اور جوانیں کسبیاں" صفحہ ۳۲۳ اردوئے معلیٰ

العظمۃ للہ یوں مسلمانوں کے دارالسلطنت کے متعلق دلی ہی میں بیٹھ کر یہ لکھتے ہوئے کہ

"جس شہر میں ہوں، اس کا نام دلی اور محلہ کا نام بلیماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا"

آگے قسمیں کھا کر غالب ہی کی گواہی یہ بھی ہے کہ

"واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا" صفحہ ۶۵

ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے پاسپورٹ یا پرمٹ وغیرہ کے قصے تو سنے جاتے ہیں لیکن اس وقت دلی میں دیکھا جا رہا تھا، خود مرزا غالب دیکھ رہے تھے کہ

"یہاں (دلی) باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا"

نگرانی میں تشدد اور قدغن کا حال یہ تھا،

"جو باہر کے گوروں سے آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں (تھانیدار) بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں، یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے، آٹھ دن قید رہتا ہے، اور سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے، اور کون ٹکٹ رکھتا ہے" صفحہ ۲۱۶

کون اندازہ کر سکتا ہے ان مصائب و آلام کا کہ اپنے گھر میں بھی کوئی ٹکٹ یعنی پرمٹ کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا، اور شہر سے باہر جنگلوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جھونپڑے ڈال ڈال کر جو پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق بھی حسب اطلاع غالب

"کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں، جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو، اور آئندہ ممانعت کا حکم سنا دو" ص۲۱۷

اسی دلی میں جہاں مسلمانوں کا لال قلعہ اور جامع مسجد ہے، اسی کے متعلق غالب اپنے خط مورخہ دسمبر ۱۸۵۹ء میں اپنے اس احساس اور اندیشہ کو قلم بند کرتا ہے،

"دیکھا چاہیے مسلمانوں کو آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں" ص۶۶

ان ہی خطوط میں دلی کے اسی "شہر آشوب" کے متعلق غالب نے اپنی ایک ماتمی نظم کے چند اشعار کا بھی تذکرہ کیا ہے،

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا

چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

(ص۳۰ اردوئے معلیٰ)

غالب نے جو کچھ دیکھا تھا دلی ہی میں دیکھا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں درحقیقت ملک کے اکثر حصوں کی تصویر کھینچ آئی ہے، دلی اور دلی والوں پر جو کچھ گذر رہی تھی تقریباً سارے ماؤف آسیب رسیدہ علاقوں کا حال یہی تھا، اس برپا ہونے والی قیامت کے ہنگاموں سے بچ نکلنے کی ایک مختصر راہ تو یہی تھی جو حافظ شہید کو میسر آئی۔ بندوق کی گولی، صرف ایک گولی نے سارے قصوں کو صرف ختم ہی نہیں کردیا، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی وحی قرآنی سے علمی ربط قائم کرلینے کے بعد جو کچھ دکھایا جاتا ہے اور دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے سے اس جاں نواز نظارے کو کون ہٹا سکتا ہے کہ مغلوں کی حکومت ہو، یا پٹھانوں کی خلجیوں کی ہو، یا غوریوں کی، الغرض دنیا کی کوئی حکومت مشرقی ہو، یا مغربی، جباری ہو یا جمہوری، فرعونی ہو یا اشتراکی جسے مہیا نہیں کرسکتی، بلکہ مہیا کرنے کا خیال بھی نہیں کرسکتی، حافظ شہید امن و عافیت کی ان ہی لازوال راحتوں سُکھ اور چین کی ان ہی نہ ختم ہونے والی

لذتوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ کے نازل ہونے والے سوال کا یہ قلندری جواب تھا، جسے حافظ شہید نے اپنے مقدس اور پاک خون سے لکھ کر پوچھنے والوں کو دیا تھا۔ جسم کو چھید کر اور ہڈیوں کو توڑ کر نکل جانے والی گولیوں کی دشواریوں کو اپنے لئے حافظ شہید کی طرح جو بھی آسان بنا لے گا۔ اس کے لئے یہ قلندری راہ ہمیشہ کیلئے کھلی ہوئی ہے۔ لیکن کھانے سے پہلے ہچکچانے والوں کو بھی کیسے چھوڑا جا سکتا تھا، اور کن پر چھوڑا جاتا، دینے والے نے ان ہی کے لئے یہ قربانی دی کہ گولی کھانے کی دشواریوں کو آسان بنا لینے کے بعد بھی اس قلندری راہ کو چھوڑ کر وہ واپس آ گیا، ہائے اگر وہ واپس نہ ہوتا، تو جس ملک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو باہر نکل جانے کی دھمکی دی جا رہی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ چلے جانے کے بعد پھر اس ملک میں وہ واپس ہو سکتا تھا، صدق مولنا الکریم

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا اللہ علیہ فمنهم من قضی نحبه ومنهم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا (الاحزاب)	ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے۔ بعضے ان میں (شہادت کے) مشتاق ہیں اور (اب تک) انہوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

یقیناً جو چلے گئے وہ بھی سچے تھے، اور اپنے مالک سے جو عہد کیا تھا، اس میں پکے تھے لیکن انتظار کی سختیوں کو جھیلنے کے لئے جو رک گئے یا روک لئے گئے۔ انہوں نے بھی اپنی بات پوری کی، یہ حافظ شہید کے رفقا سیدنا الامام الکبیر اور قطب ربانی حضرت گنگوہی قدس اللہ اسرارہم وغیرہم حضرات تھے۔ بہرحال جو چلے گئے، وہ چلے ہی گئے، لیکن منتظر بنا کر جو روک لئے گئے، ان پر کیا گذری، جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، اسے بھی سن لیجئے۔ مولنا عاشق الٰہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید اور اس کے حاشیہ میں جو کچھ مصالح وقت کا خیال کر کے لکھا ہے، سب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] صحاح (ترمذی و نسائی) کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما یجد الشهید من مس القتل الا کما یجد احدکم من مس القرصة (یعنی قتل کی تکلیف شہید کو اس سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی جتنی تکلیف کھٹمل مچھر وغیرہ جیسی چیزوں کے کاٹنے سے ہوتی ہے) ۱۲

شاملی کی تحصیل کے کواڑ کو توڑ کر جب گڑھی میں یلغار کر کے مجاہدین پہنچے اور دست بدست جنگ انگریزی فوج کے سپاہیوں سے شروع ہوئی تو موقع کو غنیمت دیکھ کر بعض منچلوں کا ذہن تحصیل کے خزانے کی طرف منتقل ہو گیا۔ خزانے پر بھی ہلّہ بول دیا گیا۔ اور جس وقت حافظ شہید کے جنازے کو کندھوں پر لئے ہوئے باچشم گریاں، و دل بریاں مجاہدین کا طبقہ تھانہ بھون کی طرف جا رہا تھا، اسی وقت ان ہی میں ملے جلے وہ لوگ بھی تھے جو تحصیل کے خزانے سے دست دبرد کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ مال جو تحصیل کے خزانے سے لوٹا گیا تھا، اس کا انجام کیا ہوا! مستقر تھانہ کے امیر پر پیش کر کے اس کو "غنیمت" کا قالب عطا کیا گیا یا یہ لوٹا ہوا مال صرف لوٹا ہوا مال ہی ہو کر رہ گیا، اس کا تو پتہ نہ چل سکا، لیکن نتیجہ اس کا سب ہی کو بھگتنا پڑا۔ مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے جانے اور خزانے کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم (غالباً مظفر نگر کا کلکٹر) شاملی پہنچا، اور چار طرف نعشوں اور قصبہ کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا"

لکھا ہے کہ غیظ و غضب کے اسی ارتعاشی حال میں زبان سے اسی انگریزی افسر کے یہ فقرہ نکلا کہ

"تھانہ بھون کو بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا" ص۱۴۲

اس وقت تو صرف اسی قول کے ساتھ وہ مظفر نگر واپس ہو گیا۔ لیکن جوں ہی کہ (جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے)

"دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی"

ہر ایک کے سامنے اس کا قول "فعل" کی دھمکیاں تھانہ بھون والوں کو دینے لگا، مولوی صاحب کا بیان ہے،

"تھانہ میں خبر گرم ہوئی، کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچا چاہتی ہے"

تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی تو حکومت کے نزدیک اس ہنگامہ کے بانی مبانی ہی تھے لیکن خود مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اسی عرصہ میں یعنی شاملی کو دیکھ کر

مظفر نگر کا حاکم واپس ہوا، اور دلی کی فتح کی خبر پہنچی، اس درمیانی وقفہ میں سرکاری گوئندوں نے حکومت تک یہ خبر بھی پہنچائی، مولنا کے الفاظ یہ ہیں

"کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے"

یہی لوگ سے مراد تھانہ بھون کی جہادی مہم کے امیر المومنین حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء سیدنا الامام الکبیر و مولنا گنگوہیؒ وغیرہم حضرات تھے۔ لکھا ہے کہ رپورٹ میں مخبری کی گئی تھی کہ

"شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا بھی یہی گروہ تھا، بستی کی دو دکانوں[1] کے چھپر انہوں نے تحصیل کے دروازہ پر جمع کئے، اور اس میں آگ لگادی، یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے، ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملاؤں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا" ص ۸۰ تذکرۃ الرشید ج ۱

ادھر مخبری کی یہ کارروائی سرکار میں جاری تھی کہ حاکم مظفر نگر جو شاملی کے انتقامی غصہ کی آگ میں جل بھن رہا تھا، دلی کی فتح کی خبر سننے کے ساتھ ہی، اس کے زیر اقتدار فوجیوں کا جو دستہ تھا، اسکو تھانہ بھون

---

[1] جیسا کہ پڑھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ تقریباً یہ وہی بات ہے جس کی تفصیل مولنا طیب صاحب کی یادداشت سے پہلے نقل کر چکا ہوں، بیان میں اختلاف صرف اسی حد تک ہے کہ مولنا کی یادداشت میں دروازے کے باہر کی کٹیا کے چھپرے کا ذکر کیا گیا ہے جو فوج کے کواڑوں کو جلانے کیلئے آگ لگا دی گئی تھی، اور مولنا عاشق الٰہی بجائے کٹیا کے فرماتے ہیں کہ بستی کی دکانوں کے چھپروں سے یہ کام لیا گیا، خاکسار نے حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سے شاملی کی مہم کی جو داستان براہ راست سنی تھی۔ جہاں تک خیال آتا ہے، اس سے مولنا طیب صاحب ہی کی یادداشت والی روایت کے الفاظ کی تائید ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ چھپرا جو تحصیل سے باہر پڑا ہوا تھا۔ اس میں تحصیل والوں کی عام ضروریات کیلئے لوگ دکان بھی لگاتے ہوں۔ یوں کوئی چاہے تو دونوں روایتوں میں تطبیق بھی دے سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ مخبری کی اس رپورٹ میں ان بزرگوں کی طرف خزانے کی لوٹ کو جو منسوب کیا گیا ہے۔ میرا خیال وہی ہے کہ مجاہدین میں بعضوں سے یہ فعل سرزد ہوا، جس سے مخبروں کو موقع مل گیا جو ان حضرات کی طرف اس کو منسوب کر دیا۔ اگر یہ جنگ کے مواقع میں قانون حیات کی رو سے غنیم کے مال کے ساتھ اس قسم کا تصرف غیر قانونی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن بحث یہاں واقعات سے ہے، اس رپورٹ کے بارہ میں آج تک نہ کسی سے سننے ہی میں آیا نہ کہیں پڑھا کہ ان بزرگوں نے کوئی مالی استفادہ بھی کیا تھا۔ ۱۲

کی طرف مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ مظفر نگر سے تھانہ بھون کا فاصلہ ہی کتنا تھا، خبریں تو پہلے ہی سے آرہی تھیں، مولٰنا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"صبح صادق نمودار ہوئی، تو بلائے بے درماں اپنے ساتھ لائی، تھانہ بھون کو سرکاری فوج سے گھیر لیا گیا۔"

لکھا ہے کہ

"مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہو گئی۔"

مولٰنا کے بیان میں تو اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، کہ قصبہ والوں نے اس گولہ باری کے مقابلہ میں کیا کیا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خاکسار نے یہ سنا تھا کہ شروع میں تھانہ والوں نے سرکاری فوج سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، فصیل کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے، اور کوئی توپ جو تھانہ والوں کو کہیں سے مل گئی تھی، ممکن ہے کہ شاملی ہی کی گڑھی میں ہاتھ آئی ہو، بہر حال حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ کسی بلند مقام پر اس توپ کو چڑھا کر قصبہ والوں کی طرف سے جوابی فائر ہونے لگے، ایک دفعہ اتفاقاً یہ عجیب صورت پیش آئی کہ گولا جو قصبہ والوں کی توپ سے پھینکا گیا تھا، ٹھیک غنیم کی توپ کے دہانہ پر جا کر پڑا، انگریزی فوج کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہاں بمشکل ایک آدھ توپ غریبوں کو میسر آ گئی تھی، گولہ بارود کی مقدار بھی ان کے پاس آتی کہاں سے ہوتی، جو انگریزوں کی توپوں اور گولہ بارود کے ذخیرے کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتی، مولٰنا عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ والے چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ڈٹ سکے، ان کے الفاظ ہیں

"دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہو گئی۔"

پھر کیا ہوا؟ انتقام کی وہی جہنم جو مظفر نگر کے کلکٹر کے سینے میں دبی ہوئی تھی، ابل پڑی، مولٰنا نے لکھا ہے کہ

"قتل و قتال، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا، اور رات کی تاریکی کے چھانے سے پہلے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے اڑا دئے گئے، اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ دے دی گئی" حاشیہ

ان الفاظ پر اضافہ کی ظاہر ہے کہ ضرورت ہی کیا ہے؟ تھانہ بھون کا سارا قصبہ دہی جہنم بن گیا جو مظفر نگر کے کلکٹر کے اندر چھپی ہوئی تھی، ان زندہ انسانوں جن کے گھروں سے باہر تو انگریزی فوج کی گولیاں برس رہی تھیں، اور گھروں کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں پر کیا گذری ہو گی یا ان حالات میں کیا گذر سکتی ہے، انسان تو اس کے سوچنے کی بھی تاب نہیں لا سکتا؟ لیکن مظفر نگر کا انگریز عیسائی حاکم نہتوں اور بیکسوں کے ساتھ یہی کر رہا تھا اور کر کے دکھا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ گھروں کے اندر آگ تھی، اور گھروں سے باہر بندوقوں کی باڑھ تھی، بلکہ مولنا عاشق الٰہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ چھوڑ کر جو بھاگنا چاہتے تھے، ان پر بھی راہ گریز اس لئے بند تھی، کہ

"عالم کس مپرسی میں نواح و حوالی کے دیہاتیوں کی لوٹ مار اور بے جا حرکتوں کا زیادہ موقع ملا" حاشیہ

گویا ع جائے ماندن نہ، مقتل شدہ، مسدود مفر

تاہم واقعات بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے قصبہ کے رئیس بیچارے قاضی عنایت علی کو دیکھا گیا کہ وہ لاپتہ ہیں، مولنا عاشق الٰہی نے ان ہی کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"خدا جانے کہاں گئے، اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہ چلا"

کہنے والے کہتے تھے جیسا کہ مولنا ہی نے لکھا ہے کہ

"آدھی رات کے وقت قاضی صاحب مع چند ہمراہیان کے تھانہ بھون کو خیرباد کہی، اور بسمت نجیب آباد روانہ ہوئے"

اگر یہ صحیح ہے، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمالیہ کے کوہستانوں میں قاضی صاحب نے اپنے آپ کو شاید گم کر دیا ہو نجیب آباد جو دامن ہمالہ کی مشہور آبادی ہے اسکی طرف روانگی کا مطلب بظاہر یہی ہو سکتا ہے واللہ اعلم بالصواب

باقی تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

احسان کے دونوں مرید عزیز سیدنا الامام الکبیر اور حضرت مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم ان بزرگوں پر کیا گذری؟
معلومات جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کی روشنی میں ان سوالوں کا صحیح جواب دینا میرے لئے کافی دشوار ہے
مطلب یہ ہے کہ شاملی سے واپس ہونے اور حافظ شہید کے دفن کر دینے کے ساتھ ہی یہ حضرات
منتشر ہو گئے، یا تھانہ ہی میں کچھ دن مقیم رہے، پھر حکومت کے نمائندے کی طرف سے جب تھانہ بھون
پر انتقام کی جہنم انڈیلی گئی، اس وقت یہ حضرات کہاں تھے؟

مولنا عاشق الٰہی صاحب کی کتاب میں بھی کوئی واضح جواب ان باتوں کا نہیں ملتا، ان کے بیان سے جو کچھ
بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ گوئندوں کی مخبری کے بعد

"ان تینوں حضرات کے نام، چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے، اور گرفتار کنندہ کے
لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا، اس لئے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ ودو میں پھرتے
تھے۔" ص تذکرۃ الرشید ج ۱

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تھانہ بھون میں حکومت کی رسائی ان لوگوں تک نہ ہو سکی، اور وارنٹ
جاری کر کے حکومت کے کارندے ان کی گرفتاری کی فکروں میں مشغول ہو گئے، ہمارے مصنف امام
نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر پر دوسری دفعہ بندوق کی گولی جب چلائی گئی،
جس میں مونچھ اور داڑھی کا کچھ حصہ فائر کے سینکنے سے جل بھی گیا تھا، اسی سلسلہ میں ان ہی کے حوالہ سے
یہ بھی نقل کر چکا ہوں کہ

"کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا"

آنکھ کے اس "قدرے صدمہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ

"اس زخم کی خبر اچھالی، بعض دشمنوں نے جو سُنی، تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے
فساد میں شریک تھے۔" ص۳۷

گویا اس "زخم چشم" کو مجرم کی شناخت کی علامت بتانے والوں نے بتائی ہوگی۔ مخبروں کی ساعی گراں بہا
کے ساتھ اس "عینی شہادت" کے قصے نے قدرتاً بہ نسبت دوسروں کے سیدنا الامام الکبیر کے مسئلہ کو

زیادہ اہم بنا دیا، لیکن اس اہمیت کا حال سنئے، جو تہیں ڈھونڈے جا رہے تھے، مولنا طیب صاحب نے "متوسلین و خدام" کے عنوان سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"متوسلین اور خدام نے عرض کیا کہ احتیاط خلاف توکل نہیں، حضرت روپوش ہو جائیں"

مگر انتقام کے زہر سے ملو و معمور حکومت زہریلے، سانپ کی طرح بل کھانے والی جسے ڈھونڈھ رہی تھی، خود اس کا حال کیا تھا۔ مولنا طیب کی اسی یادداشت میں ہے کہ

"حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی فطری شجاعت اور ہمت قلب سے کھلے بندوں پھر رہے تھے"

مگر "روپوشی" کے مشورہ دینے والوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا تب جیسا کہ اسی یادداشت میں ہے،

"اپنی سسرال کے عالیشان مکان (دیوان) میں روپوش ہو گئے"

لیکن یہ روپوشی جو اصرار بلیغ کے بعد اختیار کی گئی تھی، جانتے ہیں اس کا سلسلہ کتنے دنوں تک جاری رہا، سال و ماہ نہیں، دنوں کے حساب سے لے دے کر حسب روایت مولنا طیب صاحب تین دن سے آگے نہ بڑھ سکا، مولنا کے الفاظ ہیں

"تین دن پورے ہوتے ہی، اکدم پھر باہر نکل آئے، اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے"

ظاہر ہے کہ روپوشی کے سوا حفاظت و نگہبانی کا کوئی دوسرا ذریعہ جن بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اچانک باہر نکلنے کی اس جسارت پر قلق بھی سراسیمہ ہوتے، اپنی یافت و عقل کے مطابق اُن کی سراسیمگی بالکل بجا تھی، مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"لوگوں نے پھر منت روپوشی کیلئے عرض کیا"

اس موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جواب میں جس عذر کو پیش کیا گیا تھا، اسی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، انصاف سے کام لینا چاہئے، شاملی کے میدان کی سطح پر واقعات کا جو متن لکھا گیا تھا، اور فقیر نے عرض کیا تھا کہ تیرہ سو ساڑھے تیرہ سو سال پیش تر، تاریخ کے پاک ترین عہد میں جو واقعات

سرزمین عرب میں پیش آئے۔ اسی کی شرح مجھے شاملی کے میدان کا یقین نظر آتا ہے۔ اس کو میری ذاتی خوش اعتقادی قرار دینے والوں کو چاہیئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس جواب کو ذرا غور سے پڑھیں دوبارہ روپوشی کی طرف توجہ دلانے والوں سے فرمایا گیا کہ

"تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں۔"

دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے یاد دلایا گیا کہ

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں۔"

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے، اور دار العلوم کے حلقہ میں حضرت والا کے اس جواب کا چرچا تقریباً حد تواتر تک پہنچا ہوا ہے، سوچنا چاہیئے کہ اس جہادی مہم کے آغاز ہی سے امارت، بیعت، والدین کی اجازت وغیرہ ہر موقع پر تاریخ کے اسی مقدس دور کی طرف مڑ مڑ کر جو مسلسل دیکھتا رہا ہو، تا اینکہ مہم جب ختم ہوتی ہے، تو دیوان کی ڈیوڑھی کی روپوشی میں "غار ثور" کی تجلی جس کی نظروں کے سامنے تڑپ رہی ہو، الغرض غلام جو قدم بھی اٹھاتا ہو، یہ دیکھ کر اٹھاتا ہو، کہ اس کے آقا نے اپنا مبارک مسعود قدم کہاں کہاں رکھا تھا، کس طرح رکھا تھا، جس کے ادراک کی لطافت کا اس باب میں یہ حال ہو کہ "مطلق روپوشی" کے جواز کا نتیجہ "غار ثور" کے واقعہ سے جو نکلتا ہے، نتیجے کے اس اطلاق پر اس کا دل راضی نہیں ہے، بلکہ جتنے دنوں تک غار ثور میں روپوشی کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا، دنوں کی اس اتفاقی قید کو بھی اتباع سنت کا لازمی جز کم از کم اپنی ذات کی حد تک قرار دے رہا ہو، اور جوں ہی کہ اس کی روپوشی کی مدت غار ثور والی روپوشی کے حدود سے آگے بڑھنے لگی، جان گسل روح گداز خطرات کی پروا کئے بغیر اپنی روپوشی کو ختم کر کے باہر نکل گیا ہو، کہنے والے لاکھ سمجھا رہے ہوں، لیکن تین دن سے زیادہ روپوشی پر آخر وقت تک آمادہ نہ ہوا، الغرض جو کچھ کر کے دکھایا گیا تھا، اس کے سوا جو کچھ دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا، اگر اسی کو شاملی کے مختصر میدان میں وہ سب کچھ دکھایا گیا، جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا تو جزاءً وفاقاً کے قدرتی قانون کا اقتضا اس کے سوا خود ہی سوچئے کہ اور کیا ہوتا، آخر جس راہ پر چلنے والوں

کو بشارت دی گئی ہو کہ ایک بالشت جو آگے بڑھتا ہے' اس کی طرف بڑھنے والا ایک ہاتھ بڑھ جاتا ہے اور معمولی رفتار سے جو چلتا ہے' اس کی طرف آنے والا دوڑ کر (ہرولۃ) آتا ہے' ایک حسنہ کو معاوضہ میں دس تک' ایک حبہ (دانہ) کو سات سو تک بلکہ یضاعف لمن یشاء (بڑھاتا ہے اس کا معاوضہ جہاں تک چاہتا ہے) پہنچا دیتا ہے' وہاں جو کچھ ہوا لوگوں کو اس پر تعجب ہے۔ حالانکہ حیرت تو اس وقت ہوتی' جب یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

جو ہو سکتا ہے' اسے کر کے دیکھو' پھر بظاہر جو نہیں ہو سکتا ہے' وہ بھی دکھایا جاتا ہے اور دل کو سوجھ رہا ہو یا نہ سوجھ رہا ہو' لیکن جہاں نہیں دیکھا جا سکتا تھا' دیکھنے والوں کو وہیں بدر بھی دکھایا گیا اور احد بھی' خندق بھی اور خیبر بھی' موتہ بھی' اور ثور کا غار بھی' بلکہ تھانہ بھون کے جہاد کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو بالآخر اقطار ارض میں "مہاجر مکی" کے نام سے مشہور ہوئے' اُن کے دل میں جو یہ ڈالا گیا' جیسا کہ مولنا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"وطن کو خیر باد کہی' اور بہ نیت حرمین گھر سے باہر نکلے" ص۷۳ تذکرۃ الرشید

صرف مکہ معظمہ نہیں بلکہ حرمین کی نیت ہندوستان سے ہجرت کے وقت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تھی۔ تو مدینہ منورہ کی طرف تاریخی ہجرت تیرہ سو سال پیش تر ہوئی تھی' اس ہجرت کی پرچھائیں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت میں اگر دکھائی دے تو واقعہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے کیا اس سے بھی ثابت یہی نہیں ہوتا'

بہرحال تھانہ بھون میں تو حکومت کی طرف سے آگ لگا دی گئی' قصبہ کے رئیس قاضی عنایت علی ہمالیہ کی وادیوں میں گم ہو گئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھانہ کے جہاد کے امیر' حرمین کی نیت کر کے عرب کی سمت روانہ ہو گئے' مولنا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ حضرت مولنا گنگوہی گنگوہ کے سوا زیادہ وقت اس زمانہ میں رامپور منہیاران کے طبیب اور اپنے مخلص دوست حکیم ضیاء الدین کے یہاں گذارتے تھے' اور سیدنا الامام الکبیر قصبہ دیوبند کی دیوان والی ڈیوڑھی میں تین دن روپوش رہنے کے بعد باہر نکل آئے۔ کیوں باہر نکل آئے۔ اس کی وجہ تو خود ان ہی کی زبانی سن چکے۔ لیکن

جس طرح نکلے، وہ بھی کم دل چسپ نہیں ہے۔ ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے، یہ لکھ کر کہ

"ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے۔ زنانہ مکان کے کوٹھے پر" ص۳۰

کہ اتفاقاً یہ صورت پیش آئی کہ گھر میں اس وقت

"مردوں میں سے کوئی نہ تھا، زینہ پر آ کر فرمایا، پردہ کرلو، میں باہر جاتا ہوں" ص۳۰

ظاہر ہے کہ بے چاری عورتوں میں آپ کے اس خطرناک ارادے سے کافی کھلبلی مچ گئی، روکنے کی ممکنہ کوشش ان کی طرف سے کی گئی، لیکن کارگر نہ ہوئی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"عورتوں سے نہ رک سکے، باہر چلے گئے" ص۳۰

آگے مصنف امام نے واقعات کا ذکر ایسے مبہم اور مجمل الفاظ میں احتیاطاً کیا ہے کہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عورتوں نے جب دیکھا کہ حضرت تو باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے، تو کسی ذریعہ سے گھر کے مردوں تک آپ کے نکل جانے کی اطلاع عورتوں نے پہنچائی، سرکاری جاسوس گھومتے ہی رہتے تھے، ان کو سن گن جو کچھ لگی، تو دیوان کی خبر وطئی پر دھاوا کردیا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

"بعض مرد بازار میں تھے، ان کو اطلاع کی۔ وہ اتنے میں مکان پر پہنچے، دوڑ سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی تھی، انہوں نے آکر تلاشی لی" ص۳۰

لیکن ایسے وقت میں تلاشی اس مکان کی لی گئی، جب سیدنا الامام الکبیر اس مکان کے احاطہ سے باہر ہو چکے تھے۔ ناکامی اور نامرادی کے ساتھ سرکاری دوڑ کو واپس ہونا پڑا، خدانخواستہ باہر نکلنے کے بجائے حضرت مکان کے اندر ہوتے، تو گرفتار ہو جانا آپ کا یقینی تھا، لیکن لطیف خبیر کے لطف خفی کا اشارہ تھا کہ عین وقت پر اس مکان سے باہر ہو جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا، اور مردوں کے نہ رہنے کی وجہ سے نکل جانے کا موقعہ بھی بآسانی مل گیا۔

عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم	قریب ہے کہ تم کسی بات کو مکروہ سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو

کی قرآنی خبر کی تجربوں سے یوں ہی تصدیق ہوتی رہتی ہے۔

مصنف امام نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

"اس کے بعد سے (یعنی دیہان والوں کا گھر سرکاری مخبروں کی نگاہوں پر جب چڑھ گیا تھا) مسجد میں رہتے۔"

مسجد سے مراد بظاہر چھتہ کی مشہور مسجد ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مسجد میں قیام کا یہ زمانہ بھی جس طریقہ سے گذرا' اس کا کچھ اندازہ مولنا طیب صاحب کی یادداشت کی اس اطلاع سے ہو سکتا ہے' یہ لکھ کر کہ

"مخبروں کی خبروں سے کہیں نہ کہیں پولیس حضرت کو پالیتی تھی' لیکن منجانب اللہ حفاظت ہوتی تھی۔"

اسی سلسلہ میں چھتہ کی مسجد کے قیام کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے وہی رقم طراز ہیں کہ

مخبر نے خبر دی کہ حضرت (نانوتوی) چھتہ کی مسجد میں ہیں' دوش آئی' مسجد کا محاصرہ کر لیا' کپتان پولیس مسجد میں آیا۔ حضرت ٹہل رہے تھے۔"

یوں کپتان کی نظر آپ پر پڑی اور آپ کی کپتان پر' مولنا نے لکھا ہے کہ

"کپتان نے خود حضرت (نانوتوی) سے پوچھا کہ مولنا محمد قاسم کہاں ہیں؟"

سیدنا الامام الکبیر کی طرف منسوب کر کے دارالعلوم دیوبند کے حلقوں میں ایک دل چسپ لطیفہ حاضر جوابی کے متعلق جو مشہور ہے' معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقعہ پر اس لطیفہ کا ظہور ہوا تھا۔ لطیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ اگر سوچا جائے تو جہاد کی سنن میں ایک سنت کی تعمیل کی سعادت اس ذریعہ سے حاصل ہوئی' بہر حال ہوا یہ کہ جسے ڈھونڈھ رہا تھا' خود اسی سے اس کا پتہ جب کپتان دریافت کر رہا تھا' گویا غالب ہی کی بات سے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کچھ یہی صورت جب پیش آئی تو جیسا کہ مولنا طیب نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر نے

"ایک قدم ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے دیکھ لیجئے۔"

حضرت ٹہل رہے تھے۔ ٹہلنے والے کا ہر دوسرا قدم ظاہر ہے کہ اس جگہ پر نہیں پڑتا' جہاں وہ پہلے

ہوتا ہے جس جگہ کو چھوڑ چکے تھے۔ اسی جگہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا کہ "یہیں تھے" جو بالکل واقعہ کے مطابق بات تھی، "دیکھ لیجئے" یعنی جسے ڈھونڈھ رہے ہو اسے تم دیکھ بھی سکتے ہو، لیکن جہاں

تراھم ینظرون الیك وھم لا یبصرون	تو دیکھتا ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوجھ نہیں رہا تھا۔

کپتان غریب دیکھ رہا تھا، لیکن جسے ڈھونڈھ رہا تھا، وہ اسے سجھائی نہ دیا، اور بقول مولانا طیب صاحب

"کپتان دیکھ بھال میں مصروف ہوا"

اور جو دیکھا ہوا تھا، اس کو کپتان کی نظروں سے اوجھل ہونے کا موقعہ مل گیا، اور یوں

"حضرت (نانوتوی) غایتِ اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے، اور پولیس کے گھیرے میں سے گذرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد شاہ رمزالدین کی طرف روانہ ہو گئے"

اس عرصہ میں کپتان بھی مسجد سے باہر نکلا، اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، اور کس علامت سے اس نے پہچانا، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

"کپتان مسجد سے باہر نکلا، اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا، کہ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں، جو جا رہے ہیں، پولیس ادھر چلی، اور مسجد شاہ رمزالدین کا محاصرہ کر لیا"

آگے جو صورت پیش آئی، یعنی لکھا ہے کہ

"حضرت وہاں (مسجد شاہ رمزالدین) سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں سے گذرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے"

کپتان کے یہ کہنے کے باوجود کہ "مولانا یہی معلوم ہوتے ہیں" پولیس کے جتھے سے گذرتے ہوئے نکل جانے کی توجیہ میں بجز اس کے کہ

وجعلنا من بین ایدیھم سدًا ومن خلفھم سدًا فاغشیناھم فھم لا یبصرون	اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی اور ایک آڑ انکے پیچھے کر دی جس ہم نے (ہر طرف سے) ان کو پردوں سے گھیر دیا سو وہ (کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے۔

اور کیا کہا جائے۔ اسلام کی تاریخ میں اس قرآنی حقیقت کا تجربہ پہلی دفعہ نہیں کرایا گیا تھا بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ غلام قولان ہی نعمتوں سے نوازا جا رہا تھا جن سے آقا کو سرفرازی بخشی گئی تھی لیکن غلامی کرکے ترکوئی دیکھے پولیس والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کا یہ کھیل جو کھیلا گیا تھا، اور مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں آگئے جو یہ الفاظ ہیں

"غرض پولیس کا چکر، اور حضرت کا یہ دور عرصہ تک جاری رہا۔ مگر بحفاظت الٰہی" پولیس حضرت پر قابو نہ پا سکی" ص۱

ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک آدھ بار ہی یہ صورت پیش نہیں آئی، بلکہ بار بار مخبری کرنے والوں کے اشارے سے پولیس پیچھا کرتی تھی، لیکن یوں ہی تین چار چکروں میں اسے پیچھے چھوڑ کر چھڑانے والا اپنا پیچھا چھڑا لیا کرتا تھا، اور قصہ دیوبند ہی تک محدود نہ رہا۔ مولنا طیب صاحب کی اسی یادداشت میں "چکولی" کے گاؤں کی سرگذشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ خیال آتا ہے کہ کسی موقعہ پر اجمالاً کسی دوسری ضرورت سے اس کا ذکر گذر بھی چکا ہے، اسی اجمال کی اب تفصیل سنئے۔

مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ پولیس والوں کے بار بار تعاقب کی جھنجھٹوں سے تنگ آکر آخر سیدنا الامام الکبیر کے نسبتی بھائی شیخ نہال احمد مرحوم رئیس دیوبند جن سے ہماری اس کتاب کے پڑھنے والے کافی طور پر شناسا ہو چکے ہیں، ان ہی شیخ صاحب نے

"حضرت نانوتوی کو مجبور کیا کہ چند دن، ان کے گاؤں موضع چکوالی میں قیام فرمائیں"

اصرار اتنا شدید تھا کہ ان کے مشورہ پر عمل کرنا ہی پڑا، اور حضرت چکوالی پہنچ گئے، چکوالی کے محل وقوع کو بتاتے ہوئے مولنا طیب نے لکھا ہے کہ یہ گاؤں

"نانوتہ اور دیوبند کی درمیانی سڑک پر واقع ہے"۔

لیکن زیادہ دن تک اس گاؤں میں آپ کے قیام کا واقعہ پوشیدہ نہ رہ سکا، پتہ چلانے والوں کو خبر ہو گئی، یادداشت میں ہے کہ

"مخبر نے اس قیام کی گورنمنٹ میں اطلاع کردی"

جیسا کہ چاہیے تھا'

"دوش جکوالی پہنچ گئی' پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ خود شیخ نہال احمد مرحوم بھی بطور رفاقت کے اسی گاؤں میں مقیم تھے۔ گاؤں کا محاصرہ پولیس والوں نے کرلیا ہے۔ اس واقعہ سے واقف ہونیکے ساتھ ہی جیسا کہ مولانا طیب صاحبؒ کا بیان ہے۔

"شیخ نہال احمد صاحب کے تو چھکے چھوٹ گئے' سخت خائف اور ہراساں ہوئے۔"

لیکن خوف و ہراس کی اس کیفیت میں بقول مولنا طیب صاحب شیخ صاحب کے اس احساس کو زیادہ دخل تھا کہ

"مولنا (نانوتوی) کی گرفتاری میرے گاؤں میں ہو' جس میں میں ہی خود حضرت کو باصرار لے کر آیا ہوں۔"

لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی پریشان حالی کو دیکھ کر حضرت نانوتوی نے ذرا درشت لہجہ میں فرمایا کہ

"اس طرح خوف زدہ صورت بنا کر تو آپ مجھے پکڑوا کر رہیں گے۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"آپ بالکل مطمئن رہیں' میں اپنا بچاؤ خود کرلوں گا۔"

جکوالی میں شیخ صاحب کا جو مکان تھا' اس میں بھی زنانہ مردانہ دو حصے تھے۔ حضرت الاؔ کو لیکر شیخ صاحب اسی زنانہ حصہ میں رہا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کو تو اسی زنانہ حصہ میں چھوڑ کر بقول مرتب لکھا ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) باہر نکل آئے۔"

سامنے پولیس کا کپتان کھڑا تھا' نظر پڑتے ہی' بغیر کسی اضطراب اور گھبراہٹ کے کپتان کو مخاطب بناتے ہوئے فرمانے لگے

"آئیے آئیے تشریف لائیے۔"

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ روایت میں یہ بھی ہے کہ کپتان صاحب کے لئے چائے تیار کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ چائے تیار ہو کر آئی، پلائی گئی، کپتان بھی آپ سے مانوس ہو کر پوچھتا رہا کہ

"آپ مولنا محمد قاسم صاحب کے واقف ہیں؟"

جواب میں یہ کہتے ہوئے کہ

"جی ہاں میں ان کو خوب جانتا ہوں"

مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"اپنی زبان سے اپنے مناسب وقت حالات بیان فرماتے رہے"

اس پر کپتان نے کہا کہ

"ہم زنانہ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں"

ظاہر ہے کہ تلاشی جس کے لئے کپتان صاحب لینا چاہتے تھے وہ تو ان کو ملا ہوا تھا، زنانہ مکان میں ان کو ان کا شکار کہاں ملتا۔ بخندہ جبینی ارشاد فرمایا گیا

"شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں"

لکھا ہے کہ کپتان زنانہ حصہ میں داخل ہوا، اور

"کونہ کونہ چھان مارا"

لیکن جو کھویا ہوا ہوتا، اسے البتہ پا سکتا تھا۔ مگر جسے پائے ہوئے تھا، وہ اس کو کھویا ہوا سمجھ کر ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس ڈھونڈھ اور تلاش کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی ہوا۔ لطف یہ ہے، جیسا کہ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) کپتان کے ساتھ ساتھ تلاشی دلانے میں مصروف تھے" ص۱

ناکامی اور نامرادی کے ساتھ غریب زنانہ مکان سے واپس ہوا، جب تلاش و جستجو کے سارے مراحل ختم ہو گئے، اور کپتان چھاؤنی سے رخصت ہونے لگا تو لکھا ہے کہ

"حضرت بھی اس سے رخصت ہو کر نانوتہ روانہ ہو گئے"

اتنی تگ و دو کنج و کاوش کے بعد یہ ناکامی و نامرادی کپتان کے لئے کافی ہیجان انگیز، اور تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ نزلہ کے گرنے کے لئے مخبر کا ضعیف وجود اس کے ساتھ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ اسی "عضو ضعیف" کو مشق کا تختہ بنا کر

"کپتان نے بہت ڈانٹا، کہ تو غلط خبریں دیا کرتا ہے"

مخبر نے اس وقت کپتان صاحب سے عرض کیا کہ

"آپ نے غور نہیں کیا، کہیں مولانا ہی صاحب تو نہ تھے، جنہوں نے تلاشی دلوائی"

جب چونک کر چڑیا کھیت سے اڑ چکی تھی، اس وقت مخبر صاحب بھی چونکے تھے، اور ان کی توجہ دلانے سے کہتے ہیں کہ

"کپتان نے وارنٹ جیب سے نکال کر حلیہ پڑھا تو حضرت نانوتوی۔ کے چہرے مہرے پر منطبق پایا"

مگر نانوتہ اور اس کے گرد و نواح کے گھپ اندھیرے گھنے نخلستانی جنگل کو جس نے دیکھا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ چکوالی سے نکل جانے کے بعد راستہ میں گرفتار کرنا آسان نہ تھا۔ غصہ میں کپتان نے حکم دیا کہ دو شن نانوتہ کی طرف مارچ کرے۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ لوگ پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے، قبل اس کے کہ دو شن نانوتہ پہنچے، سیدنا الامام الکبیر کو اطلاع ہو گئی اور بقول مولانا طیب

"دوسرے راستہ سے دیوبند پہنچ گئے"

پیدل چلنے پھرنے کی عادت آج کام آرہی تھی، ابھی چکوالی میں تھے، چکوالی سے نانوتہ پہنچے ابھی سانس لینے بھی نہ پائے تھے، کہ وہاں سے بھی روانہ ہو گئے، اور دم کے دم میں چوبیس میل کے دراز فاصلہ کو طے کر کے حضرت والا دیوبند میں رونق افروز تھے

ہر پھر کر پولیس والوں نے پھر دیوبند ہی کی مسجدوں میں آپ کا سراغ لگانا چاہا۔ لیکن یہاں وہی ایک مسجد سے دوسری مسجد، دوسری مسجد سے تیسری مسجد کا چکر جاری رہا، پولیس بھی گھومتی رہی لیکن گھومنے کے سوا جسے ڈھونڈھ رہی تھی اس کے پانے میں آخر وقت تک کامیاب نہ ہوئی،

مولانا طیب نے لکھا ہے

"غرض پولیس کو چکر میں رکھا، اور گرفتار نہ ہوئے"

اس قسم کے قصوں کا سنانا بھی آسان ہے اور سن لینا بھی آسان ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کا قصہ سنایا گیا خود وہ جس آسانی کے ساتھ ان جان فرسا ہائلہ حوادث سے گذر رہا تھا، ہر شخص کے لئے گذرنا آسان نہیں ہے، بے پناہ قوت رکھنے والی ملوکیت کے سامنے سینہ تان کر انتہائی لاپروائی کے ساتھ صحیح معنوں میں وہی ٹھہر سکتا ہے، جس پر السموات والارض کی ملکوت (یا دشاہت) کا صحیح راز آشکارا ہو چکا ہو۔ پہاڑ بھی اس کے قدموں کے نیچے پانی بن جاتے ہیں۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی کا تماشا کیا نہیں دکھایا جا رہا ہے؟ کچھ ٹھکانا ہے اس سکینت قلب، جمعیت خاطر کا کہ وارنٹ جیب میں رکھے ہوئے گرفتار کرنے کے لئے جو آیا ہوا ہے، اسی کو چائے پلائی جاتی ہے اور جس کو گرفتار کرنا چاہتا ہے، وہی گرفتاری کی کارروائیوں میں گرفتار کرنے والے کی مدد کر رہا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن بظاہر جس کا کوئی پشت پناہ نہیں ہے، اس کو گرفتار کرنے میں وہی قطعی ناکام ثابت ہوا جسے ظاہر بین فی الارض اور ملک کی سب سے بڑی قاہرہ سیاسی قوت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

خیر سیدنا الامام الکبیر تو دھرو دیوبند، نانوتہ اور چکوالی کے راستے پھیرے میں مصروف تھے لیکن آپ کے پیر و مرشد امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "حرمین کی نیت سے گھر (تھانہ) سے باہر نکل چکے تھے" بقول مولانا عاشق الٰہی

"چند ماہ انبالہ، تگری، پنجلاسہ وغیرہ مواضع و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر براہ سندھ کراچی عرب کا راستہ لیا" صہ تذکرۃ الرشید

یہی چند ماہ جو حضرت حاجی صاحب کے ان مقامات میں گذرے، اسی زمانے میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پولیس کے تعاقب کے مذکورہ بالا قصے پیش آ رہے تھے۔ ہمارے مصنف امام نے بھی ان ہی اتفاقات کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"اس زمانہ کی کیفیات عجیب و غریب گذری ہیں، لکھنا ان کا طول ہے"

"عجیب و غریب کیفیات" غالباً وہی تھیں، جن کی تھوڑی بہت تفصیل مولنا طیب صاحب کی یادداشت کی مدد سے سنائی گئی۔

اسی سلسلہ میں مصنف امام نے علاوہ دیوبند، نانوتہ، جیکوالی کے املیا نامی گاؤں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں سیدنا الامام الکبیر کا قیام نارنٹ کے ان دنوں میں رہا تھا۔ آگے انہوں نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ

"بوڑیہ، کنتھل، لاڈوہ، پنجلاسہ، جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے"

کئی دفعہ آنے جانے کا ذکر جن مقامات کے متعلق کیا گیا ہے، بظاہر یہ اسی راستہ پر واقع ہیں جس سے گذرتے ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سندھ (کراچی) عرب جانے کے لئے پہنچے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کا جرم آپ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، یعنی وہی جہاد کے امیر تھے۔ اور بیعت جہاد کی ان ہی کے ہاتھوں پر کی گئی تھی۔ ایسی صورت میں وارنٹ کے بعد کھلے بندوں تو ان کے کراچی تک پہنچنے کی صورت ہی کیا تھی، بلکہ بقول مولنا عاشق الٰہی ان ہی آبادیوں میں چھپتے چھپاتے حضرت الاسحل سمندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے، جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حکومت ان کا تعاقب کر رہی تھی، جس جگہ پہنچ کر پناہ لیتے، حکومت کے نمائندے وہیں پہنچکر آپ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہی "حفاظت الٰہی" گرفتار کرنے والوں کو ناکام بناتی رہی کہتے ہیں، اور یہ قصہ عام طور پر مشہور بھی ہے کہ مشرقی پنجاب کے قصبہ پنجلاسہ میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اپنے پیر بھائی پنجلاسہ کے رئیس راؤ عبد اللہ مرحوم کے مکان میں تھا کہ پولیس کو خبر ہو گئی، لکھا ہے کہ اس علاقہ کا انگریز افسر دوڑ کو لے کر راؤ عبداللہ کے مکان پر پہنچ گیا، راؤ صاحب نے حاجی صاحب کو بنظر احتیاط اپنے اصطبل کی ایک ایسی کوٹھری میں جگہ دے رکھی تھی جس میں کسی شخص کے رہنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، جس میں گھوڑوں کا گھانس اور چارہ بھرا ہوا تھا مگر انگریز تک خبر اس تفصیل کے ساتھ پہنچی تھی کہ فلاں کوٹھری میں مجرم ٹھیرایا گیا ہے۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ

ٹھیک اسی کوٹھری تک پہنچ کر انگریز نے کواڑ کھول دئے۔ راؤ عبداللہ کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے لیکن کواڑ کے کھلنے کے بعد جب دیکھا گیا، تو مصلیٰ بچھا ہوا تھا، پانی کا لوٹا بھی تھا لیکن کوٹھری میں کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ انگریز حیران تھا، اس نے پوچھا کہ یہ مصلیٰ اور پانی کا لوٹا کیسا ہے؟ راؤ صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ فرض نماز مسجد میں پڑھتے ہیں اور نوافل گھر آکر پڑھتے ہیں۔ بہر حال انگریز راؤ صاحب سے معافی مانگ کر شرمندا سا واپس ہوا، اس کی سمجھ میں کوئی صورت نہ آئی۔ راؤ صاحب انگریز کو رخصت کر کے جب گھر میں لوٹے تو حیران تھے کہ حضرت حاجی صاحب اس عرصہ میں کوٹھری سے کیسے باہر ہوئے اور کہاں تشریف لے گئے۔ کوٹھری کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حاجی صاحب بدستور اپنے مصلیٰ پر تشریف رکھتے ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت آپ ابھی تلاشی کے وقت کہاں تھے؟ فرمایا، میں تو یہیں بیٹھا ہوا تھا، عرض کیا کہ انگریز نے تو آپ کو نہیں دیکھا، فرمایا، وہ اندھا ہو جائے تو میں کیا کروں؟ یہ سب وہی حفاظت الٰہی کے کرشمے تھے جو ان واصلین کی کرامتوں کی صورت میں نمایاں ہو رہے تھے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ جمنا پار کے ان قصبات اور مواضع تک سیدنا الامام الکبیر کی اس زمانہ میں آمد و رفت اپنے پیر و مرشد کی قدم بوسی و تفقد حال اور ان کی خیر و عافیت کی دریافت ہی کے سلسلے میں ہوتی رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے سوا ان گمنام آبادیوں میں تشریف لے جانے کی بظاہر کوئی دوسری وجہ نہ تھی۔ روپوشی کے لئے جمنا کے اس پار کی آبادیوں میں کافی گنجائش تھی۔ نیز آپ سن چکے کہ حکومت کے نمائندوں سے بچنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر زیادہ کنج دکاؤ سے کام بھی نہ لیتے تھے۔ زیادہ نرغہ ہوتا، تو اس مسجد سے اس مسجد کے چکروں ہی میں نرغہ والوں کا سانس پھول جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے یہاں تک لکھ دیا کہ دیوان والوں کی حویلی میں روپوشی کے تین دن گذار لینے کے بعد جب سیدنا الامام الکبیر باہر نکل آئے۔

"تو مسجد میں رہتے، اور کوئی کسی قسم کا تعرض نہ کرتا" تذکرہ ص۷۹

باوجود وارنٹ اور تفتیش کے تعرض نہ کرنے کا مطلب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تعرض کرنے والے چشم پوشی سے کام لیتے تھے، بلکہ پچلاسہ کے اصطبل کی کوٹھری میں دیکھا گیا تھا کہ ڈھونڈھنے والا انگریز آنکھیں

رکھتے ہوئے گویا آنکھوں سے محروم کردیا گیا ہے۔ عدم تعرض میں یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ کچھ اسی قسم کی کیفیتوں کو زیادہ دخل تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک مسجد سے نکل کر جب بجائے کسی دوسرے مقام کے مسجد ہی آپ کی قرارگاہ ہوتی تھی تو "مسجد میں رہتے تھے" اس کے سوا اور اس واقعہ کی تعبیر ہی کیا کی جا سکتی ہے۔

بہرحال میرا صرف یہ خیال ہی نہیں ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری کے لئے مذکورہ بالا مقامات میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی آمد و رفت کے سلسلہ کو جاری رکھا تھا۔ بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"اپنے ہادی برحق (حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی ہندوستان میں آخری زیارت کے شوق سے بے تاب ہو کر اپالنگری اور پھلاسہ کے سفر کو اٹھے اور مستورالحال مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن (گنگوہ) ہوئے" ص۵۴

اس خبر سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان مقامات کا سفر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے لئے اختیار کیا جاتا تھا، پیادہ پا چلنے کے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ زیادہ عادی نہ تھے۔ شاید اسی لئے آپ کو اس سلسلہ میں ایک ہی دفعہ سفری صعوبتوں کی زحمت برداشت کرنی پڑی۔ مشکلات راہ کو عشق کی کشش نے آسان کیا۔ اس سفر کی دشواریوں کا اندازہ اسی سے کیجئے۔ دوسری جگہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"راتوں کو چلتے، دنوں چھپتے، خاردار جنگل، پیدل قطع کرتے" ص۵۵

اور اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جمنا پار کے ان ہی مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو لکھا ہے کہ

"کئی دفعہ آئے گئے"

اس کئی دفعہ کے آنے جانے میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، اگرچہ ابتدائے زندگی سے پیدل چلنے کے چونکہ آپ عادی تھے، کسی موقعہ پر لکھ چکا ہوں کہ پیادہ پا چلنے کی اسی عام عادت کی وجہ سے آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی کے دل میں کافی گرانی بھی پائی جاتی تھی۔ لیکن اسی قسم کے نازک مواقع پر کام لینے

کے لئے قدرت شروع ہی سے انتظام کر رہی تھی - سواری رہتے ہوئے بھی اسی کا نتیجہ تھا کہ پیدل ہی چلنے کو آپ پسند فرماتے تھے ۔

بہرحال رات کو چلنا، اور دن میں جنگلوں میں چھپنا، اور یوں تن تنہا، جمنا پار کے ان گمنام اور دشوار گذار مقامات کو طے کرنا جن سے ان آبادیوں یعنی پنجلاسہ وغیرہ تک پہنچنے کے لئے گذرنا ناگزیر تھا، اور بار بار آمد و رفت کے اس سلسلہ کو قدرت کی غیبی تائید و نصرت کے بغیر کیا قابل تصور بھی کہا جا سکتا ہے، قرائن کا اقتضا یہ بھی ہے کہ یہ سارے پیادہ پا سفر اس عرصہ میں جو کئے گئے، تنہا طریق کے کسی رفیق کے بغیر کئے گئے، رفاقت پر کوئی آمادہ بھی ہوتا تو احتیاطاً اس ارادہ سے اس کو روک دیا جاتا تھا، سمجھایا جاتا تھا کہ ہماری وجہ سے تم اپنے لئے کوئی خطرہ کیوں خریدو، مولنا عاشق الٰہی صاحب نے حضرت مولنا گنگوہی کے سفر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ پنجلاسہ جاتے ہوئے نگری نامی مقام میں جب آپ پہنچے، جو دیوبندی حلقہ کے مشہور ربانی مستجاب الدعوات صاحب دل بزرگ مولانا عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا آبائی وطن تھا۔ رائے پور میں بعد کو آپ نے قیام اختیار فرما لیا تھا۔ اس زمانہ میں جب مولنا عبد الرحیم رائے پوری اپنی عمر کے تیسرے سال میں تھے، نگری کی نگری حضرت گنگوہیؒ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہوئی۔

اس گاؤں کے رئیس مولنا عبد الرحیم صاحب کے پدر بزرگوار راؤ اشرف علی خاں مرحوم تھے ۔ وہاں کے خوش حال زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ حضرت گنگوہی کو راؤ صاحب نے اپنا مہمان بنایا اخلاص و مودت کا ظہور غیر معمولی طور پر ان کی طرف سے جب ہوا، تو حضرت گنگوہی نے سفر کے نصب العین کو بتاتے ہوئے جو کچھ گذری تھی، اس سے ان کو آگاہ کیا۔ راؤ صاحب حالات کو سن کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ باوجود نوجوانی کے بوڑھے راؤ صاحب حضرت گنگوہی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے آرزو مند ہوئے، لیکن حضرت کے یہ فرمانے سے کہ میرے پیر و مرشد تو آپ کے قریب ہی پنجلاسہ میں مقیم ہیں، بیعت کی تمنا ہے تو بجائے میرے اپنی آرزو ان ہی سے بیعت کر کے پوری کر سکتے ہیں۔ راؤ صاحب اس پر راضی ہو گئے، اور خواہش ظاہر کی کہ اپنے ساتھ مجھے پنجلاسہ لے چلئے،

سفارش کر کے مرید کرادیجئے لیکن مولنا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ اپنی

"اندیشہ ناک حالت ظاہر فرما کر سمجھایا کہ بیعت قرین مصلحت نہیں، البتہ اگلے دن آپ آئیں، اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے سفارش کا میں ذمہ دار ہوں"

ملخّص تذکرۃ الرشید

الغرض اصرار بلیغ کے باوجود رفیق سفر بنانے پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اور جیسے اب تک تن تنہا سفر کرتے ہوئے چلے آرہے تھے، پنجلاسہ بھی تنہا ہی پہنچے۔ حالانکہ نگری سے پنجلاسہ کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ غالباً ایک منزل کا سفر تھا۔ لیکن ایک دن کیلئے بھی رفیق طریق بنانے کو خلاف مصلحت جب قرار دیا گیا، تو سمجھا جا سکتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر جن کے آنے جانے کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل جاری تھا، اس میں کسی دوسرے کو رفیق بنانے پر کیسے آمادہ ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ اس زمانہ میں جتنا یا حضرت والا نے جو سفر کئے، ان سفروں کے حالات اور تفصیلات سے کوئی دوسرا واقف نہ ہو سکا۔ اسی لئے کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ کافی دلچسپ اور عبرت آموز حالات ہوں گے۔

بہر حال اب واقعہ کی صورت یہ تھی کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو حجاز کو منزل مقصود بنا کر کراچی تک پہنچنے کے لئے ایک آبادی کو چھوڑ کر دوسری آبادی اور دوسری آبادی سے تیسری آبادی کی طرف منتقل ہو رہے تھے، اور آپ کے دونوں دلکش خدام، راست باز اور جاں باز مرید سیدنا الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما انتقام کے غصہ سے بھری ہوئی حکومت کے نشانہ بنے ہوئے جس طرح ممکن تھا، دن کاٹ رہے تھے۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ پنجلاسہ پہنچکر اپنے پیر و مرشد حاجی صاحب کی خدمت میں

"اصرار کیا کہ بندے کو ہمرکاب لے چلیں"

مگر ہندوستان سے جو خود تو ہجرت کا فیصلہ کر کے اسی کی نیت سے سفر کر رہا تھا، مولوی صاحب کی شہادت ہے کہ اسی نے ہجرت ہی کی اس درخواست کو جو مرید رشید کی طرف سے پیش ہوئی تھی،

صاف لفظوں میں مسترد کردی، لکھا ہے کہ

"اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے نہ مانا، اور فرمایا کہ جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا۔"

صرف یہی نہیں بلکہ جس الٰہی الہام کے تحت حاجی صاحب نے ہجرت کا تہیہ فرمایا تھا حضرت گنگوہی کے متعلق اپنے اسی لاہوتی احساس کے زیر اثر رخصت کرتے ہوئے اس راز کا بھی افشاء فرمایا کہ

"اسی طرح خدا کا حکم ہے۔"

اور فرمایا کہ

"میاں رشید احمد تم سے حق تعالیٰ کو ابھی بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت۔" ملہ

ایک دفعہ حاضری کے بعد جو واپس کیا گیا تھا، جب خدا کے حکم کا اظہار اس کے متعلق ان الفاظ میں فرمایا گیا، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بار بار حاضری کے بعد مختلف مقامات سے جسے واپسی کا حکم دیا جاتا تھا، اور وہ واپس ہی ہوتا چلا گیا۔ میرا اشارہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ ان کی واپسی بھی کیا صرف عقلی مشوروں اور ذہنی وسوسوں کی بنیاد پر ہو رہی تھی حالانکہ کیف تحکمون؟

رہا یہ کہ تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو راہی عرب ہوئے، اور اس کے سوا بظاہر ان کے لئے کوئی چارۂ کار بھی عالم اسباب میں نہ تھا۔ صحیح طور پر اس کا متعین کرنا تو دشوار ہے کہ حاجی صاحب کب ہجرت کے اس سفر پر روانہ ہوئے، اتنی بات تو یقینی ہے کہ دلی پر انگریزوں کا قبضہ حافظ ضامن شہید کی شہادت کے بعد ہی ہو گیا، اور تھانہ پر اس کے بعد جو مصیبت ٹوٹی۔ درد کی اس داستان کو بھی آپ سن چکے۔ تھانہ کو تو حاجی صاحب جہاں تک قیاس چاہتا ہے، اسی زمانہ میں چھوڑ چکے تھے۔ اس کے بعد کہاں کہاں رہے، بس اس سلسلہ میں ان ہی مقامات کا لوگ ذکر کرتے ہیں جن کا تذکرہ سیدنا الامام الکبیر کی آمد و رفت کے سلسلے میں گذر چکا ہے، کراچی تک اس طریقہ سے پہنچنے میں چاہئے تو یہی کہ کافی مدت گذری ہو گی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست ہندوستان پر ملکہ وکٹوریہ کے قبضہ کا اعلان انگریزی پارلیمان کی طرف سے

۴ راگست ۱۸۵۸ء کو ہوا تین مہینے کے بعد یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بمقام الہ آباد لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کے اس "عام معافی نامہ" کو پڑھ کر سنایا، جس کے بعد عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غدر کے مجرمین کو بخش دیا گیا۔ ہنگامے میں جو شریک تھے، حکومت کے دارو گیر کا کھٹکا ان کے لئے باقی نہ رہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ معافی نامہ باوجود عام ہونے کے عام نہ تھا، بلکہ اس میں ان خاص امور کا استثنا بھی تھا کہ

"انگریزی رعایا کے قتل میں بغاوۃ جو شریک ہوئے ان کو رحم کا مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔ مزید برآں چند قیدیں بھی تھیں۔

(۱) جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو۔

(۲) یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں۔

(۳) یا جنہوں نے ترغیب بغاوت دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامہ میں یہ الفاظ درج کئے گئے تھے کہ

"ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی۔ لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وے اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا۔"

اسی زمانہ میں ملکہ کے اس معافی نامہ کا انگریزی سے اردو میں جو ترجمہ ہوا تھا، بہ جنسہ اسی کے الفاظ ہیں، مطلب یہی تھا کہ جان کی حد تک مندرجہ بالا تینوں جرائم کے مجرموں کو مطمئن کر دیا گیا تھا لیکن اس کے سوا حکومت اندر جو کچھ بھی کر سکتی تھی، اس کا خطرہ موجود تھا، اور حکام کی صوابدید پر ان کی سزا کی نوعیت معلق کر دی گئی تھی۔

تھانہ بھون کی جہادی مہم میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے، انگریزی رعایا ہی نہیں بلکہ انگریزی فوج کے ملازمین بھی شاملی میں قتل کئے گئے تھے۔ خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاملی کے سریہ میں موجود تھے، لیکن اس کا ثبوت آسان نہ تھا۔ اس لئے جان تک کے خطرے سے وہ محفوظ نہ تھے۔ کم از کم

قاتلوں کے پناہ دینے، باغیوں کی سرداری، بغاوت کی ترغیب ان الزاموں سے بری ہونے کی صورت کیا تھی، خود ان پر بھی یہ سارے الزامات تھے، اور جو فردِ جرم آپ کے جاں باز دست گرفتوں سیدنا الامام الکبیرؒ اور محدث روشن ضمیر حضرت مولٰنا رشید احمد گنگوہی پر لگائی گئی تھی، اس کی فہرست بھی بجنسہٖ یہی تھی۔

ایسی صورت میں مان بھی لیا جائے کہ عرب روانہ ہونے سے پیشتر اس "عام معافی نامہ" کا اعلان ہو بھی چکا ہو، جب بھی نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مطمئن ہونے کے لئے کافی تھا اور نہ ان کے دونوں نوجوان خدام رفیقوں کے لئے۔ اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگاہوں سے ہٹے اور ٹلے رہنے کا سلسلہ تینوں صاحبوں کے لئے معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی جاری رہا۔ حاجی صاحب تو کسی نہ کسی طرح کراچی سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے بغیر کسی تعیین تاریخ کے صرف یہی لکھا ہے کہ

"اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے چند ماہ انبالہ بجری پنجلاسہ وغیرہا مواضع وقصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، اور آخر براہ سندھ وکراچی عرب کا راستہ لیا ہندستان کو خیرباد کہی، اور ہوائی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچے" ص۳۰

ہوائی جہاز بادبانی جہاز کی عاشقانہ تعبیر ہے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ پانی سے بے تعلق ہو کر صرف ہوا پر چلنے والا جہاز بھی سامنے آنے والا ہے۔

بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے حاجی صاحبؒ کی روانگی جس خاص طریقہ سے اس زمانہ کی سست فتار سواریوں پر ہوئی تھی اور جن حالات میں ہوئی تھی چاہئے تو یہی کہ ہند کے ان مختلف مقامات سے گذرتے ہوئے عرب تک پہنچنے میں مدت صرف ہوئی ہو۔ سال ڈیڑھ سال بھی یہ مدت اگر فرض کی جائے، تو قیاس کا اقتضاء یہی ہے کہ زیادہ نہ ہو۔

رہے ان کے صاحبین (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ) تو ان میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اگرچہ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ امن عام کے اعلان کے بعد ہی حکومت نے اپنی

نگرانی آپ سے ہٹالی تھی، غدر کے ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد حضرت والا جن خدمات کی طرف متوجہ ہوئے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ

"یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے امن عام کا مشہور اعلان ہو گیا، اور ہر شخص آزادی سے چلنے پھرنے لگا۔" صلا

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقعہ گویا مل گیا تھا، اور یوں بغیر کسی روک ٹوک کے ان مہمات میں مشغول ہوئے جن کی باگ غدر کے بعد آپ کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مصنف امام نے حضرت والا کی سوانح عمری میں آپ کے حج اول کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے قطعی طور پر اس کی تردید ہوتی ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ لوگوں میں یہی بات کیوں پھیلی رہی، کہ ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے بعد ان خطرات سے محفوظ ہو گئے تھے جنھیں حکومت کے وارنٹ نے آپ کے لئے پیدا کر دیا تھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے پہلے حج کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سفر میں وہ بھی آپ کے ساتھ تھے، مصنف امام نے ہندوستان سے روانگی کی تاریخ ۱۲۷۷ھ ماہ جمادی الثانی بتائی ہے۔ گویا سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۰ء دسمبر کا مہینہ تھا، حساب کر کے دیکھ لیجئے اب اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حج کے اس سفر کی

"روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دے دی۔" صلا

جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۸۶۰ء کے آخری مہینہ دسمبر تک "روپوشی کی بلا" سیدنا الامام الکبیر کے پیچھے لگی ہوئی تھی، اگرچہ تین دن کی اختیاری روپوشی کے بعد آپ کی روپوشی بھی برائے نام تھی، اور وہ بھی بقول مصنف امام جیسا کہ اس موقعہ پر بھی انہوں نے لکھا ہے کہ

"مولانا کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔"

کچھ بھی ہو، مصنف امام کی اس تحریری شہادت کی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے معافی نامہ کی استثنائی دفعات کے زیر اثر اس عام معافی نامہ سے مستفید ہونے کا موقع حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نہ ملا، اسی لئے امن عام کے اعلان کے بعد بھی آپ کا سفر عرب کی طرف جاری رہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی تھی۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امن عام کا اعلان جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، لارڈ کیننگ کی طرف سے ۱۸۵۸ء کی پہلی نومبر کو ہو چکا تھا، لیکن سیدنا الامام الکبیر کا نام ان مجرموں کی فہرست میں ۱۸۶۰ء کے آخر تک باقی تھا، جن کو حکومت کے رحم وکرم کے سلوک کا مستحق نہیں ٹھیرایا گیا تھا۔ اسی لئے میرا خیال تو یہ بھی ہے کہ حج کا یہ پہلا سفر گو حضرت والا نے تو خاص حج ہی کی نیت سے فرمایا تھا، لیکن آپ کے اعزہ واقربا، خصوصاً والدین کے سامنے یہ مصلحت بھی تھی کہ حکومت کی داروگیر سے بچنے کی بھی محفوظ ترین شکل یہی ہو سکتی ہے۔ ہمارے مصنف امام نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے۔ کم از کم اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے

مصنف امام بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے، لکھا ہے کہ،

"کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے، کراچی سے جہاز میں بیٹھے" ص ۳۵

دیکھنے اور پڑھنے میں تو یہ چند الفاظ ہیں لیکن حکومت اور حکومت کے نمائندوں، اور چغل خور گوئندوں کی متجسس نگاہوں سے بچتے ہوئے براہ پنجاب کراچی تک پہنچنے کی دشواریوں کا صحیح اندازہ وہ نہیں کر سکتے، جن کو اس قسم کے اسفار کا اور وہ بھی خاص حالات میں سابقہ نہیں پڑا ہے۔ اسی راستے سے کئی سال بعد حضرت قطب ربانی مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حج ہی کے لئے تشریف لے گئے تھے، ان کے سفر نامہ کی تفصیلات کو درج کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ

"فیروزپور تک چھکڑے میں بیٹھے، اور وہاں سے کشتیوں میں بہاولپور کے نیچے گزرتے ہوئے حیدرآباد سندھ پہنچے، وہاں سے بغلہ[1] میں سوار ہو کر کراچی بندر آئے" ص ۴۲ تذکرۃ الرشید

[1] بغلہ کی تشریح مولانا عاشق الٰہی صاحب نے یہ کی ہے کہ بقدر تیس چالیس آدمی کی اس بڑی کشتی بغلہ نامی میں دباقی اگلے صفحہ پر)

فیروز پور تک چھکڑے کی سواری میں مسافروں پر کیا گذرتی تھی۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ

"ہچکولوں سے ہڈیوں کا چورا ہوتا ہے"

اور ہڈیوں کو چورا کرنے والی اس سواری میں بقول ان ہی کے "ہفتوں بیٹھنا پڑتا تھا" حیدر آباد سندھ سے کراچی تک پہنچنے کے لئے بلکہ کی بحری سواری میں کیا ہوتا تھا، مولوی صاحب ہی نے اطلاع دی ہے کہ

"مرطوب ہوا کے جھونکوں سے دوران سر میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے پر جا پڑتے تھے، اٹھتے تو چکر اور استفراغ بے ہوش بنا تا، اور پڑتے تو غشی کا بادل چھاتا چلا جاتا تھا۔"

ص۲۵ ج ۱ تذکرۃ الرشید

سفر کی ان صعوبتوں سے تو ان کو بھی دوچار ہونا پڑتا تھا، جو آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ لیکن ہر چار طرف سے حکومت کی دارو گیر کا خطرہ جس کے لئے ہو، سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی دشواریوں کا کیا ٹھکانہ ہوگا؟

لیکن شیخ اور پیر (حضرت حاجی صاحب رح) نے جس راہ سے عشق کی یہ وادی طے کی تھی، اسی راہ سے سعادت مند مرید (حضرت نانوتوی) بھی اللہ کے گھر پہنچا، مصنف امام نے لکھا ہے،

"کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے"

یعنی ۵۷ء سے ۷۷ء تک ہندوستان میں حکومت کی اسی تیز نظر کے نیچے گذار کر ۷۷ء میں آپ حج کے لئے روانہ ہوئے، اور اس طرح ۵۷ء کے بعد ۷۷ء تک کے تمام سنین حضرت والا کے لئے درحقیقت اعلان آزادی سے مستفید ہونے کے نہ تھے۔ اور گویا سمجھنا چاہئے کہ جہاد کی جس مہم کا آغاز ۵۷ء میں ہوا تھا، سیدنا الامام الکبیر ستاون، اٹھاون، انسٹھ، ساٹھ بلکہ بقول مصنف امام

"بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ کم و زیادہ میں وطن آئے" ص۲۸

(گذشتہ صفحہ سے) گنجائش ہوتی ہے۔ بادبانوں کے ذریعہ ملاح ہوا کے رخ پر چلاتے تھے۔ دن بھر چلا کر شام کے وقت کسی بستی کے قریب کنارے پر باندھ دیا کرتے تھے ۱۲

یعنی ۱۸۳۱ء میں واپسی ہوئی گویا پانچ سال تک مسلسل بغیر کسی انقطاع کے جہاد ہی میں مشغول رہے۔ اور جہاد کے ساتھ ساتھ فریضۂ حج سے بھی سبکدوشی اسی مدت میں آپ کے لئے حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آسان کی گئی۔

حفظِ قرآن کی نعمتِ عظمیٰ

صرف حج ہی نہیں، بلکہ انزوا (یعنی فی الجملہ روپوشی) کے ان ہی مبارک و مقدس ایام میں جب حکومت کھلے ہوئے مشاغل میں حصہ لینے سے مانع تھی، فریضۂ حج کے ساتھ ایک ایسے عمل کی توفیق میسر ہوئی جس کا وجوبی مطالبہ تو بندوں سے ان کے پیدا کرنے والے نے نہیں کیا ہے لیکن سید الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کے توفیق یافتوں کو بشارت سنائی ہے کہ

کانما ادرجت النبوۃ فی جنبہ	گویا کہ اس کے (یعنی حفظ قرآن کرنے والے کے) پہلو میں نبوت لپیٹ دی گئی۔

یعنی قرآن پاک کے حفظ کی دولت گرانمایہ سے بھی ان ہی جہادی دنوں میں آپ سرفراز ہوئے اگرچہ آپ کے حفظ قرآن کے متعلق یہی مشہور بھی ہے کہ آپ اسی پہلے حج کے موقعہ پر جہاز میں روزانہ ایک ایک پارہ یاد کرکے تراویح میں سنا دیا کرتے تھے۔ خاکسار نے بھی بعض کتابوں کے حوالہ سے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں یہی نقل بھی کر دیا ہے۔ لیکن واقعہ کی صحیح اور تفصیلی شکل وہی ہے جس کا ذکر مصنف امام نے فرمایا۔ انہوں نے براہ راست حضرت کا بیان نقل کیا ہے۔

"فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے، اور جب یاد کیا، پاؤ سیپارہ کی قدر، یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا۔"

بظاہر رمضان کے یہ دونوں مہینے اسی زمانہ کے ہیں جب حکومت کے وارنٹ کی وجہ سے انزوائی زندگی کا موقعہ آپ کو مل گیا تھا۔ اس زمانہ کا بہترین شغل یہی ہو سکتا تھا کہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا اس سے مکالمہ و مناجات کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اسی عرصے میں حج کا سفر پیش آ گیا۔ جمادی الثانی میں گھر سے روانہ ہوئے، مصنف امامؒ نے یہ لکھتے ہوئے کہ کراچی میں بادبانی جہاز میں ہم سب سوار ہوئے

خبر دی ہے کہ ہم لوگوں کا سفر شروع ہوتا

"رمضان کا چاند دیکھ کر"

ہوا تھا۔ گویا یکم رمضان کو جہاز میں داخل ہوئے، اور وہی قرآن جو دو سال سے یاد کیا جا رہا تھا۔ تراویح میں اسی کے سنانے کا پہلا موقعہ اسی جہاز میں ملا تھا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں

"مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا، اول وہاں (جہاز میں) سنایا۔"[۱] ص۳۵

ختم تراویح کے موقعہ پر مٹھائی کی تقسیم کا جو عام دستور ہے، ظاہر ہے کہ جہاز میں اس کا کیا سامان ہو سکتا تھا، لیکن یہ بادبانی جہاز عرب کے ساحلی مقام حضرموت کی راجدھانی کے سامنے جس کا نام مکلّہ ہے کچھ دن کے لئے لنگر انداز ہوا، تو مصنف امام راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"بعد عید مکلّہ پہنچ کر حلوائے مسقط خرید فرما کر (بطور) شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمایا۔" ص۳۵

الغرض اور عام لوگوں سے علاحدگی کے ان دنوں میں حفظ قرآن کا یہ پاک مشغلہ حضرت والا کا جو جاری تھا، اس کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کا اس سے پہلے (یعنی جہاز میں قرآن سنانے سے پہلے) قرآن یاد کرنا۔ کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے۔" ص۳۵

اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"حافظوں کے نزدیک ٹھیرا ہوا ہے کہ (قرآن) بلند آواز سے یاد ہوتا ہے۔" ص۳۵

لیکن سن رسیدہ ہونے اور آہستہ آہستہ یاد کرنے کے باوجود ان کی یہ شہادت ہے کہ

"جب سنایا، ایسا صاف سنایا، جیسے اچھے پرانے حافظ۔" ص۳۵

قرآن آپ نے کس لئے یاد کیا تھا، قطع نظر دوسرے اسباب و وجوہ کے فقیر نے جو یہ عرض کیا تھا کہ

---

[۱] دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف یا دو رمضانوں میں کیا ہو جو مفاد ہے، مصنف امام کی روایت کا اور روزانہ ایک ایک پارہ صاف کیا ہو، اس رمضان میں جس میں تراویح جہاز میں سنائی جو مفاد ہے مشہور روایت کا۔ محمد طیب غفرلہ

جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا، اسی سے مکالمہ اور مناجات کا رشتہ قائم کرنا بھی مقصود تھا۔

یہ کوئی سیراصرف خیالی حسن ظن نہیں ہے، بلکہ "القرآن العظیم" کا جو تعلق سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک سورہ فاتحہ سے تھا، جس کا تفصیلی ذکر تو انشاء اللہ قرآن کے تحقیقی معارف اور لدنی مواہب کے ذیل میں آئے گا۔ لیکن اسی موقعہ پر مصنف امام نے اس واقعہ کا جو ذکر کیا ہے، یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

"پھر تو (قرآن) اکثر بہت بہت پڑھتے" ص۳۲

آگے یہ دلچسپ کہئے، یا دل دوز اطلاع دی ہے کہ

"ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے" ص۳۲

یہ یاد تو مصنف امام کی ہے۔ اور فقیر نے یاد پڑتا ہے کہ اپنے اساتذہ میں سے کسی استاد گرامی سے سنا تھا کہ پہلی رکعت میں ستائیس پارے اور باقی تین پارے دوسری رکعت میں پڑھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ "ایک دفعہ تو اهدنا الصراط المستقیم کے کامل جواب کو ایک ہی دفعہ میں سن لو" [له] دل کی اسی تمنا کی تکمیل اس طرز عمل سے مقصود تھی۔

ایک ہی دوگانہ میں کامل تیس پاروں کو ختم کرنے کے سوا، مصنف امام ہی کی جو اطلاع ہے کہ

"اکثر بہت بہت پڑھتے"

اس سے بھی مراد ان کی بظاہر یہی ہے کہ قرآن کی کافی مقدار نمازوں ہی میں حفظ کے بعد پڑھنے کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، کیونکہ اسی کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"اگر کوئی اقتدا کرتا تو رکعت کر کر اس کو منع فرما دیتے، اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے" ص۳۲

شاید رات کے پچھلے حصہ میں تہجد کے وقت "بہت بہت" پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا، اور گو حنفی مذہب میں بھی تداعی کے بغیر نوافل یعنی تہجد وغیرہ میں جماعت کی ممانعت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص بلا اطلاع آپ کے ساتھ شریک ہوجاتا تو یہ خیال کرکے کہ ہر شخص کیلئے اتنی طویل قراءۃ اور طویل قیام کا تحمل نشاط کے ساتھ آسان نہیں ہے اس رکعت کو مختصر کرکے نماز کو ختم کردیتے اور اقتدا کرنیوالے کو شرکت سے منع فرمادیتے۔ [له]

له میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دیوان محمد یٰسین صاحب مرحوم نے ایک دفعہ حضرت کی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بہر حال خلقت سے علٰحدگی کا اضطراری موقعہ وارنٹ کے زمانہ میں آپ کو جو اتفاقاً میسر آگیا تھا، بذات خود تو آپ کے جہاد ہی کا وہ تتمہ تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن اور فریضۂ حج کی سبکدوشی بھی ان ہی دنوں میں ارحم الراحمین کی طرف سے آپ کے لئے آسان کی گئی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ معاشی حیثیت سے آپ کی جو حالت تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یوں ہی سفر حج کے مصارف کی فراہمی دشوار تھی، خصوصاً ان دنوں میں تو "معاشی مشاغل" کا وہ قصہ بھی ختم ہو چکا تھا، لیکن بایں ہمہ اسی زمانہ میں بادبانی جہاز والے سفر کو آپ نے پورا کیا، اور جس طرح سے یہ سفر پورا ہوا، مصنف امام جو اس سفر میں حضرت کے ساتھ تھے، خود اپنے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"احقر بے سامان تھا، قلیل سا زاد راہ بہم پہنچایا تھا"

اسی کے بعد اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں، کہ

"مگر مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی"

حالانکہ وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے"

پھر یہ طول طویل سفر اور بقول ان ہی کے جمادی الثانی میں جو شروع ہوا تھا، اور رجب شعبان رمضان شوال کے کامل چار مہینوں کے بعد جیسا کہ وہی لکھتے ہیں کہ

"آخر ذیقعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے" ص۳۳

گویا کم و بیش چھ ماہ میں یہ سفر پورا ہوا، سواری کے کرائے، خورد و نوش کا انتظام اس لمبی اور دراز مدت میں

(گذشتہ صفحہ سے) اقتدا کرتے ہوئے نیت باندھ لی جب پانچ چھ پارے ہو گئے تو انہوں نے ٹانگیں بدلنی شروع کیں اور آخر کار سات آٹھ پاروں پر بیٹھ گئے۔ دم لیکر پھر کھڑے ہوئے اور چند پارے سن کر پھر بیٹھے اور پھر بیٹھے ہی بیٹھے اقتدا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت والا نے ۲۵-۲۶ پاروں پر ایک رکعت کی اور پھر دوسری رکعت ذرا مختصر کر کے سلام پھیر کر ان سے فرمایا، تمہیں کس نے کہا تھا کہ اقتداء کرو؟ یہ سنتے ہی دیوان جی صاحب خفیف ہو کر یہاں سے اٹھے۔ محمد طیب غفرلہ

کیسے ہوتا رہا۔ افسوس ہے کہ بجائے تفصیل کے مصنف امام نے اس کے جواب میں صرف یہ اجمالی الفاظ درج کئے ہیں کہ

"بدولتِ توکل سب راہ بخیر وخوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہوگئے" ص۳۵

اپنے اس توکل میں بنانے والے نے جسے اپنا وکیل بنایا تھا، اس نے اپنی وکالت کا حق کس طرح پورا کیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کافی ایمان افروز واقعات ہوں گے، لیکن دیکھنے والوں ہی نے جب بیان نہیں کیا تو جس نے نہیں دیکھا وہ کیا بتائے۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے، کہ کافی خوشی اور خرمی انبساط ونشاط ہی کے ساتھ یہ سفر پورا ہوا تھا۔ جہاز میں تراویح کا سنانا، مکلا پہنچکر مقلی حلوا خرید کر احباب میں ختم تراویح کی شیرینی کے طور پر تقسیم انبساط وانشراح قلب کی غمازی کر رہی ہے پراگندہ دلی و افسردگی میں ان باتوں کی بھلا کیا گنجائش؟ بلکہ اسی موقعہ پر بے ساختہ یہ جملہ معترضہ ان کے قلم سے جو ٹپک پڑا ہے، یعنی "جہاز میں کیا سیر تھا" ص۳۵ خود اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافی سرور ونشاط کے ساتھ سفر پورا ہو رہا تھا۔

بہرحال جیسا کہ مصنف امام کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ حج وزیارت کے اس مقدس سفر میں کم وبیش ایک سال کی مدت صرف ہوئی، ۱۸۵۷ء کو فتنہ گویا سمجھنا چاہئے تقریباً چار پانچ سال گذر چکے تھے، ۱۸۶۰ء میں حضرت کی روانگی ہندوستان سے ہوئی تھی اور ۱۸۶۱ء میں واپسی ہوئی۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی سیاسی حالت روز بروز بدلتی چلی جا رہی تھی، انتقام کی آگ حکومت کے سینے میں روز بروز جیسا کہ چاہئے تھا قدرتاً دھیمی پڑتی رہی۔ بیسیوں مجرمین جن کے نام عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی استثنائی فہرست سے نہ نکلے تھے۔ تدریجاً نکلتے چلے جا رہے تھے۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا واقعہ پیش آیا، کہ حجاج کا وہی قافلہ جو پنجاب والی خشکی وتری کی راہ سے کراچی اور وہاں سے بادبانی جہاز پر حجاز پہنچا تھا، اسی کے پاس کس قسم کی اطلاعیں ہندوستان سے پہنچی تھیں، کہ اسی قافلہ کو یعنی سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء سفر کو دیکھتے ہیں کہ واپس لوٹتے ہوئے، بجائے کراچی کے بندر کے مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مراجعت براہ بمبئی اور ناسک ہوئی، ریل ناسک تک تھی، وہاں سے گاڑیوں میں آئے۔" [illegible]

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ

"ربیع الاول کے آخر میں بمبئی آئے۔ جمادی الثانی تک وطن پہنچے۔" [illegible]

گویا بمبئی سے وطن تک پہنچنے میں دو ڈھائی مہینے صرف ہوئے،

اگرچہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ بمبئی کی راہ سے یہ واپسی بھی "روپوشی" ہی کی شکل میں تھی، یا یہ قصہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن قرائن کا اقتضا اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگرانی میں اضمحلال اور لاپروائی کی کیفیت ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ اسی حج کے سفر سے واپسی کے تذکرے کو ختم کر کے مصنف امام نے لکھا ہے کہ،

"پیچھے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبہ عام اٹھا دیا تھا، چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا۔"

واللہ اعلم بالصواب "پیچھے" کے لفظ سے ان کی کیا مراد ہے، بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کے پیچھے جب وہ عرب میں تھے۔ حکومت کی طرف سے تحقیقات کے بعد "مطالبہ" کی گرفت ڈھیلی کر دی گئی تھی، اور صرف چند مخصوص شخصیتوں کی حد تک قصہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

مصنف امام کے اس بیان کے سوا اس وقت تک مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جس میں صراحۃً اس کا ذکر کیا گیا ہو کہ سیدنا الامام الکبیر کے اسم گرامی کو اشتہاری مجرموں کی فہرست سے نکال دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے بیان کے فحوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حج کے سفر سے واپسی کے بعد سیدنا الامام الکبیر کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حج سے واپس ہونے کے بعد حضرت والا

"پھر گھر پر اپنے رہے۔" ص۳۹

سمجھنا چاہئے کہ اسی نقطہ پر ۵۷ء کے جہاد کی مہم آپ کی ختم ہو گئی۔

باقی رہے حضرت حاجی صاحب کے صاحبین میں سے دوسرے صاحب یعنی قطب ربانی حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو جہاں تک میرا خیال ہے ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی اپنے رفیق سیدنا الامام الکبیر کی طرح آپ کا شمار بھی ان ہی استثنائی مجرموں میں تھا، جو اس معافی نامہ سے مستفید ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے حضرت گنگوہی کو حکومت نے گرفتار بھی کر لیا تھا، اور حوالات میں ڈال کر چھ مہینہ تک آپ پر باضابطہ مقدمہ چلتا رہا، غیبی امداد سرگرم کار تھی، نہ بڑے بڑے وکیل تھے اور نہ بیرسٹر۔ لیکن اس آفت ناگہانی سے بخیر و خوبی آپ سالم و غانم ہو کر نکل آئے۔ جس کی تفصیلات تذکرۃ الرشید میں پڑھنا چاہئے۔ یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت گنگوہی کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"تخمینے سے یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ ہجری کا ختم یا ۱۲۷۶ھ کا شروع سال ہے" ص۸۵

اگر یہی واقعہ ہے تو عیسوی سن کے حساب سے یہ ۱۸۵۸ء کا آخر اور ۱۸۵۹ء کی ابتدا کا زمانہ ہے، اور عرض کر چکا ہوں کہ ۱۸۵۸ء کے نومبر ہی میں عام معافی نامہ کا اعلان حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں کیا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر مقدمہ عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد چلایا گیا۔

حضرت مولانا گنگوہی کی گرفتاری کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے جن کا ذکر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے کیا ہے۔ آج بھی ان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ستر سواروں کو ساتھ لیکر ایک مسلمان غلام علی نامی کی مخبری اور رہنمائی میں کرنل گارڈن نے گنگوہ پر دھاوا کیا، مولانا گنگوہ میں موجود نہ تھے۔ لیکن ان کے اشتباہ میں حضرت کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر صاحب مرحوم کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جو مسجد کے کسی گوشہ میں گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ مولوی عاشق الٰہی کی روایت ہے کہ سواروں میں سے ایک سوار نے مولوی ابوالنصر

"کی گردن پر زور سے ہاتھ مارا اور پکارا کہ چل کھڑا ہو، گردن جھکائے کیا بیٹھا ہے" ص۸۵

مولوی ابوالنصر حالانکہ جانتے تھے کہ مولانا گنگوہی کے شبہ میں مجھے گرفتار کر رہا ہے لیکن اس مرد خدا

اللہ کے بندے کی زبان سے یہ تو نکلا کہ

"میں رشید احمد نہیں ہوں"

اخلاص و وفا کی یہ مثالیں سلف[۱] میں تو سننے میں آئی ہیں۔ لیکن روح القدس کا فیض خلف میں بھی ایسی روحوں کو پیدا کرتا رہا ہے۔ ایک زندہ شہادت تو اس کی یہی ہے۔

بہر حال کہا جاتا ہے کہ حضرت گنگوہی ایک مسلمان حکیم احمد امیر بخش کی مخبری سے رامپور منیہاران میں گرفتار ہو گئے' اور بقول مولانا عاشق الٰہی سہارنپور جیل کے اندر

"تین چار یوم کال کوٹھری' اور پندرہ دن جیل خانہ کی حوالات میں مقید رہے"

سہارنپور سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کر دیا گیا' لکھا ہے کہ

"مظفر نگر کے جیل خانہ میں حضرت کو کم و بیش چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا"

قرآن مجید کے حفظ کا کام تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی پورا کر چکے تھے جیل میں تلاوت و ذکر و شغل کے ساتھ ساتھ وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا لکھا ہے کہ

"حراست کے زمانہ میں آپ کی نماز ایک وقت کی بھی قضا نہ ہوئی"

نماز صرف قضا ہی نہیں ہوئی' بلکہ

"محبس کی کوٹھری میں بھی نماز با جماعت ادا کرتے رہے" ملخص تذکرۃ الرشید ج ۱

سیرت و کردار اور تقویٰ کی زندگی کا اثر جیل خانہ میں بھی یہ ہوا' کہ قیدیوں میں

"بہتیرے وہیں آپ سے بیعت ہوئے"

اس سلسلہ میں ہماری کتاب کے موضوع کے لحاظ سے قابل ذکر اس واقعہ کا اہم ترین جز وہ ہے جس کا

---

[۱] طبقات ابن سعد میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی گرفتاری کا حکم حجاج مشہور ظالم امیر نے دیا' وہ روپوش تھے' کوفہ ہی میں ایک دوسرے عالم و واعظ ابراہیم تیمی بھی تھے۔ حجاج کے آدمیوں نے ابراہیم نخعی کے اشتباہ میں ابراہیم تیمی کو گرفتار کر کے حجاج کے دربار میں پہنچا دیا' حجاج نے جیل بھی ان کو بھجوا دیا' ابراہیم تیمی جانتے تھے کہ میں نخعی کے شبہ میں پکڑا گیا ہوں۔ لیکن اس حقیقت کو آخر وقت تک ظاہر ہونے نہ دیا۔ تا اینکہ جیل ہی میں وفات بھی ہو گئی۔

تذکرہ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس وقت سہارنپور سے پابزنجیر مظفرنگر پولیس کی نگرانی میں حضرت گنگوہی جارہے تھے، راستہ دو دن میں طے ہوا تھا۔ سڑک سہارنپور سے مظفرنگر جانے والی دیوبند ہوکر گذرتی تھی، وہی دیوبند جہاں ان کے رفیق الدنیا والآخرۃ عاشق زار، یار وفادار سیدنا الامام الکبیر مسجد نرن میں اپنے اللہ کی پناہ میں زندگی گذار رہے تھے۔ حضرت گنگوہی کی دیوبند کی سڑک سے گذرنے کی خبر کسی طرح آپ تک پہنچ گئی۔ دل تڑپ اٹھا، تاکنے والی آنکھیں حالانکہ چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے بیان کیا جاتا ہے، کسی ایسی جگہ پر جاکر کھڑے ہوگئے، جہاں سے ان کی نظر اپنے محبوب رفیق پر پڑ سکتی تھی۔ اچانک ہاتھوں میں بیڑیاں پاؤں میں زنجیر پہنے ہوئے، ہندوستان کا محدث اعظم ان کے سامنے آگیا۔ پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ بات تو بات شاید اشارے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ زبان حال سے حضرت گنگوہی کی طرف سے روح کی فضاؤں میں یہ آواز گونج رہی تھی

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست

تونیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست،

گویا بلفواے شعر مذکور یہ سارا قصہ جو کچھ بھی پیش آیا تھا، گذرچکا کہ سیدنا الامام الکبیر ہی کے اقدام و اصرار کا نتیجہ تھا۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ

"سنا ہے کہ دیوبند کے قریب گزرنے پر مولٰنا قاسم العلوم نظر براہ راستہ سے کچھ ہٹ کر بغرض ملاقات پہلے سے آکھڑے ہوئے تھے۔ گو خود بھی مخدوش حالت میں تھے مگر بے تابیٔ شوق نے اس وقت چھپنے نہ دیا، دور ہی دور سے سلام ہوئے۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا۔"

گویا ع، باہم نگریستیم وگریستیم وگذشتیم، کی صورت بجلی کی طرح سامنے کوندگئی، یہ مصرعہ عرفی کا ہے جس میں نگریستیم کے بعد "گریستیم" کا اس نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جس راوی سے یہ خبر سنی تھی، اس کا بیان تھا کہ باہم ایک دوسرے کو دیکھ کر "مسکرائے" "بے ساختہ

ٹونکی شاعر کیف مرحوم کا شعر بادنیٰ تصرف یہاں یاد آرہا ہے۔

ملتے ہی آنکھ رنج نہ تھا ظلم غیر کا
ملک
کیا جانے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے کچھ کہا' جانے والا مظفر نگر جیل میں داخل ہونے کے لئے مظفر نگر کی طرف روانہ ہو گیا' اور دیکھنے والا' جب تک دیکھ سکتا تھا' دیکھتا رہا۔ پھر ان ہی آنکھوں پر کیا گذری تھی کہ جو دیکھنے سے بھی محروم کر دی گئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں صاحبین کے شیخ نے تو خیر مکہ معظمہ ہی کو وطن بنا لیا' اور یہی ان کے لئے مقدر بھی تھا' پیدا ہوئے تھے ہند میں' لیکن قدرت ان کو شیخ العجم والعرب بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس فیصلہ کی تکمیل اسلام کے قبلہ اور مرکز میں قیام کے بغیر ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ باقی صاحبین! تو دیکھ چکے کہ معافی عام کے اعلان کے بعد بھی دونوں پر حکومت کی نگرانی قائم رہی' حضرت گنگوہیؒ پر تو مقدمہ بھی چلا۔ جو خطرہ ان کے لئے تھا۔ وہ معمولی نہ تھا' تذکرۃ الرشید میں مولوی عاشق الٰہی نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک کا احساس تھا کہ حکومت حضرت گنگوہیؒ کو پھانسی دے دے گی' ایک دفعہ اپنے رفقاء سے فرمایا بھی کہ

"میاں کچھ سنا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا"۔ ۵۵

اور جب پھانسی تک کی سزا کا اندیشہ حضرت گنگوہیؒ کے متعلق پیدا ہو چکا تھا' اور اس قسم کی خبریں اڑنے لگی تھیں' تو پھر جس نے شاملی کے دروازے کو جلایا تھا' جس کے جل جانے کی وجہ سے خدا ہی جانتا ہے کہ حکومت کی فوج کے کتنے آدمی مارے گئے۔ جنیو کا ہاتھ چلا کر عفریت پیکر فوجی کو جس نے دو پارہ کیا تھا۔ اس کے سوا خود اس کی تلوار نے کتنوں کو ٹھکانے لگایا تھا' زخم چشم کی عینی شہادت سے جس کا جرم پہچانا بھی جا سکتا تھا' اندازہ کیا جا سکتا ہے' کہ وہ خطرات کی کتنی گہری تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو گا' جو کچھ بھی سوچا جا سکتا ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ سب ہی کی گنجائش تھی لیکن حضرت

گنگوہی پر مقدمہ چلنے، اور جیل میں رہنے کے باوجود اور بقول مولنا عاشق الٰہی سہارنپور میں بھی

"تحقیقات پر تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی" ص۸۲

اور مظفر نگر میں بھی حاکم کے سامنے بار بار پیش ہونے پر جس کا حال یہ رہا ہو کہ

"جو کچھ وہ دریافت کرتا، بے تکلف اس کا جواب دیتے تھے، کبھی کوئی کلمہ دبا کر زبان کو موڑ کر نہیں کہا، کسی وقت جان بچانے کے لئے تقیہ نہیں کیا، جوبات کہی سچ کہی" ص۸۲

با این ہمہ پھانسی تک کا خطرہ کیا بلکہ گونہ یقین تک کی کیفیت جس کے متعلق پیدا ہو چکی تھی، دیکھا گیا کہ حاکم اس سے پوچھتا ہے کہ

"رشید احمد تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا، اور فساد کیا؟"

جواب میں صرف چند الفاظ

"ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی"

اور کچھ نہیں کہا گیا، پوچھا گیا

"تم نے سرکار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے؟"

بجائے زبان کے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پہلے ہاتھ اٹھا، جس میں تسبیح تھی، اسی تسبیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا تھا

"ہمارا ہتھیار تو یہ ہے"

"ہاتھ کا یار" یا ہاتھ کی یاری جس سے تھی، اسی کو دکھا دیا گیا، گویا ہاتھ کے اشارے سے حافظ کی غزل سنائی جا رہی تھی

گرچہ ما بندگان بادشہیم	بادشاہان ملک صبحگہیم
گنج در آستین و کیسہ تہی	جام گیتی نما و خاک رہیم

اور یہ کہ ع روی ہمت بہر کجا کہ نہیم

دشمنان را زخون کفن سازیم	دوستان را قبائے فتح دہیم

کچھ مصنوعی بندر بھبکیوں کے بعد دیکھا گیا' روایت متواتر ہے' مصدق بالمشاہدہ ہے کہ "پھانسی کے حکم کا انتظار جس کے لئے کیا جا رہا تھا" اسی کے متعلق فیصلہ سنانے والا فیصلہ یہ سنا رہا تھا یا اس سے سنوایا جا رہا تھا کہ

"رشید احمد رہا کئے گئے"

اور یہاں تو خیر گرفتاری بھی ہوئی' مقدمہ بھی چلا' پیشی بھی ہوئی۔ پوچھ تاچھ سے بھی کام لیا گیا' لیکن جس کا جرم بھی سخت تھا' اور اپنے جرم کی عینی شہادت جس کی پیشانی پر چمک رہی تھی' اپنے تمام ممکنہ وسائل کے ساتھ حکومت کی لا محدود آنکھیں اسے ڈھونڈھتی رہیں' وہ ان ہی آنکھوں کے نیچے چلتا پھرتا رہا' ان ہی کے درمیان سے گذرتا ہوا پنجاب پہنچا' پنجاب سے سندھ' سندھ سے عرب تک سمندر پھلانگ کر پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس بھی لوٹا' دیکھنے والے دیکھتے بھی رہے' لیکن وہ کسی کو نہ سوجھا' اور آج تک یہ سربستہ اسباب معمہ ہی بنا رہا کہ ڈھونڈھنے والوں کی اقطار ہند میں بکھری ہوئی نگاہیں اچانک کیوں سمٹ گئیں۔ جو مجرم اور سخت مجرم تھا' وہ جرم سے بری کیوں ٹھہرا دیا گیا۔ کم از کم میری جستجو اور تلاش کے لئے تو یہ سوال ابتدا میں بھی چیستاں ہی تھا' اور سب کچھ الٹنے پلٹنے اور اسباب کے سارے دفاتر ممکنہ کے کھنگال ڈالنے کے بعد بھی' اب تک وہ چیستاں ہی بنا ہوا ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے معموں کا حل ان نمائشی اسباب و مسببات کے پرپیچ سلسلوں میں تلاش کرنا ہے بھی نادانی۔ ایسے حیرت ناک امور اور ان کے حیرت افزا نتائج کا حل صرف ان غیبی میدانوں میں دستیاب ہو سکتا ہے جن کی سرحد عالم محسوسات کے ماوراء سے شروع ہوتی ہے۔ یقیناً وہ مختوم القلوب انہیں کبھی نہیں سمجھ سکتے جو ہر وقت محسوسات ہی کے دائروں میں تہ و بالا اور غلطاں و پیچاں ہوتے ہوئے بالآخر ایک دن اسی ناسمجھی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ ع ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس چیستاں کا حل کہ حکومت کی نگاہوں میں ایک سخت ترین مجرم اس کی [illegible] کے

بعد بھی صاف بچا رہے اور وہ کہ جسے خود حکومت کا فیصلہ بری قرار دے رہا ہو، اسی کے ہاتھوں ۶ ماہ جیل میں بند رہے۔ ستاروں کے پیچھے ان ہی عرشی انسانوں کے واقعات کے مبادی ہیں تلاش کرو تو بآسانی مل جائے گا۔ خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ایک جملہ سے یہ سارا مجمل متن حل ہو جاتا ہے۔ مولانا گنگوہی رحؒ نے جیل سے رہائی کے بعد فرمایا کہ جہاد شاملی کے مسئلہ میں مجھے ابتداءً کچھ تامل تھا۔ شاید اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مجھے ۶ ماہ جیل میں رہنا پڑا اور مولانا محمد قاسم صاحب رحؒ کو کسی وقت بھی کوئی تامل نہیں ہوا تو وہ اس ابتلاء سے نہیں گذارے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ جس معمہ کو وابستگان اسباب کاوشوں کے بعد بھی حل نہ کر سکے، ایک وابستۂ غیب نے اسے چٹکیوں میں حل کر کے حیرتوں کا پردہ چاک کر دیا۔ یعنی معاملہ کا تعلق حسی اسباب سے زیادہ باطنی شئون سے نکلا۔ ہو سکتا ہے کہ ان تنگ چشمانِ عالم محسوسات کے لئے یہ مسئلہ پھر بھی چیستان ہی رہے۔ جنہیں غیبی مقامات پر دھیان دینے کی نہ فرصت ہے نہ اہلیت، لیکن ان کی تنگیِ چشم و داماں سے عالم روحانیات کی لامحدود وسعتوں اور ان سے وابستہ رہنے والوں کے وسیع ترین حوصلوں اور ذہنی وسعتوں میں اس سے فرق ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے اور اگر اس تقدیری حقیقت کو تدبیر کے سلسلوں میں نمایاں کرنے کے وسائل کسی کے سامنے نہ آئیں تو اصل حقیقت پر اس سے کیا غبار آ سکتا ہے۔؟

ذوق و وجدان کی راہ کو چھوڑ کر جو لوگ خواہ مخواہ اصول اور استدلال ہی کی راہ پیمائی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے بھی آخر اس قدرتی اصول میں تامل کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کہ جس کی راہ میں سو جان سے جان دینے کے لئے کھڑا ہونے والا کھڑا ہوا اسی نے اس کی جان تک کسی متجسس کسی جاسوس اور کسی دوش کو نہ پہنچنے دیا۔

اگر اس اصول کے نیچے اس لمبی چوڑی تاریخ کو رکھ لیا جائے جو اس اصول کے لئے دلائل اور مظاہر کی حیثیت رکھتی ہے تو اس میں معمہ کی کیا بات رہ جاتی ہے۔ جاں سپاروں کی جانوں کو ملائکہ مسوّمین کے ذریعہ محفوظ کرا دیا جائے۔ رجال غیب کے ہاتھوں جلادوں کے ہاتھ شل کرا دئیے جائیں۔

اور حکام کے قلم پھیر دئے جائیں۔ خلیل کے ہاتھ کی چھری ذبیح کے گلے پر آ کر کند کر دی جائے۔ راہ ہجرت میں حبیب کے بچاؤ کے لئے دیکھتی آنکھوں سراقہ ابن مالک کے گھوڑے کی ٹانگیں زمین میں دھنسادی جائیں، جو غیبی طاقت ان حقائق میں بلا توسط اسباب بلکہ خلاف اسباب اپنے جاں بازوں کے لئے یہ کرشمے دکھلا سکتی ہے۔ اسی قوت نے اگر شاملی کے میدان اور میدان کے مابعد اپنے سچے جاں نثاروں کی جانوں کے تحفظ کے لئے دشمنوں کی کھلی آنکھوں کو نابینا، حکام کے رواں قلموں کو شکستہ اور ان کی بولتی زبانوں کو گنگ بنا دیا تو یہ کوئی نیا سانحہ اور حیرت ناک چیستاں کب ہے کہ اسے عقدۂ لاینحل بنا لیا جائے؟ بلکہ ہر دور اور ہر قرن کا ایک عام اصول ہے۔ جسے تاریخ دہراتی چلی آئی ہے۔ بہر حال ذوق و وجدان، اصول و استدلال اور تاریخ و مشاہدات سبھی اس پر ایک زبان ہیں کہ من کان للہ کان اللہ لہ۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

۱۸۵۷ء میں جو طوفان اٹھا تھا، وہ اوروں کے لئے کسی وقت بھی ختم ہوا ہو۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ نشیب و فراز کی مختلف منزلوں سے گذرتے ہوئے صحیح معنوں میں اس وقت تھما، جب ۱۲۷۷ء کا سال گذر رہا تھا، اور پہلے حج کے سفر سے براہ بمبئی آپ نانوتہ واپس ہوئے، اسی کے بعد جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"پھر گھر پر اپنے رہے"۔ ۱۷۹

حضرت والا کی زندگی مبارک کے یہی چند سال (پانچ چار سال کے قریب) وہ ہیں جن میں جہاد کے فرض کفایہ، اور حج کے فرض عین سے بھی سبک دوشی آپ کے لئے آسان کی گئی، اور اسی محدود مدت میں حفظ قرآن کی سرمدی دولت و سعادت سے بھی سرفرازی میسر آئی جو مصائب و آلام کا دباؤ آپ پر ڈالا گیا۔ ان کے یہ ثمرات و نتائج تو وہ ہیں جنہیں دیکھنے والوں نے دیکھا اور جاننے والوں نے جانا، لیکن عالم شہادت اور عالم محسوس کے پیچھے غیبی میدانوں کا لامحدود سلسلہ جس کے سامنے ہو، اس کے مدارک کو کوئی کیا بیان کر سکتا ہے کہ پانے والے نے ان مصائب کا صلہ کیا کچھ پایا۔ قرب و وصال کی کتنی کتنی بلند منزلیں طے کر ڈالیں

اور ان جاں بازیوں میں اس کے سلف کو جو کچھ ملا تھا اسے اس میں سے کیا کچھ مل گیا ؟ ۔

شرح صدر کی نعمت پانے والوں کے لئے یقین مانئے کہ مصیبت کا ہر دباؤ قیبی حدود کا چڑھاؤ بنتا چلا جاتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عروج وارتقاء کے آخری نقطہ تک چڑھائی کی جو صورت اسراء کی رات میں پیش آئی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ شعب ابی طالب کے ہولناک تاریخی دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

فاتبعونی کی پکار پر چل پڑنے والوں کے سامنے کیسے بتایا جائے کہ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کسی نہ کسی رنگ میں وہ سب کچھ پیش آتا ہے، جس سے خود فَاتبعونی کا پکارنے والا گذرا تھا، یا اسے گذارا گیا تھا۔ فصلے اللہ تعالٰی علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

شاہکار

حد سے زیادہ تاریک اور مہیب مستقبل جس سے اچانک سرزمین ہند میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ دوچار ہو گئی تھی' اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اترنے والے میدان میں اترے' آپ دیکھ چکے کہ ایک طبقہ تو ان ہی میں ان لوگوں کا تھا جو بہ یک جست قلندرانہ کیفیت یا شہیدانہ دوسروں کو نہ سہی لیکن خود اپنے آپ کو ایسے "روشن مستقبل" تک پہنچا دینے میں کامیاب ہو گیا' جس کے بعد تاریکی کا خطرہ ہی باقی نہیں رہتا' تھانہ بھون کی جہادی مہم میں اس طبقہ کے سرگروہ حضرت حافظ ضامن شہید نور اللہ مرقدہ تھے ۔

لیکن فمنہم من قضی نحبہ[1] کے فرض سے سبکدوش ہونے والے اس گروہ کے مقابلہ میں و منہم من ینتظر کی قدرتی کمند نے جن کو "تاریک مستقبل" ہی کے ساتھ کش مکش کرنے کے لئے روک لیا تھا' کیا آگے بڑھنے سے وہ رک گئے ؟ بجائے گھٹنے کے تاریکی بڑھتی ہی چلی جاتی تھی' لیکن مرزا غالب جس زمانہ میں گا رہے تھے کہ

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

اس زمانہ میں دیکھنے والوں نے چشم سر سے دیکھا کہ واقعی کسی کے سر سے خون کی موج ابل رہی تھی

---

[1] اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف ہے جس میں ارشاد ہوا ہے

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنہم من قضی نحبہ ومنہم من ینتظر (الاحزاب)	ایمان والوں سے کچھ لوگ وہ ہیں کہ سچ کر دکھایا جس کا خدا سے عہد و پیمان کیا تھا پھر ان میں بعضوں نے اپنا ذمہ پورا کر دیا' اور بعض ان ہی میں انتظار کر رہے ہیں عہد کی تکمیل کا ۔

پوچھنے والے پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا؟ اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ کچھ نہیں ہوا کچھ نہیں ہوا' زد در زد ہو کر اس کے چہرے پر گولی چلائی گئی' بندوق کی گولی چلائی گئی۔ مونچھ اور داڑھی کا بھی کچھ حصہ جل گیا۔ آنکھوں کو بھی چشم زخم پہنچا۔ لیکن جو آگے بڑھنے ہی کے لئے میدان میں اترا تھا وہ بس کچھ اسی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا' جدھر جانے کا وہ فیصلہ کر چکا تھا' طوفان کا رخ پھیرا جائے گا' جو اندھیرا پھیلا ہے' اس کو روشنی سے بدلا جائے گا' اس کا یہ عزم صمیم اب بھی تر و تازہ تھا' اس کی اُمنگوں کا جوش اب بھی باقی تھا' بلکہ شاید کچھ زیادہ تیز' زیادہ قوی ہو گیا تھا' ۱۸۵۷ء تک تو اس کے ہاتھ میں تلوار بھی تھی' اس ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد تو یہ تلوار بھی چھن گئی' اور غالب ہی کے الفاظ میں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں'

آہنی اور نقرئی و طلائی الغرض سارے ہتھیار جن سے کام لیا جاتا ہے' وہ سب ہی سے نہتا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے ارادے کی بلندیاں اب بھی باقی تھیں' حالانکہ وقت تنگ ہو چکا تھا' لیکن اسی تنگ وقت میں اس سے جو کچھ ہو سکا کر گذرا' اس کی بھی کوشش بار آور اور سعی مشکور ہوئی' یوں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ وہی دینی و علمی تحریک ہے' جو ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کی طرف منسوب ہو کر "دیوبندیت" کے نام سے عوام و خواص میں موسوم و مشہور ہوئی۔

یہ دینی و علمی تحریک جس کا عرفی نام "دیوبندیت" ہے' اور اپنے بانی[1] کے نام کی نسبت سے اس کی تعبیر چاہئے تو یہی کہ

"قاسمیت"

سے کی جائے۔ حقیقت کی آئینہ دار سچ پوچھئے تو یہی تعبیر ہو سکتی ہے۔

---

[1] مراد حضرت نانوتوی قدس سرہ ہیں ۱۲

بہر حال دیوبندیت کہئے یا قاسمیت کی تحریک، اپنی اصل حقیقت کی رو سے کیا ہے، کیا یہ کوئی بسیط حقیقت ہے! یعنی اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے کسی خاص عصری نظام ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے! بظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے، لیکن حقائق آگاہ دیدہ وروں سے پوچھئے، وہ آپ کو بتائیں گے کہ جیسے یہ ایک تعلیمی نظام ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خاص قسم کی دینی و روحانی تربیت کا ایک ایسا معتدل سانچہ اور قالب بھی ہے، جس میں ڈھل کر نکلنے والوں میں اسلامی مطالبات کے اعتقادی و عملی، ظاہری و باطنی، عناصر کا امتزاج کچھ ایسے رنگ میں ہو جاتا ہے، جس کی نظیر کم از کم اس زمانہ میں ہندوستان تو ہندوستان، شاید بیرون ہند کے کسی اسلامی ملک میں بھی بآسانی نہیں مل سکتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ اس تحریک کے قیام میں ابتدا ہی سے کچھ ایسی چیزیں گھلی ملی ہوئی ہیں، جو ایک طرف خود ہندوستان کو بھی اپنے صحیح سیاسی مقام تک ان شاء اللہ تعالیٰ پہنچا کر رہیں گی، اور دوسری طرف عام عالم اسلامی سے بھی رشتۂ اتحاد و اخوت کے استحکام میں ان سے کافی مدد ملتی رہی ہے، آئندہ بھی ان شاء اللہ ملتی رہے گی۔ اور خواہ اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن ہندی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں بھی اس تحریک سے غیر معمولی انقلاب ہوا، بلکہ انصاف سے اگر کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے پس ماندہ طبقات کی معاشی حالت کے سدھارنے میں بھی اس تحریک سے کافی تقویت پہنچی ہے[۱]۔ اور حق تو یہ ہے کہ حالات کی ناموافقت اگر آڑے نہ آجاتی، جس کی وجہ سے اس تحریک کے بعض اہم اجزا کی عمر مختصر ہو کر رہ گئی، تو ہمارا وطن شاید آزادی سے بہت پہلے آزادی کی ایک بڑی منزل طے کر لیتا۔ کم از کم حکومت متسلطہ کی تعمیر کا ایک اہم غیر معمولی

---

[۱] کیونکہ اس نظام تعلیم سے زیادہ تر استفادہ کا موقع مسلمانوں کے ان پس ماندہ طبقات ہی کے بچوں کو ملا جو اپنی معاشی ابتر حالیوں کی وجہ سے حکومت کے قائم کئے ہوئے جامع یا یونیورسٹیوں کی اس تعلیم کو حاصل نہیں کر سکتے تھے جن سے سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، آج کل ان میں بہت سے مسجدوں کی خطابت اکبر مرحوم کی پیشین گوئی خواہ جتنی بھی حوصلہ گسل ہو لیکن جس عہد سے ہم گذر رہے ہیں، عربی اور دینی تعلیم کی عمومیت سے غریب مسلمانوں کی معاشی سطح کے بلند کرنے میں ضرور مدد ملی ہے۔ اپنے ایک مستقل مقالہ میں فقیر نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے جو شاید مجلہ دار العلوم کے دور اول میں شائع ہوا تھا۔ ۱۲

ستون تو یقیناً گر جاتا ' آئندہ اوراق میں ان ہی باتوں کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آپ کے سامنے آئیگی ۔

الغرض نام کے لحاظ سے تو میں نہیں کہتا ' لیکن کام جو انجام پایا ' اسکو دیکھتے ہوئے بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی و تدریسی تحریک کے ساتھ ساتھ دیوبندیت ایک قسم کی معاشرتی تحریک بھی ہے ' اور سیاسی بھی ' دینی ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے پس ماندہ طبقات کی دنیاوی فلاح و صلاح میں بھی اس کا کافی حصہ ہے ' اور بوالعجبی یہ ہے ' کہ گوناگوں پہلوؤں والی اس تحریک کا سرچشمہ نہ تو باضابطہ کوئی سوسائٹی تھی ' نہ انجمن ' بلکہ سیدنا الامام الکبیر اپنے چند راستباز مخلص رفقاء کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے ' پھر جس کے ہاتھ میں ہر کام کی آخری باگ ہے ' وہ اس کو آگے بڑھاتا چلا گیا ' واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔

بتا چکا ہوں کہ ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۷ھ ہجری میں سیدنا الامام الکبیر سفر حجاز سے واپس ہوئے ' اور ۱۸۷۹ء مطابق ۱۲۹۷ھ ہجری میں کل (۴۹) سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوگیا ' گویا ۵۷ء کے فتنہ کے بعد اٹھارہ سال سے زیادہ وقفہ آپ کو خاکدان ارضی پر قیام کا نہیں ملا ۔ اٹھارہ سال کے اس وقفہ میں بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا ۔ یک سوئی کے ساتھ آپ کی سرگرمی اور مشغولیت کی مدت کم و بیش ایک عشرہ یا دس گیارہ سال کے قریب قریب ہے ' لیکن اسی مختصر زمانہ میں اس ہمہ گیر تحریک کی صرف بنیاد ہی قائم نہیں ہوئی ' بلکہ ہر جہتی حیثیت سے وہ اپنے تمام شعبوں میں ترقی کے خاص حدود تک آپ کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی ۔

حیرت اس پر ہوتی ہے ' کہ ان ہی چند گنے چنے سالوں میں ہندوستان کے ایک بدبختانہ شقاقی و افتراقی سیلاب کے مقابلہ میں بھی آپ کو سینہ سپر ہونا پڑا ' یعنی مناظرے کے نام سے مشاتمہ و سابّہ کا جو بازار سیاسی بازیگروں کی اندرونی دسیسہ کاریوں کی بدولت اس ملک میں گرم ہوا تھا ۔ اور پادریوں کے بعد یا ان کے ساتھ ساتھ ایک نیا محاذ پنڈت دیانند سرسوتی جی نے کھول دیا تھا ۔ جیسا کہ آئندہ بتفصیل معلوم ہوگا ' اپنی افتاد طبع کے برخلاف واقعات و حالات نے اس محاذ پر بھی آپ کو لاکر کھڑا کر دیا ' کھڑے ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا تھا ' اس کی یاد دلوں سے اس وقت تک محو نہیں ہوئی ہے ' اور یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کی ساری تصنیفی یادگاریں

بھی وقفہ کی اسی قلیل مدت میں تیار ہوئیں لیکن اکثر و بیش تر حصہ یہ واقعہ ہے کہ اسی مختصر زمانہ میں قلم بند ہوا ہے، قدرتی کارفرمائیوں کے ان ہی استثنائی مظاہر کو دیکھ کر کہنے والے نے کہا تھا کہ

لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

وتلیہ ک للیس ای کی تفسیر یج پوچھئے تو اسی قسم کی ناقابل فہم سہولتیں اور آسانیاں ہیں، جن کی صحیح توجیہ عام واقعات و حوادث کی روشنی میں ہم نہیں کر سکتے ۔ اور اب آپ کے سامنے اسی اجمال کی تفصیل انشاءاللہ پیش ہوگی ۔ واللہ ولی الامر والتوفیق ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالعلوم دیوبند

کے

اور اسکے

آغاز و تاسیس کی داستان

دیوبندیت کے نام سے اسلامی ہند کی جو تحریک جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تدریس و تعلیم کے مستقل اور خاص نظام ہونے کی حیثیت، بھی اس تحریک کا سب سے زیادہ نمایاں، مشہور اور عام پہلو ہے، جس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کی مشہور عالم تعلیم گاہ پر قائم ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دارالعلوم کے قیام و بناء کی ابتداء کا مسئلہ جب کبھی عوام ہوں، یا خواص کی مجلسوں میں چھڑا، یا چھیڑا جاتا ہے، تو ایک عمومی روایت جو زبان زد عام ہے، اسی کا تذکرہ کر کے سمجھ لیا جاتا ہے، کہ جو تاریخی سوال اٹھایا گیا تھا، اس کا یہی کافی و شافی جواب ہے میرا اشارہ

انار و محمود

والی مشہور روایت کی طرف ہے، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی ہوگا، جو انار و محمود کی اس داستان سے واقف نہ ہو، اور مزے لے لے کر اس قصہ کا ذکر نہ کرتا ہو۔[1]

[1] اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو خیال آتا ہے کہ پڑھنے کیلئے سنہ [illegible] مطابق [illegible] میں خاکسار جب دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو چھتہ کی مسجد میں یاد آتا ہے شرقی دیوار سے متصل انار کا ایک درخت تھا، پرانے طلبہ اسی درخت انار کی طرف اشارہ کر کے بتاتے تھے کہ اسی کے نیچے مدرسہ پہلی دفعہ کھلا تھا۔ ملا محمود اس کے پہلے مدرس پندرہ روپے ماہوار پر مقرر ہوئے تھے اور محمودؒ (یعنی ہمارے زمانہ کے شیخ الحدیث و صدر دارالعلوم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) اسکے پہلے طالب علم تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

چھتہ کی مسجد (دیوبند) میں انار کا درخت جس کے نیچے مدرسہ دیوبند کا افتتاح ہوا
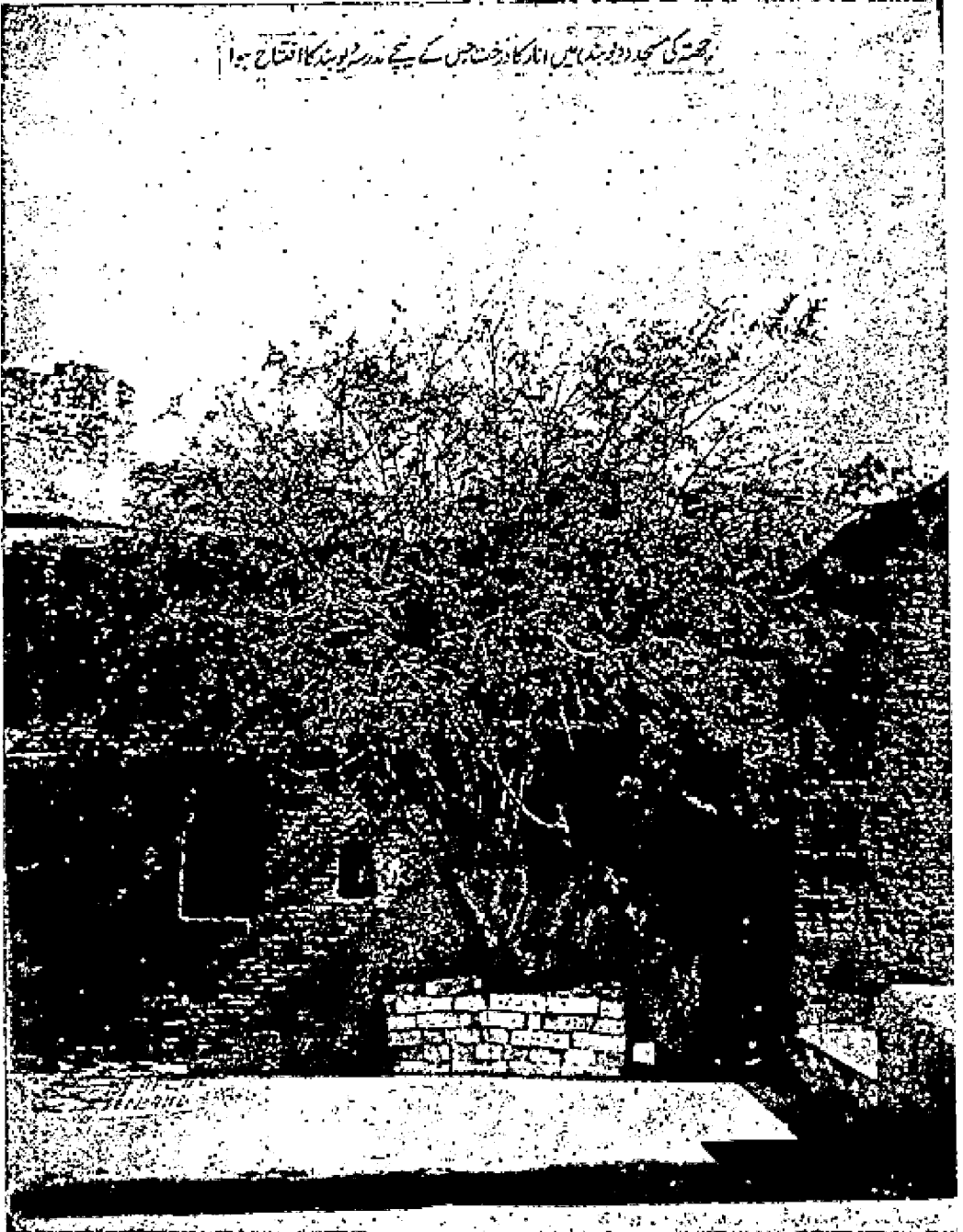
دیوبند کی اس اسلامی درسگاہ کی ابتدا کب ہوئی، اسی کا جواب دیتے ہوئے ہمارے مخدوم و محترم فاضل گرامی قدر مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی مشہور و مقبول کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں یوں رقم فرما رہے ہیں کہ

"۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء تقریباً یوم پنجشنبہ، اسلامی ہند کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے۔"

آگے "انار و محمود" والی حکایت لذیذ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ

"تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ چندہ جمع کیا گیا، اور مسجد چھتہ کے فرش پر

درخت انار

کی ٹہنیوں کے سائے میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا۔"

"درخت انار کی ٹہنیوں کے سائے" کے بعد یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"چندہ کا رومال پھیلانے والا، اور سب سے پہلے چندہ دینے والا عابد تھا۔"

یہ "عابد" کس ذات گرامی کی تعبیر ہے۔ اس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی، اس وقت تو حکایت لذیذ کے اس دوسرے جزء "لفظ محمود" کا تذکرہ مقصود ہے، مولانا نے اسی جزء کا ذکر ان الفاظ میں کیا

"سب سے پہلا معلم محمود، اور متعلم بھی محمود" ص۶۵ حصہ پنجم (علماء ہند کا شاندار ماضی)

(گذشتہ صفحہ سے) ایک نو گرفتار نو عمر طالب علم ہونے کے باوجود خیال آتا ہے، دل میں اس وقت یہی وسوسہ ہوا تھا کہ تقریباً نصف صدی تک انار کے درخت کا باقی رہ جانا کیا عام حالات میں ممکن ہے کیونکہ اس وقت تک تقریباً (۴۷) سال مدرسہ کے قیام پر گذر چکے تھے۔ نصف صدی کے لئے کل تین سال کی ضرورت تھی، واللہ اعلم یہ وہی قدیم درخت تھا، یا کوئی نیا درخت اس کی جگہ لگا دیا گیا تھا، جسے طلبہ انار کی درخت حوض کے ہوئے تھے، معلوم نہیں اب بھی "یہ درخت ام" چھتہ کی مسجد میں موجود ہے یا نہیں۔ جذباتی حیثیت سے جی تو یہی چاہتا ہے کہ کاش! انار کے اس درخت کو محفوظ رکھا جاتا" لیکن بودھ کے مقدس درخت کے انجام کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت رضوان والے درخت کو کیوں کٹوا دیا تھا۔ ۱۲

(نوٹ) یہ درخت انار بعینہ وہی ہے جس کا ذکر اس روایت میں کیا گیا ہے اور آج تک محفوظ ہے۔ (محمد طیب غفرلہ)

ابھی اس سے بحث نہیں کہ بجائے خود اس "روایت" کہئے "یا" حکایت" کی تاریخی قدر وقیمت کیا ہے، واقعات سے کس حد تک اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن جہاں تک میرا احساس ہے سننے والوں پر ابتدائی اثر اس قصہ کا یہ مرتب ہوگا کہ شروع میں شاید کسی مقامی مکتب کی شکل میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، پھر رفتہ رفتہ کچھ سازگار موافق ومساعد حالات پیش آتے چلے گئے، تو جیسے دنیا میں بہت سی چیزیں جو ابتداء میں چھوٹی تھیں، ان کو بڑا بن جانے کا موقعہ مل گیا۔ کچھ یہی صورت حال دارالعلوم دیوبند کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔ ماسوا اس کے اس "لذیذ حکایت" کی دلچسپیوں میں لوگ کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں کہ "دارالعلوم دیوبند" اور اس کے تعلیمی نظام کے خصوصی پہلوؤں کے متعلق جن سوالوں کو اجاگر کر کے اٹھانا، اور ان ہی کی روشنی میں جوابوں کو حاصل کرنا چاہئے ان ہی سے توجہ آدمی کی ہٹ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بذات خود "تعلیم وتعلم" "درس وتدریس" کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے نہ کوئی نیا مسئلہ ہے، اور نہ عجیب بات، جس امت کے دین کی بنیادی آسمانی کتاب "القرآن الحکیم" کی ابتدائی وحی میں اقرء (پڑھ) سے خواندگی کا مطالبہ کیا گیا ہو، اور سب سے پہلے اترنے والی اسی وحی میں علم بالقلم (سکھایا قلم سے) کی نعمت کا ذکر خدائی نعمتوں کے سلسلہ میں قرأۃ اور خواندگی کے مطالبہ کے بعد کیا گیا ہو، انسانی فطرت کی سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ترین امتیازی خصوصیت علم الانسان مالم یعلم (یعنی سکھایا خدا نے "الانسان" کو وہ جسے وہ نہیں جانتا) دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ انجانی باتوں کے جاننے اور جانتے چلے جانے کی فطری استعداد وصلاحیت جو آدمی میں پائی جاتی ہے اسی ابتدائی وحی میں اس پر بھی تنبیہ کی گئی ہے، الغرض نوشت وخواند کی ابتدائی منزل سے تعلیمی ارتقاء کے آخری مراتب ومنازل اور ان کے امکانات ہی پر جس دین کا گویا سنگ بنیاد رکھا گیا ہو، بھلا اس دین کے ماننے والوں کے لئے یہ بھی کوئی اچنبھے کی بات ہوسکتی ہے کہ ان ہی کے بعض افراد نے کسی خاص مقام میں پڑھنے پڑھانے کا نظم شروع کیا تھا، مسلمانوں کی تعلیم وتدریس کا دامن تو اس تعلیمی چبوترے کے ساتھ وابستہ ہے جو مسجد نبوی میں آج تک

تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے "صفہ" کے نام سے قائم ہوا تھا، بحمداللہ اسی کا سلسلہ دنیا کے طول و عرض میں بغیر کسی انقطاع کے جاری رہا، اور امید ہے کہ قیامت تک انشاءاللہ تعالیٰ جاری رہے گا، اسی طرح تعلیم پانے والے طلبہ کے ساتھ مواساۃ و ہمدردی اور ان کے طعام و قیام کا نظم بھی اسلامی دنیا کا قدیم رواج ہے، "صفہ" میں داخل ہونے والوں ہی سے اس رواج کی بھی ابتدا ہوئی اور بعد کو مسلمانوں نے جہاں کہیں وہ گئے کسی نہ کسی شکل میں اس رواج کو قائم رکھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ "انوار محمود" کی اس مقبول و مشہور ہر دل عزیز دلپذیر حکایت میں جو کچھ بھی بیان کیا جاتا ہے، اس کا حاصل یہی تو ہے کہ تعلیم و تدریس کا انتظام دیوبند میں مختصر ترین پیمانے پر کیا گیا تھا۔ لیکن کیا دیوبند کا تعلیمی نظام صرف اسی قدر ہے؟ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ یہ جانتے ہیں کہ یوں تو تاریخ کے طویل و وسیع دور میں اس امت نے دنیا کے ان تمام حصوں میں جہاں جہاں وہ آباد اور توطن پذیر ہوئی، بڑے سے بڑے پیمانے پر تعلیم کا نظم کیا۔ اور گو تعلیم و تدریس کے لئے مدارس کی مستقل عمارتوں کی تعمیر کو مسلمانوں نے ضروری تو کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں قرار دیا تھا، بلکہ بڑی بڑی مسجدوں یا خانقاہوں کے سوا سچی بات تو یہ ہے ابتدائی تعلیم کے منازل عموماً آباد کاروں کے مکانوں، اور ڈیوڑھیوں ہی میں طے ہو جاتے تھے، دور کیوں جائیے، دیوبندی نظام تعلیم کے بانی اعظم واکبر سیدنا الامام الکبیر کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ جیسا کہ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں عرض کر چکا ہوں، اسی دیوبند کے ایک امیر شیخ کرامت حسین دیوبندی یعنی حضرت والا کے خسر کی ڈیوڑھی ہی پر تو گزرا تھا۔ وہی ڈیوڑھی جو آج بھی دارالعلوم کے مشرقی گوشہ میں "دیوان کی ڈیوڑھی" کے نام سے کسی نہ کسی شکل میں کھڑی ہے، اسی ڈیوڑھی کے کسی حصہ میں "مہتابی مکتب" قائم تھا۔ جہاں دوسرے بچوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے بانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایام طفولیت و معصومیت میں ابتدائی تعلیم اپنے استاذ مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم سے حاصل کی تھی اور اسی مکتب خانے میں عربی کی ابتدائی تعلیم آپ کو شروع کرائی گئی تھی۔

بہر حال باوجود اس اطلاقی نقطہ نظر کے یعنی کسی خاص شکل وصورت کے مطابق قالب کے ساتھ تعلیم و تدریس جیسی عام اور اہم ترین ضرورت کو مقید کرنا مسلمانوں نے کسی زمانہ میں ضروری قرار نہیں دیا بلکہ ع

جس جگہ بیٹھ گئے بس وہی میخانہ بنا

بایں ہمہ تاریخ ہی آپ کو بتائے گی کہ اسی قوم نے تعلیم گاہوں کے لئے بڑی بڑی عمارتیں دنیا کے مختلف حصوں میں تعمیر کیں۔ آج بھی ان کی بچی کچھی یادگاریں 'دنیا کے مختلف حصوں اور گوشوں میں پائی جاتی ہیں۔ خاکسار نے بھی اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں ہندوستان کے بعض اہم تعلیمی ایوانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بعضوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تاہم جہاں تک تلاش و تحقیق کا اقتضاء ہے، عہد حاضر کا تعلیمی نظام جس سے مغرب نے دنیا کو روشناس کیا ہے اس میں جماعت بندی، امتحان خصوصاً تحریری امتحان، طلبہ کی حاضری کے رجسٹر اور ازیں قبیل دوسرے لوازم و خواص جن کے ایک بڑے حصہ کو دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں نہ صرف قبول ہی کر لیا گیا ہے بلکہ پوری قوت و احتیاط کے ساتھ تعلیم کی ان جدید خصوصیات کی نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں جتنا لحاظ و پاس ان امور کا کیا جاتا ہے دارالعلوم میں بھی ان پر زیادہ نہیں تو کچھ کم توجہ نہیں کی جاتی، بلکہ کہا جاسکتا ہے، کہ امتحانی سوالات کے افشاء (آؤٹ ہوجانے) کا حادثہ عموماً بڑی سی بڑی یونیورسٹیوں میں کبھی کبھی جو پیش آجاتا ہے، دارالعلوم کو تقریباً اپنی صد سالہ عمر میں اس حادثہ سے جہاں تک میں جانتا ہوں کبھی دوچار ہونا نہیں پڑا۔ جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم کی جدید خصوصیات جو عصری تقاضوں کی بنیاد پر دیوبندی نظام تعلیم میں جذب ہو چکی ہیں، ان کے آثار و لوازم کی حفاظت میں جو کامیابی دارالعلوم دیوبند کو میسر آئی ہے شاید وہ اپنی آپ نظیر ہے، جس میں زیادہ دخل اس خلوص و للّٰہیت کو ہے جو دارالعلوم کے کارکنوں کے کاروبار کی روح ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کرایہ اور بھاڑے پر کام کرنے والوں کو دارالعلوم کے کام کرنے والوں پر قیاس بھی نہ کرنا چاہئے۔ للحرب رجال وللقصعة رجال[1]

[1] عربی کی مشہور ضرب المثل ہے یعنی کچھ لوگ جاں سپاری اور جنگ کیلئے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ صرف "پیالے" کیلئے ۱۲

پس اصل سوال یہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں موجودہ عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کی خصوصیات کے شریک ہونے کے اسباب کیا ہوئے؟ کیونکہ کچھ بھی کہا جائے ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ دارالعلوم سے پہلے مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کا جو عام طریقہ مروج تھا۔ان جدید خصوصیتوں کو ہم اس میں نہیں پاتے۔ افادیت و عدم افادیت کی بحث جداگانہ ہے۔اس بحث سے اگر آپ کو دلچسپی ہو تو خاکسار کی کتاب "مسلمانان ہند کا نظام تعلیم و تربیت" شائع کردہ ندوۃ المصنفین کا مطالعہ کیجئے۔

بہرحال جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے۔دارالعلوم دیوبند کے متعلق اس قسم کی باتیں کہ ابتداء میں کہاں کس حال میں قائم ہوا، جس کا جواب "انا رو محمود" کی حکایت کو دہرا دہرا کر دینے والے دیا کرتے ہیں، ان سے زیادہ اہم یہی سوالات ہیں، شروع ہی سے ان کی طرف اشارے کرتا چلا آ رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہندوستان کی نئی قائم ہونے والی حکومت نے جو مدرسہ عربک کالج کے نام سے دلی میں قائم کیا تھا، مدرسہ سے زیادہ کالج ہی کی خصوصیات و لوازم پر جو مشتمل تھا، اور ان ہی عناصر پر اس کا مشتمل ہونا، قدرتی بات تھی۔ اسی عربک کالج کے صدر والاقدر مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ سے ہمارے سیدنا الامام الکبیر بانی دارالعلوم نے تعلیم حاصل کی تھی، اور کیسی تعلیم؟ بجز علم حدیث کے عمومی طور پر عربی کی اعلیٰ نصابی کتابوں کے مولانا مملوک العلی ہی اُن کے استاد وحید تھے، الا یہ کہ مفتی صدرالدین سے بھی کچھ پڑھا ہو، بعضوں نے تو اس کی تصریح بھی کی ہے[1]۔ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں خاکسار نے بھی قرائن و قیاسات کی بنیاد پر مفتی صاحب کے استاد ہونے کی طرف اپنے ذاتی رجحان کو ظاہر کیا ہے، کچھ بھی ہو، سچی بات تو یہی ہے، جیسا کہ عربی کا مشہور مقولہ بھی ہے کہ

الاب واحد والاعمام شتی	باپ تو آدمی کا ایک ہی ہوتا ہے، اور چچا بہت سے ہوتے ہیں۔

[1] مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں فرماتے ہیں کہ "حجۃ الاسلام دلیتی سیدنا الامام الکبیر مولانا نانوتوی اور امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب کے دوسرے استاذ جناب مولانا مفتی صدرالدین صاحب تھے" صفحہ ج ۵

اس مقولہ کی رو سے علمی اب اور تعلیمی پدر ہونے کی خصوصیت حضرت نانوتوی کے اعتبار سے مولانا ملوک العلی ہی کو حاصل ہے، یہ بات کہ مولانا ملوک العلی سے سیدنا الامام الکبیر نے کالج میں شریک ہو کر تعلیم حاصل کی تھی، یا کالج سے باہر ان کی تکمیل ہوئی تھی، اپنا خیال اس باب میں جو کچھ تھا، اسے پیش کر چکا ہوں، لیکن کالج کے اندر ہو، یا باہر تعلیم تو آپ نے کالج کے استاذ ہی نہیں، بلکہ صدر سے حاصل کی تھی، اور اسی زمانہ میں حاصل کی تھی، جب وہ یعنی مولانا ملوک العلی عربک کالج کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر جیسی وقاد فطرت اور اخاذ طبیعت والے آدمی کے لئے اس تعلیم کے لوازم اور خصوصیات کا سمجھ لینا بھلا کوئی بڑی بات ہو سکتی ہے۔ کھیل کود کے قصوں میں جس کی نظر اُن کے بنیادی اصول پر پڑتی تھی ان صبیانی ملاعب میں بھی طفولیت ہی کے ایام میں جو کلی قواعد پیدا کرتا ہو جس کی تفصیل مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکی، پھر ہمہ گیر و ہمہ پذیر دماغ کے ساتھ ساتھ حضرت والا کے سینے میں جو دردمند دل تھا، مسلمانوں کی زبوں حالیاں جیسے خون کے آنسو رلا رہی تھیں، آج کون بتا سکتا ہے کہ اس ورطہ سے نکلنے کے امکانی تصورات کے سلسلہ میں ان کی نظریں کہاں کہاں کن کن چیزوں پر پڑتی ہوں گی، تعلیمی تصورات کے سلسلہ میں کسی موقعہ پر حضرت والا کے اس حکیمانہ نظریہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی اس زمانہ کے علماء درس کی تعلیم کے انفرادی طریقہ تدریس کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ علم کی کیفیت میں تو ترقی اسی طریقہ سے ہوتی ہے، لیکن علم کی وسعت، اور علماء کی مقدار و کمیت کے بڑھانے میں کامیابی کی واحد صورت یہی ہے کہ تعلیم کے قدیم شخصی و انفرادی طریقہ کی جگہ درس و تعلیم کے اجتماعی طریقہ کو اختیار کیا جائے، مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا، سیاسی مرکز ان کا ٹوٹ چکا تھا، ان کی اجتماعی شیرازہ بندی کے سلسلے میں اپنے تعلیمی نظریہ کے مطابق کوئی وجہ ہو سکتی تھی، کہ عربک کالج میں اجتماعی درس و تدریس کے جس طریقہ کا آپ مشاہدہ فرما رہے تھے، اس سے استفادہ کی تدبیریں آپ کے دماغ مبارک میں نہ آئی ہونگی، سیدنا الامام الکبیر کے دست مبارک سے لکھی ہوئی ایک تحریر کا عموماً تذکرہ کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کی خزانے

حضرت نانوتوی کے لکھے ہوئے الہامی اساسی اصول

جن پر دارالعلوم جیسی ہمہ گیر انقلابی بنیاد رکھی گئی

وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس

چندہ بھی معلوم ہوتی ہیں

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیرِ چندہ پر نظر رہے آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے

(۲) ابقاءِ طعامِ طلبہ بلکہ افزائشِ طعامِ طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو اپنی بات کی پچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفِ رائے اور اوروں کی رائے کی موافقت ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا القصہ تہ دل سے بروقتِ مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبیِ مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو اور اسی لیے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیتِ نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدرِ ضرورت

میں یہ تحریر اس وقت تک محفوظ ہے۔ بدقسمتی سے براہ راست اس کی زیارت کی سعادت اس فقیر کو میسر نہیں آئی ہے۔ لیکن بہ تواتر بزرگوں سے یہ سنتا رہا ہوں کہ اس تحریر خاص میں سیدنا الامام الکبیر نے بطور وصیت نامہ کے ان بنیادی کلیات کو قلم بند فرمایا ہے جن پر آپ نے اس دارالعلوم کی بنیاد قائم فرمائی تھی اور وصیت فرمائی گئی ہے کہ آئندہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں دارالعلوم کے نظم و نسق کی باگ آئے، وہ ان کلیات کی روح کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجلہ "القاسم" کے دارالعلوم نمبر مجریہ ۱۳۴۷ھ کے حوالے سے اسی "تحریر خاص" کے مشتملات و مضامین کو نقل کرتے ہوئے، ناظم مرکزی جمعیۃ العلماء (دہلی)، مولانا سید محمد میاں صاحب نے "علماء ہند کے شاندار ماضی" میں منجملہ دوسری دفعات کے ایک دفعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"اس کا (یعنی دارالعلوم کا) تعلق عام مسلمانوں سے زائد سے زائد ہو، تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے، جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو۔"

آگے اسی مقصد کی تفصیل فرماتے ہوئے آخر میں اہتمام فرمایا گیا ہے کہ دارالعلوم کا مسلمانوں سے

"جمہوری تعلق ہو، جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے۔"

اسی بنیاد پر آپ نے دارالعلوم کے لئے آمدنی کے کسی مستقل ذریعہ کے قائم کرنے کے خلاف یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ عام مسلمانوں سے چاہئے کہ اس مدرسہ کا احتیاجی رشتہ ہمیشہ قائم رہے، حکومت، یا کسی رئیس کی دوامی امداد یا مستقل جائداد کی صورت میں عام مسلمانوں سے احتیاجی رشتہ دارالعلوم کا باقی نہ رہے گا۔[1]

[1] سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بعض ملنے والوں نے یہ الفاظ سنے تھے یعنی فرمایا کرتے تھے کہ
دارالعلوم اس وقت تک مستقل رہے گا، جب تک اس کی آمدنی غیر مستقل رہے گی۔ لیکن جس وقت اس کی آمدنی کا ذریعہ مستقل ہو جائے گا، اسی وقت دارالعلوم کی بنیاد غیر مستقل ہو جائے گی۔"
مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ نے بھی اصل ملا کے عنوان سے یہ فقرہ نقل کیا ہے جسے حضرت الاما کی طرف (باقی اگلے صفحہ پر)

خود براہ راست اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے خاکسار نے بھی بنا ردار العلوم کے متعلق قریب قریب کچھ اسی قسم کے الفاظ اس وقت سنے تھے، جس زمانہ میں یہ اختلاف رونما ہوا تھا کہ تعلیمی کاروبار کے سوا سیاسیات سے بھی مدرسہ کا کوئی تعلق رکھا جائے، یا نہ رکھا جائے۔ تفصیلاً اس قصہ کا ذکر مجلہ دار العلوم کے اس مضمون میں کر چکا ہوں جو

احاطۂ دار العلوم کے بیتے ہوئے دن

کے عنوان سے متعدد شماروں میں مسلسل شائع ہوا ہے، اور شیخ کے مقولہ کی حد تک اسکا تذکرہ ان اوراق میں بھی آ گیا ہے، اور سچ تو یہ ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کو "دلی عربک کالج" کے ماحول سے گذرنے اور تعلیم جدید کے لوازم وخصوصیات کے تجربہ ومشاہدہ کا موقعہ اگر نہ بھی ملتا، تو ان کی "عبقریت" اور فکر ونظر کے جس قدرتی "ملکۂ فائقہ" سے وہ فطرۃً سرفراز کئے گئے تھے، خود ہی پیش آنے والی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی کافی ضمانت تھی، مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی، اور آئندہ ان کو دینی زندگی اور دینی علوم سے منحرف کرنے کی کوششیں اس ملک میں جو ہو رہی تھیں، ان کے مقابلہ کے لئے مسلمانوں میں دینی علوم کی عمومیت کے لئے کیا کرنا چاہیئے، اور نئے حالات کی رو سے تعلیم و تدریس کے نظام میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے، ان مسائل کے حل کے لئے خود ان کا دماغ کافی تھا، اسے قدرتی تیسیر ہی کی ایک شکل سمجھنا چاہیئے، کہ "دلی عربک کالج" کے ماحول میں "نظریات" کو "عملی قالب" میں دیکھنے، اور برتے جانے کے مواقع بھی ان کے لئے آسان کئے گئے۔

جس وقت "شاملی" کے میدان سے وہ خود اور ان کے رفقاء کار بظاہر ناکامی کے ساتھ واپس

(گذشتہ صفحہ سے) براہ راست منسوب کیا گیا ہے یعنی اسی وصیت نامہ میں ہے کہ

"اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جبتک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلا رہیگا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت، یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہیگا اور امداد غیبی موقوف ہو جائیگی، کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا" مبشرات ص ۲۷

اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ احتیاجی رشتہ کا واقعی مطلب کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو "رجوع الی اللہ" کا یہی واحد ذریعہ اور اسی کی یہ ایک گونہ تعبیر ہے۔ ۱۲

ہوئے۔ تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس اور نامرادی کی واپسی نہ تھی' اور نہ ہو سکتی تھی۔ ایمان و سکینت' اتقان و طمانیت کی جن لاہوتی خنکیوں سے خون لگا اور ان کے ساتھ ان کے سینے اور دل لبریز و معمور تھے ' ان لاہوتی خنکیوں کے ساتھ بھلا قنوط و یاس کے غیر ایمانی جذبات کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے' واپس تو بیشک ہوئے تھے 'لیکن یقیناً یہ واپسی

متحرفا لقتال او متحیزا الی فئة	جنگ ہی کے لئے کتراتے ہوئے ' یا کسی ٹولی کر ملنے کے لئے
راہ قتال	

... ... ہو سکتی تھی 'یقیناً اسی کے لئے تھی بھی' جس کی تصدیق آپ کے آئندہ اقدامات اور دفاعی مجاہدات سے ہوتی ہے۔

۵۷ء کی کش مکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام' اسی لائحۂ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہری عنصر تھا' وہ مشہور روایت یعنی شاملی کے میدان کے امیر جہاد سیدنا حاجی امداد اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ سے اس زمانہ میں جب آپ مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ اور ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہو چکا تھا' عرض کرنے والے نے جب یہ عرض کیا کہ

"ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اسکے لئے دعا فرمائی جائے"

بیان کیا جاتا ہے کہ سننے کے ساتھ شاملی کے میدان کے امیر جہاد یہ فرماتے ہوئے کہ

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں' ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے"

اس اطلاع سے سرفراز فرمایا تھا کہ

"یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں' اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں' کہ خداوندا ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر"

اور اسکے بعد اصل واقعہ کا اظہار حاجی صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا کہ

"یہ مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے" (ارواح ثلثہ و علماء ہند کا شاندار ماضی)

جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا، اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے، بلکہ "بقاء اسلام اور تحفظ علم دین" کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و نظر تھے، اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے فریادی۔ یہ "غیبی لطیفہ" کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ امامت اور قیادت (لیڈری) میں یہی اصولی فرق ہے کہ قیادت میں صرف دماغ کام کرتا ہے، اور امامت میں دماغ کے ساتھ دل پر بھی زور دیا جاتا ہے، بلکہ کامیابی کی "حقیقی کلید" دل ہی کے کاروبار کو یقین کیا جاتا ہے۔ "بدر" کے میدان میں صف بندیاں بھی ہو رہی تھیں، ہر قسم کے ہتھیاروں کا استعمال کے مواقع اور مقامات بھی متعین کئے جا رہے تھے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اسی کے ساتھ خدا کے سب سے بڑے بندے کی پیشانی مبارک خاک پر بھی پڑی ہوئی تھی، سننے والے سن رہے تھے کہ السموات والارض کی ملکوت و بادشاہت جس کے ہاتھ میں ہے، جس کے حکم اور اذن کے بغیر اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کوئی چیز شریک ہی نہیں ہو سکتی تھی، اسی سے عرض کیا جا رہا تھا۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ من	اے اللہ! اہل اسلام کی یہ ٹولی اگر تباہ ہو گئی تو زمین پر
اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (صحاح)	آپ پھر پوجے نہ جائیں گے۔

بہر حال لوگ سوچتے نہیں ہیں، ورنہ وہی واقعہ جس کا ذکر کچھ دیر پہلے کر چکا ہوں، یعنی شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد امیر بیعت حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ، اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں منتقل ہوتے ہوئے جس زمانہ میں عرب پہنچنے کی کوشش فرما رہے تھے، تو جیسا کہ مصنف امام نے یہ اطلاع دی تھی کہ دشت نوردی کے ان ایام میں بھی سیدنا الامام الکبیر اپنے امیر و پیر و مرشد سے، صرف مراسلاتی ربط ہی نہیں قائم کئے ہوئے تھے، بلکہ ان سے شفاہاً ملنے کے لئے ایک دفعہ نہیں، بلکہ بقول مصنف امام

"بوڑیہ، گھلا، لاڈوہ، پنجلاسہ، جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے" ص۳۸

ظاہر ہے کہ فتنے کے ان تاریک دنوں اور نازک ترین ایام میں حضرت والا کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ صرف

پیرومرشد کی قدم بوسی کے حصول برکت وسعادت ہی کی حد تک کیا محدود تھا؟ یا محدود رہ سکتا تھا؟ بظاہر ایسی فاش شکست کے بعد مامور کی اپنے امیر کے ساتھ بار بار کی یہ ملاقاتیں، یقیناً صرف گونگی بہری خشک ملاقاتیں بن کر نہ رہ سکتی تھیں، اور نہ واقع میں ان ملاقاتوں کی یہ نوعیت تھی۔ دعا ہائے سحرگاہی اور نالہ ہائے نیم شبی جنہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک "پیشانی" کی طرف نہیں، بلکہ "پیشانیوں" کی طرف منسوب کر رہے تھے، ان "پیشانیوں" میں کم از کم ان دونوں "امیر و مامور" "پیر و مرید" کی "پیشانیوں" کو تو بہرحال شریک ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

سیدنا الامام الکبیر اس کے بعد جیسا کہ آپ سن چکے، روپوشی کے ایام میں خود حجاز پہنچ جاتے ہیں۔ "امیر اور مامور" کے باہمی اجتماع کی یہ صورت، کیا صورت ہی بن کر رہ سکتی تھی، جس کے اندر ہم فرض کرلیں، بلاوجہ فرض کرلیں کہ کوئی "معنے" نہ تھے۔

الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا تو کسی نئے محاذ ہی کے قائم کرنے اور اس "فتنہ" یا جماعت سے رشتۂ اتصال و ربط کو درست کرنے ہی کے لئے واپس ہوا تھا۔ جس کے اجتماعی شیرازے کو درہم و برہم کرکے چاہا جا رہا تھا کہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کردیا جائے، جس کتاب کو اس نے خدا کی کتاب مانا تھا، اور اس کے احکام کو خدا کا حکم یقین کرتا تھا، اس کا مطالبہ بھی یہی تھا، اور جن لوگوں کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا، ان کے بڑوں اور چھوٹوں کے متعلق بھی ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتے کہ اس قرآنی مطالبہ کی تعمیل و تکمیل ہی کے لئے وہ واپس ہوئے تھے۔ خود اس کے بلند عزائم، اور وسیع حوصلوں کا اقتضا بھی یہی تھا۔

پس واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے ۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز کے دھیمے پڑجانے کے بعد اس کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا، بذات خود اس کے لئے اور واپس ہونے والے ساتھیوں کے لئے یہ سب کچھ دیکھا بھالا تھا، ایک طے شدہ "لائحہ عمل" تھا۔ اپنے اپنے وقت پر اسی کے فیصلے عملی قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحت الٰہیہ اور "اجل مسمّٰی" کا اٹل قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کردیتا، تو

دیکھنے والوں کو خدا ہی جانتا ہے، وہی کیا کیا کر کے دکھاتا، جس کا تھوڑا بہت تذکرہ آئندہ اوراق میں بھی کیا جائے گا۔

تاہم اس نے دکھانے کی ابتداء جس انداز سے کی اس کا اجمالی خاکہ اس واقعہ سے ذہن میں آسکتا ہے جو خاکسار نے بلاواسطہ سیدنا الامام الکبیر کے سچے وارث اور جانشین الاستاذ الکریم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، اور اس کا اجمالی تذکرہ پہلے بھی اسی کتاب میں کسی موقعہ پر کر چکا ہوں کہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے) کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا صحیح سیاسی مسلک کیا ہے؟ یہ پیغام سنا تے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے، اور ارشاد فرمایا

"حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس تعلیم و تعلّم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"

آخر میں ارشاد فرمایا

(صرف) تعلیم و تعلّم درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے۔ میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں۔ لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا[۱]۔

مدرسہ دیوبند کی یہی وہ اساسی خصوصیت تھی جس نے اس مدرسہ کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا کیں، اور وہ دینی اور مذہبی حمیت و غیرت کا ہند گیر ہی نہیں، عالمگیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلاء کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص ملا جلا اور مرکب نصب العین لیکر باہر نکلے جس میں سب پر چھا جانیکی

[۱] اس واقعہ کی مزید تفصیل میں نے اپنے مضمون "احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" میں کی ہے۔ متعلقہ قسط ماہنامہ "دارالعلوم" بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ میں شائع ہوئی ہے ۱۲

اسپرٹ موجود تھی - ظاہر ہے کہ یہ اساسی خصوصیت حضرت والا کے سوا کسی کے سامنے نہ تھی اور نہ ہی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اس وقت سامنے تھے ، ہر ایک سے اتنی بلند نظری کی توقع ہی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس انس کے سب سے پہلے اور اہم رکن حاجی سید محمد عابد صاحب تھے جن کی بزرگی ہی کا نہیں دانشمندی اور اصابت رائے کا بھی اس زمانہ میں خاص شہرہ تھا۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے لیکن وہ بھی باوجودیکہ اجراء مدرسہ میں سیدنا الامام الکبیر کے دست راست ثابت ہوئے مگر اس تصور سے خالی تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالعلوم کے پرشوکت تصور سے حضرت حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحب) کا ذہن خالی تھا۔[2] (علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ)

کسی موقعہ پر الاستاذ الاکبر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے خود سنا ہوا فقرہ اس کتاب میں نقل کر چکا ہوں جو ارواح ثلثہ میں بھی منقول ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی موجودہ پرشکوہ عمارتوں کے متعلق حضرت سید حاجی

---

[1] دیکھو سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۱۹۹ ۱۲

[2] مولانا محمد میاں صاحب نے اس دعوے کی دلیل میں جو واقعہ شاندار ماضی میں پیش کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنی ہے کہ مدرسہ جاری ہو چکا تھا لیکن اس کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ کرایہ کے مکانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ جب سلسلۂ تعلیم بڑھنے لگا اور مکان کی تنگی محسوس ہوئی تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کی رائے یہ ہوئی جس کے مؤید مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری بھی تھے کہ مدرسہ کی کوئی اپنی مستقل جگہ اور عمارت ہونی چاہیئے۔ (جیسا کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے ضمیمہ روداد مدرسہ بابت ۱۲۹۲ھ میں ظاہر فرمایا ہے) حاجی صاحب نے اس کی شدت سے مخالفت فرمائی کہ کیا ضرورت اتنے مصارف کی، مسلمانوں کا پیسہ ضائع ہوگا۔ جامع مسجد کی سہ دریاں اور حجرے اس کے لئے بالکل کافی ہیں۔ لیکن بقول حضرت شیخ الہندؒ کے کہ حضرت والا کے سامنے مدرسہ کا روشن مستقبل تھا، اسلئے انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب مدرسہ کے لئے الگ ہی جگہ مناسب ہے۔ مسجد میں مدرسہ کا ہونا بہت سے اشکالات اور دشواریوں کا باعث ہوگا۔ یہ طلبہ کی قوم آزاد قوم ہوتی ہے۔ کبھی شکایت ہوگی کہ مسجد کے لوٹے ٹوٹ گئے کبھی فریاد ہوگی کہ مسجد کی صفیں گم ہو گئیں لالٹینیں نذر ہیں۔ غرض اس قسم کی بیسیوں مشکلات پیش آئیں گی۔ اس لئے مدرسہ کا مسجد سے الگ اچھا ہی (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

نے فرمایا کہ

"حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحبؒ) کے سامنے دارالعلوم کا وہ مستقبل نہ تھا جو حضرت استاذ (حضرت نانوتویؒ)

کو نظر آ رہا تھا۔ آپ کی فراست کے سامنے یہ مکتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دارالعلوم ہونے والا تھا"

بہرحال مدرسہ کے اجراء و قیام کی حد تک وہ اپنے اور اپنے رفقاء کار کے اسی طے شدہ "لائحہ عمل" کے ساتھ نئی عمارت

کے کھڑے کرنے کیلئے صرف صالح اور قابل زمین کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری

(گذشتہ صفحہ سے) مکان میں رہنا مناسب ہے۔ مگر حاجی صاحب نے اس رائے کو تسلیم نہ کیا۔ آخر کار حضرت والا نے لوگوں سے فرمایا کہ مکان مدرسہ کیلئے اشتہار جاری کر دیا جائے۔ اس اشتہار میں اس کا تذکرہ نہ ہو کہ مدرسہ کا مکان الگ بنے گا یا مسجد ہی میں رہے گا۔ یہ وقت پہلے ہو تا رہیگا۔ اتنے عرصہ میں حاجی صاحب بھی انشاء اللہ موافقت فرمالیں گے۔ چنانچہ اشتہار جاری ہو گیا اور اس میں عام مسلمانوں کو دعوت دی گئی۔ جمعہ کا دن سنگ بنیاد رکھنے کا طے ہوا اور پروگرام یہ تھا کہ بعد نماز جمعہ حضرت والا وعظ فرمائیں گے اور ختم وعظ پر یہ سارا مجمع شہری اور بیرونی حضرات کا جائے مقررہ پر پہنچکر سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کریگا چار آنہ گز کے حساب سے زمین کا معاملہ طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسب پروگرام عمل ہوا۔ اطراف واکناف کے لوگ جمع ہوئے اور حضرت کے وعظ کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ وعظ ہوا اور ختم وعظ پر حضرت نے فرمایا کہ چلئے بنیاد پر سب حضرات چلیں تاکہ سنگ بنیاد رکھدیا جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت حاجی صاحب نے غصہ کی آواز میں زور سے فرمایا "ہائیں! یہ کیا؟ حضرت نے فرمایا کہ حاجی صاحب یوں ہی مناسب ہے۔ آپ تشریف تو لے چلیں۔ فرمایا "کیوں چلوں؟ کیا ضرورت ہے اس اسراف کی؟ اور کیوں یہ بیکار اتنا بڑا بار اٹھایا جا رہا ہے؟ یہ الفاظ حضرت حاجی صاحب نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں فرمائے۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب آپ وہ چیز نہیں دیکھ رہے ہیں جو مجھے نظر آ رہی ہے۔ یہ مدرسہ بڑھنے والی چیز ہے۔ اس پر حاجی صاحب نے پھر زور سے انکار ہی میں جواب دیا۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب کو اختیار ہے۔ سب صاحب چلیں اور سنگ بنیاد رکھیں۔ حاجی صاحب تو جامع مسجد سے روانہ ہو کر چھتہ کی مسجد میں اپنے حجرہ میں جا بیٹھے اور یہ مجمع اور ہجوم حضرت کے ساتھ مدرسہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں سڑک پر مدرسہ کا موجودہ بڑا دروازہ ہے۔ مجمع کو روک کر حضرت والا نے فرمایا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریں، میں ابھی حاضر ہوا اور سیدھے چھتہ کی مسجد میں پہنچے اور حاجی صاحب کے حجرہ میں پہنچکر فرمایا۔ "اجی حاجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور بزرگ ہیں اور ہم سب آپ کے چھوٹے ہیں۔ بھلا ہم آپ کو یا آپ ہمیں چھوڑ سکتے ہیں" اور یہ کہکر حاجی صاحب کے پیروں پر ہاتھ رکھدیئے۔ اس طرز عمل کا حاجی صاحب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بے اختیار رو پڑے اور اتنا کہ آواز نکل گئی۔ انتہائی کسر نفسی سے فرمایا مولانا میرا قصور معاف فرما دیجئے۔ بات وہی حق ہے جو آپ فرما رہے ہیں۔ حضرت نے حاجی صاحب کو اٹھا کر گلے لگایا اور لیکر جائے بنیاد پر پہنچے۔ مجمع ان دونوں بزرگوں کو آتے ہوئے دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ سارے مجمع میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور پھر سب نے ملکر درسگاہ نودرہ کی بنیاد رکھی جو دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت ہے۔ محمد طیب غفرلہ

اقتضاؤں کی تکمیل کا بھی سامان کیا جائے۔ اس کے اسی لائحۂ عمل کا اہم ترین جز بلکہ قالب کے لحاظ کا سب کچھ وہی تھا کہ نئے محاذ کا یہ نیا قالب یا "عملی مرقع" کہاں قائم ہو۔ یہ سوال تھا جس کا جواب ڈھونڈھا جا رہا تھا۔ جمعیت جہاد کے امیر حضرت حاجی صاحب نور اللہ ضریحہ کی جس اطلاع کا تذکرہ ابھی گذرا، راوی کا اسی روایت کے سلسلہ میں یہ بیان بھی تھا کہ آخر میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ

"یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانمایہ کو یہ سرزمین لے اڑی" ص۵ج۳ (علماء ہند کا شاندار ماضی)

اسی روایت کے بعض طریقوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بجائے دیوبند کے "نئے محاذ" کے لئے دلوں میں تھانہ بھون، نانوتہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات کے ترجیحی خطرات بھی گذرتے تھے[1]۔ اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا دیوبند میں اس "نئے محاذ" کی بنیاد ڈالنے کے بعد علاوہ دیوبند کے مراد آباد، نگینہ، تھانہ بھون وغیرہ میں اس کی شاخیں سید الامام الکبیر کے منشاء کے مطابق کھلتی چلی گئیں۔ ناظم جمعیۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے مراد آباد کے ایک بزرگ مولانا سید غالب علی کے حوالہ سے یہ فقرہ اپنی اسی کتاب "علماء ہند کے شاندار ماضی" میں جو نقل فرمایا ہے کہ

"دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر العلوم سہارنپور کو آپ ان اسکولوں اور مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں جن کو اتفاقیہ طور پر قائم کر لیا جاتا ہے"

اس کے بعد اپنے پیر و مرشد قاضی محمد اسماعیل (جو اپنے وقت کے ارباب کشف و الہام میں شمار ہوتے تھے) کا یہ قول بھی مولانا سید غالب علی دہراتے کہ

"یہ مدارس خاص الہامات کے بموجب قائم کئے گئے ہیں" ص۱۲۲ ج۵

[1] اپنے محبوب آقا اور پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہوں پر چلنے والے بلکہ ان ہی پر مرمٹنے والے راستباز وفا کیش غلاموں کے اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے اگر آقا کی وہ بات یاد آجائے کہ مکہ کو چھوڑ دینے کے بعد کہاں جانے کا حکم دیا جائے گا، خیال کسی یمامہ یا ہجر کی طرف جاتا تھا لیکن معلوم ہوا کہ طابہ و طیبہ و مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بننے کے لئے یثرب کی سرزمین کا انتخاب ہو چکا تھا، فذھب وھلی الی انھا الیمامۃ او ھجر فاذا ھی المدینۃ یثرب (بخاری) (جلد اول ۲۲)

دل کے لحاظ سے "الہامات" اور دماغ کے اعتبار سے چاہئے تو "عمل کے لمحات" سے بھی اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عرض ہی کر چکا ہوں کہ قیادت و امامت کی راہ نمائیوں میں بھی جوہری فرق ہے۔

اور یہی میرا مطلب بھی ہے کہ "نئے محاذ" کا کسی تعلیمی و تدریسی نظام کے تحت کھولنے کا ارادہ تو فیصل شدہ ارادہ اور الہامی محرکات کے زیر اثر قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اور بقول حضرت حاجی صاحب دیوبند کی سرزمین کی یہ قسمت تھی کہ قدرت کی طرف سے اسی کا انتخاب سب سے پہلی دفعہ اس نئے محاذ کے افتتاح کے لئے ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ قسمت کہئے، یا ازلی تقدیر کا ظہور ہمیشہ اسباب و علل کے پردوں ہی میں ہوتا ہے دیوبند کی سرزمین کے لئے یقیناً یہ ایک تقدیری فیصلہ تھا، مگر "منصہ شہود" پر یہی تقدیر تدبیر کے کس رنگ میں جلوہ گر ہوئی، اس کی حد سے زیادہ تشنہ اور قطعاً نامکمل تعبیر ہو گی۔ جسے لوگ "انار اور محمود" کی روایت کی حد تک محدود کر دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے، عرض ہی کرتا چلا آ رہا ہوں، کہ اس نئے محاذ کے بانی سیدنا الامام الکبیر کو دیوبند والوں سے قرابت قریبہ کے موروثی تعلقات پشتہا پشت سے قائم تھے، یہ بھی آپ سن چکے کہ آج جس مقام پر دارالعلوم کی طویل و عریض عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے اسی کے قریب دیوان کی ڈیوڑھی میں حضرت والا کی تعلیمی زندگی کا ابتدائی زمانہ گذرا تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ آپ کی طرف سے ۵۷ء کی ناکامی کے بعد "نیا محاذ" دیوبند کے جس قطعہ اراضی پر کھلنے والا تھا، خاص اسی قطعہ اراضی اور خطۂ پاک سے بچپن ہی میں مانوس بنانے کا قدرت نظم کر چکی تھی، آج جہاں دارالعلوم ہے یہی میدان اس کے باغ و تالاب، آپ کی بازیگاہ اور سیرگاہ تھی، پھر دیوبند کے دیوان کی یہی ڈیوڑھی آپ کی سسرال بھی بنی، اور جیسا کہ تفصیل بتایا جا چکا ہے، ۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد سیدنا الامام الکبیر کی روپوشی کی کافی مدت دیوبند ہی میں گذری، حالات ہی ایسے تھے کہ نانوتہ سے اپنے اہل و عیال کو اس زمانہ میں دیوبند ہی منتقل کرنا پڑا، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جو یہ خبر دی ہے جس کا پہلے بھی ذکر کر چکا

ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے دیوبند کو بجائے نانوتہ کے جب اپنا وطن ثانی قرار دیا تو

"شمس الاسلام کی رونق افروزی ہوئی"

ان ہی الفاظ کو بعض لوگوں نے آپ کی اس نئی ترطن پذیری کا مادہ تاریخ قرار دیا تھا' جس کے اعداد ۱۲۸۳ھ ہیں جو عیسوی سن کے حساب سے ٹھیک وہی ۱۸۶۶ء کا سال ہے' جس کے معنے یہی ہوئے کہ ۱۲۸۳ھ ہی میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ بجائے نانوتہ کے حضرت والا کے اہل و عیال کا مستقل قیام دیوبند ہی میں رہے گا' اور ہوا بھی یہی نزدوپشی کے زمانہ کا بڑا حصہ حضرت الاکادیوان کی ڈیوڑھی کی مغربی پشت پر چھتہ کے نام سے جو ایک مسجد تھی' اھاس وقت تک بحمداللہ موجود ہے اسی میں گذرا۔ زمانہ دراز سے اس مسجد کے حجرے صاحب دل بزرگوں کی قیام گاہ بننے کی سعادت حاصل کرتے چلے آتے تھے' اور اس زمانہ میں بھی دیوبند کے دو مشہور و معروف بزرگوں یعنی حاجی سید محمد عابد حسین صاحب اور مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہا کی قیام گاہ بھی چھتہ کی مسجد کے یہی حجرے تھے' ہم جنسی اور ہم مذاقی کے رشتہ کا اقتضا یہ ہوا کہ اس زمانہ میں "خلوت گاہ حق" بننے کا شرف چھتہ کی مسجد کے ایک حجرے کو سیدنا الامام الکبیر کے قیام کی وجہ سے حاصل ہو[1]۔

چنانچہ صاحب سوانح مخطوطہ نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"اسی زمانہ میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب و جناب حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی جن کی تعریف ذیل میں مفصل درج کی جاوے گی' چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے"

آگے اطلاع دی ہے کہ

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا' اور ان دونوں

---

[1] ہمارے مخدوم و محترم الحاج مولوی سید محی الدین صاحب بی۔ اے (علیگ) ویرا سٹرایٹ لا' جو حکومت آصفیہ حیدرآباد دکن میں ایجوکیشن اور دینیات یعنی تعلیم و مذہب کے محکمہ کی معتمدی (سکریٹری) کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہو کر اب ہمارے البیاری والحمید آبادی کے "انپاکستانی" بنے ہوئے کراچی میں مقیم ہیں' ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ چھتہ کی مسجد کے اس "کمرے" کی فرسودہ و بوسیدہ حالی کو دیکھ کر اپنے ذاتی مصارف سے اس کو درست کرا دیا' گویا ایک نیا کمرہ ہی بن گیا' جس سے طلبہ مستفید ہوتے ہیں اور سید صاحب کے حق میں دعا گو ہیں ۱۲

بزرگوں سے کمال درجہ کا انس اور ربط ضبط قائم ہو گیا ؎

روپوشی کے زمانہ میں سرکاری دوش کا رخ اس مسجد کی طرف اگر ہوتا تو آپ سن چکے ہیں کہ اس مسجد سے نکل کر دیوبند ہی کی دوسری مسجدوں میں آپ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ہندوستان سے نکل کر بہ نیت حج اسی زمانہ میں آپ حجاز پہنچے، اور "عام معافی نامہ" کے ساتھ حکومت کی طرف سے نگرانی جب اٹھالی گئی، تو حجاز کی واپسی کے بعد بھی وطن کی حیثیت گویا دیوبند ہی کی رہی، گو اس کے ساتھ ساتھ نانوتہ بھی آتے جاتے رہتے تھے، پھر جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ مطالبہ عام کا سلسلہ حکومت کی طرف سے جب ختم ہو گیا تو

"منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا، مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا، وہی تصحیح کی خدمت تھی" ص۲۹

تصحیح کتب کی اسی خدمت کی وجہ سے میرٹھ ہی گویا اس زمانہ میں آپ کا مستقر تھا، لیکن خدمت کی جو نوعیت تھی، اس میں کافی گنجائش تھی کہ اپنے وطن ثانی دیوبند میں آپ کی آمد و رفت کا سلسلہ باقی رہے، اور حالات و واقعات سے یہی معلوم بھی ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ باقی تھا۔

بس یہی سوچنے کی بات ہے کہ جس "نئے محاذ" کے کھولنے کا ولولہ آپ کے سینہ، صداقت گنجینہ میں جوش زن تھا جس کے لئے مناسب و صالح و قابل زمین کی تلاش میں جیسا کہ چاہئے، جب آپ سرگردان تھے تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اس عہد تلاش و جستجو میں آپ کی نظر مسلمانوں کی کن کن آبادیوں پر پڑتی تھی، یہ واقعہ تھا کہ "مطالبہ عام" کے اٹھ جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو اس کا اطمینان نہ تھا کہ حکومت نے ان کا تعاقب ترک کر دیا ہے۔

اللہ اللہ! مسلمانوں کی سلطنت و سیاست، تہذیب و معاشرت، علم و فن، صنعت و حرفت کا مرکز وحید مرحوم دلّی تک کے متعلق غالب بے چارے کا جب یہ احساس تھا شاید پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں یعنی

"دیکھا چاہئے مسلمانوں کو دلّی میں، آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں" (اردوئے معلی ص۱۱)

خود یہی دیوبند جو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی "پناہ گاہ" تھی۔ اور بقول مصنف سوانح مخطوطہ آپ کا وطن ثانی بھی وہ قرار پا چکا تھا، وہاں کے مسلمانوں کی بھی حالت جب یہ تھی جس کے راوی ہمارے مخدوم و محترم مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء (دہلی) ہیں کہ

"دیوبند کے ایک بڑے میاں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں تہجد سے فارغ ہو کر انگریزوں کے لئے بد دعا کیا کرتا ہوں، مگر بد دعا سے پیشتر سارے مکان پر اور در و دیوار پر نظر ڈال دیتا ہوں کہ کوئی اجنبی شخص تو یہاں موجود نہیں" علماء ہند کا شاندار ماضی ص۲۵۷

ایسی صورت میں یہی سمجھنا چاہئے، کہ آج کل کرفیو کے نام سے کبھی کبھی خاص مواقع پر آرڈر حکومت کی طرف سے چند خاص گھنٹوں کے لئے جو سر ہوتے رہتے ہیں، لفظاً نہ سہی، لیکن ہندوستان کے سارے مسلمان "کرفیو آرڈر" کے اسی دوامی حکم کے زیر اثر گویا زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کسی مقصد اور کسی غرض سے بھی چند مسلمانوں کا اجتماع گویا اس "کرفیو آرڈر" کی خلاف ورزی کا رنگ اختیار کر لیتا تھا، جس پر حکومت کی سخت اور کڑی نگرانی قائم تھی۔

ماسوا اس کے وہ "نیا محاذ" جسے سیدنا الامام الکبیر شاملی کے میدان سے واپس ہونے کے بعد کھولنا چاہتے تھے۔ اس "نئے محاذ" اور اس کے دور رس مضمرات و مکنونات خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن ظاہری قالب تو اس کا یہی تھا کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی حفاظت کے لئے دینی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں جہاں تک ممکن ہو، بڑی سے بڑی تعداد دینی علوم کے علمبرداروں کی پھیل جائے۔ اس جدید تعلیمی نظام کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے قدیم علماء کی تدریس و تعلیم کا آزاد اور انفرادی طریقہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک قطعاً ناکافی تھا، اور مشاہدے سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی، اپنے اسی اصولی نقطۂ نظر کے زیر اثر آپ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمونے اور جذب کرنے کی صورت چاہا جاتا تھا کہ نکالی جائے۔ آج تو کالجوں اور اسکولوں کی کثرت، بلکہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے تحت چلنے والے عربی مدارس کی بھی اتنی کافی تعداد ملک کے طول و عرض میں

پھیل چکی ہے کہ تعلیم کے یہ عصری لوازم (امتحان، رجسٹر حاضری، جماعت بندی وغیرہ) جیش پا افتادہ حقیقتوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ تعلیم و تدریس کا شاید ان امور کے بغیر تصور بھی لوگ نہیں کر سکتے، لیکن اپنے "نئے محاذ" کے لئے ڈھونڈھنے والا جس زمانہ میں اس کے لئے صالح و میسر حاصل زمین ڈھونڈھ رہا تھا، آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے قدیم علماء کے لئے ان چیزوں ہی کی نہیں بلکہ ان کے تصور کی بھی کیا نوعیت تھی! نئے قائم ہونے والے اسکولوں اور کالجوں ہی کا عام نام صرف "مجہلے"[1] نہ تھا، بلکہ تعلیم کے اس اجتماعی نظام کے متعلق جس کی ابتداء دیوبند سے ہوئی تھی، ہمارے اگلے زمانہ کے علماء کی مجلسوں میں جو پھبتیاں اس پر کسی جاتی تھیں، اور جن جگر خراش، روح گداز استہزائی فقروں سے اس پر تنقید کی جاتی تھی، دردکی یہ داستان حد سے زیادہ افسوسناک ہے، شاید کسی موقعہ پر ان کی طرف کچھ اشارے بھی کئے جائیں گے۔ ان مولویوں کے نزدیک علم کی "کیفیت" کا مسئلہ تھا، اور "نئے محاذ" کے لئے کیفیت سے زیادہ "کمیت" اور "مقدار" کا مسئلہ اہم تھا۔

---

[1] یعنی جاہل کردے۔ اسکا یہ عربی ترجمہ کر لیا گیا تھا، کہتے ہیں کہ حضرت قاری عبد الرحمٰن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تلمیذ رشید حضرت شاہ اسحاق کا بنایا ہوا یہ لفظ تھا۔ تفصیل کیلئے قاری صاحب کی سوانح عمری دیکھئے۔ غالباً حیات جاوید میں بھی مولانا حالی نے اس کا ذکر کیا ہے جو قاری صاحب کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان پڑھنے کے متعلق کفر والا مشہور لطیفہ جسے مسلمانوں کے علماء کی طرف اب بھی لوگ منسوب کرتے ہیں بجائے خود یہ صرف پروپیگنڈہ تھا۔ ہندوستانی علماء کے استاذ الکل حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ کا مطبوعہ فتاویٰ موجود ہے جس میں آپ نے انگریزی زبان کے متعلق یہ فتویٰ دیا تھا کہ "تعلم انگریزی یعنی آئین خط و کتابت و لغت و اصطلاح ایشاں دانستن باکے ندارد" ص۱۹۵ انگرانگریز اور انگریزی طرف جو چیز منسوب ہو مسلمانوں کی غیرت و حمیت واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک اس کو برداشت نہیں کر رہی تھی، جب تک استداد زمانہ اور دوسری تدبیروں سے از حد طوث و مردہ بنا کر نہ رکھ دیا تھا۔ اسی فتاویٰ عزیزیہ میں ایک دل دوز کہئے یا دلچسپ واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔ کلکتہ کے کوئی مسلمان مختار کار مولوی رعایت علی خان نامی تھے۔ شاہ عبد العزیز کو حکومت کی طرف سے لکھا کہ ایک ایسے عالم مفتی کی ضرورت ہے جو شرع شریف کے مطابق فیصلہ یا روایت کر سکتے ہوں۔ یہ بھی لکھا کہ انگریزوں کے عمل کو دور تک کوٹھی میں ان کا قیام رہے گا اور شرع محمدی کے مطابق بے دغدغہ وبے وسواس حکم کا کلی اختیار ان کو ہوگا۔ شاہ صاحب کے مدرسے کے ایک عالم کے متعلق یہ خبر شاہ غلام علی صاحب خلیفہ مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ تک پہنچی کہ کلکتہ جانے پر آمادہ ہو گئے۔ اس خبر کو پا کر انہوں نے جو خط شاہ عبد العزیز کے نام لکھا تھا تاریخی خط ہے۔ کلکتہ جانے سے شاہ صاحب نے پوری قوت سے روکنا چاہا ہے۔ یہ التماس فرماتے ہوئے کہ ہرگز قصد این امر نامبارک نکنند۔ آخر میں لکھا ہے کہ ہر نفس از نفس آخریں (انگاریم "ص۹۱ فتاویٰ عزیزیہ

کچھ بھی ہو، دینی علوم کی تعلیم و تنظیم کا کام علماء ہی سے لیا جا سکتا تھا لیکن ان کی عمومیت سے اس مسئلہ میں کسی قسم کی مدد کے ملنے کی توقع نہ تھی۔ ماسوا اس کے اس قسم کے اجتماعی نظام کے تحت قائم ہونے والی "تعلیم گاہ" کے نظم و پرداخت کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ انتظامی سلیقہ رکھنے والی کوئی بیدار مغز، راستباز، مخلص شخصیت، ہر قسم کے معاشی مشاغل سے بے تعلق ہو کر "ہمہ وقتی" نگرانی کے لئے آمادہ ہو مگر جن معاشی زبوں حالیوں کا شکار اس زمانہ میں مسلمان ہو چکے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے بھلا اس کی امید کیا باندھی جا سکتی تھی۔

اب اس کو اتفاق سمجھئے، یا ازلی تقدیر کے ظہور کا تشکیلی قالب، کہ دیوبند جہاں کے باشندوں میں سیدنا الامام الکبیر کو اپنے دل کی لگی آگ کے پھیلانے کا موقعہ بہ نسبت دوسری اسلامی آبادیوں کے زیادہ آسان کیا گیا تھا اسی دیوبند میں ٹھیک اسی زمانہ میں جب "نئے محاذ" کے لئے زمین کی تلاش کی مہم میں سیدنا الامام الکبیر سرگرم و منہمک تھے۔ دیکھا گیا، کہ ایک طرف اجتماعی تعلیم کے لوازم و خصوصیات کی ایک سے زیادہ عملی تجربہ رکھنے والی ہستیاں جمع ہو گئی ہیں، جن میں ایک تو حضرت شیخ الہند مولنا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولنا ذوالفقار علی صاحب تھے، اور دوسرے صاحب مولنا فضل الرحمٰن صاحب تھے جو مفتی عزیز الرحمٰن و مولنا حبیب الرحمٰن و مولنا شبیر احمد صاحب نور اللہ مضجعہم کے پدر والا قدر تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی جیسا کہ معلوم ہوا ہے، مولنا مملوک العلی صاحب کے شاگرد تھے، یوں دلی عربک کالج کے تعلیمی نظام کے مشاہدہ و تجربہ کا موقعہ بھی ان کو ملا تھا، اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حکومت کے تعلیمی محکمہ میں ڈپٹی انسپکٹر ہو ہو کر وظیفہ (پنشن) پانے کے بعد اپنے وطن دیوبند میں خانہ نشین ہو چکے تھے۔ اور خانہ نشینی کے بعد ہی غالباً یہ دونوں بزرگ مسجد چھتہ کی مجلس انس کا جزو ہوئے ہیں۔ اس ماحول کو ابتدائی دور میں جب سیدنا الامام الکبیر کی دیوبند میں رونق افروزی ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ آ چکا ہے، ان بزرگوں کا نام نہ آنا شاید ان حضرات کی سرکاری ملازمتوں کی پابندی اور وطن میں مسلسل قیام نہ ہونے کی وجہ سے ہوگا، دور مابعد میں ان کے اسماء کا تذکرہ اسی کی علامت قرار دی جا سکتی ہے، کہ

اس وقت یہ بزرگ پنشن لے کر دیوبند آچکے تھے، اور خانہ نشین ہو گئے تھے۔

شاید اسی لئے سوانح مخطوطہ کے مصنف کے کلام میں سیدنا الامام الکبیر کے عہد رونق افروزی وقیام دیوبند کے بارہ میں جو "عہد قدیم" کا لفظ پایا جاتا ہے اور اس قید "عہد قدیم" کے ساتھ جن خواص مجلس کے ناموں کا ذکر انہوں نے کیا ہے ان میں ان دونوں بزرگوں کا ذکر نہیں ملتا، سوانح مخطوطہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"اس عہد قدیم" (زمانہ ورود حضرت نانوتوی یعنی ۱۲۸۳ھ) کے مجمع کے خاص لوگ یہ ہیں۔ حاجی دیوان محمد یٰسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوارالحق صاحب عرف حافظ کلّو۔ پیرجی ماجد علی صاحب، حاجی ظہیر الدین صاحب حکیم مشتاق احمد صاحب (ایک جگہ ذیل کے دو نام اور اضافہ کئے ہیں) شیخ منظور احمد صاحب منشی نہال احمد صاحب"

گویا اس مجلس انس کی ابتداء چھتہ کی مسجد میں حاجی محمد عابد صاحب اور مولانا رفیع الدین صاحب کی رفاقت سے ہوئی اور رفتہ رفتہ اس میں دیوبند کے مختلف محلوں کے یہ چیدہ اور سربرآوردہ لوگ شامل ہوتے گئے، جن سے "عہد قدیم" کی مجلس کی قدرتی تشکیل ہوئی، اور قصبہ کی اصلاح اور نئے محاذ کی زمین ہموار کرنے میں اولاً یہی حضرات سیدنا الامام الکبیر کے دست وبازو ثابت ہوئے، جن کے احوال پر صاحب سوانح مخطوطہ نے بھی اجمالی روشنی ڈالی ہے۔ "عہد قدیم" کی قید کو سامنے رکھ کر جس کی ساتھ ان مخصوص ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد والے دور کو جس میں یہ دونوں بزرگ مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب بھی آ ملے۔ مسجد چھتہ کی مجلس کا "عہد جدید" کہنا چاہئے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ "عہد قدیم" نئے محاذ کے لئے تہیۂ استعداد اور زمین ہموار کرنے کا دور تھا اور "عہد جدید" اس کی عملی تشکیلات اور فعلیت کے ظہور کا زمانہ تھا۔

اس "عہد قدیم" میں جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں چھتہ کی مسجد کے گوشہ گزینوں میں حاجی سید محمد عابد و مولانا رفیع الدین دو ایسے بزرگ تھے، جن کو سیدنا الامام الکبیر کے بساط قرب وانبساط میں علاوہ ظاہری وباطنی فوائد کے جو حضرت والا کی مجالس انس ودانش کی خصوصیات تھیں۔ سب سے زیادہ

آپ کی اولوالعزمانہ امنگوں اور بلند حوصلوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر اثر پذیر ہونے کی کچھ ایسی قدرتی صورت پیدا ہوگئی، کہ وہ چاہتے یا نہ چاہتے۔ لیکن اس آنچ کے تاثیری عمل سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے تھے، جو اندر ہی اندر ان کو پگھلاتی اور نئے سانچے میں ان کے جذبات دعواطف کو ڈھالتی چلی جارہی تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "گلیم خویش بدری برد زموج" کے جس طبقہ سے ان کا تعلق تھا، اس طبقہ کے عام حدود سے نکل کر "غریق گیری" کے نئے سودے کو لے کر یہ لوگ بھی میدان میں کود پڑے، مولانا رفیع الدین صاحب کی باقی زندگی جیسا کہ معلوم ہے اسی "غریق گیری" کی جدوجہد میں بسر ہوئی، حقیقی معنوں میں دارالعلوم کے مہتمم اول وہی ہوئے۔ آخر اسی شغل پاک میں شاید آخری سانس ان کی پوری ہوئی۔[1]

اس شغل میں سیدنا الامام الکبیر سے ان کے تاثر یا باطنی استفادہ کا عالم یہ تھا کہ ان کا قلب بھی قلب قاسمی کا دوسرا رخ بن گیا تھا، انہوں نے اپنے زمانہ اہتمام دارالعلوم میں جیسا کہ کسی موقعہ پر تذکرہ آچکا ہے۔ خود ہی فرمایا ہے کہ دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا، حضرت نانوتوی فرماتے ہیں، جو کچھ حضرت کے

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم جو اپنے عہد میں دارالعلوم کی روح رواں کی حیثیت حاصل کئے ہوئے تھے، اپنے تدبر، پیش بینی، مردم شناسی کے دانشمندانہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کم از کم فقیر ان کی قلبیت و اخلاص سے زیادہ متاثر تھا، وہی فقیر سے براہ راست مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمامی کارناموں کا ذکر کرتے کرتے کبھی کبھی ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کردیا کرتے کہ مجھ جیسے عقلیت زدہ آدمی کے لئے اس کا ماننا دشوار ہو جاتا تھا۔ فرماتے کہ بسا اوقات مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے کہ دارالعلوم کے متعلق کوئی مفید تجویز میرے دماغ میں آئی، لیکن عمل کرنے کے وقت اس کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا رفیع الدین صاحب اپنے ایام اہتمام میں اس کی بنیاد ہموار کرچکے تھے۔ بہات ہی کی حد تک نہیں بلکہ مجھے خوب یاد ہے مولانا حبیب الرحمٰن فرماتے کہ مدرسہ کی عمارت میں کسی ترمیم و تجدید کا خیال آیا، کام جب شروع کرایا تو دیکھا کہ پہلے ہی سے اس ترمیم کی گنجائش قصداً پیدا کر کے مولانا رفیع الدین جاچکے ہیں۔ فرماتے کہ کسی چھت میں مجھے نالی بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، جب بنوانے لگا تو دیکھا کہ پہلے ہی سے نالی اسی مقام پر بنائی جاچکی تھی، چونکہ اس وقت ضرورت نہ تھی اس لئے چھپا دی گئی تھی، گویا مجھے صرف اسی بنی ہوئی نالی کے کھلوا دینے کا کام کرنا پڑا، جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ سررشتہ اہتمام کو ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی بصر و بصیرت دماغی و قلبی ہر قسم کی قوتوں کو دارالعلوم ہی کی فلاح و بہبود میں مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے غرق کردیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا رفیع الدین کے جو حالات میں نے سنے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ کسی مستقل سوانح عمری کے ذریعہ ان کی زندگی کے عملی اسباق اور نمونوں کو محفوظ کردیا جاوے ۱۲

قلب پرنازل ہوتا ہے بعینہ میرے قلب میں منعکس ہوجاتا ہے اور میں وہ کرگذرتا ہوں۔ چنانچہ میرے کر لینے کے بعد حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے میرے دل میں یہی آرہا تھا جو آپ نے کرلیا۔ فرمایا کہ بارہا نہیں تقریباً میرے تمام کاموں میں حضرت سے ہم آہنگی کی یہی نوعیت قائم رہتی تھی اور حضرت نانوتوی اسی طرح اسے ظاہر فرمادیا کرتے تھے۔

رہے ہمارے سید مغفور و مرحوم حاجی سید عابد حسین صاحب[1]، انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کے اس "نئے محاذ" کی افتتاحی منزلوں میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں، ان سے وابستگان دارالعلوم کے عوام نہ سہی، خواص اچھی طرح واقف ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ممدوح کی اس جدید پرواز اور "عرش گیری" کی مخفی روح مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم نے عاطف قاسمی ہی کو ٹھیرایا ہے، وہ اپنے ایک مشہور قصیدہ میں ان کے مناقب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

مرد حق "عابد" صداقت کیش	اولین گسترانندہ مالش
ہم باخلاص دل دماں بنہاد	چیزے از طیبات اموالش
گوئیا ایں ہمہ فتوح کثیر	در رسیدہ ہمہ باقبالش

آگے اس مخفی روح کا ذکر کر رہے ہیں کہ

لیک ایں "طائر ہمایوں فال"	شد ز قاسم عطا پرو بالش

یہاں مجھے حاجی صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ باطنی معرفت و سلوک کا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے حاجی صاحب ممدوح کو نو عمری ہی سے شوق تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتی طریقہ کے ایک بزرگ جن کا نام نامی میاں جی کریم بخش تھا، رامپور منیہاران کے رہنے والے تھے۔ ان ہی سے حاجی صاحب مرید ہوئے، کسب و سلوک کے مراتب ان ہی کے زیر تربیت طے کئے۔ خلافت بھی حاجی صاحب کو میاں جی کریم بخش ہی سے شروع میں حاصل ہوئی تھی۔ اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ سید صاحب

---

[1] یعنی حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

"جناب میاں جی کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رام پوری چشتی کے خلیفہ ہیں۔" ص۳۵

اسی کتاب میں اس کی معاصرانہ شہادت بھی مصنف کتاب نے ادا کی ہے کہ

"اہل دیوبند کو آپ سے (یعنی سید محمد عابد صاحب سے) کمال درجہ عقیدت ہے۔"

ظاہر ہے کہ ایک سالک مسلک معرفت و حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ جب اپنے پیر و مرشد میاں جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ چشتی کے خلیفہ مجاز بھی سید صاحب ہو چکے تھے، تو اس زمانہ کے لحاظ سے مسلمانان دیوبند کی عقیدت کیشیوں اور نیاز مندیوں کی مرکز ان کی ذات گرامی بن گئی ہو، تو اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، بلکہ اسی کے ساتھ اسی کتاب میں سید صاحب مرحوم کی ایک خصوصیت جس کے گونہ مشاہدہ کا موقعہ خود اس فقیر کو بھی اس زمانہ میں ملا ہے جب دارالعلوم میں زیر تعلیم تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ دیوبند سے باہر حتیٰ کہ صوبجات متحدہ سے بھی آگے بڑھ کر بہار و بنگال تک سید صاحب کی اس امتیازی خصوصیت کا چرچا اور شہرہ پھیلا ہوا تھا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ سید صاحب کے دیگر ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ

"ان میں ادنیٰ تعویذ و گنڈہ ہے، جس کے سبب اہل دیوبند اور نواح دیوبند کے ہر قسم کے دکھ درد و دلدر دور ہوتے ہیں۔"

اسی کا نتیجہ تھا کہ سید حاجی صاحب کی ہر دل عزیزیاں خواص ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھیں، بلکہ بقول مصنف کتاب

"دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی ایسا بچہ ہوگا جس کے گلے میں آپ کا (یعنی حاجی سید عابد صاحب کا) تعویذ نہ ہوگا، اور کم تر ایسی عورتیں ہوں گی، جن کے بازو پر آپ کا نقش نہ ہو۔"

سید صاحب کے اسی "نقش" کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت نے مثنوی میں جو دارالعلوم کے متعلق کسی زمانہ میں آپ نے نظم فرمائی تھی یہ مصرعہ بھی لکھا،

ع نقش وتعویذ ش مثال نقش قدم" (منقول از ص۲۲ حصہ پنجم علماءِ ہند کا شاندار ماضی)

واقعہ یہ ہے کہ جسکی جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈوں کی مقبولیت کا حال جب یہ ہو جیساکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"آپ کا مطب (تعویذی) بڑے بڑے (دوائی) طبیبوں سے زیادہ گرم رہتا ہے، خصوصاً وبائی و موسمی امراض میں غربار علاج کم کرتے ہیں، آپ ہی کے تعویذوں پر قناعت کرتے ہیں۔"

خواص وعوام کی فیض رسانی کی اس زمانہ میں یہ ایک صورت ایسی تھی کہ مصنف کتاب کو یہ گواہی دینی پڑی کہ

"آپ کی (سید صاحب کی) ذات فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہے۔"

"خلائق" کے اس لفظ میں اسی کتاب کے مصنف کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں ہی تک اس باب میں آپ کی فیض رسانیاں محدود نہ تھیں، بلکہ وہی لکھتے کیا اپنی عینی شہادت نقل کرتے ہیں کہ

"غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں۔"[1]

الغرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حاجی سید محمد عابد صاحب کی ذات بابرکات پر گویا دیوبند اور اس کے باشندے سمٹے ہوئے تھے، جن میں مسلمانوں کے ساتھ جیساکہ آپ دیکھ رہے ہیں غیر مسلم بھی شریک تھے، علاوہ درویشی کے حالات کے شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی میں ان کے رسوخ اور استواری کا یہ حال تھا کہ بقول مولانا سید محمد میاں صاحب علماء کے مشہور سربرآوردہ عالم

---

[1] ارواح ثلثہ میں حضرت تھانوی کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب کے ساتھ عورتوں کی عقیدت کا یہ رنگ تھا کہ ایک بیوی صاحبہ جن کا دوپٹہ چوری گیا تھا، کہتی تھیں کہ کچھ پروا نہیں، حاجی محمد عابد سے کہلا بھیجو۔ دوپٹہ یہیں آجائے گا۔ چنانچہ حاجی صاحب سے کہلا بھیجا گیا، انہوں نے تعویذ دے کر فرمایا کہ الگنی جس پر کہ دوپٹہ چوری گیا ہے، اسی پر آجائے گا۔ چنانچہ دوپٹہ وہیں آگیا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ شاید کوئی جن وغیرہ تابع ہے۔ ص۲۲ قصص الاکابر۔

دمناظر مولنا مرتضیٰ حسن مرحوم یہ کیفیت بیان فرماتے تھے کہ

"ایک روز آپ کو (یعنی حاجی محمد عابد صاحب کو) بہت رنجیدہ دیکھا گیا، کبیدگی اور افسردگی کی یہ حالت تھی، کہ جیسے کسی جواں مرگ ...... پر ہو، جب سبب دریافت کیا گیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہو گئی" ص۳۵ ج ۵

اب صحیح طور پر تو میرے لئے یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ کس زمانہ کی بات ہے، چھتہ کی مسجد میں سیدنا الامام الکبیر نے جو آتشدان روشن فرمایا تھا، اور بجائے "گلیم بری" کے "غریق گیری" کے ذوق کا شعلہ آپ کی وجہ سے دلوں میں بھڑک اٹھا تھا۔ اس کے بعد کا یہ واقعہ ہے یا پہلے کا، یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت ہے کہ حاجی عابد حسین پر ایسا حال طاری ہوا کہ

"گھر، باہر، زمین، باغ، جس قدر آپ کی ملک میں تھا، سب کا سب راہ خدا میں دیکر محض خدا پر تکیہ کیا" ص۳۶

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے قالب میں "نئے محاذ" کے افتتاح کے لئے تعلیم کے اس جدید نظام کے چند عملی تجربہ کاروں کے ساتھ ساتھ کام کو ہاتھ میں لینے، اس کو پروان چڑھانے، آگے بڑھانے کے لئے ایک ایسی

"ہمہ وقتی توانائی"

کا جو اہم سوال تھا، یعنی ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر کامل یک سوئی کے ساتھ اسی کا جو ہو کر رہ جائے، اسی سوال کا مجسم زندہ جیتا جاگتا جواب بن کر حاجی محمد عابد کی ذات گرامی نگاہوں کے سامنے دیوبند میں گویا کھڑی ہو گئی تھی،

"دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانمایہ کو یہ سرزمین لے اڑی"

حضرت حاجی امداد اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اجمالی ارشاد کا یہی تفصیلی مطلب یا قسمت و تقدیر کے ظہور کی یہی تدبیری شکل تھی، زمین بھی مل گئی، زمین پر کام کرنے والے بھی مل گئے، تو جس قالب

میں "نئے محاذ" کے کھولنے کا ارادہ کیا گیا تھا، وہ کھول دیا گیا۔

یہی دارالعلوم دیوبند ہے، جو بحمد اللہ اس وقت تک اپنے تاریخی وجود اور تاثیری نتائج و ثمرات کے ساتھ ہم سب کے سامنے ہے، دیوبند کی خوش قسمت سرزمین میں درخت انار کی چھاؤں کے نیچے محمود معلم و متعلم ناسیوں کو بٹھا کر کھولنے والوں نے "نئے محاذ" کے اس تعلیمی قالب کے کھولنے کی توفیق جس زمانہ میں توفیق یافتوں کو بخشی گئی تھی کھول دیا، اسی زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر سنائی ہے کہ

"وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، اور مولوی فضل الرحمن اور مولوی ذوالفقار علی اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں" ص ۳۹

اس سے پہلے خود ہی یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ اس زمانہ میں خود وہ اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نوراللہ ضریحہما بھی میرٹھ میں مقیم تھے، اور مطبع مجتبائی جو پہلے میرٹھ ہی میں قائم ہوا تھا، اسی مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کی خدمت دونوں حضرات انجام دیتے تھے، بطور خود میرٹھ میں انفرادی درس و تدریس کا سلسلہ بھی سیدنا الامام الکبیر نے جاری کر رکھا تھا، جس زمانہ میں قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی بنیاد پڑی، پڑھنے والے آپ سے صحیح مسلم پڑھ رہے تھے[1]۔ پڑھنے والوں میں خود ہمارے مصنف امام بھی شریک تھے۔

---

[1] ایک بات یاد آگئی، بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری (جن کا آبائی وطن دیوبند ہی کے قریب ضلع مظفرنگر کے ایک گاؤں محی الدین پور نامی متصل اسٹیشن کھاتولی ہے) اس زمانہ میں جب حضرت والا مونگیر کی خانقاہ رحمانیہ میں جلوہ افروز تھے۔ براہ راست اس قصہ کو فقیر سے بیان کیا کرتے تھے کہ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بمقام میرٹھ میسر آئی تھی۔ غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، مولانا مونگیری قدس سرہ العزیز فرماتے تھے، حدیث پڑھی گئی، حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع و مدلل تقریر کی، جس سے کلیۃً شافعی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی تھی، طلبہ حیران ہوئے کہنے لگے کہ آپ کی اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعی ہی کا مسلک صحیح ہے، اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے۔ مولانا مونگیری فرماتے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ مولانا نانوتوی نے رنگ بدلا، اور فرمانے لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ (باقی اگلے صفحہ پر)

دیوبند کا وہی مدرسہ اور دارالعلوم جس کے اول وآخر، ظاہر وباطن، اندرو باہر، بلکہ جس کی اینٹ اینٹ، اور ذرہ ذرہ پر "قاسمیت" کی امٹ چھاپ پڑی ہوئی ہے، زمین والوں میں بھی قاسمیت ہی کے "امتیازی چھاپ" سے وہ پہچانا اور اسی نام سے پکارا جاتا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آسمانی غلغلوں کی یہ صدائے بازگشت نہیں ہے، جسے زمین کے رہنے والے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے دہراتے ہیں، الغرض یہی جانی پہچانی، خواص کی مسلمہ اور عوام کی مانی ہوئی حقیقت کے زیر اثر زندگی گذارنے والے جب سنتے ہیں، مصنف امام دارالعلوم دیوبند کے صدر اول کی زبانی قلم سے سنتے ہیں کہ جس وقت دیوبند میں دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور انار کے تاریخی درخت کے نیچے اس کا افتتاح ہوا، تو یہ "نیا محاذ" جس کے لئے کھولا جارہا تھا، وہی اپنے "نئے محاذ" پر موجود نہ تھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ اس "نئے محاذ" کا تعلیمی قالب جس وقت سرزمین دیوبند میں واقعیت کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ تو واقعۃً اس "قالب" کا "قلب" اور اس مرئی ودیدہ جسد کی جو روح تھی، وہ دیوبند میں موجود نہ تھی؛ "عقل" تو نہیں مانتی، لیکن جو واقعہ ہے، آخر اس کے انکار کی صورت ہی کیا ہے؛ نکتہ تراشیوں کا وہ سلسلہ اس سے بھی زیادہ عجیب تر ہے جب نہ ماننے والی عقل کو تھپکیاں دیتے ہوئے لوریاں سنائی جاتی ہیں، انار کے درخت کے نیچے چھتہ کی مسجد میں پندرہ روپے ماہوار کے ایک مدرس کا تقرر کرکے کھولنے والوں نے جس مدرسہ کو کھولا تھا، وہ مدرسہ ہی نہ تھا، ایک قصباتی مکتب مقامی بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا تھا، گویا دارالعلوم کی تاریخ کا جو سلسلہ انار والے درخت کے ساتھ باندھا جاتا ہے، چاہا جاتا ہے، کہ اس تاریخی رشتہ ہی کا انکار کرکے عقلی بےچینیوں کا ازالہ کر دیا جائے۔ اس سے بھی زیادہ دور کی کوڑیوں سے

(گذشتہ صفحہ سے) کہنے والے اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں، جو تم سن چکے، اب سنو! امام ابوحنیفہ کے مسلک کی بنیاد دی ہے۔ اس کے بعد مولنا نانوتوی نے پھر ایسی تقریر کی کہ لوگ مبہوت بنے ہوئے سن رہے تھے۔ ابھی جس مسلک کے متعلق ان کا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حدیثوں کے مطابق کوئی دوسرا مسلک نہیں ہو سکتا، اچانک معلوم ہوا کہ درحقیقت صحیح حدیثوں کا مفاد وہی ہے جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے منقح فرمایا ہے۔ مولنا مونگیری اس کے بعد دیر تک مولانا نانوتوی کی خداداد ذہانت وذکاوت کی تعریف فرماتے رہے۔ ۱۲

لانے والوں کا یہ سیاسی نکتہ ہے کہ اپنے خاص حالات کے لحاظ سے قصداً وارادۃً سیدنا الامام الکبیر نے اپنے آپ کو اس مقام سے غائب کر دیا تھا۔ جہاں بہرحال ان کی حاضری عقلاً ضروری اور ناگزیر تھی۔ یعنی اشتباہی نظر حکومت کی جو آپ پر تھی یہ عدم حاضری اسی مصلحت سے تھی۔ الغرض یہ یا اسی نوعیت کی "دقیق شناسیوں" اور "دقیقہ آفرینیوں" کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہوتا رہتا ہے۔

حالانکہ "درخت انار" کی چھاؤں میں ایک استاذ والا یہ مدرسہ، اس مدرسہ کے مستقبل کے اعتبار سے خواہ جس حد تک بھی مختصر نظر آ رہا ہو، تقطیع اس کی اس زمانہ میں جتنی بھی چھوٹی ہو، لیکن بہرحال وہ عربی ہی کا دینی مدرسہ تھا، جیسے اپنے اس طویل وعریض ہیکل میں بھی دیوبند کا یہ دارالعلوم اس وقت بھی عربی ہی کا دینی مدرسہ ہے شروع میں جس وقت وہ قائم ہوا تھا اس وقت بھی یہی تھا، درمیان میں بھی وہی رہا، اور اس وقت تک وہی ہے۔ اس سے بڑھ کر محکم واستوار شہادت اس دعوے کے ثبوت کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ درخت انار کی چھاؤں میں اس مدرسہ کا ۱۲۸۳ھ میں افتتاح ہوا، مدرسہ کے اسی پہلے سال کی پہلی مطبوعہ روداد میرے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ روداد کو ان الفاظ سے شروع کرکے کہ

"الحمد للہ کہ ۱۲۸۳ ہجری بخیریت تمام ہوا۔"

آگے اسی میں یہ اطلاع دی گئی کہ

"یہ وہ سال مبارک ہے جس میں بناء

"مدرسہ عربی"

کی دیوبند میں قائم ہوئی۔"

نام ہی نہیں، امتحانی کتابوں کے ناموں کی فہرست بھی ہمیں جب یہ ملتی ہے یعنی لکھا ہے کہ شرح وقایہ شرح ملا، میبذی، قطبی، اصول شاشی، سراجی وغیرہ کتابوں میں طلبہ کا امتحان لیا گیا، اسی سے اس

"مدرسہ عربی" کے پہلے سال کے کاموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کو گیا' اس وقت تک "دارالعلوم" کے وسیع تدریسی احاطہ میں چند ابتدائی کلاسیں بھی مقامی ضرورتوں کے پیش نظر قرآن ناظرہ و حفظ' اردو فارسی حساب وغیرہ کی بھی ہیں، لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ عربی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد جیسا کہ دوسرے سال کی روداد میں لکھا ہے' ان تحتانی کلاسوں کا اضافہ بعد میں ہوا ۱۲۸۳ھ کی روداد جو دوسرے سال کی روداد ہے' اس میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"جب دیکھا گیا کہ طلبہ مبتدی بیرونجات و دیوبند کی کارروائی' بدون پڑھنے کتب فارسی کے نہیں ہوتی' اور فارسی تعلیم' عربی میں ابتداءً دخل تمام رکھتی ہے' اور نیز خیال کیا گیا کہ اگر کتب فارسی ابتداء سے پڑھائی جاوینگی تو بالضرور لوگ اپنے چھوٹے لڑکوں کو مدرسہ بھیجیں گے' اور اس میں امید قوی ہے کہ رفتہ رفتہ شوق تعلیم عربی ہو" صک

جس کا حاصل یہی تو نکلا کہ عربی زبان کی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد فارسی ادب کی کتابوں کے لئے گنجائش مدرسہ کے نصاب میں پیدا کی گئی' اسی روداد میں آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ تعلیم قرآن کا درجہ بھی اسی کے بعد کھولا گیا' اور اس سلسلہ میں

"اوائل ماہ ذی الحجہ سے حافظ نامدار خاں جن کی تعلیم اور حفظ قرآن مشہور ہے' بہ تنخواہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے ہیں۔"

ہمارے مصنف امام نے بھی دیوبند میں قیام مدرسہ کی خبر دینے کے بعد جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"چند ہی روز گذرے کہ چندہ کو افزونی ہوئی' اور مدرس بڑھائے گئے' اور مکتب فارسی حافظ قرآن مقرر ہوئے۔" ص۱۳

دیکھ رہے ہیں کہ قائم جب ہوا تو "مدرسہ عربی" ہی کے نام سے قائم ہوا' مکتبی کلاسوں کا اضافہ اس "مدرسہ عربی" میں بعد کو ہوا' ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ چھتہ کی مسجد میں دارالعلوم کی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی' اور اسی سے لئے کردہ ایک مقامی قصباتی مکتب خانہ تھا' سیدنا الامام الکبیر اس کی افتتاحی تقریب میں

شریک نہ تھے۔ خود ہی سوچئے کہ یہ توجیہ واقعات کے مطابق کس حد تک ہو سکتی ہے، پھر مدرسہ کے پہلے سال کی اسی روداد میں

"نام مہتممان"

کے عنوان کے نیچے حسب ذیل ناموں کو جب ہم پاتے ہیں، یعنی

"حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی مہتاب علی صاحب، مولوی ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمٰن صاحب، منشی فضل حق، شیخ نہال احمد"

بظاہر "ارکان مجلس شوریٰ" کی تعبیر "مہتممان" کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند میں "مدرسہ عربی" جو قائم ہوا تھا، اس سے اپنے تعلق کو سیدنا الامام الکبیر قطعاً پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جب "مجلس شوریٰ کے ارکان" میں آپ کا نام شریک تھا۔ وہی طبع بھی ہوا شائع بھی ہوا، تو یہ کہنا کہ ابتداء میں حضرت والا اس مدرسہ سے سیاسی مصالح کے پیش نظر ایسا تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے، جس پر حکومت کی نظر پڑ سکتی ہو۔ بجز ایک خود تراشیدہ[1] مفروضہ کے اور بھی کچھ ہے، اسی سال کی روداد میں

---

[1] احقر کے خیال ناقص میں بسلسلہ تاسیس دارالعلوم حضرت والا کے کھل کر سامنے نہ آنے کو وقت کی سیاسی مصالح پر محمول کر لیا جانا بھی کوئی ایسی بے سر و پا توجیہ نہیں کہ اسے خود تراشیدہ مفروضہ کہہ کر کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے۔ اس وقت کی نازک حالات، حضرت والا کا وارنٹ، روپوشی، سرکاری دوشوں کا پیچھے پیچھے لگا رہنا، پھر حضرت والا کے اُن جذبات و نظریات کا باہمی سوز یا تعقل کیلئے ہوتا جو اس وقت اجراء مدرسہ کی روح اور آج ایک مستقل مکتب خیال اور ملت کی تاریخ بنی ہوئے ہیں، جن کی رو سے یہ مدرسہ تعلیمی ہونے کے ساتھ ساتھ گویا اہل اللہ کی سیاست کا ایک مرکز بھی تھا، کچھ ایسی باتیں نہ تھیں جو کلیۃً پردہ خفا میں ہوں یا کم از کم بحیثیت مجموعی حکومت وقت کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہوں ایسی صورت میں حضرت والا کا بحیثیت بانی یا بحیثیت کسی ذمہ دار عہدیدار کے سامنے آنا بلاشبہ مدرسہ کو خطرات و مہالک کا شکار بنا سکتا تھا اور ابتداء ہی سے حکومت وقت کی نگاہیں اس پر کڑی ہو جاتیں جس سے وہ حریت پرور مقاصد بروئے کار نہ آ سکتے جن کے لئے یہ تاسیس عمل میں آئی تھی، ان حالات میں حضرت والا کا کسی رسمی ذمہ داری کی صورت سے سامنے نہ آنا مدرسہ کے حق میں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ ہونے کو نمایاں رکھنا ایک اچھی خاصی سیاسی مصلحت کی صورت ہو جاتی ہے۔ رہا ممبران یا مہتممین کی فہرست میں حضرت والا کا نام شائع ہو جانا ان کی کسی رسمی ذمہ داری کو ظاہر نہیں کرتا اگر اس میں ذمہ داری نمایاں ہوتی ہے تو ایک جماعت کی اور وہ بھی اعزازی جس کا کسی مسئولیاتی منصب سے تعلق نہیں ہوتا پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو تارک الدنیا اور مسجد نشین بزرگ تھے، جنہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

"امتحان سالانہ"

کا عنوان قائم کرکے یہ رپورٹ درج کی گئی ہے کہ

"ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم نانوتوی نے بشمول مولوی مہتاب علی و

مولوی ذوالفقار علی صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا"۔ صلہ

کام کرنے کیلئے 'میرٹھ' سے جو دیوبند مجلس شوریٰ میں شریک ہوئے' طلبہ کا امتحان لینے کیلئے آسکتا تھا اسی مدرسہ کا

سنگ بنیاد جب رکھا جا رہا تھا' افتتاح مدرسہ کی اس تاریخی مجلس سے بجائے حاضر ہونے کے غائب تو الگ کیوں ہو گیا؟ اور

غائب ہو کر آخر اس مدرسہ کے اجراء افتتاح سے اسکے تعلق کی کیا نوعیت تھی؟ یقیناً مندرجہ بالا "معلومات" کے پیش نظر ایک

دلچسپ سوال بن جاتا ہے۔ خدا جانے دماغوں میں اسکی اور کیا کیا توجیہیں آئی ہیں یا آسکتی ہیں' لیکن میں کیا عرض کروں۔ انکے لئے

(گذشتہ صفحہ سے) سیاسیات سے تو بجائے خود' عام شہری معاملات سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور یا ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ

کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے جن کے بارہ میں گورنمنٹ کو شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایسے سلسلے نام وری تیغ نا

کسی خاص شخصیت پر نگاہ عادۃً نہیں پڑ سکتی۔ اس پر بھی مخالفین مدرسہ نے حضرت ہی کے تعلق کو بنیاد قرار دیکر مدرسہ کو حکومت وقت

کی نگاہوں میں مشتبہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بغاوت کے الزامات بھی لگائے اور غیر ممالک سے سازش کی تہمتیں بھی

تراشیں' حتی کہ گورنمنٹ کو تحقیقات کرانی پڑی' اس وقت یہی حضرات آگے بڑھے اور اپنے سرکاری اعتماد کو سامنے رکھکر مدرسہ کی

طرف سے صفائی پیش کی جو کارگر ہوئی۔ ورنہ اگر شخصی طور پر عہدیدارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت الامام آگے آئے ہوئے ہوتے تو ظاہر

ہے کہ مدرسہ کی طرف سے ان بزرگوں کی یہ صفائی اور یقین دہانی کبھی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔ گویا حضرت والا کا پس پردہ رہنا جس مصلحت

سے تھا' عملاً اس کا خوشگوار نتیجہ ظاہر بھی ہوا۔ اسلئے حضرت والا کی یہ حکمت عملی کہ مدرسہ کے سب کچھ ہونے کے باوجود وہ کچھ

بھی نہ ہونا ہی دکھانا چاہتے تھے اور نہ صرف تاسیس مدرسہ ہی کی حد تک بلکہ آخر تک اسی کو نباہا گیا۔ بلاشبہ وقتی مصالح کے لحاظ

سے ایک حکیمانہ روش تھی جس کو سیاسی مصلحت کے سوا اور کس نام سے تعبیر کیا جائے؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس اخفاء و تستر میں حضرت والا کی قلبی افتاد اور روحانی کسر نفسی اور تواضع کو بھی کافی دخل تھا

اور کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح وہ امامت خطابت' زعامت مشیخت افتاء اور تمام امتیازی مواقع سے گھبراتے تھے اسی طرح

کار ہائے مدرسہ کی قیادت سے بھی یقیناً گریز فرماتے ہوئے جیسا کہ حضرت مصنف دام مجدہ کا نظریہ ہے اور واقعہ بھی ہے لیکن

ان دونوں باتوں' یعنی سیاسی مصلحت اور قلبی تواضع میں کوئی منافات نہیں۔ اگر قلبی افتاد کے ساتھ عقل کی انگیز بھی شامل ہو جائے

تو اہل اللہ کے لئے یہ جمع اضداد کچھ مشکل نہیں۔ ایسے لوگوں کے قلب سلیم کی مقاماتی ترقی میں عقل معین ہوتی ہے اور عقل کے

اونچے اونچے نظریات میں قلب کی سلامتی مددگار ہوتی ہے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ قلب نے اپنے راستہ سے اور دماغ نے

اپنے طریقہ سے حضرت والا کو اس باہمہ و بے ہمہ حکمت عملی پر قائم کیا ہو' نظر بریں ہم اسے اعلیٰ ترین تواضع بھی کہہ

سکتے ہیں اور بہترین سیاسی مصلحت کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔

محمد طیب غفرلہ

اور اکثر نے اپنے ہمجولی بچوں پر برتری اور فوقیت حاصل کرنیکا ذریعہ یا دھوکا عید کے اسی جوڑے کو جس پھونک کر رکھدیا تھا
طفولیت کے ایام بیہوشی میں جو ہوش کی ایسی باتیں کرتا تھا کہ بڑے بڑے ہوشیاروں سے بھی جنکی ہم توقع نہیں کر سکتے، لکھنے
پڑھنے حتی کہ کھیلنے کودنے تک کے مشغلوں میں کام کو انتہائی منزلوں تک پہنچانے میں کامیاب ہونے کے ساتھ
ہی نام اور شہرۂ عام کے موقعہ پر جس کا جبلّی سجیّہ اور دوامی وطیرہ بجائے حاضری کے غائب ہو جانا
ہی قرار پا چکا ہو، ساری بلندیاں جن پر چڑھ چڑھ کر بجانے والے اپنے اپنے فضل و علم کی ڈگڈگیاں
پہلے بجاتے تھے، یا آج تک بجا رہے ہیں، کیا ہمیشہ ان سے آتر نے ہی پر اصرار کرتے ہوئے اسے
نہیں پایا گیا، حکومت کی ملازمت یا وکالت جیسی باتوں کو تو خیر دور رکھئے، آپ سن چکے کہ جس زمانہ میں
اس کے دیوان علم کے رفقاء وسیع صحراؤں کی طرف بگٹٹ بھاگے چلے جاتے تھے، ٹھیک ان ہی
دنوں میں وہ دلّی کے کوچہ چیلان نامی کے ایک مکان میں جھلنگے پر پڑا ہوا تھا۔ اسی طرح امامت،
خطابت، افتاء، درانست، تصنیف و کتابت، حتی کہ ارشاد و بیعت تک کی راہوں میں آپ دیکھ
چکے کہ کبھی وہ خود آیا نہیں، بلکہ لایا گیا، علم و دین کی ان نمائش گاہوں پر خود چڑھا نہیں بلکہ چڑھایا گیا، بزور جبر
چڑھایا گیا، پھر کام کے بعد آج یہی نام کے مقام پر وہ کیوں ڈھونڈھا جا رہا ہے، جو اس مقام پر پہلے
کب اور کہاں پایا گیا تھا۔ ان ہی پہنائیوں میں تو عرض کر چکا ہوں۔ اس کی "پیدائیوں" کا راز پوشیدہ
ہے، آج اس کے ظہور کی شدت ممکن ہے، بعضوں کے لئے ناقابل برداشت بنی ہوئی ہو۔
سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ وہ تو غائب تھا۔ پھر ہر جگہ وہی وہ آج کیوں پایا جا رہا ہے۔ شاید قرآنی
قانون واللہ مخرج ما کنتم تکتمون اور اس کی تفسیر جو انہیں سنائی گئی تھی، اسے وہ بھول
گئے، حالانکہ چاہئے تھا کہ بجائے اس کے ان معلومات کا جائزہ لیتے اور ان میں اپنے اس سوال
کا جواب تلاش کرتے جو ان کے "حافظہ" سے امید ہے کہ ابھی غائب نہیں ہوئے ہوں گے،
کچھ بھی ہو، سچی بات یہی ہے، یہی واقعہ ہے، اور اسی کو واقعہ ہونا بھی چاہئے کہ "جامعہ قاسمیہ" یا
"دیوبند کے دار العلوم" کی جب بنیاد پڑی تھی تو سیدنا الامام الکبیر اس وقت دیوبند میں موجود نہ تھے
اسی لئے قیام دار العلوم کی ابتدائی داستان میرے دائرۂ بحث سے سچ پوچھئے تو خارج ہے۔

ان جزئیات کی سراغ رسانی یعنی مقامی طور پر "مدرسہ عربی" کے نام سے دیوبند کے قصبہ میں اس تعلیم گاہ کا افتتاح کب اور کن مقامی بزرگوں کی تحریک و تجویز سے ہوا۔ ان باتوں کی تحقیق کا صحیح مقام سیدنا الامام الکبیر کی سوانح عمری نہیں، بلکہ دارالعلوم کی تاریخ ہو سکتی ہے، لیکن آئندہ کی کڑیوں کی حلقہ بندی کے لئے یہاں بھی ضرورت ہے کہ ذیلی طور پر ان معلومات کو اس کتاب میں بھی درج کر دیا جائے، جو ان امور کے متعلق اب تک سیدنا الامام الکبیر کے اس ظلوم و جہول سوانح نگار تک پہنچے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاملی کے میدان کا زخم خوردہ شیر، اس میدان سے واپس ہونے کے بعد نئے داؤ اور نئے گھات کے لئے کسی نئی "کمین گاہ" کی تلاش میں جب سرگرداں تھا، تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا تو دشوار ہے کہ اس زمانہ میں ان کی نظریں کہاں کہاں کن کن لوگوں پر پڑ رہی تھیں، تاہم قرائن و قیاسات کا اقتضاء ہے کہ سہارنپور تھانہ بھون مرادآباد میرٹھ وغیرہ جیسے مقامات جہاں سے آپ کے خاص تعلقات تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ کوئی وجہ نہ تھی کہ دیوبند اور اس کے امکانات آپ کے سامنے نہ آئے ہوں، جو اب بجائے نانوتہ کے آپ کا وطن ثانی بھی بن چکا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے اس

"کچھار"

کے پروردہ شیر بچوں سے جو آپ ہی کی آغوش تربیت میں پل رہے تھے، آپ کے طبعی رجحانات و میلانات، خول کو آپ کی "مجلس انس" میں شریک ہو ہو کر شعوری و غیر شعوری طور پر جو چوس رہے تھے ان ہی شیر بچوں سے توقعات کی لہریں آپ کے قلب مبارک سے زیادہ ٹکراتی ہوں، ان ہی سے آپ کا دل زیادہ امیدیں باندھتا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ لیکن با ایں ہمہ اس کا کوئی تاریخی وثیقہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ قیام مدرسہ کی تاریخ و سنہ یا اس کے ابتدائی مبادی طے کرنے کیلئے بقید وقت صاف صاف دو ٹوک الفاظ میں "دیوبند" کے باشندوں کو کوئی واضح تصریحی حکم آپ نے دیا تھا۔ اگرچہ آپ کی ہر حرکت اور ہر سکون ساری زندگی اس میں شک نہیں کہ مجسم سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی لیکن اس سوال کا جواب کہاں سے آئیگا؟ اور کون لوگ لبیک کہینگے؟ اسی کے انتظار میں دن پر دن، مہینوں پر مہینے، سال پر سال گذرے چلے جاتے

تھے ' ایک سال دو سال ' تین سال ' تا آیں کہ قریب تھا کہ سالوں کا ایک دہایا عشرہ بھی گذر جائے اسی سوال کا جواب زمین پر بھی ڈھونڈھ رہا تھا اور عرض کر چکا ہوں ' کہ تلاش کرنے والا آسمانوں میں بھی اسی سوال کے جواب کو تلاش کر رہا تھا ' کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب میرٹھ کا شہر اور اس کے مطبع مجتبائی میں انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں کہ دیوبند سے یہ "بشارت ثامنہ" موصول ہوا ' یعنی حاجی عابد حسین صاحب نے سیدنا الامام الکبیر کو میرٹھ خط لکھا ' جس کا اقتباس تذکرۃ العابدین میں دیا گیا ہے۔ حاجی نذیر احمد صاحب مصنف تذکرۃ العابدین یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ حاجی عابد حسین صاحب نے مدرسہ کے سلسلہ میں چندہ شروع کر دیا ' خود بھی دیا ' اور دوسروں سے بھی لیا اور جمع کیا۔ آگے لکھتے ہیں

" اگلے روز حاجی صاحب (حاجی عابد حسین صاحب) نے مولوی محمد قاسم صاحب کو میرٹھ خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آئیے۔ فقیر نے یہ صورت فراہمی چندہ اختیار کی ہے۔" (تذکرۃ العابدین ص۷۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

اس خط کے بارہ میں جو بیان مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاذ دار العلوم دیوبند کا شامل سواد سوانح قاسمی ہے اس میں اس خط کے کچھ اور فقرے بھی ملتے ہیں۔ جن سے بعض دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا ممدوح لکھتے ہیں

"حاجی عابد حسین صاحب کا یہ خط میں نے حاجی نذیر احمد صاحب کے پاس بچشم خود دیکھا ہے اور مجھ اس کا مضمون بجنسہ قریب قریب اسی کے الفاظ میں پوری طرح محفوظ ہے اس خط میں حاجی صاحب نے مولانا مرحوم کو لکھا ہے ' کہ وہ جو آپ کے ہمارے درمیان مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایک ایک سوال پوچھنے کے لئے سہارنپور آدمی بھیجنا پڑتا ہے۔ فقیر کے دل میں اک دم خیال آگیا اور چندہ کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپے ہوگئے۔ اب آپ تشریف لے آئیے۔ (فائل مسودات سواد سوانح)

یہ سوال کا جواب اور لبیک کی پہلی آواز تھی جو خوش قسمت دیوبند اور اس کے خوش نصیب، توفیق یافتہ باشندوں کی طرف سے تقریباً دس سال کی "تاذین عام"[1] کے بعد پہلی دفعہ سیدنا الامام الکبیر کے "قلب منتظر" سے ٹکرائی، سب پیچھے رہ گئے، دیوبند سب سے آگے بڑھ گیا اور "الفضل للمتقدم" کا "قدرتی حق" ضلع سہارنپور کے اس گمنام قصبہ "دیوبند" کے طالع ارجمند کے لئے ہمیشہ کے واسطے محفوظ ہو گیا، سبقت اور پیش قدمی کا ایسا حق جو کوئی اس سے اب چھین نہیں سکتا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

مندرجہ بالا "بشارت نامہ" حضرت سید حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارقام فرمودہ تھا جو چھتہ کی مسجد کی "مجلس انس" کے رکن رکین تھے

بشارت نامہ کے ان دونوں اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسال بشارت نامہ تک حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب کی مساعی صرف فراہمی چندہ تک محدود ہیں۔ تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا اسی کے لئے انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کو یاد فرمایا۔ اور ان مذاکرات کا حوالہ دے کر یاد فرمایا جو اجراء مدرسہ کے سلسلہ میں ان میں اور سیدنا الامام الکبیر میں ہوا کرتے تھے۔ گویا یہ اقدام ان مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر ایک باہمی سمجھوتہ یا ایک معہود فی الذہن منصوبہ کے تحت عمل میں آیا تھا۔

ابتدائی مراحل کی اطلاع بشارت نامہ کے ذریعہ میرٹھ پہنچی جس کے قلب میں ۱۲۸۲ھ کے بعد سے ایک اساسی مقصد کی آگ لگی ہوئی تھی، اور جس کے پردے کار آنے ہی پر بظاہر اسباب مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی تعمیر ہونے والی تھی۔ جس کے لئے ۱۲۸۳ھ ہی سے دیوبند کی آمد و رفت مسجد چھتہ کی مجلس انس اور مذاکرات و تصرفات کا ایک لمبا سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ آج جبکہ اسی مقصد کے بارہ میں

[1] اقتباس از آیت واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔ اور غالباً بناء دار العلوم کے سلسلہ میں اسی آیت کے مضمون سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اقتباس کر کے اپنے استاذ حضرت نانوتوی کے بارہ میں یہ شعر لکھا ہے۔ اس کی آواز تھی یا بانگ خلیل الٰہی + کہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم۔ اسی تاذین اور اس کی لبیک کی داستان کی طرف حضرت مصنف لفظ تاذین سے اشارہ فرما رہے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

عملی لبیک کی خوش خبری سامنے آئی تو سیدنا الامام الکبیر کی خوشی و مسرت کا آج کون اندازہ کر سکتا ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جلد سے جلد اصل مقصد کی عملی تکمیل کا ولولہ کس حد تک قلب مبارک میں جوش زن ہوا ہوگا۔ اس بشارت نامہ کے جواب میں آپ نے جو والا نامہ تحریر فرمایا اس کا یہ متعلقہ حصہ صاحب تذکرۃ العابدین نے نقل کیا ہے جس کے الفاظ بجنسہ یہ ہیں۔

"مولوی محمد قاسم صاحب نے جواب لکھا کہ میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں۔ وہ پڑھا دینگے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔" (تذکرۃ العابدین ص۶۹)

سیدنا الامام الکبیر کے اس اذن اور عملی پیشقدمی پر جو تعمیلی صورت دیوبند میں نمودار ہوئی اس کے بارہ میں صاحب تذکرۃ العابدین ہی نے یہ اطلاع دی ہے

"چنانچہ ملا محمود صاحب آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کیا۔"

(تذکرۃ العابدین ص۶۹)

حاجی محمد عابد صاحب کے اس بشارت نامہ اور سیدنا الامام الکبیر کے جوابی والا نامہ سے یہی معلوم ہوتا ہے اور سوچنے والے اس کے سوا اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں کہ دیوبند میں تعلیم کی اجتماعی شکل میں "نئے محاذ" کا افتتاح سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و صوابدید کے مطابق اور آخر کار اُن ہی کے اذن صریح بلکہ افتتاح مدرسہ کے بارہ میں عملی پیش قدمی سے عمل میں آیا تھا۔ جس کے لئے سربراہ کار حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب تھے، گویا سیدنا الامام الکبیر نے اگر ابتداء ہی سے انہیں اس کام کے لئے نگاہ میں رکھ کر چھتہ کی مسجد کا قیام اختیار فرمایا تھا۔ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کی عبارت اس بارہ میں پیش کی جا چکی ہے۔ پھر مذاکرات کی داغ بیل ڈالی تھی، جیسا کہ حاجی صاحب کے اس بشارت نامہ کی عبارت سے واضح ہے تو حاجی صاحب ہی اس سلسلہ میں آگے بڑھے انہوں نے ہی قیام مدرسہ کے ابتدائی مراحل (فراہمی چندہ) طے کئے اور انہوں نے ہی حضرت والا کو بشارت نامہ بھیجکر گویا استیذان کیا اور بالآخر حضرت والا کے اذن اور مدرس بھیجنے پر چھتہ کی مسجد میں

مدرسہ کا افتتاح عمل میں آگیا۔

باقی یہ جو لوگ پوچھتے ہیں کہ مقامی طور پر مدرسہ کے افتتاح کی دیوبند میں کیا صورت پیش آئی؟ تحریک و تجویز میں کس نے پہل کی؟ وغیرہ سو میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ دیوبند کے بعد سہارنپور، مرادآباد، تھانہ، کیرانہ، نگینہ، گلاؤٹھی، مظفرنگر، رڑکی، انبہٹہ وغیرہ آس پاس کے قریٰ و امصار میں سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و ایماء کے متعلق مقامی درسگاہیں وقتاً فوقتاً جیسا کہ آگے معلوم ہوگا کھلتی رہیں، ان کے متعلق تحقیق کی جائے کہ مقامی طور پر ان مقامات میں سب سے پہلے کس نے "درسگاہ" کے قیام کی تجویز پیش کی، تجویز کو کن کن لوگوں نے پہلی دفعہ قبول کیا، اور اہتمام و انتظام کا بار کن بزرگوں نے اپنے اوپر لیا، میرے نزدیک کوئی قابل توجہ بات نہیں۔

تاہم اس وقت مسجد چھتہ کی مجلس انس کے سربرآوردہ اور ذمہ دار اراکین میں حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب اپنے تقدس اور درویشی کی حیثیت سے مقبول خلائق اور دیوبند میں مرجع عوام و خواص بنے ہوئے تھے جن کے بارہ میں مولٰنا ذوالفقار علی صاحب کا یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ مدرسہ دیوبند کو سلطان روم بھی بغیر حاجی محمد عابد صاحب کی مدد کے نہیں چلا سکتا اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی مشہور نظم میں انہیں "مرد حق" - "عابد صداقت کیش" اور "طائر ہمایوں فال" وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر کے اپنی گہری عقیدتمندی کا ثبوت دیا ہے، اور ادھر یہ دونوں نامبردہ بزرگ یعنی مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں اپنی علمی حیثیت اور تعلیمی تجربہ کے لحاظ سے قصبہ میں ممتاز تھے۔ بقول مصنف امام ان تینوں حضرات نے تجویز کی اور گویا ارادہ کیا کہ دس سال سے جس کام کے لئے قلوب مستعد ہوتے چلے آرہے تھے اب وہ کام بروئے کار لایا جائے۔ پھر اس مبارک کام کو چھیڑنے کے لئے تحریک ان میں سے پہلے کس نے کی؟ سو تذکرۃ العابدین کی روایت کے مطابق حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے اور سوانح مخطوطہ کی روایت کے مطابق مولٰنا فضل الرحمٰن صاحب نے، ہمارے نزدیک یہ دونوں روایتیں متعارض نہیں ہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ دونوں بزرگوں نے کی۔ کیونکہ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ مسجد چھتہ کی مجلس انس کی تاثیری کارفرمائیوں سے

جبکہ یہ کام ان سب ذہنوں کی مشترک پکار بن چکا تھا تو جو زبان بھی پہلے ہلی۔ اُس نے اپنی ساتھ دوسرے کی ترجمانی بھی کی، اسلئے ہم اس پہل کو تذکیر سمجھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ صدا کبھی کسی کی زبان پر اور کبھی کسی کی زبان پر آتی رہی جو دوسروں کو اُبھارنے اور یاد دلانے کے لئے ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو، بہرحال اچانک دیکھا یہ گیا کہ حاجی محمد عابد صاحب تن تنہا گلے میں جھولی ڈال کر چندہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کی تفصیلی روایت آگے آرہی ہے، اور روپیہ جمع کر کے اصل مقصد یعنی افتتاح تعلیم و اجراء مدرسہ کے لئے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں میرٹھ بشارت نامہ بھیجدیا، اور وہاں کی تصویب تا دین اور مدرس کا تقرر کر کے بھیجدینے پر افتتاح مدرسہ عمل میں آگیا، جیسا کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ اسی کے ہاتھوں اس کام نے عملی قالب اختیار کیا۔ جس کے قلب کا یہ جذبہ تھا، اور جس نے دوسرے قلوب کو بھی اس تپش سے تیار رکھا تھا۔ یعنی اجراء مدرسہ حضرت والا نے کیا گو پس پردہ میرٹھ میں بیٹھ کر کیا۔ لیکن عملاً اس کام کو چلانے اور آگے بڑھانے کے لئے بہرحال ایک ایسی مقامی شخصیت کی ضرورت تھی جو اپنے اثر و اقتدار سے "مالی سرمایہ" کے فراہم کرنے میں بھی کامیاب ہوسکتا ہو، اور اسی کے ساتھ بڑا اہم مسئلہ یہ تھا کہ ہمہ وقتی نگرانی کے لئے دوسرے مشاغل سے وہ آزاد بھی ہو، کہہ چکا ہوں کہ ان دونوں خصوصیتوں یعنی اثر و اقتدار اور ہمہ وقتی توانائی" کی جو ضرورت اس ادارہ کو عملی گردش میں لانے کے لئے تھی۔ ان دونوں جوہری خصوصیتوں کی جامع ذات اس زمانہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ کے سوا جہاں تک معلومات کا تعلق ہے، دیوبند میں اس وقت شاید کوئی دوسری ہستی نہ تھی، حاجی صاحب کا اثر اور کافی گہرا اقتدار مسلمان مردوں اور عورتوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ قصبہ کی غیر مسلم آبادی میں بھی جیسا کہ سن چکے، اپنے خاص حالات کے لحاظ سے وہ کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے، اور صرف یہی نہیں بلکہ سوانح مخطوطہ کے باخبر مصنف[۱] نے حاجی صاحب کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ

---

[۱] پہلے تو ان کی شخصیت کچھ مجہول سی تھی لیکن معلومات ان کے متعلق جو فراہم ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں تو دار العلوم دیوبند کی تاریخ میں ان کی ہستی کافی ممتاز اور اہم بن جاتی ہے۔ مولانا طیب صاحب کے (باقی اگلے صفحہ پر)

"آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔"

آگے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"پابندیٔ وضع، استقلال طبع، اولوالعزمی، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے۔"

اور گو لکھنے کے بعد اپنے مسودہ میں ان الفاظ کو نہ معلوم کیوں قلم زد کر دیا گیا ہے۔ لیکن بہر حال ہیں یہ قلم زدہ الفاظ بھی ان ہی کے قلم سے نکلے ہوئے، اور وہ یہ ہیں کہ

"باوجودیکہ (حاجی عابد صاحب نے) دنیا کو ترک کر دیا، مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے، تو اس میں بھی ایسی اچھی صائب رائے ہوتی ہے، جیسے بڑے ہوشیار دنیا دار کی۔"

شاید آخری الفاظ میں کچھ تعبیری خامی محسوس ہوئی، اسی لئے وہ کاٹ دیئے گئے مگر میرے سامنے جو سوال ہے، اسکے حل میں ان کے قلم کے نکلے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ سمجھ میں آتا ہے کہ "اثر" د "فرصت" کے سوا حاجی صاحب میں وہ ساری خوبیاں جمع تھیں جن میں کسی اجتماعی نظام کے تحت چلائے جانیوالے ادارہ کی فلاح و بہبود، بقاء و ارتقاء کی ضمانت پوشیدہ ہے، حاصل یہی ہے کہ صاحب دل ہونے کے ساتھ حاجی صاحب "صاحب دماغ" بھی تھے۔

(گذشتہ صفحہ سے) بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف دیوبند ہی کے ایک بزرگ منشی فضل حق نامی ہیں، یہ وہی منشی فضل حق صاحب ہیں، جن کا اسم گرامی دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان کی اس فہرست میں درج ہے جو مدرسہ کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ کی روداد میں شریک ہے، گویا ابتداء ہی سے مجلس شوریٰ کے رکن "منتخب ہوئے اور آخر تک رہے۔ دارالعلوم کی بعض قدیم رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ ہجری میں حاجی سید عابد حسین صاحب کی تحریک اور قطب ربانی حضرت گنگوہی کی ترشیح سے منشی فضل حق دارالعلوم کے مہتمم بھی مقرر ہوئے تھے؛ حاجی عابد حسین صاحب نے اپنی تحریک مجلس شوریٰ میں جن الفاظ میں پیش کی تھی ان کی خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے تحریک کے الفاظ یہ تھے۔ "منشی فضل حق ابتداء مدرسہ سے داخل اہل شوریٰ ہیں اور پہلے عرصہ تک اہتمام کا کام کر چکے ہیں" اور استعداد تحریر و تقریر کی وافی رکھتے ہیں، اور تدابیر وقت انتظامیہ کی بھی عاری نہیں ہیں" منشی صاحب کا خاندان اوپر کی پشتوں کو حساب کر کے حاجی عابد حسین صاحب سے مل جاتا ہے، خود سیدنا الامام الکبیر کی بھی سسرالی رشتہ آپ کا تھا۔ منشی صاحب کے ایک صاحبزادے مولانا ظہور الحق صاحب (قطب طیبہ و ہوشیار) مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس ہیں اور ڈاکٹر شفیق احمد صاحب منشی صاحب مغفور کے نواسے ہیں، جو آج کل دیوبند کے ممتاز معالجوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ منشی صاحب کا مکان دیوبند کے محلہ سرائے میں اب بھی موجود ہے، ان کے خاندان والوں سے مولانا کے گھرانے سے خوش گوار گہرے تعلقات ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف کے بعد "سوانح مخطوطہ" اور اس کے مشتملات کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ۱۲

بلکہ صاحب دل وصاحب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب کے متعلق اس قسم کے معلومات ہم تک جو پہنچے ہیں۔ مثلاً ارواحِ ثلاثہ میں حضرت تھانوی کی یہ روایت پائی جاتی ہے، حضرت والا اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب کے حوالے سے بیان فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا فتح محمد صاحب جب زیر تعلیم تھے، تو کسی ضرورت سے وہ حاجی سید محمد عابد صاحب قبلہ کی خدمت میں پہنچے، اس وقت وہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے لیکن ٹھیک اسی وقت کوئی ڈپٹی صاحب بھی حاجی صاحب کی ملاقات ہی کی غرض سے آدھمکے۔ حاجی صاحب نے حد سے زیادہ لاپروائی سے گویا کام لیتے ہوئے ڈپٹی صاحب سے سرسری گفتگو کی، اور اٹھ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ مولانا فتح محمد جن کی حیثیت اس زمانہ میں مدرسہ کے ایک معمولی طالب علم سے زیادہ نہ تھی، دیکھا کہ وہ آرہے ہیں، ان پر نظر کا پڑنا تھا کہ پلٹ پڑے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر مولوی صاحب سے آنے کی وجہ دریافت فرمانے لگے، مولوی فتح محمد صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حاجی صاحب جا رہے تھے، خواہ مخواہ میری وجہ سے ان کو رکنا پڑا۔ اور یا عرض کرنے لگے کہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ پھر کبھی عرض کردوں گا، مگر ان کو حیرت ہوگئی، جب وہ حاجی صاحب کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو سن رہے تھے۔

"تم اپنے کو ڈپٹی صاحب پر قیاس کرتے ہوگے، کہاں وہ دنیا دار اور کہاں تم نائب رسول" ارواح ۲۶۹

اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں ایک دوسری روایت بھی پائی جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدرسہ کے کسی طالب علم اور حاجی صاحب کے درمیان باہمی رنجش کی کوئی صورت پیش آگئی تھی، طالب العلم نے منہ پر حاجی صاحب کو کچھ سخت وسست بھی سنا دیا تھا، طالب العلم ایک مسجد میں رہتا تھا، لکھا ہے کہ حاجی صاحب اسی مسجد میں بہ نفس نفیس پہنچے، دیکھا جا رہا تھا کہ طالب العلم کے

"سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا معاف کر دیجئے۔ آپ نائب رسول ہیں، آپ کا ناراض رکھنا مجھے گوارا نہیں" ۲۶۹

"ملا اور صوفی" کے تعلقات جن کی طرف کتاب کے تمہیدی مقدمہ میں بقدر ضرورت بحث بھی کی گئی ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب پر درویشی ہی کا پہلو ابتدا سے غالب تھا گو شریعت کے ظاہر احکام کی پابندی میں بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ خاص امتیازی شان رکھتے تھے، لیکن بجائے انقباض کے غریب ملاؤں کی، حاجی صاحب کی درویشی میں اتنی گہری جگہ جس کا اندازہ مذکورہ بالا مثالوں سے ہوتا ہے۔ اب خواہ یہ رنگ جس راستہ سے بھی آیا ہو، ۱۲۸۳ھ کے بعد دیوبند کو وطن ثانی بننے کی عزت سیدنا الامام الکبیر کی بدولت جو حاصل ہوئی، اور چھتہ کی مسجد میں جو حلقہ درویشوں کا اس کے بعد قائم ہوا، بظاہر تو اسی حلقہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں جیسا کہ گذر چکا اس رنگ کے سب سے بڑے علمبردار حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بھی حاجی صاحب کا رشتہ قائم ہوا، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خلافت کی سعادت بھی آستانہ امدادی کو حاجی محمد عابد صاحب[۱] کو حاصل ہوئی تھی۔ لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں[۲]۔ بظاہر یہ قصے اس وقت کے ہیں جب دیوبند میں عربی کا مدرسہ شروع شروع میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت تک حاجی عابد حسین صاحب میں یہ رنگ اس زمانہ کے لحاظ سے اگر منتقل ہو سکتا تھا تو مسجد چھتہ کی قاسمی محفل ہی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ شاید اسی کی طرف مولانا فضل الرحمن صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔ جو ان کے ایک قصیدہ کے شعر میں پایا جاتا ہے۔

لیک این طائر ہمایوں[۱] فال   شد ز قاسم عطا پر و بالش

بہر حال صاحب دل، صاحب دماغ ہونے کے ساتھ علماء اور علماء کے علم کی عزت و احترام اور اسیر قاسمی تصرفات سے پیدا شدہ غیر معمولی جذبہ جو حاجی صاحب میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سارے اسباب و وجوہ تھے ہی ایسے کہ مدرسہ کے افتتاح کی تجویز کو عملی شکل میں لانے کے لئے نظر انتخاب دیوبند میں حاجی صاحب کے سوا آپ خود سوچئے، اور کس پر پڑتی؟ سارے

---

[۱] ۱۲۹۵ھ میں معلوم ہوا ہے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خلافت حاصل ہوئی یعنی قیام مدرسہ کے پندرہ سال بعد۔ ۱۲ [۲] یعنی حاجی محمد عابد صاحب ۱۲

سازوسامان جن کی اس مہم کی سرانجامی میں ضرورت تھی یا ہوسکتی تھی، ان سے وہ لیس تھے۔

بہرحال حاجی عابد صاحب جب کام ہاتھ میں لینے کے لئے آمادہ ہوگئے، تو جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے، اور ان کا یہ بیان کافی اہمیت رکھتا ہے، لکھا ہے کہ

"ایک دن بوقت اشراق سفید رومال کی جھولی بنا، اور اس میں تین روپیہ اپنے پاس سے ڈال، چھتہ کی مسجد سے تن تنہا مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم کے پاس تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے، اور دعا کی، اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب دیوبندی) نے دیئے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے۔ مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں، فوراً بارہ روپے دیئے، اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی[1] ثانی دیوبندی وہاں موجود تھے، ان کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کئے،

---

[1] مدرسہ کی تاریخ میں مالی امداد کے ساتھ پہلی دفعہ پیش قدمی کرنے والوں کی اس تاریخی فہرست میں جن جن بزرگوں کے گرامی اسماء درج ہیں، ہماری کتاب کے پڑھنے والے عموماً ان سے روشناس ہو چکے ہیں۔ مولانا مہتاب علی صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تایا تو وہی بزرگ ہیں، جن کے مہتابی مکتب دیوبند میں سیدنا الامام الکبیر نے عربی شروع کی تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا ذوالفقار علی صاحب کے علاوہ مصنف سوانح مخطوطہ کے حال سے بھی آپ آگاہ ہو چکے ہیں۔ البتہ ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی سو مولانا محمد طیب صاحب کی یہ اطلاع ہے، کہ دیوبند کے مشاہیر میں ان کا شمار تھا۔ قلعہ پراں کی شاندار حویلی اب تک موجود ہے، جس میں اب اسلامیہ ہائی اسکول کھول دیا گیا ہے۔ لاہور کا سب سے پہلا نسوانی مجلہ "تہذیب النسوان" ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولوی ممتاز علی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا، مولوی ممتاز علی صاحب نے قرآنی مضامین کی ترتیب کر کے چار جلدوں میں "البیان فی مقاصد القرآن" کے نام سے شائع کی تھی۔ عہد جدید کے ممتاز انشاء پردازوں میں مولوی ممتاز علی کے صاحبزادے منشی امتیاز علی تاج ہیں۔ ۱۲

وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت (یعنی حاجی محمد عابد صاحب) محلہ ابوالبرکات میں پہنچے "

آگے کے الفاظ مخطوطہ مسودہ میں کچھ کٹ گئے ہیں، جو صاف طور پر پڑھے نہیں گئے، بظاہر کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ محلہ کی اس مسجد میں بیٹھ کر حاجی عابد صاحب مرحوم نے چندے کی اپیل شروع کی، الفاظ اس کے بعد جو پڑھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں،

"دو سو روپے جمع ہو گئے، اور شام تک تین سو روپے۔ پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا، اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں "

ابتدائی چندے کی اس لطیف سرگذشت کو درج کرنے کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ

"یہ قصہ بروز جمعہ دوم ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا "

ذی قعدہ کے بعد ۱۲۸۲ھ ہجری کا ایک ہی مہینہ ذی الحجہ کا باقی تھا، ان ہی دو مہینوں میں کوشش کی گئی اور اتنا سرمایہ فراہم ہو گیا، کہ مدرسہ کھول دیا جائے، اور اسی مبارک تاریخی فیصلہ کے مطابق ان ہی کا بیان ہے کہ

"اور مدرسہ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۳ھ میں جاری ہوا "

سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۶ء ماہ اپریل کی غالباً ۲۰ تاریخ ہوگی، گویا بہار کا موسم ختم ہو رہا تھا، لیکن ختم ہوا نہیں تھا، اور دیوبند کے علاقہ میں آموں کا موسم شاید شروع ہو چکا تھا، یا شروع ہونے والا ہی تھا۔

غرض سیدنا الامام الکبیر کی "تاذین عام" اور آخر میں میرٹھ والی "تاذین خاص" کے مقابلہ میں لبیک کا پہلا جواب سرزمین دیوبند سے جو بلند ہوا، اور ان ہی کے منشا کے مطابق مجوزین کرام نے "نئے محاذ" کی اس تعلیمی قالب کو دیوبند ہی میں قائم کرنے کی صورت پیدا کر کے جو مدرسہ کو کھول دیا تو واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے ان بزرگوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے عربی الفاظ میں دیوبند کے مدرسہ کے

کے افتتاح اور اس وقت کے ماحول کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

وان لم یساعدہ الزمان والمکان ولم یوافقه الحین والاوان	اگرچہ اس مدرسہ کے قیام کے لئے نہ زمانہ کے حالات ہی سازگار تھے، اور نہ وہ جگہ جہاں مدرسہ قائم ہوا اس کا ماحول ہی مناسب تھا۔

الغرض وقت بالکل ناموافق تھا۔

ایسی صورت میں اس کام کو اٹھانے والے، اس کی تحریک کو قبول کر کے اسے عملی شکل میں لانے والے، مالی امداد میں پیش قدمی کرنے والے، الغرض اس راہ میں دامے، درمے، قدمے، سخنے جس منزل میں بھی جن سے کچھ بن پڑا، حد سے زیادہ ناموافق حالات میں گزرنے والے سچ تو یہ ہے کہ اس سنت حسنہ کی راہ کھولنے میں جو بھی جس منزل میں بھی شریک ہوئے وہ صرف اپنے ہی عمل کی حد تک نہیں، بلکہ "دارالعلوم دیوبند" کے وجود کے سارے ثمرات ونتائج جو اس وقت تک سامنے آچکے ہیں، اور آئندہ جب تک خدا کی مرضی ہو، سامنے آتے رہیں گے ہر ایک میں ان کے اجر وصلہ کا حق نبوی وثیقہ کی بنا پر وہاں محفوظ ہو چکا ہے، جہاں وہ پہنچ چکے ہیں، اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس دنیا میں بھی دارالعلوم ان "آباء صالحین" کے "ابناء صالحین" کی فلاح میں کافی معاون ثابت ہوا ہے آج ان اسلاف کا وجود ان کے اخلاف کے لئے سرمایۂ ناز وافتخار ہے۔[1]

---

[1] چھتہ کی مسجد کے مجلس انس کے یہی تین اساطین جنہوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ کے "ذہن" کو سب سے پہلے عملی صورت دی اور جن کا ذکر حضرت مصنف امام نے مجوزین کے نام سے کیا ہے، یعنی حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب نور اللہ مرقدہم ان ہی کو دیکھئے مولانا فضل الرحمن صاحب کی براہ راست اولاد میں حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں علم ودین کے افق پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اسی زمانہ میں مولانا مطلوب الرحمن صاحب مدفیوضہم جو ان ہی مولانا فضل الرحمن صاحب کے صاحبزادے ہیں مسلمانوں کی دینی اور روحانی تربیت جس وسیع پیمانہ پر کر رہے ہیں یقیناً اس کو بھی دارالعلوم ہی کے فیوض وبرکات میں شمار کرنا چاہئے۔ اسی طرح حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کے صاحبزادے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ تو ہند کے شیخ الکل ہی بن کر رہے، اور سچ ہی کیا، کون گن سکتا ہے کہ آپ کے تلامذہ اور شاگرد (باقی اگلے صفحہ پر)

چھتہ کی مسجد دیوبند میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا حجرۂ مبارک جس میں اب طلبائے دارالعلوم رہتے ہیں
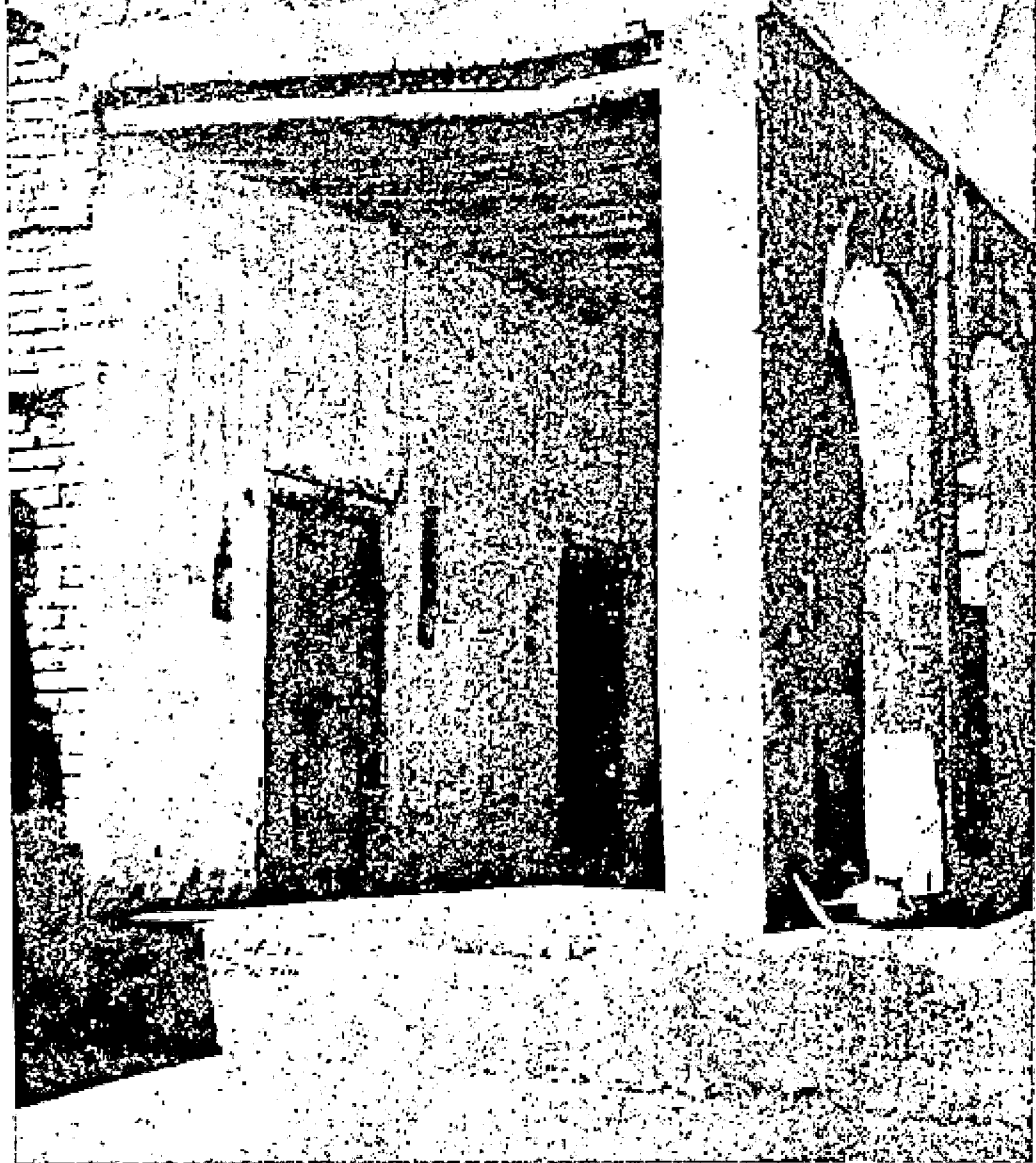
باقی دارالعلوم کی تاسیس و آغاز کے سلسلہ کی "حکایت لذیذ" یعنی قصہ "انار و محمود" یہ عجیب ستایا ہے کہ سوانح مخطوطہ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، مگر ان الفاظ کے ساتھ

دگزشتہ صفحہ سے) ایشیا و افریقہ کے کن کن علاقوں میں پھیلے ہوئے علم و دین کی خدمت میں مصروف ہے اور یہاں علمی اور دینی پہلوؤں کے سوا ملک کے سیاسی انقلاب میں آپ کا جو حصہ ہے کیا اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے؟ یقیناً آج جن قربانیوں، جاں فروشیوں کی قیمت ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس قیمت میں کافی اور معقول سرمایہ شیخ الہند کی غیر معمولی اور اولوالعزمانہ قربانیوں کا بھی شریک ہے۔ حضرت شیخ الہند کے حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن رحمہ اللہ کی پوری زندگی دارالعلوم کی علمی خدمات کے ساتھ اس ... کے شعبۂ طب کی بہ وقت خدمت میں صرف ہوئی اور اساتذۂ دارالعلوم میں اپنی خصوصیات کے ساتھ علمی میدان میں ان کی شخصیت نمایاں رہی۔ شیخ الہند کے داماد مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کو آج دارالعلوم کے شعبۂ افتاء کی خدمات میں زندگی کھپا دینے کی توفیق مل ہوئی ہے۔ مجلس انس کے تیسرے اور نمایاں رکن جن کی عقیدت و عظمت کے سامنے سابقہ ہر رکن بھی جھکے ہوئے تھے، یعنی حضرت اقدس حاجی سید محمد عابد صاحب قدس سرہ کے متعلق یہی کیا کم ہے کہ مرکزی جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم مولانا سید محمد میاں صاحب سلمہٗ دیوبند کے اسی خانوادۂ سادات کے چشم و چراغ ہیں جس کے ایک رکن حضرت حاجی صاحبؒ بھی تھے۔ اپنے اس تعلق کا اظہار مولانا موصوف نے اپنی مشہور کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں فرمایا ہے۔

علاوہ براہ راست اولاد کے ان حضرات کے احفاد و اسباط کو دارالعلوم کی برکات ظاہری و باطنی سے مستفید ہونے کے جو مواقع میسر آئے، ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے پوتے یعنی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ادارہ "ندوۃ المصنفین" اور مجلہ "برہان" کے ذریعہ جن علمی مہمات کو انجام دے رہے ہیں، وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی قاری حافظ جلیل الرحمٰن صاحب دارالعلوم کے شعبۂ تجوید کی قابل قدر خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نواسے مولانا محمد عثمان صاحب دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ ملک کی سیاسی خدمات اور شہری معاملات کی تنظیم کے سلسلہ میں کافی متعارف ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دوسرے نواسے یعنی مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد ہارون صاحب بھی دارالعلوم دیوبند کے دائرۂ تدریس میں کام کر رہے ہیں، اور انہیں علمی و دینی خدمات کی اہلیت نصیب ہوئی ہے، اور پھر ان تمام علمی قالبوں کی روح رواں یعنی حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس اللہ سرہ جن کے فلک رس جذبات آتش دان سے مشکل بہ شکل گرمی اس سارے ماحول کو تپائے ہوئے تھی، اور آج تک یہ تپش اپنے کام میں مصروف ہے، ان کی روحانی اور معنوی ذریت کے ساتھ جو پورے عالم اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے نسبی سبط کو دیکھا جائے تو براہ راست ان کے خلف اکبر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے جو پھل پھول اس چمنستان قاسمی کو لگے آج ان کا کون انکار کر سکتا ہے؟ (باقی اگلے صفحہ پر)

"سب سے پہلے اس مدرسہ کے مدرس ملا محمود صاحب ہیں اور جانے مدرسہ فرش مسجد چھتہ طالب علم مولوی عبدالعزیز صاحب ہیں۔

حکایت کی اس تعبیر کو عجیب اسلوب قرار دے رہا ہوں، جیسا کہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اس میں متعلم کا تو نہیں مگر معلم کا نام "محمود" ہی بتایا گیا ہے اور جگہ کے سلسلے میں بھی خبر دی گئی ہے کہ چھتہ ہی کی مسجد کے فرش پر پہلی دفعہ اس مدرسہ کا افتتاح ہوا لیکن انار کے مشہور زبان زد عام درخت کے ذکر کو ہم اس کتاب میں نہیں پاتے۔ اور اس سے بھی حیرت افزا چیز ان کی اس اطلاع کا یہ ہے کہ مدرسہ کے پہلے متعلم کا نام بجائے "محمود" کے وہ مولوی عبدالعزیز بتاتے ہیں، درخت انار کے عدم ذکر کے متعلق اگرچہ مولویانہ توجیہ ہو بھی سکتی ہے کہ عدم الذکر عدم الوجود کو مستلزم نہیں، تاہم اس کا

(گذشتہ صفحہ سے) ان کا چالیس سالہ دور اہتمام دار العلوم کا تابناک دور اور یادگار زمانہ عہد کہا جاتا ہے جس میں دار العلوم نے بہت سی ترقیات کے مدارج طے کئے اور وہ مدرسہ سے ایک بڑے دار العلوم کے قالب میں ڈھلا تعمیری ترقیات ہوئیں، ملی حیثیت اونچی ہوتی گئی، حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہوا، اور بالآخر وہ مرکزیت جو اس ادارہ کی بنیاد میں چھپی ہوئی تھی۔ اسی دور میں شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوئی۔ پھر ان کی مدرسی خدمات ان ہمہ گیر خدمات کے علاوہ ہیں۔ آگے کی اولاد میں حضرت والا کے نواسے ابو حامد مولانا محمد میاں رحمہ اللہ مہاجر کابل رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ احاطۂ دار العلوم سے علم و سیاست کے میدان میں کام کرتے ہوئے کابل پہنچے تو انہوں نے دار العلوم کے بنیادی مقاصد کو وہاں کی حکومت اور پبلک میں روشناس کرانے اور وہاں کے لوگوں کو تقریر و تصنیف کے ذریعہ ان مقاصد سے ہم آہنگ بنانے میں ۳۰ برس تک جو کردار ادا کیا، اس سے عوام اگر زیادہ واقف نہ ہوں، تو خواص سے ان کی جانبازانہ مساعی مخفی نہیں ہیں، جو اسی دار العلوم کے فیوض و برکات کا ثمرہ تھیں۔ حضرت نانوتوی کے پڑپوتے اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے پوتے مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہ بھی بحمد اللہ دار العلوم دیوبند میں فرائض درس و تدریس انجام دے رہے ہیں تصنیف میں بھی ان کا قلم تیز گام ہے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں تقریر و خطابت بھی امید افزا انداز سے سامنے آرہی ہے۔ پھر عام افادیت کی لائن پر "ادارۂ تاج المعارف" قائم کر کے اشاعت دین کی جو قابل قدر خدمت وہ انجام دے رہے ہیں، وہ بلاشبہ اسی احاطۂ قاسمی کا فیض اور ان کی جدی نسبت کا مظاہرہ ہے۔ بہرحال مدرسہ کی تاسیس و افتتاح کے سلسلہ میں یہ اسلاف اور ان کی مساعی جس حد تک مقبول ہوئیں۔ اسی حد تک ان کے اخلاف رشید بھی اس سلسلہ میں ان کے ساتھ شرف الحاق سے محروم نہیں رکھے گئے اور اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ کے خدائی قانون نے ان کی نسبتوں کے راستہ سے انہیں بہت کچھ اونچا کر کے دکھایا ہے فمتعنا اللہ بآثارہم ونفعنا بانفاسہم۔

محمد طیب غفرلہ

پتہ ضرور چلتا ہے کہ "شعورعام" میں انار کے اس درخت کا مقام وہ نہ تھا 'جہاں پچھلے دنوں سے ہم اس کو پانے لگے ہیں' اور انار کے اس درخت کو تو چھوڑیے 'ایک اتفاقی واقعہ تھا جس پر کچھ دنوں سے بیان کرنے کا اتفاق ہو گیا ہے' لیکن مدرسہ کے "پہلے متعلم" کے متعلق ان کی روایت میں ہم جو کچھ پا رہے ہیں' اس میں تو مذکورہ بالا اصولیاتی توجیہ کی بھی گنجائش نہیں' کیونکہ ذکر مدرسہ کے اولیات کا وہ کر رہے ہیں' روایت میں آئندہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے' وہ "سب سے پہلے" کے تمہیدی الفاظ کے نیچے درج ہے' یہ کہنا کہ "سب سے پہلے" کا تعلق صرف مدرسہ کے مدرس سے ہے' اس توجیہ کو تو ہمارا مولویانہ ذہن بھی شاید برداشت نہیں کر سکتا' پھر قصہ کیا ہے؟ اگر "انار محمود" والی حکایت صرف افواہاً منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی' تو "افواہ" کے مقابلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف جیسے گواہ کی تحریری گواہی کی ترجیح پر شاید ہم مجبور ہو جاتے' لیکن کیا کیجئے کہ "انار محمود" والی حکایت کا اعادہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی تاریخی "محفل" میں لکھ کر کیا گیا ہے' میں نے خود تو نہیں دیکھا ہے' لیکن مولانا طیب الحفیظ صاحب حال صدر مہتمم دارالعلوم سے معلوم ہوا کہ "دارالعلوم" کے عظیم الشان جلسۂ دستاربندی منعقدہ ۱۳۲۸ھ میں "زرین ماضی و مستقبل" کے نام سے ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریری بیان دارالعلوم کے ہزارہا ہزار فارغ شدہ علماء و اراکین کے آگے پیش کیا تھا' جن میں خود وقت کے صدر دارالعلوم حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک اور موجود تھے' اسی تحریری بیان میں منجملہ دوسری باتوں کے علیٰ رؤس الاشہاد "انار محمود" والی حکایت بھی بایں الفاظ دہرائی گئی تھی کہ

> "مدرسہ دیوبند کا افتتاح دیوبند جیسی گمنام بستی میں چھتہ کی مسجد کے اندر انار کے درخت کے نیچے ہوا' جناب مولانا ملا محمود صاحب دیوبندی مدرس تھے' اور مولانا محمود حسن صاحب پہلے طالب علم تھے' جنھوں نے کتاب کھولی' مدرسہ دیوبند نے اس سادگی کے ساتھ وجود میں قدم رکھا۔"

مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ مطبوعہ شکل میں یہ تحریری مقالہ اس وقت دارالعلوم کے دفتر میں محفوظ ہے اور اس کے صفحہ ۲۲ پر مذکورہ بالا فقرات کو آج بھی پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں' حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جن کی حیثیت دارالعلوم کے لحاظ سے "صاحب البیت" کی تھی'

علمائے کرام کی بھری مجلس میں ان کے اس تحریری بیان کے متعلق یہ خیال تو یقیناً بیہودہ خیال ہوگا کہ ایک زبان زد عام "سنی سنائی افواہی روایت جو لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آرہی تھی"، اسی کا ذکر بطور "حکایت لذیذ" کے آپ نے بھی فرمادیا۔ چونکہ دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے سبز اعلیٰ و ادنیٰ کے کان اس حکایت سے مانوس تھے، اور سوانح مخطوطہ کے مصنف کی نوشتہ شہادت سے لوگ واقف نہ تھے، اسی لئے خاموشی کے ساتھ سننے والوں نے اس کو سن لیا۔ کسی طرف سے کسی قسم کی تنقید اس پر نہیں کی گئی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس قسم کا وسوسہ وہی پکا سکتا ہے، جو حضرت مولانا حافظ محمد احمد علیہ الرحمۃ و الغفران کی ذمہ دارانہ ہستی اور ان کے صحیح منزل و مقام سے ناواقف ہے، یہ صحیح ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اس ابتدائی تقریب میں حضرت حافظ صاحب خود موجود نہ تھے، اور سوانح مخطوطہ کی عصری شہادت کے مقابلہ میں ان کی روایت کی حیثیت یقیناً سماعی روایت کی ہے۔ لیکن سماعی روایت ہی، یہ دارالعلوم کے رکن رکین، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا "صاحب البیت" کی روایت ہے۔ ماسوا اس کے یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اس تاریخی "مجلس کبیر" میں جس وقت دارالعلوم کے صدر مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی یہ نوشتہ تحریر پڑھ رہے تھے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس وقت مجلس میں دارالعلوم کے صدر تدریس یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود نہ ہوں، یہ دعویٰ کہ "سب سے پہلے جنہوں نے کتاب کھولی" خود ان ہی کی ذات اقدس سے براہ راست تعلق رکھتا تھا، اگر یہ واقعہ نہ ہوتا، تو کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ بجائے تصحیح کے آپ اس غیر واقعی امر کے متعلق خاموشی سے کام لے سکتے تھے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق کا امکان جب باقی نہیں ہے، تو یقیناً حضرت حافظ صاحب کا بیان ہی ہر لحاظ سے ترجیح کا مستحق ہے۔[1]

[1] یہ حد سے زیادہ بیدردی اصرار کا رنگ نوازی ہوگی کہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے اول طالب علم مولوی عبدالعزیز کو قرار دیا جائے جیسا کہ سوانح مخطوطہ کی روایت کا اقتضاء ہے، لیکن اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے کتابیں مولوی عبدالعزیز کے پاس نہ ہوں گی۔ کتاب لانے والوں اور استاد کے آگے اس کو کھول کر پڑھنے والوں میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب سب سے پہلے طالب علم تھے۔ اور یوں دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت پیدا کر دی جائے (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر واقعہ کچھ بھی ہو، پہلے متعلم مدرسہ کے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے یا مولوی عبدالعزیز، جس زمانہ کی یہ بات ہے، اس وقت کے اعتبار سے یہ دونوں باتیں مساوی ہیں۔ ہاں حضرت مولانا بعد کو جو کچھ ہوئے، اس کے لحاظ سے دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس بڑے مدرسہ کا آغاز بھی مولانا جیسے بڑے آدمی سے ہو، کیونکہ باوجود تلاش کے سوانح مخطوطہ والے مولوی عبدالعزیز کی شخصیت میرے لئے اس وقت تک مجہول ہے، مگر کیا کیجئے کہ متعلم محمود تو نہیں مگر "معلم محمود" کی بڑائیوں کے متعلق بھی ہمارے معلومات حد سے زیادہ محدود ہیں۔ کم از کم "متعلم محمود" اور دارالعلوم کی بڑائیوں میں جو مناسبت ہے، اس مناسبت کا دعوے معلم محمود کے متعلق مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔[1]

غالباً میری دل چسپیاں اس ذیلی مسئلہ کے متعلق کچھ حد سے زیادہ بڑھ گئیں، لیکن ایک عام اور مشہور روایت کے ساتھ ساتھ سوانح مخطوطہ میں بعض ایسی چیزیں مل گئیں، کہ دل ان کے قلم انداز کرنے پر راضی نہ ہوا، آئندہ دارالعلوم کی تاریخ پر قلم اٹھانے والوں کے لئے بحث کا یہ "جدید پہلو" بھی پیش نظر رہے گا، اور "آثار محمود" والی حکایت کی تحقیق میں امید تو یہی ہے کہ آئندہ لوگ کافی غور و خوض سے کام لیں گے۔ خیر اب اس قصہ کو ختم کیجئے، اپنے "موضوع بحث" کے لحاظ سے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دیوبند میں مدرسہ جس وقت ابتداء میں قائم ہوا، حسب تحریر مصنف امام وہ خود اور ہمارے سیدنا الامام الکبیر اس زمانہ میں بسلسلہ ملازمت مطبع مجتبائی (میرٹھ) میرٹھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند میں خواہ جس پیمانہ پر بھی ہو، مدرسہ قائم ہو گیا، مدرس اور طلبہ بھی آ گئے۔ چندہ بھی فراہم ہوا۔ اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر تک

(گذشتہ صفحہ سے) میرے خیال میں تو "کتاب کھولی" کے الفاظ طالب علم ہونے کی یہ عام تعبیر ہے۔ اس عام اور اتفاقی تعبیر سے خواہ مخواہ ناجائز نفع اٹھانے کے سوا یا زکرتب کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۱۲

[1] "زرین ماضی و مستقبل" کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں ان کے نام کے ساتھ مولانا ہی نہیں بلکہ علامہ کے لفظ کو ہم پاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم و تبحر کا اچھا خاصہ وزن اسالیبن دارالعلوم کے قلوب میں تھا، لیکن اسی کے مقابلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ملا ہی نہیں بلکہ باضافہ نون "ملاں" ہی کے لفظ کو ان کے لئے کافی قرار دیا ہے، دارالعلوم کی تاریخ مدون کرنے والوں کے فرائض میں ہے کہ دارالعلوم کے ان پہلے مدرس و معلم کے صحیح حالات کا پتہ چلائیں ۱۲

یہ بشارت بھی پہنچائی گئی، کہ ان کے حسب منشا دیوبند والوں نے دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کی افتتاح میں سبقت کی، مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن وہ بھی قرار دیئے گئے، ۱۲۸۳ھ جس میں مدرسہ قائم ہوا۔ اس کی روداد سے نقل کر چکا ہوں کہ طلبہ کے امتحان لینے والوں میں بھی دوسروں کے ساتھ آپ کا ذکر بھی خاص طور پر کیا گیا ہے، چندہ دہندوں کی فہرست میں آپ کے اسم گرامی کے آگے (رقم درج ہے، جو آخر وقت تک جاری رہی۔ اتنی بات تو یقینی ہے، کہ حاجی سید محمد عابد صاحب مرحوم کے بشارت نامہ میں دیوبند تشریف آوری کی دعوت آپ کو جو دی گئی تھی، اس وقت یہ دعوت دعوت ہی بن کر رہ گئی۔ صحیح طور پر یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ صورت حال کب تک قائم رہی، بس مصنف امام ہی یکایک یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

> "مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے، اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے" ص۱۱

میرٹھ سے دیوبند حضرت والا کی یہ تاریخی تشریف آوری جس کے بعد بقول مصنف امام "ہر طرح" اور "ہر پہلو" کے لحاظ سے آپ مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔ کچھ اتنے دبے پاؤں، خاموشی کے ساتھ ہوئی، کہ تلاش کے باوجود اس کی چونکہ صحیح تاریخ معین نہ ہو سکی، اس لئے یہ بتانا بھی سخت دشوار ہے کہ قیام مدرسہ اور "ہر طرح سرپرست" بن جانے والی اس تشریف آوری کی درمیانی مدت کا وقفہ کتنے دنوں پر مشتمل ہے، ایک مطبوعہ حمائل شریف جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ کے ساتھ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ شاید کہیں پہلے بھی اس کا ذکر گذرا ہو اس حمائل میں بجائے عام دستور کے ترجمہ زیر سطور نہیں بلکہ ہر صفحہ کی آیتوں کا ترجمہ نمبر لگا کر حاشیہ پر چھاپا گیا ہے، شاید اب بھی ملتا ہو، اس حمائل کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابتداءً یہ نسخہ خاص طریقے سے میرٹھ کے مطبع مجتبائی سے ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوا تھا[1]۔ اسی سلسلہ میں

---

[1] اسی حمائل کے طبع کی تاریخ بھی سید نا الامام الکبیر کی نکالی ہوئی "امالامثل له ولامثال" کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے بھی ۱۲۸۶ھ کے اعداد نکلتے ہیں، اگرچہ ہے تو ایک تاریخی مادہ اور "لیس کمثله شئ" (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ اطلاع بھی درج کی گئی ہے کہ میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں شائع ہونے والی اس حمائل کی

"قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح بانی مدرسہ دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی"

اس کا اقتضاء بہرحال اتنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۳ھ جس میں دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا، اس کے تین سال بعد یعنی ۱۲۸۶ھ تک میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کا کام سیدنا الامام الکبیر انجام دیتے رہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے براہ راست میرٹھ میں قیام ضروری نہیں۔ اور تین سال تک اگر اسی بناء پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میرٹھ ہی میں آپ کا قیام رہا، تو مصنف امام کی اطلاع ہیں

"شروع مدرسہ میں دیوبند آئے"

اس میں "شروع" کے لفظ کی پھر کیا توجیہ کی جائے گی؟ کیا تین سال کے بعد تشریف آوری کے واقعہ کی تعبیر "شروع مدرسہ" کے لفظ سے کسی حیثیت سے صحیح ہو سکتی ہے؟

بمشکل ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ "لفظ شروع" سے حقیقی آغاز و ابتداء مدرسہ تو ہم مراد ہی نہیں لے سکتے کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اور تین سال کے وقفہ کی بھی گنجائش "شروع" کے لفظ میں نہیں، کچھ اوسط ہی نکالنا پڑے، لیکن وہ اوسط بھی کیا ہو؟ اور تو کوئی بات ملی نہیں، البتہ ۱۲۸۴ھ جو قیام مدرسہ کا دوسرا سال ہے، اس کی جو روداد شائع ہوئی ہے، اس میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ مدرسہ کی

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) کے کلام کی تاریخ کے لئے مقدون ترین مادۂ تاریخ یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یوں بھی جب ہم غور کرتے ہیں، کہ قرآن چو سورتوں اور پاروں کے ساتھ ساتھ رکوعوں میں تقسیم شدہ ہے، لیکن ہندوستان کے شائع شدہ قرآنی نسخوں میں ہر رکوع کے آیات پر نمبر اندازی کا رواج نہیں تھا۔ غالباً سیدنا الامام الکبیر کی یہ جدت طرازی تھی کہ ہر صفحہ کی آیتوں پر آپ نے نمبر لگائے، اور ان ہی نمبروں کے حساب سے حاشیہ پر ہر آیت کا اردو ترجمہ اس طرح سے درج ہو گیا ہے کہ سابقہ و لاحقہ آیتوں کے ترجمہ سے کسی قسم کا اشتباہ ان لوگوں کے لئے بھی باقی نہیں رہتا، جو براہ راست قرآن کی عربی عبارت سمجھنے سے معذور ہیں۔ زیر سطری ترجموں میں اگلی اور پچھلی آیتوں کے ترجموں کے الفاظ میں ان غریبوں کو جو دشواری قدرتاً پیش آتی ہے۔ نمبر اندازی کی اس تدبیر سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے، سچ پوچھئے تو اس لحاظ سے یہ اچھوتا کام تھا جس کی تقلید نہیں کی گئی ۱۲

عمر کے اسی دوسرے سال میں

"ایسا امر عظیم اور حادثہ فخیم پیش آیا، کہ جس سے تمام اہل دیوبند اور جملہ مدرسین و طلبہ کو گمان غالب تھا کہ اب قائم رہنا اس مدرسہ کا مشکل ہے"

آگے اسی "امر عظیم" اور "حادثہ فخیم" کی تفصیل یہ درج کی گئی ہے کہ

"حاجی عابد حسین صاحب جو مہتمم مدرسہ، بلکہ اصل اصول اس کام کے تھے، اور باشندگان دیوبند و اطراف و جوانب کے دلوں میں ان کی عظمت و توقیر بدرجہ کمال تھی، ان کے لحاظ و پاس سے بہت سے طلبہ بیرونجات کے واسطے کھانا مقرر ہوا، اور چندہ بھی بہت آب و تاب سے تحصیل ہوا، یکایک عزم بیت اللہ کا کیا، اور قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان تشریف نہ لائیں گے"

ایک ایسے الہامی کام کو شروع کر کے اچانک حاجی صاحب قبلہ کا یہ تکوینی طرز عمل اور انقلابی اقدام اس کے ظاہری و معنوی اسباب کیا تھے؟ اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتے، اب خواہ اسباب کچھ ہی ہوں، اسی روداد میں لکھا ہے کہ حاجی صاحب کے اس فیصلہ نے دلوں میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ

"بنیاد مدرسہ از بیخ کندہ ہو جاتی تو عجیب نہ تھا"

بایں ہمہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور جس مدرسہ کی باگ الہام کے زیر اثر جیسا کہ کہا جاتا ہے، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا، اس کے "از بیخ کندہ" ہو جانے کے نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر وہی کر گذرے جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا، اور شاید یہی مطلب ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ دیوبند کا مدرسہ جس پیمانہ پر بھی شروع میں قائم ہوا تھا، حج کو چلے جانے کے اس ارادہ کے بعد ہی کم از کم اپنی ذات کی حد تک حاجی عابد حسین صاحب نے صرف یہی نہیں کہ اس مدرسہ کو ختم ہی کر دیا تھا بلکہ روداد ہی میں جو یہ لکھا ہے کہ

"قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان تشریف نہ لائیں گے"

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے طرز عمل سے مستقبل میں بھی لوگوں کو اس مدرسہ کی جانب سے مایوس

بتا چکے تھے، لیکن واقع میں یہ مدرسہ جس کا تھا، اور جو پیدا ہی کیا گیا تھا اس مدرسہ کے لئے، مدرسہ کے ختم ہونے کا یہی خطرہ یا حادثہ اسی حقیقت اور واقعہ کے ظہور کا ذریعہ بن گیا، اور اب اسی مسئلہ پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مدرسہ میں مستقل قیام

اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے، اس سے بہر حال اتنی بات عیاں ہو چکی کہ دیوبند میں مدرسہ عربی سیدنا الامام الکبیر کی چشم وابرو کے اشاروں بلکہ صریح اذن اور عملی پیش قدمی کا رہین منت تھا۔ ۵۷ء کی ناکامی کے بعد اس "نئے محاذ" یا گھات کی "نئی کمین گاہ" کے کھولنے میں پیش قدمی بھی ان ہی کے کچھار کے پروردہ شیر بچوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اور فراہمی چندہ کے بشارت نامہ ہی میں آپ کو دعوت بھی دی گئی کہ براہ راست اپنے ہاتھ سے تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجرا کریں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قیام مدرسہ سے پہلے بھی، اور قیام مدرسہ کے بعد بھی روح اور قلب تو دیوبند ہی میں، لیکن جسم کہئے یا قالب جس پر دیکھنے والوں کی نظر پڑ سکتی تھی، کچھ خاص اسی موقعہ پر نہیں بلکہ اپنی فطری عادت اور دوامی وطیرے کے مطابق آج بھی نگاہوں سے وہ مخفی تھا۔ مگر عوام نہ سہی، خواص کی آنکھوں سے بھی دیوبند کے مدرسہ سے آپ کا واقعی تعلق کیا مخفی تھا، یا مخفی رہ سکتا تھا۔ مخفیانہ سہی، لیکن چھتہ کی مسجد کی "محفل" میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ راز بن کر رہتا تھا؟ آخر میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں، دیوبند، جو عرض کر چکا ہوں، ضلع سہارنپور کے دوسرے مجہول الحال والاسم قصبات کے ساتھ ساتھ جس زمانہ میں دیوبند نہیں بلکہ عوام کا صرف دیبنڈ تھا۔ اسی دور افتادہ مقام میں مدرسہ قائم ہوتا ہے، مانا کہ حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو قصبہ اور اس کے گردونواح میں غیر معمولی ہر دل عزیزی حاصل تھی، ان کا ان لوگوں پر کافی اثر واقتدار بھی تھا، اسی لئے جیسا کہ روداد کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں، بیرونجات کے طلبہ کے قیام وطعام کے نظم میں سہولتیں بھی ہوئیں۔ یوں بھی "طلبہ نوازی" مسلمانوں کا موروثی ذوق تھا، اس زمانہ میں بھی اور اس سے پہلے بھی میں تو یہی جانتا ہوں کہ شہروں اور قصبوں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ دیہاتوں تک میں بسنے والے

مسلمانوں کے یہاں "طالب علم کی جاگیر" ہندوستان کے ارباب ہمت و ثروت کے لوازم زندگی میں داخل تھی لیکن اسی کے ساتھ آپ آئندہ سالوں کی نہیں، بلکہ دیوبند کے اس "مدرسہ عربی" کے پہلے سال کی سطبوعہ روداد اٹھا لیجئے۔ اس کے ابتدائی اوراق میں آپ کو بیرونجات کے طلبہ کے متعلق یہ خبر بھی ملے گی؛

"فقط قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع ممالک مغربی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ

پنجاب و کابل و بنارس

تک کے لوگ جمع ہو گئے تھے"

جس کا مطلب یہی تو ہوا کہ مغرب میں پنجاب سے گذر کر کابل تک طلبہ کو دیوبند کا یہ مدرسہ دامن کشاں اپنے احاطہ میں لئے چلا آرہا تھا؛ اور مشرق میں "بنارس" تک کے طلبہ پہلے ہی سال میں اس مدرسے کے طالب علم بن چکے تھے۔ بنارس کے نام کی تو روداد میں تصریح کی گئی ہے۔ طلبہ کے خانے پر میری نظر جب اسی روداد میں پڑی تو دوسرے ناموں کے ساتھ "مولوی بدرالدین عظیم آبادی" کا نام بھی دیکھا کہ پہلے سال کی اسی روداد میں شریک ہے، مولوی صاحب کی شخصیت سے تو واقف نہیں ہوں، لیکن "عظیم آبادی" کی نسبت بتا رہی ہے کہ بنارس سے آگے بڑھ کر عظیم آباد، پٹنہ (بہار) تک کے طلبہ اس مدرسہ کی آغوش تعلیم و تربیت میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔

اسی طرح مالی امداد کے سلسلہ میں ذرا ملاحظہ فرمائیے پہلے سال کی اسی روداد کا اور جائزہ لیجئے۔ ان ناموں اور مقاموں کا جن سے ضلع سہارنپور کی گمنام آبادی دیوبند میں چندے آنے لگے تھے میری آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب چندہ کے خانے میں ایک طرف راجپوتانہ کی پہاڑی ریاست ٹونک سے حکیم عبدالحمید نامی کے چندے کا اور دوسری طرف سینکڑوں میل دور داناپور (بہار) کے باشندوں کے نام سے بھی پچاس روپے کی رقم کا ذکر کیا گیا ہے۔ سوچتا ہوں تاریکی، دہشت و خوف کے ان بھیانک دنوں کو سوچتا ہوں، چند ہی سال تو گذرے تھے کہ "شہ" میں بزن و بکش، گیر و دار کے ہنگاموں سے ہندوستان کی زمین خصوصاً مسلمانوں کی آبادیاں کانپ رہی تھیں۔ اس خونی سمندر اور آتشیں دوزخ

میں تہ و بالا ہونے کا تماشہ جنھوں نے کیا تھا، ان کی آنکھوں کے سامنے سے تو یہ تماشہ ضرور ہٹ چکا تھا
لیکن وہ مرے بھی تو نہ تھے۔ جو اپنے حافظے اور یادداشت کی قوتوں سے ان خونیں، جگر خراش، روح گسل
مہیب و ہولناک، انسانیت سوز نظاروں کی یاد کو مٹانا بھی چاہتے تھے تو مٹا نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں
عزیزوں، جگر پاروں، دوستوں، ہمسایوں کی پھانسیوں پر لٹکی ہوئی لاشوں، اور ان پابزنجیر دست بطوق
سسکتے ہوئے جسموں کو بھولنا ہی چاہتے تھے جو ان ہی کے ساتھ جیل خانوں اور دریائے شور کے ویران
جزیروں کو بھرنے کے لئے گھسیٹے جا رہے تھے، لیکن بھول نہیں سکتے ظلم و ستم کے اس طوفانی تلاطم
میں گو نہ سکون کی کیفیت تو دس سال کے اس عرصہ میں یہ واقعہ ہے کہ پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن یہ تو جو کچھ تھا،
باہر میں تھا، اندر میں تو اب بھی تہلکہ ہی برپا تھا، باطن تو اب بھی ان ستم دیدوں کا غیر مطمئن لرزاں و ترساں
ہی تھا، پھر مراسلات و مواصلات کے ذرائع بھی اس وقت تک حد سے زیادہ ناکمل تھے، غلغلہ انگیزیوں
اور شاغبہ بازیوں کے عام ذرائع اخبار اور پریس کی قوت سے ملک اس وقت تک گویا کچھ ناآشنا ہی تھا
ٹوٹے پھوٹے شکستہ در بودہ حال میں کچھ ماہوار یا ہفتہ وار اخبار نکلے بھی تھے۔ یا گنتی کے چند مطابع
ملک کے مختلف گوشوں میں جاری بھی ہوئے تھے۔ سو ۵۷ء کی افراتفری میں ان کا نظام بھی درہم برہم
ہو چکا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے وہ سارے اسباب و وسائل جن سے کسی چیز کے مشہور کرنے میں کام لیا جائے
یا اس وقت جن سے لوگ کام لے رہے ہیں، اس زمانہ میں ہم ان کا شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن حیرت
ہوتی ہے کہ پنجاب و کابل، راجپوتانہ، بہار، جو اس زمانے کے لحاظ سے یقیناً دیوبند کے لئے دور دست
علاقے تھے۔ ان علاقوں سے طلبہ بھی، اور چندے بھی اس قصباتی مدرسہ میں قائم ہونے کے پہلے سال ہی
سے کیسے اور کیوں آنے لگے تھے۔ کیا دیوبند کے مقامی بزرگوں کے وجود اور ان کے وجود کے اثر و اقتدار
سے ہم اس کی من مانی نہیں، دل نشین اور واقعی صحیح منطقی توجیہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

وہی جس کا جسم دیوبند سے غائب تھا، لیکن روح اس کی ہمہ تن ابتدا ہی سے اس مدرسہ کی بنیاد
میں جذب تھی، اس کے تعلق کے سوا کوئی صحیح جواب اس سوال کا دل کو یا دماغ کو مل سکتا ہے؟ اور سچ تو یہ
کہ مدرسہ کی پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان اور مدرسہ کے پہلے امتحان تک کے کاموں میں روح کے ساتھ اس کے

جسم مبارک کو ہم جب حاضر ہی پاتے ہیں، تو قالب کی یہ مجازی غیر حاضری بھی مجازی ہونے کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتی ہے، جن کی نظر مجاز پر تھی، وہ نہ سہی، لیکن ملک کے طول و عرض میں حقیقت شناسوں کا طبقہ بھی تو تھا، مسلمانوں کے دینی تعلیم کے اس سب سے پہلے اجتماعی نظام کے عملی قالب "مدرسہ عربی دیوبند" سے سیدنا الامام الکبیر کا جو تعلق تھا، ان کی نگاہوں سے بھی کیا یہ تعلق اوجھل رہ سکتا تھا؟ "غیب" کے "لاتحتسبی" قوانین کے نتائج و آثار کا جنھیں تجربہ نہیں ہے، وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ظاہری اسباب کی مدد سے بھی ضلع سہارنپور کی اس قصباتی آبادی میں قائم ہونے والے مدرسے میں، پنجاب و کابل، بنارس و عظیم آباد، ٹونک (راجپوتانہ) داناپور (بہار) سے طلبہ اور مالی امداد کے سلسلہ کا شروع ہو جانا محل حیرت و استعجاب نہیں ہوسکتا، واقعہ یہ ہے کہ دیوبند و اطراف دیوبند کی آبادیوں پر حاجی عابد حسین صاحب کا جو اثر و اقتدار تھا، سیدنا الامام الکبیر کی اس زمانہ تک تقریباً سارے ہندوستان کی اسلامی آبادیوں سے یہی نسبت قائم ہو چکی تھی، اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ دیوبند کے جس مقامی مدرسہ کے لئے جہانگیر کیا سارے اسلامی ممالک کا "عالمگیر جامعہ" بن جانا مقدر ہو چکا تھا، اسی تقدیر کو تدبیر کے قالب میں لانے کیلئے کہ ایک طرف بظاہر بشر کی صورت میں یہ حادثہ پیش آیا کہ از بیخ کندہ ہو جانے کا خطرہ حاجی عابد حسین صاحب کے قطع تعلق کی وجہ سے مدرسہ کے لئے پیش آیا، اور دوسری طرف جیسا کہ اسی روداد میں لکھا ہے کہ

"باشندگان دیوبند میں بظاہر ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا کہ اس کام کا متکفل ہوتا"

یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ مجاز کا جو پردہ حائل تھا، وہ بھی سامنے سے ہٹ جائے اور وہ ہٹ گیا، قلب کے ساتھ ساتھ قالب بھی اس کا دیوبند ہی پہنچ گیا، جسے ابتدائے قیام مدرسہ کے وقت تاریخ کی آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اور تھک تھک کر واپس ہوتی ہیں کہ آخر جس کا یہ مدرسہ تھا اور جو اس مدرسہ کے لئے تھا، وہی آج کیوں غائب ہے؟

صحیح تاریخ متعین ہوسکتی ہو، یا نہ ہوسکتی ہو، اور جس شخص کی ولادت کی تاریخ تو تاریخ کے مہینے تک کو اس کی طفولیت و شباب و کہولت کے رفیق ہمارے مصنف امام تک متعین کرنے سے اپنے آپ کو قاصر و معذور بتا رہے ہوں تو ایسی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق دارالعلوم کی دوامی خدمت کیلئے

دیوبند میں مستقل قیام کی تاریخ ہم جیسے دور افتادوں کے لئے کچھ مبہم ہو کر اگر رہ جائے تو اس پر تعجب کیوں کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ مدرسہ کے کاروبار کا جو متکفل ہو' جب دیوبند میں کوئی ایسی ہستی بظاہر باقی نہ رہی' یا نظر نہ آئی' تب لانے پر دیوبند والے اور آنے پر سیدنا الامام الکبیر بھی مجبور ہو گئے۔ اسی کے بعد مدرسہ سے آپ کا وہ عجیب و غریب "با ہمہ و بے ہمہ" رشتہ نفس واپسیں تک قائم رہا کہ ایک طرف مصنف امام تو سیدنا الامام الکبیر کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ

"ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے"

اور دوسری طرف سنانے والے مسلسل یہی سناتے چلے آ رہے ہیں کہ

"دارالعلوم دیوبند میں مولانا محمد قاسم نے نہ درس دیا' اور نہ اس کے اہتمامی و انتظامی شعبوں سے بظاہر بحیثیت عہدہ کے کسی قسم کا کوئی تعلق آپ کا کبھی قائم ہوا"

"با ہمہ و بے ہمہ" کا یہ حیرت انگیز رشتہ اس لئے بھی عجیب تھا کہ "ہر طرح سرپرست" بن جانے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ آپ دارالعلوم تھے اور دارالعلوم آپ ہی کا وجود باجود تھا' لیکن مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ مدرسہ کی دوات کی سیاہی کے ایک قطرہ کا بھی بلا معاوضہ صرف کرنا' فقط اسی کو اپنے لئے کبھی آپ نے جائز نہیں قرار دیا۔ جس میں سیاہی کے چند قطرات ہی کا ہی' کچھ خرچ تو ہوتا تھا' بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ "سرد خانہ" سے صفاتی استفادہ جس سے نہ سرد خانے کی ذات میں کوئی کمی پیدا ہوتی تھی' اور نہ صفات میں اس استفادہ کا بھی حقدار اپنے آپ کو نہیں خیال کیا' اور شدید طبعی حرارت مزاج کے باوجود موسم گرما کی تپش اور لو کی تکلیف کے برداشت کرتے ہی کو اپنی دلی راحت کی ضمانت ٹھیراتے رہے۔ قدس اللہ سرہ ونفعنا اللہ بماثرہ الطیبۃ الطاہرۃ الزہرۃ الباہرۃ۔

بہر حال میرٹھ میں قیام مدرسہ کے بعد آپ جتنے دنوں بھی رہے ہوں' لیکن مصنف امام کے بیان کے مطابق اتنا ماننے پر بہر کیف ہم مجبور ہیں کہ

"شروع مدرسہ میں آپ دیوبند رہے اور ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے"

اب "شروع" کے لفظ کو سامنے رکھتے ہوئے "قالب" کی دوری کے ان دنوں کی نوعیت جتنی بھی جی چاہے

متعین کر لیجئے' ان دنوں میں مدرسہ میں کیا کیا ہوا' ہندوستان کے عربی' دینی تعلیم کے قدیم نظام کے مقابلہ میں' دیوبندی سلسلہ کے اس جدید نظام میں جن امتیازی خصوصیات کو ہم پاتے ہیں' ان میں کتنی باتوں کا اضافہ سیدنا الامام الکبیر کی مستقل تشریف آوری اور ہر طرح سرپرست بن جانے کے پہلے اس مدرسہ میں ہوا' ان امور کی تفصیل جیسا کہ کہتا چلا آ رہا ہوں' دار العلوم کی تاریخ لکھنے والوں کا عملی فریضہ ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ جماعت بندی' رجسٹر حاضری' امتحان تحریری جیسی باتیں جن سے حکومت قائمہ کے نئے نظام تعلیم نے ملک کو روشناس کیا تھا' شروع ہی سے ان کی افادیت اور ضرورت کو محسوس کر کے قبول کر لیا گیا ہو' آخر حاجی سید عابد حسین صاحب مرحوم جن کے ہاتھ میں مدرسہ کے اہتمام و انتظام کی باگ ابتدا میں سپرد کی گئی تھی۔ وہ اجتماعی تعلیم کے ان عصری لوازم و خصوصیات سے مانا کہ کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں' لیکن مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا ذوالفقار علی طالب ثراہما کی تو عمر ہی ان چیزوں کے عملی تجربوں کی دشت نمائی میں گذری تھی' طالب علمی کے زمانہ میں بھی' اور ملازمت کے ایام میں بھی' دونوں دلی عربک کالج کے صدر مولانا مملوک علی سے تلمذ کا تعلق رکھتے تھے' اور حکومت کے محکمۂ تعلیمات میں منسلک ہو کر ڈپٹی انسپکٹر کے عہدوں تک پہنچے تھے۔ ان نئے اصلاحات کے لئے ان ہی دونوں بزرگوں کا وجود کافی تھا' پھر سیدنا الامام الکبیر بھی مکانی بُعد کے باوجود حقیقۃً اس مدرسہ سے جتنے قریب تھے' ان کے مشوروں سے بھی اثر پذیر ہونے کی راہیں اس زمانہ میں بھی کھلی ہوئی تھیں لیکن براہ راست حضرت والا کا قیام چونکہ مدرسہ میں ابھی نہیں ہوا تھا' اس لئے وقفہ کی اس مدت کے متعلق جو کچھ بھی عرض کیا گیا' اپنی بحث کے حقیقی دائرہ سے تجاوز کے بعد ہی عرض کیا گیا' لیکن میرٹھ چھوڑ کر دیوبند میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے کے بعد جب مدرسہ کے کاموں سے آپ کا وہ عجیب و غریب اچھوتا اور انوکھا رشتہ "با ہمہ اور بے ہمہ" والا قائم ہوا' یعنی سب کچھ ہونے کے باوجود دیکھنے والے یہی دیکھ رہے تھے کہ آپ "کچھ نہیں" ہیں۔ اس "عہد" کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے' کہ جن جن سوالوں کے جوابوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں جس نوعیت کی "معلومات" کو دل ڈھونڈھتا ہے' جیسا کہ چاہئے' ان کی فراہمی میں تو کامیاب نہ ہو سکا' تاہم تلاش و جستجو سے اب تک جن امور تک

رسائی میرے لئے آسان کی گئی ہے' انہیں پیش کر دیتا ہوں' جن سے اس کا بھی پڑھنے والوں کو اندازہ ہوگا کہ دینی نظام تعلیم کے اس نئے قالب و ہیکل میں جس کا مرکز دار العلوم دیوبند ہے' اس میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے منشار کے مطابق کتنی باتیں پوری ہو چکی ہیں' اور کتنی اس وقت تک تشنۂ تکمیل ہیں' و اللہ ولی الامر والتوفیق ۔

دار العلوم کا نصاب تعلیم

سب سے پہلا مسئلہ "نصاب تعلیم" کا ہے ۔ دار العلوم میں جو کچھ پڑھا پڑھایا جاتا ہے ۔ یا پڑھ پڑھ کر اب تک جو لوگ اس مدرسہ سے فارغ ہوئے ہیں' ان کو دیکھ کر عام رائے یہی قائم ہو سکتی ہے کہ دار العلوم کی تاریخ میں "نصاب تعلیم" کے مسئلہ پر شاید کبھی غور نہیں کیا گیا' اور من وعن "درس نظامیہ" کا جو نصاب تھا اسی کو قبول کر لیا گیا ہے' الزام لگایا جاتا ہے' کہ زمانہ کے جدید تقاضوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کی گئی' اس میں شک نہیں کہ جو دیکھا جا رہا ہے' اس کو دیکھ کر کہنے والے آخر اور کیا کہہ سکتے ہیں' لیکن سیدنا الامام الکبیر کا نقطۂ نظر اس باب میں کیا تھا' اس کا اندازہ حضرت والا کی اس تقریر سے کر سکتے ہیں جو خوش قسمتی سے سنہ ۱۲۹۰ھ کی روداد میں شریک کر دی گئی ہے' وہی مطبوعہ شکل میں میرے سامنے ہے ۔ طلبہ جو فارغ ہوئے تھے' ان کو سند و انعام دینے کے لئے ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۴ء میں یہ جلسہ دیوبند میں منعقد ہوا تھا' گویا عصری یونیورسٹیوں میں "کانووکیشن" کے اجلاس کی جو نوعیت ہوتی ہے' کچھ اسی طرز کا جلسہ تھا' اطراف و جوانب سے بھی کافی تعداد مہمانوں کی اس تعلیمی تقریب میں شریک ہونے کے لئے دیوبند پہنچی تھی' فارغ ہونے والے طلبہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے' منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت اس "تعلیمی حفلہ" کی یہ بھی نظر آتی ہے' کہ جن علوم و فنون کی تعلیم فارغ ہونے والے طلبہ کو دی گئی تھی' ان میں سے کسی فن اور علم کے کسی خاص موضوع پر امتحانی مقالے لکھوائے گئے تھے' یہی مقالے لوگوں کو

سنائے گئے۔ یہ مقالے بھی روداد میں شائع کردیئے گئے تھے، جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں دیوبند کے اس مدرسہ کا تعلیمی معیار کتنا بلند ہوچکا تھا، گویا سمجھنا چاہئے، کہ مختلف یونیورسٹیوں کے آخری مدارج مثلاً ایم۔ اے یا ریسرچ وغیرہ کی کلاسوں میں جیسے مقالے (تھیسس) لکھوائے جاتے ہیں، دارالعلوم کے نظام تعلیم میں اسی سال گویا ایک صدی پہلے یہ سنت جاری ہوچکی تھی، جو افسوس ہے کہ بعد کو جاری نہ رہی، اور کہہ سکتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کے "کانوکیشن" کے جلسوں میں خطبوں، یا ایڈریسوں کا جو عام رواج ہے، تقریباً کچھ اسی رنگ میں سیدنا الامام الکبیر نے ایک تقریری خطبہ عطائے اسناد وانعام کے اس جلسہ میں ارشاد فرمایا تھا، خطبہ کافی طویل ہے، اور جیسا کہ چاہئے گوناگوں حقائق و معارف سے لب ریز ہے، سارے نقاط جن پر اس خطبہ میں بحث کی گئی ہے، ان کے پیش کرنے کا نہ یہ موقعہ ہے، اور نہ ضرورت، بلکہ "نصاب تعلیم" کے متعلق اپنی اس تقریر میں حضرت والا نے جن اصولی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، صرف ان ہی کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

لیکن اصل تقریر کے الفاظ کو پیش کرنے سے پہلے چاہئے کہ ایک بات سمجھ لی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے، کہ ہمارے عربی و دینی مدارس کے تعلیمی نصاب کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہی ہے کہ عصر حاضر کے عام علمی حلقوں میں امتیاز و وقار یورپ کے جن جدید علوم و فنون اور السنہ یا زبانوں سے آگاہی حاصل کئے بغیر علمی کاروبار کرنے والے حاصل نہیں کرسکتے، ان کا پیوند اپنے یہاں کے دینی علوم، اور دوسرے عقلی و ذہنی قدیم فنون سے کیسے قائم کیا جائے۔

اب تو تقریباً علماء کی اکثریت اس سوال کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے، لیکن یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پیوند قدیم و جدید علوم و فنون میں کیسے قائم کیا جائے۔ کیا دینی علوم اور قدیم تدریسی فنون کے ساتھ ساتھ جدید علوم والسنہ کی کتابیں بھی نصاب میں شریک کرنی چاہئیں! یا جدید علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کا موقعہ طلبہ کے لئے فراہم کیا جائے؟ یہ دونوں صورتیں تو ایسی ہیں جو ہندوستان کے بعض تعلیمی و تدریسی اداروں میں زیر تجربہ بھی آچکی ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ دینیات میں مشترک نصاب کے طریقہ کو اور مسلم یونیورسٹی میں

بی ۔ ٹی ۔ ایچ ۔ کی کلاسوں کو کھول کر دوسرے طریقہ کو عملاً آزمایا جا چکا ہے جس کے نتائج بھی لوگوں کے سامنے آ چکے ہیں، لیکن اسی سلسلہ میں ایک تیسرا احتمال بھی عقلاً پیدا ہوتا ہے یعنی پہلے مسلمان بچوں کو دینی و اسلامی علوم سے کم از کم وقت میں قدر ضرورت کی حد تک واقف بنا لینے کے بعد ان کو جدید علوم و فنون کی یونیورسٹیوں میں شریک کیا جائے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انفرادی طور پر اس ترتیب سے بھی تعلیم پانے والے چند گنے چنے اشخاص ہندوستان میں جدید یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد ضرور پیدا ہوئے ہیں، لیکن تقریباً ایک صدی کی طویل مدت میں اتنے طویل و عریض ملک جیسا کہ ہندوستان ہے، اس میں شاید اتنی تعداد بھی اس قسم کے تعلیم یافتوں کی نہیں مل سکتی، جن کو گننے کے لئے دس انگلیوں کے استعمال کی ضرورت ہو، مگر باوجود اس کے شاید یہ کہنا واقعہ کا اعتراف ہوگا، کہ اسی تیسرے نہج پر تعلیم پانے والوں میں علم و عمل کے جن نمونوں کا اس وقت تک مشاہدہ کیا گیا ہے، شاید ان کی مثال مذکورہ بالا دو طریقوں پر تعلیم حاصل کرنے والوں میں ہم نہیں پا سکتے، الا ما شاء اللہ و قلیل ما ھم۔

بہرحال جدید و قدیم علوم کے "پیوند" کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے، عملی تشکیل کی یہی تین عقلی صورتیں ممکن ہیں، اب دیکھئے کہ سیدنا الامام الکبیر کا زاویۂ نگاہ اس باب میں کیا تھا، "مجلس عطائے اسناد وانعام" کے اسی جلسہ میں تقریر فرماتے ہوئے، دوسری باتوں کے ساتھ آخر میں یہ فرماتے ہوئے کہ

"اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ درباب تحصیل، یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا"

طریقہ خاص سے مراد یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں جدید علوم و فنون اور السنہ کی کتابیں کیوں شریک نہیں کی گئیں، خود ہی اجمال کی تفصیل آگے ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے کہ

"اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا"

سب سے پہلی بات تو صرف اسی سوال سے یہ سمجھ میں آتی ہے، کہ جدید علوم و فنون کے سوال سے جو یہ باور کرایا گیا ہے، یا اب بھی باور کرایا جاتا ہے، کہ ہمارے علماء قطعاً خالی الذہن تھے، افترا یا اتہام کے سوا

وہ کچھ نہیں ہے۔ کم از کم دیوبندی حلقہ کے علماء کی ذمہ دار ہستیوں کا دامن تنگ خیالی اور جمود کے اس داغ سے پاک تھا۔ اس کے لئے تو یہی کافی ہے کہ اس طبقہ کے سب سے بڑے پیشوا "امام کبیر" کے سامنے یہی نہیں کہ صرف سوال ہی تھا، بلکہ جو جواب اس سوال کا دیا گیا ہے، اسے سنئے، اور انصاف سے کہئے کہ تقریباً ایک صدی پہلے حضرت والا کا ذہن جن اشتباہی پہلوؤں کو پاک کر کے نتیجہ تک پہنچ چکا تھا، کیا اس وقت تک فراخ چشمیوں کے مدعیوں کا گروہ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے؟

اس سوال کی جوابی تقریر سیدنا الامام الکبیر کے ان الفاظ سے شروع ہوئی ہے، فرمایا گیا تھا کہ

"منجملہ دیگر اسباب کے، بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے"

"دیگر اسباب" جن کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا گیا ہے، ان کا ذکر تو بعد میں کروں گا، پہلے "سب سے بڑے سبب" کی تفصیل ان ہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں، ٹھنڈے دل کے ساتھ فکر معقول سے کام لیتے ہوئے، ان گرامی ارشادات کا مطالعہ کیجئے، سب سے پہلے ایک کلی قاعدے کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا تھا کہ

"تربیت عام ہو، یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہئے، جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو"

مطلب یہ ہے کہ افراد ہوں، یا جماعتیں، ان کے اٹھان، اور جن کمالات تک ان کو پہنچانا مقصود ہو، سب سے پہلے توجہ کے مستحق اس سلسلہ میں وہی معاملات ہوتے ہیں، بلکہ چاہئے کہ وہی ہوں جو سب سے زیادہ کس مپرسی اور لاپروائی کا شکار ہو چکے ہوں، ایک شخص جس کے بدن پر کھادی ہی کا کرتہ کیوں نہ ہو، لیکن کرتہ کے ساتھ یہ دیکھا جاتا ہو کہ نیچے کا بدن اس کے بالکل ننگا ہے، تو ظاہر ہے کہ کھادی کے کرتہ کی جگہ ریشمین قمیص کی فکر سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہوگا کہ بے ستری سے محفوظ کرنے کے لئے لنگی یا پائجامہ کا نظم اس غریب ننگے کے لئے کیا جائے۔

جس زمانہ میں یہ تقریر ہو رہی تھی، اس وقت تعلیمی راہ سے مسلمانان ہند کی تربیت و اصلاح کے

مسئلہ کی نوعیت مذکورہ اصول کی روشنی میں کیا ہونی چاہئے' اسی کا جواب دیتے ہوئے پہلا فقرہ یہ فرمایا گیا تھا

"سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے' کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی"

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی تھا کہ نہ علوم جدیدہ کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے' اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم و فنون سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے' جن سے ملک کو نئی قائم ہونے والی حکومت نے روشناس کیا ہے۔ توجہ صرف اس پر دلائی گئی' کہ خود حکومت کی طرف سے جن علوم و فنون کے پڑھنے پڑھانے کا نظم وسیع پیمانے پر کیا جا چکا ہے اور آئندہ کیا جائے گا۔ اور کیسا نظم وسیع؟ کہ بقول حضرت والا اتنی سرپرستی قدیم علوم' اور اسلامی فنون کو گذشتہ سلاطین اور مسلمان بادشاہوں کی طرف سے بھی کبھی میسر نہیں آئی تھی'

علوم جدیدہ کی عام اشاعت و ترقی کے اس تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا کہ

"ہاں! علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا"

علوم جدیدہ' اور علوم اسلامیہ دینیہ دونوں کے باہمی تقابل کی تصویر جو حقیقت اور واقعہ کی عکاسی تھی' اس کو پیش کرنے کے بعد نتیجہ کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا تھا کہ

"ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا' تحصیل حاصل نظر آیا"

گویا مثال اس کی وہی ہوئی' کہ جو کرتہ ہی نہیں ریشمین قمیص پہنے ہوئے ہے' اس کی قمیص میں قمیصوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے' لیکن جس وجہ سے غریب ننگا کہلاتا ہے' اور عریانی و بے ستری کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے' اسی سے لاپروائی برتی جا رہی ہے۔

بہرحال جس چیز کی متکفل غیر محدود ذرائع رکھنے والی حکومت ہو' اسی کے اضافہ میں محدود ذرائع رکھنے والے محکوموں اور رعایا کی آمدنی کو خرچ کرنا' اور اس کے لئے امدادی چندوں کا بار ان ہی غریبوں

کے سر ڈالنا' حضرت والا کا خیال تھا کہ تحصیل حاصل کے سوا اسے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آپ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ پبلک کے عام چندوں' اور مالی امداد سے استفادہ کی اسی لئے قرین عقل و دانش یہی تدبیر نظر آئی کہ حکومت جن علوم کی سرپرستی کر رہی ہے' ان کو تو حکومت کے سپرد رکھا جائے لیکن مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے' اور نئی حکومت اپنے خاص حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے صرف دست برداری نہیں ہو گئی ہے بلکہ واقعات بتا رہے تھے کہ نئی حکومت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں زبونی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں' ان علوم کے احیاء و بقاء کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے' اور یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو آگے اسی تقریر میں پائے جاتے ہیں' یعنی دار العلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب میں اسی لئے ارشاد ہوا کہ

"صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی و دینی علوم) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے انعطاف ضروری سمجھا گیا"

آپ دیکھ رہے ہیں' دار العلوم کے نصاب میں خالص دینی و اسلامی علوم (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) کے ساتھ ساتھ عقلی و ذہنی فنون کی شرکت کی توجیہ کرتے ہوئے' حضرت والا نے جہاں اس عام اور مشہور غرض کا تذکرہ فرمایا ہے' یعنی مسلمانوں کے "علوم مروجہ" کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے قیل وقال' جواب و سوال سے فکری ورزش کرا کے طلبہ میں دقیقہ سنجیوں' موشگافیوں کے ملکہ کو ابھارا جاتا ہے "استعداد علوم مروجہ" سے یہی مراد ہے۔

خیر یہ تو عام بات ہے' بیان کرنے والے عموماً اس کو بیان بھی کرتے ہیں' لیکن خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھنے کا مستحق توجیہ کا دوسرا پہلو ہے' یعنی یہ جو فرمایا گیا ہے کہ

"اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے"

جس کا مطلب اس کے سوا' اور کیا ہو سکتا ہے' کہ دار العلوم کے مروجہ نصاب میں حضرت والا یہ بتانا چاہتے ہیں' ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں "علوم جدیدہ" کے

حاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے' گویا "علوم جدیدہ" کی تعلیم کا مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے' اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے' دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب کے متعلق حضرت والا کا یہ جدید نقطۂ نظر ہے' جس کی طرف آپ نے صرف اسی اجمالی اشارہ سے ہی توجہ نہیں دلائی ہے' بلکہ خالص دینی و اسلامی علوم کے مقابلہ میں مدرسہ کے نصاب کے عقلی و ذہنی فنون کا "علوم دانش مندی" کے عنوان سے تذکرہ کرتے ہوئے اپنے صحیح تعلیمی نصب العین کو سیدنا الامام الکبیر نے کھلے کھلے واضح الفاظ میں پیش فرما دیا ہے' آگے اسی تقریر میں اس کا اعادہ کرتے ہوئے کہ کیوں'

"علوم نقلیہ' اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا"

اپنی اس تجویز سے اسی زمانہ میں سننے والوں اور سمجھنے والوں کو آگاہ فرما دیا تھا کہ

"اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا' مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی"

ذرا سوچئے کہ غم و غصہ' بے زاری' اور دل افگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان جیسے اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنا لیا گیا تھا' جو آسمانوں پر تھے زمین پر پٹک دیئے گئے تھے' ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہئے تھا' قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی' فطرتاً اس سے مسلمان بھڑکتے تھے' بلکہ چڑھتے تھے۔ انگریزی مدارس اور ان مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا' اس کے تصور سے بھی وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ "جو انگریزی پڑھے گا وہ کافر ہو جائیگا" مولویوں کی طرف اس تکفیری لطیفہ کو مسخروں نے جو منسوب کر رکھا ہے' بجائے خود افترا اور بہتان کی یہ جتنی بھی شرمناک مثال ہو' لیکن اس کا شاید انکار نہیں کیا جا سکتا' کہ اسلامی آبادیوں کی فضا کچھ اسی قسم کی صداؤں سے معمور ضرور تھی' کس نے فتویٰ دیا' کب دیا' ان سوالوں سے بے تعلق ہو کر کہنے والے کچھ

اسی قسم کی باتیں کہہ رہے تھے، اور اسی نوعیت کے چرچے عموماً پھیلے ہوئے تھے۔

لیکن اسی مسموم فضا، اور غلط فہمیوں سے بھرے ہوئے ماحول میں سیدنا الامام الکبیر یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جواز ہی کا فتوے دے رہے ہیں، بلکہ بغیر کسی جھجک کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرما رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم علمی کمالات کے چمکانے، اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ الغرض ایک طرف اسی زمانہ میں مولویوں کا ایک طبقہ تھا، بلکہ ان کی اکثریت یہ باور کئے بیٹھی تھی کہ جو کچھ انہوں نے پڑھ لیا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے، جسے سیکھا اور پڑھا جائے۔ ان ہی مولویوں کو درمیان پکارنے والا پکار رہا ہے، کہ مولویوں میں اپنے علمی کمالات میں جو مزید فروغ، اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چاہئے کہ یورپ کے جدید علوم وفنون کا مطالعہ کرے، ان کی علمی زبانوں کو سیکھے، جو سرکاری مدارس میں سکھائی جاتی ہیں، یقیناً حضرت والا کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے اور دین، یہی کہنا چاہتا تھا کہ یورپ کے جدید علوم وفنون کی اہمیت وضرورت کا انکار جسے اُس زمانہ میں عموماً ہمارے علماء نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ یہی نہیں، کہ صرف انکار ہی کی حد تک بات محدود تھی، بلکہ

"دیوبندی نظام تعلیم"

نے امام اول واکبر نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت واہمیت ہی کو تسلیم کر لیا تھا، بلکہ جن الفاظ میں حضرت والا نے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ اس سے آگاہ ہونے کے بعد بلا خوف تردید بآسانی یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ علوم اسلامیہ کے ساتھ یورپ کے جدید علوم وفنون، والسنہ کے پیوند لگانے کے سلسلہ میں مذکورہ بالا تین عقلی شکلوں یعنی دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ دلائی جائے، یا عصری علوم سے فارغ ہونے کے بعد جو پڑھنا چاہتے ہوں انکے لئے اسلامی علوم کے پڑھنے کا نظم کیا جائے۔ یا مسلمانوں کے دینی وموروثی علوم میں بقدر ضرورت بصیرت حاصل کر لینے کے بعد مسلمان بچوں کو دانش نو سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں، ان ہی تین شکلوں میں تیسری شکل کو اپنے نصب العین میں حضرت والا نے شریک کرنا چاہا تھا، اپنی اسی تقریر میں آپ نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ بجائے تقدم وتأخر کی اس ترتیب کے

قدیم وجدید علوم کا مشترک نصاب دارالعلوم دیوبند میں کیوں جاری نہیں کیا گیا، یعنی ہر دو صنف کے علوم کی کتابیں ساتھ ساتھ پڑھائی جائیں، ایسا کیوں نہ کیا گیا، جواب میں فرمایا گیا ہے کہ

"زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے"۔

ایک مطلب تو اس کا ظاہر ہے کہ اسلامی و دینی علوم کی صحیح بصیرت حاصل کرنے کے لئے جن فنون کی تعلیم بطور مقدمہ دی جاتی ہے، صرف ونحو، ادب، معانی، بیان، اصول فقہ، کلام اور علوم دانش پسندی جن سے ذہنی ورزش کا کام لیا جاتا ہے۔ ان سب کی چھوٹے سے چھوٹے مختصر ترین نصاب کے لئے بھی، اتنی کتابوں کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ علوم جدیدہ کی کتابوں کی گنجائش بمشکل نکل سکتی ہے۔ اور طلبہ پر کسی نہ کسی طرح اس ناقابل برداشت بوجھ کو لاد بھی دیا جائے تو "طلب الکل فوت الکل" کے سوا عموماً کوئی دوسرا نتیجہ سامنے نہیں آئے گا، پوری محنت اور توجہ جس کے بغیر صحیح استعداد طلبہ میں پیدا نہیں ہوسکتی، سیدنا الامام الکبیر یہی فرمانا چاہتے ہیں۔ قدیم وجدید دونوں علوم اس سے محروم رہ جائیں گے۔ آپ کے بیان کا یہ تو خیر کھلا ہوا پہلو ہے، اسی کے ساتھ اگر اس کو سوچا جائے کہ جس زمانہ میں یہ تقریر کی گئی تھی، یعنی آج سے ستر اسّی سال پہلے حالت یہ تھی کہ مشرقیات کے پڑھنے پڑھانے والے ہمارے علماء، اور مغربی علوم کے معلمین، پروفیسروں اور لیکچروں کا طبقہ دونوں کے پڑھنے پڑھانے کا صرف طریقہ ہی مختلف نہ تھا، بلکہ مشرقیات کو اساتذہ پر عموماً عقیدت ویقین وادب سلف کے احترام کے جذبات غالب تھے، اور اس کے برعکس مغربی علوم وفنون کی تعلیم جو دیتے تھے، وہ شک وارتیاب، بے اعتمادی، مطلق العنانی کی ذہنیت کے دباؤ کے نیچے دبے ہوئے تھے اور مرض متعدی کی طرح ان سے پڑھنے والوں میں اسی ذہنیت کے جراثیم قدرتاً منتقل ہوتے رہتے تھے اب تو مختلف اسباب ووجوہ کے کسر وانکسار کی بدولت ایک صدی کی طویل مدت میں دونوں طبقوں کے رجحانات میں اتنا بعد وتخالف باقی نہیں رہا ہے

لیکن جس عہد میں قدیم وجدید نصاب کے پیوند کے اس مسئلہ کو سیدنا الامام الکبیر نے اٹھایا تھا، اس وقت یہ واقعہ ہے کہ ان دو مختلف، قطعاً مختلف احساسات ورجحانات والے اساتذہ کو ایک ہی

زمانہ میں تعلیم پانے والوں کے متعلق اگر یہ تخمینہ کیا گیا تھا کہ قدیم ہو، یا جدید دونوں ہی سے صحیح مناسبت نہ پیدا ہو سکے گی، تو جو واقعات تھے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح بصیرت کسی اور نتیجہ تک شاید پہنچ بھی نہیں سکتی تھی، الغرض "نقصان استعداد" کے جس اندیشہ کا اظہار مندرجہ بالا تقریر میں کیا گیا ہے۔ ایک پہلو اس اندیشہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے۔[1] آخر استادوں کے ایک حلقہ میں جن علوم و مسائل کی قدر و قیمت طلبہ پر واضح کی جاتی ہو، اور معاً دوسرے حلقے میں پہنچنے کے ساتھ ان ہی کے وزن و وقار سے طلبہ کو خالی الذہن کر دیا جائے، اثبات و نفی کے اس قصہ میں اگر ہر دو کی نفی" ہوتی رہے، تو ان دو مختلف طریقۂ تعلیم کا خود ہی سوچئے دوسرا انجام ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اور یہ وجہ تو اس بات کی تھی کہ قدیم و جدید علوم کا مشترکہ نصاب دار العلوم دیوبند میں کیوں نافذ نہیں کیا گیا۔ بلکہ بجائے اس کے سیدنا الامام الکبیر نے اپنے اس تعلیمی نظریہ کو پیش کیا ہے کہ پہلے دینی و اسلامی علوم کا نصاب دانش مندی کے فنون کے ساتھ ختم کرایا جائے، جن کے بغیر خالص اسلامی علوم، تفسیر، شروح احادیث و فقہ وغیرہ کی کتابوں کے نہ مطالعہ ہی کی صحیح قدرت پیدا ہو سکتی ہے، اور جیسا کہ چاہئے، ان کتابوں سے استفادہ بھی بآسانی ممکن نہیں، اس کے بعد جیسا کہ آپ

[1] بعد کو ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے خاکسار بھی اسی نتیجہ تک پہنچا، بلکہ اسی کے ساتھ جدید علوم و فنون و السنہ کو چونکہ حکومت کی سرپرستی و پشت پناہی حاصل تھی، اس کی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا کہ اسلامی دینی علوم کے جن آثار کی توقع پڑھنے والوں میں کی جاتی ہے، بجائے ان کے اکثریت میں وہی رنگ غالب ہو جاتا ہے، جو رنگ خالص مغربی علوم و فنون کی تعلیم پانے والوں کی خصوصیت ہے، رنگ ڈھنگ، وضع قطع، طریقۂ فکر و بیان سب ہی میں پایا گیا کہ وہ مغربی علوم کے طلبہ کے طفیلی بنے ہوئے ہیں۔ الناس علی دین ملوکھم بات تو پرانی ہے، لیکن ہر نئے زمانہ میں اسی پرانی بات کا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، مولانا حبیب الرحمٰن سابق مہتمم دار العلوم رحمۃ اللہ علیہ سے دار العلوم کے نصاب کے متعلق اسی سلسلہ میں ایک دن گفتگو ہوئی، تو پہلی دفعہ اسی "پیر دانا" نے نوجوانی کے زمانہ میں فقیر کو سمجھایا تھا کہ توازن کا باقی رہنا دشوار ہو جائے گا۔ طلبہ پر عموماً انگریزیت غالب آ جائے گی، دین کی ٹوٹی پھوٹی خدمت دار العلوم کے طلبہ سے اس وقت جو بن آتی ہے، تم دیکھو گے کہ اس سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا چلا گیا، مشاہدہ سے ان تجربہ کاروں کے خیال کی تائید ہوتی چلی جا رہی ہے ۱۲

دیکھ چکے صاف اور واضح لفظوں میں اپنی یہ تجویز پیش کی ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے۔ اپنی اس تقریر میں یہ دعوے بھی کیا ہے کہ اس ترتیب سے تعلیم دلانے کا تجربہ کیا جائے۔ عوام ہی کو نہیں خود حکومت کو جوش میں آکر براہ راست مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ

"سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد اسے کہا کرتے ہیں"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دانش ہندی کے قدیم علوم جن کو معقولات بھی کہتے ہیں، ان میں بال کی کھال نکالنے کی مشق کی وجہ سے قدرتاً فکر و نظر میں گہرائی کی کیفیت جو پیدا ہو جاتی ہے، نازک سے نازک بات تک پہنچنے اور پہنچانے کی اس عادت کے ساتھ جدید علوم و فنون میں حقیقت بینی، واقعات طلبی پر جو زور دیا جاتا ہے۔ قدیم و جدید تعلیم کی ان دونوں طبعی خاصیتوں کی باہمی ترکیب سے علمی استعداد کے جس رنگ کو پیدا کیا جا سکتا ہے، اس رنگ کو صرف قدیم، یا صرف جدید تعلیم کی راہ سے شاید حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا نے اپنے ہی زمانہ میں تعلیم کے تمام پہلوؤں، اور ان کے مختلف نتائج کا صحیح اندازہ کر لیا تھا تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ حکومت مسلطہ جس کی امداد کی طرف غلطی سے بھی آپ دیکھنا شاید پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن قدیم و جدید علوم کے پیوند کی مجوزہ ترتیب کی افادیت کے خیال نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس التزام کے حدود کے توڑنے پر بھی آپ کو شاید مضطر و مجبور کر دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑی رکاوٹ آپ کی تجویز کے "عملی نفاذ" میں حکومت کا وہ عجیب و غریب رویہ تھا کہ "حصول علم" کو بھی طلبہ کی عمر کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، فلاں عمر تک فلاں امتحان میں طلبہ شریک نہیں ہو سکتے، یا فلاں امتحان میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ امیدوار اتنی عمر کا ہو چکا ہو۔ امتحان میں شرکت کے حق سے وہ محروم ہو جائیں گے، جو حکومت کی مقرر کردہ عمر سے ایک دن بھی آگے بڑھ گئے ہوں، علم کے طلب کی غلامی کے ساتھ خود علم کی اس غلامی کو دیکھتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے محسوس فرمایا کہ میری مجوزہ ترتیب پر تعلیم پانے والوں کے لئے سرکاری مدارس میں

داخل ہو کر جدید علوم و فنون سے استفادہ میں رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلاف دستور دستگیری کے لئے اس موقع پر آپ نے حکومت کو پکارا ہے ارشاد ہوا تھا کہ

"کاش! گورنمنٹ یہ بھی قید عمر طلبہ نو داخل کو اڑا دے" ملا

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات و اسلامیات کی تعلیم کے بعد یورپ کے نئے علوم اور اس ملک کی نئی علمی زبانوں کے سیکھنے سکھانے کے متعلق حضرت والا کے خیالات و جذبات کی صحیح نوعیت کیا تھی؟

بہرحال مسئلہ کے جن جن زاویوں کو جس جس طریقہ سے اپنی تقریر میں حضرت والا نے پیش کیا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ صرف جواب دینے کے لئے سرسری طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا تھا، گویا ذکر کرنے والے کے سامنے حقیقی معنوں میں کوئی مشخص تجویز اس باب میں نہ تھی۔

میں کیا عرض کروں، دارالعلوم دیوبند کی روددادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ شروع میں مدرسہ کی تعلیمی مدت معلوم ہوتا ہے کہ دس سال مقرر کی گئی تھی، لیکن دو سال گذرنے کے بعد ۱۲۸۵ھ میں ہم دیکھتے ہیں، نصاب اور تعلیمی مدت وغیرہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک مجلس مقرر کی گئی، جس نے منجملہ دوسری تجویزوں کے ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ

"کل میعاد مدت تمام کتب اسباق ثلاثہ کے چھ سال معین ہوئے" مثلاً رودادِ ۱۲۸۵ھ

"اسباق ثلاثہ" مراد یہ ہے کہ وقت واحد میں تین کتابوں سے زیادہ پڑھنے کی اجازت کسی طالب علم کو نہیں دی گئی تھی، چھ سال کی محدود مدت میں اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ خالص دینیات یعنی حدیث و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و فرائض کی وہ ساری کتابیں ختم ہو جائیں، جن کے پڑھنے پڑھانے کا عام رواج اس زمانہ میں تھا، اور جن کو پڑھ لینے کے بعد دینی علوم کے متعلق مزید کتابی تعلیم کی سمجھا جاتا تھا کہ ضرورت باقی نہیں رہتی، اس میں مشکوٰۃ کے ساتھ حدیث میں ہم صحاح ستہ کو بھی پاتے ہیں، فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں توضیح تلویح تفسیر میں بیضاوی تک اس میں شریک ہے، ادب عربی کے لئے شرح ملا تک صرف و نحو کی کتابوں کے ساتھ نثر میں نفحۃ الیمن حریری، کلیلہ دمنہ، تاریخ عینی، اور نظم میں متنبی، حماسہ شریک ہیں، عربی سے اردو،

اردو سے عربی ترجمہ کے لئے بھی وقت نکالا گیا ہے، اور معقولات یا علوم دانش سندی میں فلسفہ کی حد تک اگرچہ صرف میبذی ہے لیکن دماغی تربیت اور ذہنی ورزش کے لئے منطق کی چھوٹی بڑی کتابوں کی کافی تعداد باقی رکھی گئی تھی، مختصر رسالوں، ایساغوجی، قال اقول، مرقات، تہذیب، اور مبسوط کتابوں میں شرح تہذیب قطبی، میر قطبی سب کو باقی رکھا گیا ہے۔

چھ سال کی اس محدود مدت میں اس نصاب کو ختم کرانے کے لئے نقشہ میں سال بھر کے تعلیمی دنوں کی میزان کو پیش کر کے ہر دن اور ہر دن میں ہر سبق کے لئے کتنا وقت دینا چاہئے، تفصیل وار نقشہ میں ان سارے امور کا ذکر کر کے مدرسین کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے کہ فلاں کتاب کو اتنی مدت میں ختم کرادیں۔

الغرض کوئی سوال اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جسے تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو نقشہ کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ دس سال کی عمر میں بھی، دارالعلوم کے اس شش سالہ نصاب کو شروع کر کے سولھویں سال میں پڑھنے والے اس کو ختم کر سکتے تھے، اور یوں صرف خالص اسلامی علوم ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے موروثی مروجہ فنون سے بھی کافی مناسبت پیدا کر لینے کے بعد سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم، اور نئی علمی باتوں کو سیکھ کر بائیس تیئیس کی عمر میں گریجویٹ بن جانے کا کافی اور منتظم موقعہ پیدا کر دیا گیا تھا یعنی آج بھی گریجویٹ بننے کی جو عام عمر ہے کم و بیش اسی عمر میں سیدنا الامام الکبیر کی مجوزہ ترتیب کے مطابق باضابطہ مولوی اور مستند گریجویٹ بن جانے کا وقوعی امکان، مسلمانوں کے سامنے آ گیا تھا، دین اور اپنے آبائی سرمایہ کی ضمانت کے ساتھ باہر کی چیزوں سے استفادہ کی صلاحیت کے لئے مزید وقت دینے کی ضرورت قطعی طور پر باقی نہیں رہی تھی،

صحیح طور پر یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ اس تعلیمی نصب العین کے مطابق آئندہ عمل درآمد کی راہوں میں کیا رکاوٹیں پیش آئیں کہ اس منتظم اور قیمتی امکان سے مستفید ہونے کا موقعہ نہ مل سکا۔

دیوبند کے مقامی مدرسہ کو ہمہ گیر جامعہ کے قالب میں ڈھالنے کی کوششوں میں بدترین ناسازگار ماحول میں جس کے عزم کی بے پناہ قوت سرگرم عمل تھی، چند ہی سال گذرے تھے کہ اچانک ہندی مسلمانوں کو اس کی ناسوتی خدمات سے قدرت کی نامعلوم مصلحتوں نے محروم کر دیا یعنی پچاس سال بھی

پورے نہیں ہوئے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کی "اجل مسمّیٰ" پوری ہوگئی۔ یہ حادثہ واقعہ تو یہ ہے "دارالعلوم کی تاریخ کا ایسا حوصلہ گسل، ہوش ربا حادثہ تھا کہ دیوبند کی یہ تعلیم گاہ باقی ہی کیسے رہ گئی" اور گو جو کچھ ہونا چاہئے تھا، مان لیا جائے کہ وہ نہ ہوا، لیکن جو کچھ بھی ہوا، حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ یہی کیسے ہوگیا۔ پہلے سال میں جس ادارہ کا میزانیہ (بجٹ) (۳۹۳) روپیہ تھا۔ آج قریب قریب پانچ لاکھ روپے کا بجٹ اسی ادارے کی مجلس شوریٰ نے بحمداللہ منظور کر رہی ہے، اور جس مدرسہ کی بنیاد قائم کرتے ہوئے قائم کرنے والوں کو یہ اندیشہ ستا رہا تھا کہ

"پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آئیں گے" (صدا پہلی روداد متعلقہ ۱۲۸۳ھ)

آج اسی میں طلبہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزار سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہے، اور جن کی اکثریت کی ہر جیبی ضرورتوں کا متکفل خود مدرسہ ہے۔

بہرحال بظاہر میرا خیال تو یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے عملی نفاذ میں غالباً آپ کی وفات کا واقعہ زیادہ اثر انداز ہوا، ہر شخص کے بس کی بات یہ نہ تھی کہ جس زمانہ میں مدرسہ قائم ہوا تھا، اور جو ماحول اس عہد کا تھا، اس میں اس "تعلیمی نصب العین" اور اس کے ثمرات و فوائد کا صحیح اندازہ لگا سکتا۔ روداد میں درج ہونے کے باوجود آپ کے اس "تعلیمی نصب العین" کا چرچا لوگوں میں بعد کو نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ اس کا خیال بھی لوگوں میں باقی نہ رہا، خود یہی واقعہ بتا رہا ہے کہ سوچنے والے کی بات شاید سوچنے والے کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔

باقی اس زمانہ کا "ماحول" جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، آج تو اس کا سمجھنا بھی دشوار ہے لیکن اس "ماحول" میں جو جی رہے تھے، میں تو سمجھتا ہوں کہ بے چارے معذور تھے تفصیل کا تو موقعہ نہیں ہے، لیکن اجمالاً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند خصوصی مؤثرات کا ذکر کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کا مدرسہ سرزمین ہند میں جس وقت قائم ہوا تھا۔ اس وقت ایک طرف تو درس نظامیہ کے نصاب کے پڑھنے پڑھانے والے حضرات تھے، ان ہی کو "علماء" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، دوسری طرف عام مسلمان تھے، جن کے آباء و اجداد مغل حکومت کی کشوری و فوجی خدمات انجام دیتے تھے،

مغل حکومت اگرچہ ختم ہو چکی تھی، لیکن مغل دربار کی کشوری و فوجی خدمات کیلئے شاہی زبان (فارسی) کا جو نصاب تھا۔ فارسی ادب (نظم و نثر) کا وزن و وقار ان کے دلوں سے خاندانی روایات کے زیر اثر نہیں نکلا تھا۔ نئی قائم شدہ حکومت کی خدمات کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہو، یا نہ ملتی ہو۔ لیکن موروثی دباؤ کے نیچے لوگ فارسی کے اسی نصاب کو پڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ بجائے خود فارسی ادب کا یہ نصاب بھی کافی بوجھل اور وزنی تھا۔ گویا علماء کے مقابلہ میں یہ تعلیم یافتوں کا قدیم طبقہ تھا، اور اب نئی حکومت کے جدید دفاتر اور خدمات کے لئے نئے قائم شدہ سرکاری مدارس، اور یونیورسٹیوں سے ملک روشناس ہو رہا تھا۔ یہی جدید تعلیم یافتوں کا نیا گروہ تھا، جو خاص قسم کی ذہنیت لے کر آبادیوں میں پھیل رہا تھا، یا پھیلایا جا رہا تھا۔

گو واضح اور صریح شہادت تو میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن دارالعلوم کے اس شش سالہ نصاب اور جو تبدیلیاں آئے دن اس نصاب میں ہوتی رہیں۔ ان کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ چھ سال والے اس نصاب کو درس نظامیہ والے مولویوں نے تو اس لئے قبول نہیں کیا کہ سلمیات اور زواہد سے بھی یہ نصاب خالی تھا، اور میبذی کے سوا فلسفہ کی کوئی کتاب اس نصاب میں نہیں رکھی گئی تھی۔[1]

عام طور پر درس نظامیہ کے مولویوں میں دیوبند سے فارغ ہونے والوں کے متعلق ملّی ہونے کا تصور لطفی نعرہ مشہور تھا۔ کہتے ہیں، کہ نظامیہ نصاب کے پڑھانے والے ایک مشہور و معروف

[1] سلمیات سے میری مراد محب اللہ بہاری کا مشہور منطقی متن، سلم اور اسکی شروح حمد اللہ قاضی مبارک شرح سلم بحر العلوم، ملا حسن وغیرہ ہیں، زواہد ثلاثہ، عالمگیری عہد کے ایک معقولی مولوی مرزا زاہد کی تین کتابیں ہیں، جو میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میر زاہد شرح مواقف کے ناموں سے مشہور ہیں۔ مرزا زاہد کی ان کتابوں کے ساتھ نظامی مولویوں کے والہانہ شغف کا یہ حال تھا کہ جب تک ان تینوں یا ان میں سے کسی ایک کتاب پر اپنا خاص حاشیہ مولوی نہ لکھتا تھا، مستند مولویوں میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ یہی حال سلم اور اس کی شروح کا تھا۔ ان کتابوں کی افادیت کے متعلق ہمارے علماء کا غلو اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں نظامی نصاب کی ترمیم کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے یہ تجویز جب سامنے آئی کہ ایسا غوجی منطق کے رسالہ کو نصاب سے خارج کر دیا جائے تو صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن مرحوم مغفور رحمۃ اللہ علیہ جو اس اجلاس میں خود شریک تھے۔ اکثر اس قصہ کا ذکر کیا کرتے تھے کہ تین دن تک اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی۔ علماء کی اکثریت کو اصرار تھا کہ علم کی بنیاد ہی اکھڑ جائیگی اگر ایسا غوجی کو نصاب سے خارج کیا گیا۔ ۱۲

مولوی صاحب کا دستور تھا کہ ان سے پڑھنے والے طلبہ میں کوئی طالب علم کسی مسئلہ پر الجھنے لگتا اور نافہمی سے کام لیتا تو مولوی صاحب کہتے "دیکھو! اس کا چہرہ دیوبند کی طرف تو نہیں ہے" ظاہر ہے کہ یہ حال زیادہ دن تک قابل برداشت نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامیہ کی ایک ایک معقولی کتاب اپنے تمام منہیات و حواشی کے ساتھ اسی طرح بہ تدریج شریک ہوتی چلی گئی، جن کو خارج کر کے نصاب کو چھ سال کی محدود مدت میں ختم کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

اسی طرح دارالعلوم کی رودادوں میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے، شاید میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے کہ فارسی ادب کی کتابوں کے درس کے اضافہ کو قرین مصلحت قرار دیا گیا، اور اسی سلسلہ میں گلستان بوستان کے ساتھ ابوالفضل، سکندر نامہ، انوار سہیلی، یوسف زلیخا، عبدالواسع، انشاء خلیفہ وغیرہ کتابوں کو بھی دارالعلوم کے درسی نصاب میں ہم شریک پاتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس سے ملک کے قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین کا کام لیا گیا۔

اسی کے ساتھ میرا ذاتی تاثر یہ بھی ہے کہ اس شش سالہ نصاب میں بھی ادب عربی کی نظم و نثر اور ترجمہ کو داخل کر کے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سرکاری مدارس کے جدید تعلیم یافتوں کے اس مطالبہ کی تکمیل کی گئی تھی، کہ انگریزی زبان پڑھنے والے انگریزی میں بولنے اور لکھنے کی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن مولویوں پر حیرت ہے کہ سالہا سال تک کہتے ہیں کہ انہیں عربی زبان ہی میں سب کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن نہ ایک جملہ وہ بول ہی سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ ہندوستان کے مولویوں کے لئے عربی بولنے یا لکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن چونکہ انگریزی پڑھنے والے انگریزی بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عربی پڑھنے والے مولوی بھی عربی میں بول کر اور لکھ کر ہم کو دکھائیں۔ گویا اس کمال کے بغیر جدید تعلیم یافتہ طبقہ مولویوں کو مولوی ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان ہی کے مطالبہ کی تکمیل عربی ادب کی کتابوں کو نصاب میں داخل کر کے کی گئی تھی۔

بہرحال اسی ستہ عملی میں علم کا جو آشیانہ بن رہا تھا، قدرتاً ہر ایک کا دباؤ اس پر پڑنا ہی چاہئے تھا،

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا تعلیمی نصاب کافی بوجھل اور عریض و طویل ہوتا چلا گیا' اسی نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صرف ہونے لگا' اور دینی تعلیم پانے کی وجہ سے عمر نبانی کے آلات (ریش دربروت) سے بھی کش کش کا موقعہ ان کے لئے باقی نہ تھا' حقیقت کے چہرے پر مجاز کی نقاب چڑھانے سے مذہبا وہ معذور تھے' ظاہر ہے کہ لمبی لمبی داڑھیوں کے ساتھ سرکاری مدارس میں داخل ہو کر پڑھنے کی صورت ہی کیا تھی؟ اور یوں سیدنا الامام الکبیر کا تعلیمی نصب العین صرف ایک تاریخی نصب العین بن کر رہ گیا' عوام کے مطالبہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے' جس سے قطع نظر کر کے کام کرنا آسان نہیں ہے' اور تو اور اسی ششش سالہ نصاب میں' عربی ادب کی نثر و نظم اور ترجمہ کا کافی زور جو نظر آتا ہے' میں تو نہیں سمجھتا کہ خالص اسلامی علوم (قرآن و حدیث فقہ و کلام وغیرہا) کی عربی عبارتوں کے سمجھنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر جیسے دیدہ ور حضرات نصاب میں اس غیر ضروری اضافہ کو اسی طرح ناگزیر قرار دیتے تھے' جیسے حقائق و واقعات سے جو ناواقف ہیں' کچھ بھی باور کئے ہوئے ہیں۔

ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو' لیکن اپنا ذاتی احساس یہی ہے' کہ ادب عربی میں ناقص رہ جانے کا جو اعتراض جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے مولویوں پر کیا جاتا تھا' اس اعتراض کا ازالہ کر کے چاہا گیا تھا کہ مولویوں سے انگریزی خواں مسلمانوں کو مانوس بنایا جائے' یہی دیکھا بھی گیا کہ شروع شروع میں ان ہی مولویوں کو حسن قبول جدید تعلیم یافتوں میں حاصل ہوا' جنہوں نے کسی نہ کسی طرح عربی ادب کی مہارت کا ثبوت اس زمانہ میں پیش کیا تھا۔ اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے' کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی درس نظامیہ کے معقولاتی مولویوں کے مقابلہ میں زیادہ رعایت نصاب مرتب کرنے والوں کے مدنظر تھی۔

آخر اگر یہ نہ مانا جائے' تو پھر اس واقعہ کی کیا توجیہ کی جائے' کہ نظامیہ درس کی اکثر و بیشتر معقولاتی کتابیں خارج کر دی گئیں۔ وہی کتابیں جن کے پڑھے بغیر نظامی درس کے مولویوں کا عام خیال تھا کہ طالب علم سطحی بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن عربی ادب کی ایسی کتابیں جن کے نام سے بھی شاید اس زمانہ کے نظامی مولوی عموماً واقف نہ تھے' مثلاً کلیلہ دمنہ' تاریخ یمینی وغیرہ کا اضافہ ششش سالہ نصاب میں کیا گیا'

اور کسی طرف سے کوئی مخالفانہ آواز مجلس شوری میں نہیں اٹھائی گئی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ درس نظامیہ کی خارج شدہ معقولاتی کتابیں سیدنا الامام الکبیر کی زندگی ہی میں جیسا کہ روودادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، تدریجاً دارالعلوم کے نصاب میں شریک ہوتی چلی جارہی تھیں۔ سطحیت کا الزام دارالعلوم کے فیض یافتوں پر نظامی درس کے معقولاتی مولویوں کی طرف سے جو مسلسل لگایا جارہا تھا، اور طعن و تشنیع تعریض و تضحیک کا جو طوفان اٹھایا گیا تھا، اس کا مقابلہ آخر کب تک کیا جاتا، لیکن باایں ہمہ اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ حلقہ دیوبند کے بعض ذمہ دار اکابر آخر وقت تک اسی پر اصرار فرماتے رہے، کہ قدیم فلسفہ کی کتابوں سے دارالعلوم کے نصاب کو پاک رکھا جائے۔ ان اکابر میں سب سے زیادہ نمایاں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات تھی حضرت والا کی وفات کے بعد دارالعلوم کے مستقل سرپرست اپنی زندگی کے آخری دنوں تک آپ ہی رہے، مسلمانوں کے شاندار ماضی میں مولانا محمد میاں صاحب نے بھی آپ کی مخالفت کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ مکاتیب رشیدی میں حضرت گنگوہی کا خط مولانا صدیق احمد مرحوم کے نام جو پایا جاتا ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے متعلق مولانا صدیق احمد صاحب کے ایک خواب کی تعبیر درج کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا تھا کہ

"مگر دیوبند کے مدرسہ کے خواب کی البتہ ضرورت تعبیر ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس حقیر کا خیال بہر روز یہ ہے، کہ فلسفہ محض بے کار امر ہے، اس سے کوئی نفع معتد بہ حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ دو چار سال ضائع ہوں، اور آدمی خر دماغ، اجنبی دینیات سے ہو جائے، فہم کج، و کند فہم شرعیات سے ہو جائے، اور کلمات کفریہ زبان سے نکال کر ظلمات فلاسفہ میں قلب کو کدورت ہو جائے، اور کوئی فائدہ نہیں۔"

اسی کے بعد یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"لہٰذا اس فن خبیث کا مدرسہ سے اخراج کر دیا تھا، چنانچہ ایک سال سے اس کی پڑھائی مدرسہ دیوبند سے موقوف کر دی گئی ہے۔"

آگے لکھا ہے کہ

"مگر بعض بعض مدرسین اور طلبہ کو خیال اس کا (یعنی فلسفہ کا) چلا جاتا ہے اور شاید خفیہ درس بھی اس کا ہوتا ہو" مثلاً مکاتیب رشیدی

مکتوب گرامی کے آخر میں تاریخ رمضان ۱۳۱۱ھ کی درج ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جیسے شش سالہ نصاب سے میبذی کے سوا فلسفہ کی ساری کتابیں، اور معقولات کا سارا طومار دیوبند کے تعلیمی نصاب سے سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد داخل ہونے کے بعد کچھ دنوں کے لئے پھر فلسفہ کی کتابیں مدرسہ بدر ہوئیں۔ لیکن مولویت کا اس زمانہ میں جو ماحول تھا اس نے پھر مجبور کیا، اور نکلی ہوئی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں لوگ پھر وقت ضائع کرتے رہے، اور آج تک "اضاعت اوقات" کا وہی سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ دارالعلوم کی تاریخ میں معقولاتی کتابوں کی بے قدری، اور بے ثمری کا خیال ابتداء ہی سے شریک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے کی حد تک ان کتابوں کو لوگ پڑھتے بھی رہے، اور پڑھانے والے پڑھاتے بھی رہے، کافی وقت طلبہ کا اس میں صرف ہوتا ہے، لیکن حوصلہ شکن موروثی روایات نے اس توجہ و محنت سے اس فن کو محروم رکھا جس کی وہ کتابیں اکابر اور ان کے اس شغل میں ضرورت ہے، اور یوں ذہنی ورزش، فکری ریاضت کا فائدہ جیسا کہ سمجھا جاتا ہے عموماً طلبہ کو میسر نہ آسکا۔ ضرورت سے زیادہ، اور بہت زیادہ طول کلامی سے اس موقعہ پر مجھے کام لینا پڑا، لیکن کرتا کیا؟ سیدنا الامام الکبیر کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اس کو سمجھانا، وثائق و شواہد سے دعویٰ کو مدلل کرنا، اور سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جب یہی چاہا گیا تھا کہ اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کرا لینے کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا موقعہ مسلمان بچوں کے لئے فراہم کیا جائے۔ تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک "نمونہ" بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دارالعلوم پیش نہ کر سکا۔ یقیناً یہ کافی اہم اور دشوار سوال تھا۔ واقعات کی روشنی میں اس کا صحیح جواب اگر نہ دیا جاتا تو اس تعلیمی نصب العین کا سیدنا الامام الکبیر کی طرف انتساب کا دعویٰ، شاید

میرا ذاتی رجحان، یا صرف خوش اعتقادی بن کر رہ جاتا۔

بہت سے مخفی پہلو، اور دقیق اسباب پھر بھی باقی رہ گئے، لیکن واضح اسباب جن کی وجہ سے آپ کا تعلیمی نصب العین بر روئے کار نہ آسکا۔ اور قدیم و جدید علوم والسنہ کے پیوند، و گرہ اندازی کی جو مہم آپ سر کرنا چاہتے تھے۔ افسوس ہے، کہ دارالعلوم دیوبند کا نظامِ تعلیم مان لینا چاہیئے کہ اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ بہ تدریج جو حالات پیش آئے، اور مسلسل پیش آتے چلے جا رہے ہیں۔ جن کی ان پر نظر ہے، وہ یہ امید قائم کر سکتے ہیں، کہ جو مہم اب تک سر نہ ہو سکی، اس کے سر کرنے کے لئے جس زمین کی ضرورت تھی، وہ بحمد اللہ چند در چند وجوہ سے کہا جا سکتا ہے کہ تیار ہو چکی ہے[1]۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔

یہ عجیب بات ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین یعنی خالص اسلامی، اور دانش ہندی کے قدیم علوم سے فارغ ہونے کے بعد، سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم و فنون کو حاصل کیا جائے اس نصب العین کے مطابق جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اپنی پوری تاریخ میں دارالعلوم دیوبند کسی "صحیح نمونہ" کو پیش کرنے سے اگرچہ اس وقت تک قاصر رہا ہے۔ لیکن ۱۳۲۸ھ میں عام دستار بندی کے لئے مشہور تاریخی اجتماع دارالعلوم دیوبند میں جو ہوا تھا، جس میں پہلی دفعہ دیوبندی علماء کے جلسے میں جدید تعلیم یافتہ کی

---

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ نظامی درس کے معقولات کی ہوا بھی اکھڑ چکی ہے، اور مغل دربار کے دفتریوں کی اولاد فارسی ادب کی اس اہمیت کو بھلا چکی ہے، جو صرف مدرسی روایات کی پیداوار تھی، اہل بصیرت پر عربی زبان کی دونوں قسموں کی نوعیت واضح ہو چکی ہے، یعنی خالص اسلامی علوم (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے سمجھنے سمجھانے کے لئے عربی زبان کے جس حصہ سے واقفیت کی ضرورت ہے، اس حصہ سے بالکل مختلف ہے، جس کی ضرورت صرف ان ہی لوگوں کو ہے، جو عربی زبان کے جاہلی و اسلامی ادبی ذخیروں پر عبور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسے قدرتی تغیرات ہیں، جن کی وجہ سے خالص اسلامی علوم کے نصاب میں کافی گنجائش اس بات کی پیدا ہو چکی ہے کہ جدید علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری مدارس میں داخل ہونے کیلئے بطور مقدمہ کے جن چیزوں کے سکھانے کی ضرورت ہے، ان کو نصاب میں شریک کر کے قدیم و جدید علوم میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق رشتہ قائم کرنے کیلئے راہ درست کی جائے۔ خاکسار نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں بجائے ثنویت کے نظام تعلیم کی وحدت کا نظریہ جو پیش کیا ہے، اس میں بھی اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے"

بعض ممتاز اور سربرآوردہ ہستیاں شریک ہوئی تھیں، علیگڑھ کالج جو اب مسلم یونیورسٹی بن چکا ہے اس کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم گویا نمائندہ بن کر اس جلسہ میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس وقت پھر وہی "قدیم و جدید علوم کے پیوند" کا مسئلہ چھیڑا، اور چاہا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے بالکل برعکس ترتیب ہی کا اس سلسلہ میں تجربہ کیا جائے۔ یعنی جدید علوم و فنون کے گریجویٹوں کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کر کے اسلامی علوم و فنون کی تعلیم سے استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔ تجویز پاس بھی ہوئی، اور اس کے مطابق علیگڑھ کالج کے گریجویٹ دیوبند کے مدرسہ میں شریک بھی ہوئے لیکن نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ ناظم جمعیت العلماء مولانا سید محمد میاں صاحب اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں یہ لکھتے ہوئے، کہ

"اس کا (یعنی اس تعلیمی ترتیب کا) ثمرہ نہایت تلخ تھا"

آگے وہی اطلاع دیتے ہیں، کہ

"پہلی مرتبہ جو علیگڑھ سے عربی حاصل کرنے کے لئے آئے وہ انگریز کے سی۔ آئی۔ ڈی تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرانے میں وطن دوستی اور قوم پروری کا حق ادا کر کے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا عہدہ حاصل کیا" صفحہ ۱۱ حصہ پنجم

اب جب کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی زندان خاکی سے آزاد ہو کر اپنے سلف صالحین تک عزیز مقتدر کے مقعد صدق میں پہنچ چکے، اور ان کا دشمن انگریز بھی ملک کو خالی کر کے جا چکا۔ اس "ثمرہ تلخ" کی اجمالی خبر کی تفصیل فضول ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، اور میں نہیں سمجھتا کہ جس تلخی کا تجربہ ہوا، سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے معکوس ترتیب کا تجربہ آخر اس کے سوا کس ثمرہ کو پیدا کرتا، انسانی جبلت کا یہ فطری قانون ہے، کہ خام عمری میں جس رنگ کو بھی پختہ کر دیا جائے، وہی پختہ ہو جاتا ہے۔ پختہ رنگ کا ازالہ کر کے نئے رنگ کا چڑھانا آسان نہیں ہے۔ سیدنا الامام الکبیر کی حکیمانہ بصیرت نفسیات انسانی کے اس راز کو تجربہ سے پہلے اگر نہ پا لیتی تو اور کون پاتا۔

باقی میں نے افواہاً یہ بھی سنا ہے، اور مولانا سید محمد میاں نے بھی لکھا ہے کہ معکوس ترتیب کے

کے تجربے کے ساتھ ساتھ تجویز کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ دارالعلوم سے فارغ ہونے والوں میں سے بھی انتخاب کرکے جدید علوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگوں کو علیگڈھ بھیجا جائے۔ گویا دوسرے لفظوں میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے تجربہ کا بھی کہا جاتا ہے کہ ارادہ کیا گیا تھا۔ مولانا سید محمد میاں صاحب نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علیگڈھ کالج انگریزی پڑھنے جایا کریں" ص۱۱۱

اس کا مطلب یہی ہے، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، ترتیب معکوس کا عملی تجربہ تو یقیناً کیا گیا، شاید دارالعلوم میں ایک سے زیادہ گریجویٹ، یا انڈر گریجویٹ حضرات شریک کرلئے گئے، اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود میرا علم یہی ہے کہ ان میں بعضوں کو مدرسہ سے امداد (تعلیمی وظیفہ یا خوراک وغیرہ) کی شکل میں دی گئی۔ لیکن علیگڈھ بھی دیوبند سے اپنے خرچ، یا کالج کے خرچ پر کوئی بلایا گیا، شاید ایسی کوئی صورت عملاً پیش نہ آئی، کاش! ایک دو نمونے بھی سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق تیار ہوجاتے، تو شاید معکوس ترتیب کے تجربہ کی تلخیوں کی تلافی کی کوئی صورت نکل سکتی تھی، لیکن یہ مسئلہ

خداوندان نعمت را کرم نیست
کریماں را بدست اندر درم نیست

کے جھولوں ہی میں جھولتا رہا، اور آج تک جھول رہا ہے۔

بہر حال دارالعلوم کے تعلیمی نصاب پر سیدنا الامام الکبیر کے تعلق سے جو کچھ کہنے کی ضرورت تھی، آپ اسے پڑھ چکے، البتہ اسی سلسلہ میں حضرت عالا کے رفیق الدنیا والآخرہ مولانا گنگوہی کے گرامی نامہ سے فلسفہ کے متعلق جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو کچھ زیادہ درشتی اور سختی ان الفاظ میں محسوس ہوئی ہو۔ لیکن جب یہ سوچا جاتا ہے، کہ خواہ کتابوں میں "فلسفہ" کی فنی تعریف کچھ بھی کی جاتی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ کائنات کے متعلق انسانی فطرت میں

بنیادی[1] سوالات جو پیدا ہوتے ہیں، ان سوالوں کے حل کی قدرتی راہ، یعنی وحی و نبوت سے بے نیازی اختیار کر کے جانے بغیر اپنے اپنے زمانہ کے چرب زبانوں نے خود تراشیدہ وسوسوں کے جس مجموعہ کو فرض کر کے مشہور کر دیا کہ یہی ان بنیادی سوالوں کا صحیح جواب ہے، اسی کا نام "فلسفہ" رکھ دیا گیا، چونکہ ان جوابوں کا تعلق حقائق و واقعات سے نہیں ہوتا، بلکہ مفروضہ اوہام سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں ہوتے، اسی لئے مقبول ہونے کے بعد تھوڑے تھوڑے دنوں پر ہر زمانہ کا فلسفہ مسترد ہوتا رہا ہے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے، اور اب بھی ہو رہا ہے، آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے درس نظامیہ کے تدریسی حلقوں میں فلسفہ کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ اس زمانہ میں جس میں حضرت گنگوہیؒ نے یہ خط لکھا ہے، قطعی طور پر مردہ ہو چکا تھا۔ لیکن ہمارے علماء محض موروثی روایات کے زیر اثر اسی مرحوم و مدفون فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے چلے جا رہے تھے، آپ ہی بتائیے کہ طلبہ کا قیمتی وقت اور عمر کا گرانمایہ حصہ ایک ایسے مہمل مشغلہ میں جو برباد ہو رہا تھا، اس پر سنجیدہ دماغوں کو جتنا بھی غصہ آئے، کم تھا۔ دین کے لئے فلسفہ کے مطالعہ کی ضرورت صرف اس لئے ہوتی ہے، کہ فلسفہ کی راہ سے خام عقلوں کو جن مغالطوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، ان کا ازالہ کیا جائے۔ اس لحاظ سے بجائے اس مسترد اور مردہ فلسفہ کے کچھ ضرورت تھی تو اس بات کی، کہ اس زمانہ میں "فلسفہ" کے نام سے جن خیالات کو حسن قبول حاصل ہو رہا تھا، جو ظاہر ہے کہ مغرب کا جدید فلسفہ ہی ہو سکتا تھا، لیکن اس کی طرف نظامی درس کے معقولی علماء نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت والا کے منشاء کے مطابق یہ رشتہ اگر قائم ہو جاتا، تو بجائے اس مردہ فلسفہ کے یورپ کے "جدید فلسفہ" کے مطالعہ کا موقعہ ہمارے علماء کے لئے بآسانی

[1] یعنی یہ کائنات جن میں انسان بھی شریک ہے کیا ہے، اس کی ابتداء کیا ہے انتہا کیا ہے۔ اس کا مدعا کیا ہے یہی وہ بنیادی سوالات ہیں، جن کے صحیح جوابوں کا علم حاصل کئے بغیر عالم کا یہ سارا نظام صرف گونگے کا ایک خواب بن کر رہ جاتا ہے، مذہب یا دین درحقیقت ان ہی سوالوں کے ان جوابوں کا نام ہے، جو وحی و نبوت کی راہ سے بنی آدم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وحی و نبوت کے سوا ان سوالوں کے حل کا کوئی علمی ذریعہ آدمی کے پاس نہیں ہے ۱۲

میسر آسکتا تھا، اور اس وقت بقول سیدنا الامام الکبیر دنیا دیکھ سکتی تھی کہ علماء کی علمی استعداد کیسی ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ مکتوب کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ علماءِ دیو بند کلیۃً "عقلی علوم" کے درس و تدریس، مطالعہ و مذاکرہ کے مخالف تھے۔ صحیح نہ ہوگا۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ مطلقاً عقلیات کے اگر وہ مخالف ہوتے تو شش سالہ نصاب میں بھی نصف درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں منطق کی کیوں باقی رکھی جاتیں۔ اور مفتی مبارک علی صاحب حال نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، براہ راست مولانا سید برکات احمد بہاری ثم ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر جس قصہ کے راوی ہیں۔ یعنی مولانا برکات احمد مرحوم مفتی صاحب سے فرماتے تھے، کہ آج فلسفہ اور منطق کے درس و تدریس میں غیر معمولی شہرت مجھے جو حاصل ہوئی ہے، اس کو میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت سمجھتا ہوں، کہتے تھے کہ بچپن میں ایک دفعہ اپنے والد مرحوم حکیم مولانا دائم علی خاں صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، میرے والد نے حضرت والا سے استدعا کی کہ اس بچے کے لئے دعا فرمائی جائے، مولانا برکات احمد صاحب کا بیان ہے کہ

"حضرت مولانا نانوتوی کی زبان سے بے ساختہ نکلا، کہ اللہ تعالےٰ اس کو علم معقول میں کمال عطا فرمائے"

سننے کے ساتھ کہتے تھے کہ میرے والد حکیم دائم علی صاحب نے عرض کیا کہ

"حضرت نے یہ کیا دعا فرمائی، میری تمنا تو یہ ہے، کہ اس کو فقہ اور دین کا علم حاصل ہو"

مفتی صاحب کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے جو کچھ فرمایا تھا، الفاظ تو یاد نہیں رہے، لیکن مولانا برکات احمد صاحب کی روایت کے مطابق خلاصہ اس کا یہی تھا کہ فتنے کے اس زمانہ میں

"دین پر قائم رہنا علم معقول حاصل کئے بغیر دشوار ہے"[1]

---

[1] مفتی مبارک علی صاحب دام مجدہ نے اپنے ایک نوازش نامہ میں جو فقیر کے نام انہوں نے لکھا تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

گویا خود "دین" پر استقامت کے لئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ "عقلیات" کے مطالعہ کی ضرورت محسوس فرماتے تھے، اور کیسی ضرورت کہ علم دین کے طالب کو عقلیات کے مطالعہ کا صرف مشورہ ہی نہیں دیا جاتا تھا بلکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دعا تک اسی کیلئے کی گئی ۔

اور یہ روایت تو خیر مفتی مبارک علی صاحب کی ہے خود "صاحب البیت" حضرت نانوتوی کے لخت جگر فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سے براہ راست خاکسار نے جو قصہ "انگریزی زبان" کے سیکھنے کے متعلق سنا ہے ۔ اپنی کتاب نظام تعلیم وتربیت میں تفصیلاً اس قصہ کو درج کر چکا ہوں، حاصل جس کا یہی ہے کہ حج کے سفر میں سیدنا الامام الکبیرؒ جہاز کے کسی یورپین کپتان نے مذہبی سوالات کئے جن کا جواب "ترجمان" کے ذریعہ دیا گیا، کپتان آپ کے جوابوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ ہندوستان آنے کا موقعہ ملا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا، حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ نے اس کے بعد عزم کر لیا تھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد

(گذشتہ صفحہ سے) اس روایت کا تذکرہ فرمایا ہے یہ بھی اسی خط میں ہے کہ حکیم صاحب قبلہ نے بمقام سرونج اس قصہ کو جس مجلس میں بیان کیا تھا، اس میں علی صاحب کے ساتھ حکیم فضل الرحمٰن ٹونکی بھی تھے جو مولانا برکات احمد کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، تو کہا جا سکتا ہے کہ خیر آبادی خاندان کی عقلیت کا چراغ آخر دنوں میں مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں جو روشن رہا، پس پردہ بانی دارالعلوم دیوبند کی دعا ہی سے اسے امداد ملی تھی، اس سلسلہ میں قدرتاً حضرت مرشد تھانوی کا وہ قول یاد آتا ہے جو یہی فرماتے تھے کہ ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں میرزاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں" (رسالہ النور ماہ ربیع الاول س[illegible]ھ) اور اپنے استاد دارالعلوم دیوبند کے صدر اول مولانا محمد یعقوب صاحب علماء دیوبند کے اساتذہ الاساتذہ کا یہ قول بھی وہی نقل فرماتے تھے کہ "ہم کو تو امید ہے کہ جیسے بخاری اور مسلم کے پڑھانے میں ہم کو ثواب ملتا ہے، ایسے ہی فلسفہ کے پڑھانے میں بھی ملے گا" آخر میں فرماتے کہ "ہم اعانت فی الدین کی وجہ سے فلسفہ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں (قصص الاکابر) اور صرف فلسفہ ہی نہیں، بلکہ حضرت مولانا یعقوب کا مذاق مطالعہ کے باب میں کتنا وسیع تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، فرمایا کرتے تھے، کہ میاں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو، تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہئے، اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی" (قصص) سچ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں کا مطالعہ صحیح معنوں میں وہی کر سکتے ہیں اور وہی ان کی تصنیفات سے مستفید ہو سکتے ہیں، جنہوں نے کسی نہ کسی حد تک عقلی علوم کا مطالعہ کیا ہو ۔

ہندوستان پہنچکر میں خود انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کروں گا۔ حضرت نانوتویؒ کا احساس تھا کہ ترجمان کے بغیر براہ راست تقریر سے کپتان زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔

مطلب جس کا یہی ہو سکتا ہے کہ دوسروں تک دین کی دعوت کو پہنچانے کیلئے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی حضرت والا نے اپنے "دینی مجاہدات" کی فہرست میں شامل کر لیا تھا، اور حج سے واپسی کے بعد ہی آپ کا وقت پورا نہ ہو جاتا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کا یہ عزم پورا ہونے سے رہ جاتا۔

آپ ہی بتائیے کہ "مذکورہ بالا معلومات" جن کا ذکر متن اور حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ ان سے واقف ہونے کے بعد کیا علماء دیوبند کی طرف "تنگ نظری" کے الزام کے عائد کرنے کی اب بھی کوئی جرأت کر سکتا ہے۔ مولانا سید محمد میاں نے اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں حضرت کو بھی کمال حاصل تھا، کسی فن کی کوئی کتاب ملی، اسکو شروع سے آخر تک ایک بار ضرور مطالعہ فرمالیا۔"

یہ اطلاع بھی دی ہے

"آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی۔"

غالباً جدید سائنس یہ وہی ابتدائی کتاب ہے، جسے بیروت کی یونیورسٹی نے عربی زبان میں تالیف کر کے شائع کیا تھا، یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے، کہ

"اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہئے۔"

۲۲۲ حصہ پنجم

جتنی مدت دارالعلوم دیوبند کے قیام پر اب تک گذر چکی ہے۔ اس کے اول وسط آخر ہر دور میں اس تعلیمی ادارہ سے تعلق رکھنے والی ذمہ دار ہستیاں اپنے جن احساسات و تاثرات کو ظاہر کرتی رہی ہیں چاہئے تو یہی تھا کہ ان کے مطابق کچھ عملی نمونے بھی پیش ہوتے۔ لیکن ایسا کیوں نہ ہوا۔ اس کا کیا جواب دیا جائے مسلمانان ہند کے تقدیری کرشموں میں اس کو بھی شامل کر لیجئے۔

ایک یہی کیا، دارالعلوم دیوبند کو ہندگیر جامعہ بنانے کے لئے، یہی نہیں کہ ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے طلبہ کو مدرسہ میں داخل کر کرکے ملک کے ہر حصہ میں پھیلانے کا کام جو کیا گیا، اور بحمد اللہ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اس کے سوا بھی جہاں تک میرا خیال ہے "سیدنا الامام الکبیر کے زمانہ میں جس کوشش کا آغاز ہو چکا تھا، کرکچھ بھی اس کو آگے بڑھانے کا ارادہ کیا جاتا، تو غالباً ہندوستان کی عام یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں دیوبند ہی کا جامعہ ایسا جامعہ بن جاتا، جس کی براہ راست نگرانی میں بے شمار مدارس ہر ہر صوبہ اور صوبہ کے ہر ضلع، ضلع کے ہر تعلقہ میں چاہیئے توہی تھا کہ قائم اور جاری نظر آتے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند میں مدرسہ کے قیام کے کل دو سال بعد اس قصبہ کے ضلع کا جو صدر مقام تھا، یعنی سہارنپور، وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی، سنہ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں سیدنا الامام الکبیر کی جو تقریر جلسہ تقسیم اسناد وانعام میں ہوئی تھی، اسی تقریر میں سہارنپور کے اسی عربی و دینی مدرسہ کا ذکر فرماتے ہوئے، ارشاد ہوا تھا،

"مخدوم العلماء و مطاع الفضلاء مولٰنا سعادت علی سہارنپوری مرحوم کو خیال مدرسہ جس کے باعث اہل سہارنپور نے کمر ہمت باندھ کر دوسرا چشمہ فیض علم برپا کیا۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا تھا،

"آج وہ مدرسہ اس مدرسہ کی ہم جہت ہے۔"

ہم جہتی کی تشریح اسی کے بعد ان الفاظ میں کی گئی تھی،

"غرض اصلی اس مدرسہ سے بھی یہی تعلیم علوم دین ہے۔ گویا یہ دونوں ایک دریا کے دو گھاٹ ہیں، جن پر ہزاروں تشنہ لب آتے جاتے ہیں، اور اپنی لیاقت کے موافق اپنا حصہ لے جاتے ہیں، اس نعمت غیر مترقبہ کا شکر کس زبان سے کیجئے۔" روداد ص ۱۳ بابت ۱۲۹۲ھ

اور ایک سہارنپور ہی کی خصوصیت نہیں ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ دیوبند میں قیام مدرسہ کے بعد روہیل کھنڈ کی متعدد چھوٹی بڑی آبادیوں میں تدریجاً عربی مدارس کے گویا جال ہی ایسا معلوم ہوتا ہے،

بچھے چلے جاتے ہیں۔ مظفر نگر، مراد آباد، رڑکی، خورجہ، منگلور، نگینہ وغیرہ میں آگے پیچھے، مدرسے جو قائم ہوئے، اور بحمداللہ اس وقت تک ان میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی شکل میں اب تک باقی ہیں، ان کی تاسیس زیادہ تر سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے چشم و ابرو کے اشاروں ہی کی رہین منت ہے۔ نئے قائم ہونے والے ان مدرسوں کے ساتھ حضرت والا کے غیر معمولی تعلق و توجہ کی نوعیت کیا تھی، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ نگینہ میں عربی کا مدرسہ جو قائم ہوا تھا، اور صدارت کیلئے حضرت والا ہی نے اپنے تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہی کا انتخاب فرمایا تھا، کچھ دن بعد اپنے ایک خط میں مولانا فخر الحسن مرحوم نے حضرت نانوتوی کو خبر دی کہ مدرسہ باشندگان نگینہ کی ٹاپڑ ٹائیوں کا شکار بنتا چلا جا رہا ہے، شاید یہ بھی لکھا کہ ان حالات میں اب میرا قیام نگینہ میں مشکل ہے، اسی کے جواب میں حضرت والا کے قلم سے جو الفاظ نکلے ہیں، انہیں پڑھئے، جواب کی زبان جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا، فارسی تھی، ارقام فرمایا گیا تھا کہ

"باقی باطلاع تزلزل بنا مدرسہ نگینہ بدو وجہ رنج دارم، یکے از طرف آں عزیز، دوم از طرف اہل نگینہ، کہ چہ کم حوصلگی کردند"

لہجہ اس کے بعد کافی تند و تیز ہو جاتا ہے، بے ساختہ نوک قلم سے یہ فقرہ نکل پڑا ہے۔

"آہے ہر نعمتے کہ بے سابقہ جد و جہدی رسد تا قدر شناساں ہمیں ساں ضائع می کنند"

بے چین ہو کر اپنی قلبی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا

"یارب! ایں چہ زمانہ است کہ از شرفاء فہم برگرفتند"

آخر میں نگینہ کے ان ہی شرفاء کے مرض کی تشخیص ان الفاظ میں فرماتے ہوئے کہ

"چوں بنظر غور بنگرم، ایں ہمہ نیرنگ بار بے نیازی ست، صدق رسولہ الکریم "یرفع العلم"

مطلب یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے علم کا جو نیا اور قیمتی سرمایہ مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا، اس کی ضرورت کا احساس لوگوں میں باقی نہیں رہا ہے، اسلئے باور کر لیا گیا ہے کہ مسلمان علم کی

اس نبوی سرمایہ سے بے نیاز اور مستغنی ہو چکے ہیں۔ مشہور حدیث جس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ وقت ایسا بھی مسلمانوں پر آئے گا کہ نبوت کی راہ سے علم کی جو دولت ان کو ملی تھی دینے والا اس کو واپس لے لے گا' وہی پیشگوئی پوری ہو رہی ہے' گویا علم ہی مسلمانوں کو چھوڑ رہا ہے' لیکن وہ سمجھ رہے ہیں' کہ ہم اس کو چھوڑ رہے ہیں۔ آخر میں نگینہ والوں کو اسی خط میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ

"بظاہر چناں می نماید کہ اگر ایں خوان نعمت را از نگینہ خواہند برداشت باز نخواہند گسترانید

انا للہ وانا الیہ راجعون" ص۲ مکتوب یازدہم (مجموعہ قاسم العلوم)

شاید یہی دھمکی کارگر ثابت ہوئی' اسی کا نتیجہ ہے' کہ مدت دراز تک نگینہ کا یہ مدرسہ قائم رہا' اور نگینہ والے کسی نہ کسی طرح اس کو چلاتے ہی رہے۔

بہر حال قصبہ دیوبند کے سوا قرب و جوار کی چھوٹی بڑی آبادیوں میں مدرسے جو قائم ہو رہے تھے' آج تو عموماً یہ مدرسے جداگانہ ہستی' اور مستقل وحدت کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن قدیم رودادوں کے جائزے سے اس کا انکشاف ہوتا ہے' کہ کافی مدرسے ان میں ایسے بھی تھے' جو باضابطہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ اسی طرح ملحق تھے' جیسے جدید عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کے ساتھ مختلف شہروں میں قائم ہونے والے کلیات اور کالج ملحق ہوا کرتے ہیں۔ ان الحاقی تعلیم گاہوں کی تعلیم و نصاب' مدرسین کا تقرر' ان کے امتحانات' ان کی آمد و خرچ کا حساب و کتاب' یہ اور اس قسم کے سارے متعلقہ امور براہ راست دارالعلوم کی نگرانی قائم تھی' دستور یہی تھا کہ دارالعلوم کی سالانہ روداد کے ساتھ ان الحاقی مدارس کے نتائج امتحانات' اور آمد و خرچ کے حسابات بھی بطور ضمیمہ التزاماً شریک ہو کر شائع کئے جاتے تھے' ۱۲۹۳ھ یعنی قیام دارالعلوم کے گیارہ سال بعد پرانی رودادوں میں ایک جدید عنوان یہ ملتا ہے' یعنی

"ذکر مدارس شاخہائے مدرسہ اسلامی دیوبند"

پہلی دفعہ ۹۳ھ کی روداد میں اس عنوان کے نیچے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

اس مدرسہ کی چند شاخیں بھی بعض اہل اسلام کی ہمت سے جاری ہیں" ص۲۲

اس اجمال کی تفصیل یہ کی گئی ہے، کہ

"منجملہ ایک انبیٹھہ پیرزادگان، ضلع سہارنپور میں، اور دو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اور شہر مظفر نگر میں اور ایک گلاوٹھی، ضلع بلند شہر میں ہے"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نئے قائم ہونے والے عام مدارس میں سے دس گیارہ سال کی مدت میں پانچ مدرسے تو ایسے تھے جن کا باضابطہ قانونی شکل میں الحاق مرکز یعنی دارالعلوم سے ہو چکا تھا، آگے ہر مدرسہ کے متعلق تفصیلی طور پر بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کس مدرسہ میں امتحان لینے کے لئے مرکز نے اپنے یہاں سے کن کن مدرسین کو بھیجا۔ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی، اس کا پتہ اسی سے چلتا ہے، کہ بجائے عام مدرسین کے عموماً امتحان لینے کے لئے دارالعلوم کے صدر اول مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس تشریف لے جاتے تھے، ۱۲۹۳ھ کی روداد میں گلاوٹھی کے مدرسہ کے متعلق لکھا ہے کہ

"مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول نے بہمراہی مہتمم مدرسہ دیوبند اس مدرسہ کا امتحان لیا" ص۴۳

اسی طرح انبیٹھہ کے مدرسہ کے امتحان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس مدرسہ کا امتحان سالانہ بھی جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول مدرسہ دیوبند نے لیا" ص۴۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی، بلکہ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں "اطلاع" کے عنوان سے الحاقی مدارس کے تذکرے کے بعد ایک اعلان بھی شائع کیا گیا تھا، جس میں درج تھا کہ

"ارباب مشاورت مدرسہ دیوبند کے نزدیک جن کے سپرد اب ان مدارس (یعنی الحاقی مدارس) کا امتحان وغیرہ رکھا گیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اگر مہتمان شاہجہاں مذکور اپنے اپنے مدارس کے چندے سے تھوڑی تھوڑی امداد فرمائیں، تو ان مدارس کے امتحان اور نگرانی تعلیم کے لئے ایک گروہ اور مقرر کیا جائے، جو ماہوار یا دوسرے مہینے جیسا کہ اتفاق پڑے، ان مدارس کا امتحان لیا کرے، اور جو کسی قسم کی ابتری یا خرابی دیکھا کرے، تو اس کے دور کرنے کی

حسب رائے مہتمان اس کی تدابیر کیا کرے" ص۱۳

اس کا پتہ تو نہ چلا کہ الحاقی مدارس کے مہتمموں پر اس اعلان اور مشورہ کا ردعمل کیا ہوا، لیکن بہرحال اس سے سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کا ایک ایسا پہلو تو سامنے آتا ہے، جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ سرکاری مدارس کی نگرانی کے لئے جیسے انسپکٹروں کا تقرر حکومت کرتی تھی، چاہا جاتا تھا کہ اس کے مقابلہ میں آزاد تعلیم کا متوازی نظام قائم کر کے اس آزاد نظام تعلیم کے تحت چلنے والے مدارس کی نگرانی کیلئے بھی مرکزی دارالعلوم کی طرف سے بھی انسپکٹروں کا تقرر کیا جائے، اسی لئے خواہش کی گئی تھی، کہ ہر الحاقی مدرسہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ مرکزی خزانہ میں داخل کرے۔

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ خبر انہی رودادوں میں یہ بھی درج کی گئی ہے، کہ مشہور قصبہ کیرانہ میں بھی مدرسہ قائم کر کے مرکز سے اس کا الحاق کیا گیا تھا۔ عام چندے کے علاوہ وہاں کے باشندوں سے آمدنی حاصل کرنے کی یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی، جو روداد میں بایں لفظ درج ہے، کہ

"یہاں کے رقبہ میں چاہ بکثرت ہیں، اگر سر چاہ ایک من غلہ مقرر کیا جائے تو بہتر ہے، چنانچہ اس پر اکثر اصحاب راضی ہو گئے ہیں" ص۶ روداد ۱۲۹۴ھ

اس تجویز کا ذکر کر کے دارالعلوم کی روداد میں باشندگان کیرانہ کو توجہ دلاتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ

"اگر یہ بات چل نکلی، تو پھر دیکھو کہ اس مدرسہ کا کام کس خوبی سے چلتا ہے، اور کیسے کیسے پھل پھول لگتے ہیں"

آخر میں یہ لکھتے ہوئے کہ "اب خدمت میں جملہ رؤسا قصبہ کیرانہ، و نواح کیرانہ عرض ہے" یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ

"علم سیکھو سکھاؤ، کہ علم ہی دونوں جہان کی کنجی ہے" ص۶

الغرض الحاقی مدارس کی آمدنی سے جہاں چاہا گیا تھا، کہ مرکزی دارالعلوم کے خزانہ میں حسب استطاعت کچھ داخل کریں، وہیں ان الحاقی مدارس کی امداد پر بھی لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ سرکاری مدارس کو حکومت اور حکومت کے خزانہ کی پشت پناہی حاصل تھی، اور

یہاں جو کچھ بھی تھا، سب کا دار و مدار رضا کارانہ خدمات پر تھا، سیدنا الامام الکبیر کے بعد مرکز نقل پر جمع کرنے والی قوت باقی نہ رہی، نئے مدارس کا الحاق تو آپ کے بعد کیا عمل میں آتا۔ اپنے الحاق کو تسلیم کرنے والوں نے (پرانی درسگاہیں جو منظور کر چکی تھیں) بہ تدریج مضمحل ہوتے ہوئے دارالعلوم سے ان کا رشتہ بھی اتنا کمزور ہو گیا، کہ اب رسمی تعلق سے زیادہ شاید ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔[1]

بہر حال تاسیس دارالعلوم کے ابتدائی سالوں ہی میں یہ نصب العین سامنے تھا کہ سارے ہندوستان کے مناسب مقامات پر قومی خزانہ سے دینی تعلیم گاہوں کا جال اسی طرح بچھا دیا جائے، جیسے حکومت کے خزانے سے دنیاوی مدارس ہر جگہ کھولے جا رہے تھے۔ آپ کو مدرسہ کے تیسرے سال یعنی ۱۲۸۵ھ ہی کی روداد میں یہ عبارت مل جائے گی، روداد کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے دعا و شکریہ کی سرخی قائم کر کے منجملہ دوسری باتوں کے یہ اطلاع درج کرتے ہوئے کہ

"نہایت خوشی اپنی ظاہر کرتے ہیں۔ اس امر پر کہ اکثر حضرات باہمت نے اجراء مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقامات مختلفہ دہلی و میرٹھ و خورجہ و بلند شہر و سہارنپور دکن وغیرہ جاری فرمائے" اور دوسری جگہ مثل علیگڈھ وغیرہ اس کار خیر کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔[2]

آخر میں جامعاتی نصب العین کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ

"امید کرتے ہیں، کہ ہم کو بھی وہاں کے حالات و حساب و کتاب سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں کے مہتمم کرتے ہیں، مطلع فرماتے رہیں، تاکہ جو عمدہ انتظام ان کے مدارس میں تجویز ہو، وہ یہاں بھی جاری کئے جایا کریں، اور یہاں سے وہاں، اور نتیجہ اس نیک تدبیر کا یہ ہوگا، کہ انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جاویں گے"۔ ص۲۳ روداد ۱۲۸۵ھ

---

[1] دارالعلوم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے خاکسار جب وہاں مقیم تھا، آج سے تیس چالیس برس پہلے کی بات ہے اس وقت تک اتنا اثر باقی تھا کہ چند خاص مقامات کے مدارس خصوصاً تھانہ بھون ڈابھیل، بریلی، نگینہ وغیرہ کے مدرسوں سے ہر سال چند ممتحنوں کو طلب کیا جاتا تھا، کبھی کبھی خاکسار بھی جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب اب یہ رسم قدیم باقی ہے، یا یہ بھی ختم ہو گئی ۱۲ (بحمداللہ اب بھی باقی ہے، اور اس میں وسعت بھی ہو گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ)

آخری الفاظ یعنی "انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جاویں گے" اسی کو میں جامعاتی نصب العین کہتا ہوں۔

قومی سرمائے سے چلنے والے مدارس کو نظم و ضبط کے وحدانی قالب میں ڈھال دیا جائے، اس دعوے کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ واضح شہادت اور کیا مہیا ہو سکتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتداری قوت کی پشت پناہی سے محرومی کا احساس کر کے اسی پر لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا کہ بجائے لاگ ڈانٹ اور رقیبانہ تعلقات کے قومی مدارس میں ربط و ضبط کے مراسم ہی کو باقی رکھا جائے، اور ہر تعلیم گاہ کوشش کرے کہ جس مدرسہ میں مفید طریقہ کار اختیار کیا جائے، بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری کے دوسرے مدارس بھی اسی کو اختیار کریں۔

اب یہ واقعات ہی بتا سکتے ہیں کہ کرنے والوں نے کس حد تک ان قیمتی مشوروں اور تجویزوں پر عمل کیا۔ پیش کرنے والا وہ سب کچھ پیش کر کے جا چکا تھا۔ سوجھ والوں کو وہ سوجھا یا نہ سوجھا، ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری ان ہی لوگوں پر عائد ہو سکتی ہے، جن کے ہاتھوں میں درس نظامی کی باگ آئندہ سرزمین ہند کے ان مدارس کی آئی۔

تعلیم ہی کے سلسلہ میں ایک نئے اقدام کا پتہ ان ہی پرانی رودادوں سے چلتا ہے، مشکل کے حل ہو جانے کے بعد تو اب اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہیں ہو سکتا، لیکن جس زمانہ میں یہ اقدام کیا گیا تھا، تعلیمی و تدریسی نقطۂ نظر سے شاید وقت کا وہ نازک ترین مسئلہ تھا۔

مطلب یہ ہے کہ مطابع اور پریس سے پہلے مسلمانوں میں ایک مستقل نظام "نقل کتب" کا قائم تھا، میں نے اپنی کتاب "مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت" میں اس مسئلہ کے متعلق کافی معلومات جمع کر دی ہیں۔ حاصل یہی ہے کہ شہروں اور قصبوں تک میں "وراقیت" اور "نساخیت" یعنی کتابوں کو نقل کر کر کے بیچنے والوں کا ایک گروہ پایا جاتا تھا۔ جو نادر سے نادر کتابوں کے متعلق اپنے پاس معلومات رکھتا تھا کہ کہاں تی ہیں۔ ان کی نقل کس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے، ان امور کی واقفیت کے ساتھ اس کا سامان کئے رہتا تھا کہ فرمائش کے ساتھ ہی ضرورت مندوں تک وہ کتاب نقل کر کے پہنچا دی جائے، معتدل قیمتوں پر

بڑی سے بڑی کتابیں بآسانی ان وراقوں اور نساخوں کے ذریعہ سے مہیا ہو جاتی تھیں، اندازہ کے لئے یہی کافی ہو سکتا ہے کہ جہاں قرآن مجید کا ہدیہ پانچ پانچ سو تنک بھی تھا، وہیں صحیح تاریخی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ عام معمولی نسخہ ایک ایک تنکہ (روپیہ) میں بھی مل جاتا تھا، جو شاید آج بھی قابل تصور مشکل ہی سے ہو سکتا ہے، اسی کتاب میں مدراس کے مشہور انگریزی روزنامہ "ہندو" کے حوالے سے آپ کو یہ نوٹ بھی ملے گا، یعنی ہندوستان میں پریس کا رواج کب سے ہوا، اس کا یہ جواب دیتے ہوئے کہ

"ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۵۰ء میں چھپ چکی تھی"

گویا آج سے تقریباً چار سو سال پہلے ہی طباعت کا رواج حالانکہ اس ملک میں ہو چکا تھا، مگر باایں ہمہ اسی نے لکھا ہے کہ

"ملک کے مختلف حصوں میں چھاپے خانے بہت کم کھل سکے"

جس کی وجہ ذیل یہ بیان کرتا ہے کہ

"ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ترقی میں سست رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی کہ مشہور کتابوں کی نقل کیلئے خطاطوں کا انتظام مغلوں نے کر رکھا تھا" (اخبار ہندو مدراس ۱۹۴۳ء)

مغلیہ عہد کا یہی انتظام مغلوں کی حکومت کے ختم ہونے کے ساتھ درہم و برہم ہو گیا۔ لیکن اس کی جگہ نئی حکومت کی سرپرستی میں یوں قائم ہونے کو تو اس ملک میں مطابع قائم ہونے لگے تھے۔ لیکن عام مشرقی زبانوں کی طباعت و اشاعت کی طرف جیسا کہ چاہئے تھا، حکومت نے کافی توجہ نہ کی سا انگریزوں کی ابتدائی عہد حکومت میں دفتر چونکہ فارسی زبان ہی میں تھا، اس لئے فارسی زبان کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی زیادہ متاثر نہ ہو سکا، اور اسی زبان کی خصوصاً درسی کتابیں ہی زیادہ ان مطبعوں میں چھپتی رہیں۔ فارسی کی جگہ انگریزی کے ساتھ حکومت نے اردو کی طرف اپنی توجہ جب مبذول کی، تو اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا رواج بھی تھوڑا بہت ہوا، لیکن عربی زبان اور اسی زبان میں مسلمانوں کی جو دینی و علمی کتابیں تھیں، ان کے چھاپنے چھپوانے کا محرک اگر کچھ ہو سکتا تھا، تو مسلمانوں کا مذہبی جذبہ، لیکن مسلمانوں کی عمومیت غریب عربی سے ناواقف تھی، لاکھوں لاکھ میں ایک دو ٹوٹے پھوٹے مولوی

غریبوں کی طلب کی تکمیل کے لئے کسی کو کیا ضرورت تھی کہ عربی زبان کی ان کتابوں کے چھاپنے میں اپنا سرمایہ لگائے۔

الغرض "وراقیت" یعنی نقل نویسی کے ذریعہ کتابوں کی فراہمی کا قصہ ایک طرف ختم ہوا، اور طباعت کے لئے پہلی شرط یہ تھی کہ جو کتاب چھاپی جائے، اس کے طلب کرنے والوں کی تعداد کافی ہو، لیکن ناکافی تعداد بھی جس چیز کے خواہش مندوں کی بازار میں بآسانی فراہم نہیں ہو سکتی تھی، خود سوچئے اس کے چھاپنے پر روپے صرف کرنے، محنت برداشت کرنے کے لئے کون آمادہ ہوتا، مگر دینی تعلیم کی عام اشاعت میں عربی زبان کی کتابوں کا مسئلہ کافی اہم تھا، اسی سے اندازہ کیجئے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد دوسری روداد ۱۲۸۴ھ کی جو شائع ہوئی تھی، اس میں اس کی شکایت کرتے ہوئے کہ

"ترقی خواندگی میں بالخصوص یہ امر بھی حارج رہا کہ کتب درسیہ خاصۃً کتب ادب انشاء عرب جس کی تعلیم بیش تر مدنظر ہے، بقدر کفایت بہم نہ پہنچ سکیں" صلا

اس سے جہاں ضمناً اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ادب عربی و انشاء کی طرف دارالعلوم کی تاسیس کی ابتدائی زمانے میں خاص توجہ کی جاتی تھی، آگے جن کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی اطلاع دی گئی ہے ان میں متنبی اور نفحۃ الیمن جیسی عام کتابیں بھی ہیں۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، کہ نہ دستیاب ہونے والی کتابوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"بالکل بہم نہ ہو سکیں"

اور یہ کہ ایسی دشواری ہے کہ

"رفع کرنا اس حرج کا اختیار مہتمان مدرسہ و طلبہ سے باہر ہے" صلا روداد ۱۲۸۴ھ

مطلب جس کا یہی ہوا کہ ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے جب "نفحۃ الیمن" اور "متنبی" وغیرہ جیسی عام متداول کتابوں کا بندوبست کرنا طلبہ ہی کے لئے نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام و انتظام کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ اللہ اللہ وقت کی نزاکتوں کا کچھ ٹھکانہ تھا۔

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ حالات کی ان غیر معمولی نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے یہ تجویز کس نے پیش کی

لیکن اسی سال کی روداد میں ہمیں ایک تجویز ملتی ہے، درسی کتابوں کی نایابی و کمیابی کی دشواریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ لکھ کر کہ

"یہ مشکل بہ توجہ تاجران کتب، و اہل مطابع حل ہو سکتی ہے"

گویا ملک کے اسی خاص طبقہ کو متوجہ کر کے تجویز بایں الفاظ پیش کی گئی ہے۔

"یعنی ان کتب کو بکثرت چھاپیں، اور فروخت کریں، اور کسی قدر وقف خرچ مدرسہ بھی فرما کر شامل نفع دین و دنیا ہوں"

جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ تجویز کس کی پیش کی ہوئی ہے، روداد میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن دارالعلوم کا سارا کاروبار جس کی نگرانی اور مشورے کی روشنی میں انجام پا رہا تھا۔ بظاہر خیال یہی گذرتا ہے کہ ان ہی کی طرف[1] سے یہ تجویز پیش کی گئی ہوگی، اور ان ہی کے اشارے سے مہتمم صاحب مدرسہ نے روداد میں اس کو غالباً درج کیا ہے۔ یوں بھی سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا مطابع سے خاص تعلق تھا، آپ کی عمر کا اکثر و بیشتر زمانہ گذر چکا کہ مطابع میں تصحیح کتب کی خدمت میں گذرا تھا بلکہ اسی تجربے کو پڑھ کر میرا ذہن خدا جانے کن کن مسائل کی طرف منتقل ہونے لگا۔ علمی خدمات کے سلسلے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا عربی کتابوں کے چھاپہ خانوں کی خدمت کو قبول کرنا، غدر سے پہلے زیادہ تر آپ کا اسی مشغلہ میں مصروف رہنا، فتنہ کے فرو ہونے کے بعد عربی خط نسخ کے سب سے بڑے مرکزی جگت استاذ نزہت رقم یعنی منشی ممتاز علی صاحب مرحوم کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلقات جن کا ذکر کر چکا ہوں، ان ہی منشی ممتاز علی مرحوم کا

---

[1] مجھ سے بلا واسطہ مولانا نظام الدین معقولی حیدرآبادی مرید خاص حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ نے بیان کیا جب میں حیدرآباد میں مقیم تھا، کہ ان سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم نے فرمایا " (نیز میرے والد صاحب نے بھی مجھ سے یہی واقعہ دوسرے عنوان سے بیان فرمایا) کہ حضرت نانوتوی" کی حیات میں دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا تھا بلکہ درحقیقت حضرت نانوتوی فرماتے تھے۔ کیونکہ انتظام کی جو چیز حضرت نانوتوی کے قلب پر وارد ہوتی تھی، اس کا عینہ انعکاس میرے قلب پر ہو جاتا تھا، اور جب اس کام کو کر گذرتا تھا۔ میرے کام کر لینے پر حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے، میرا دل یہی چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ پھر یہی واقعہ میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے بھی سنا، آگے متن میں بھی اسی روایت کا حوالہ آ رہا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

قائم کردہ وہ مطبع تھا جو بعد کو مطبع مجتبائی دہلی کے نام سے مشہور رہا" اور مولوی عبدالاحد مرحوم جیسے آدمی نے یہ مطبع خریدا، جس سے بالآخر وہ دلی کے رئیسوں میں شمار کئے گئے۔ نصف صدی تک عربی مدارس کی درسی کتابوں کے طبع و اشاعت کا کام منشی ممتاز علی مرحوم کا قائم کردہ یہی مطبع مجتبائی انجام دیتا رہا، منشی صاحب کے دو صاحبزادے منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی اپنے والد کے بعد خط نسخ عربی کے سارے ہندوستان میں استاذ الکل سمجھے گئے۔ یاد ہوگا کتابی کاروبار سے براہ راست تعلق رکھنے والے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کے نور چشم مولانا حفیظ الرحمٰن کے مکتوب گرامی سے خط نسخ کے ان ہی دونوں کاتبوں (منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی) کے متعلق یہ شہادت نقل کی گئی تھی کہ ان کے

"سینکڑوں تلامذہ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں"

ہندوستان میں عربی خط نسخ کی طباعی سرگذشت کی ان مجمل معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ خود سوچئے مندرجہ روداد کی تجویز کے ان الفاظ کو جس کے مخاطب ارباب مطابع تھے یعنی

"ان کتب (عربی کی درسی کتب) کو بکثرت چھاپیں"

اگر تجویز کے اس جزء کو سیدنا الامام الکبیر کی طرف میرا ذہن منسوب کرتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ میرے دل میں اس قسم کے خیالات جو آرہے ہیں، کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جیسے دینی علوم کی درسًا و تبلیغًا اشاعت کا ذریعہ سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک کو دارالعلوم دیوبند قائم کرکے حق سبحانہ و تعالیٰ نے بنایا، کیا عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں بھی کام لینے والے نے آپ ہی سے کام لیا، وہی ہندوستان جہاں نفحۃ الیمن، اور متنبی جیسی عام کتابیں بھی ڈھونڈھے نہیں ملتی تھیں، وہیں پھر عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام طول و عرض اور عمق میں جتنا بڑھا، پھیلا پھولا، اور جو کچھ تماشا بھی دیکھا گیا، اور ۱۹۴۷ء تک جب تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، عروج و ارتقاء کے ان تماشوں سے شمال و جنوب کے ملاتے پٹے ہوئے تھے۔ عربی کی ضخیم ضخیم کتابیں جو کسی خالص اسلامی ملک میں بھی نہ چھپ سکیں، ہندوستان میں وہ چھاپی جارہی تھیں، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس کی تہ میں اوروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی

توجہ وہمت کی قوت پوشیدہ نہ تھی۔ واقعات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑ کر دیکھئے۔ شاید واقعہ آپ کے سامنے بھی اسی شکل میں آجائے، جیسے میرے سامنے آرہا ہے۔

بہرحال یہ تو تجویز کا پہلا حصہ تھا، یعنی ارباب مطابع کو کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ دوسرا جزء اس کا جو یہ تھا کہ اپنی چھاپی ہوئی کتابوں کے کچھ نسخے بطور وقف مدرسہ میں بھی داخل کریں۔ بظاہر اس وقت یہ ایک معمولی تجویز تھی، لیکن جس کا جی چاہے آج دارالعلوم دیوبند میں آکر معائنہ کر سکتا ہے کہ تجویز کے اسی ابتدائی تخم نے کتنے بڑے تناور درخت کا قالب اختیار کر لیا۔ آج اسی کی چھاؤں میں علم کے غریب مسافروں کی کتنی بڑی تعداد آرام کی زندگی گذار رہی ہے۔ نیچے سے اوپر تک بیسیوں جماعتوں، اور ان جماعتوں میں سو سو اور اس سے بھی کہیں زیادہ بہت زیادہ تعداد شریک ہوتی ہے۔ نہ جانے والوں کو سن کر تعجب ہوگا کہ اول سے آخر تک مدرسہ میں تعلیم پانے والے طلبہ میں مشکل ہی سے انگلیوں پر گنے جانے والے ایسے افراد ہونگے جو اپنی خریدی ہوئی کتابیں پڑھتے ہوں، بلکہ پڑھنے کے لئے ہر جماعت کے طالب علموں کو مدرسہ ہی کی طرف سے عاریۃً کتابیں دی جاتی ہیں، پڑھنے کے بعد طلبہ ان کو پھر مدرسہ میں واپس کر دیتے ہیں۔ ان کتابوں میں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ جہاں بعض کتابیں روپے دو روپے کی ہوتی ہیں۔ وہیں ان میں ایسی کتابیں بھی ہیں، جن کی قیمت اس وقت بازار میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپے سے کم نہیں ہے۔ یقین مانئے کہ مدرسہ کی طرف سے مفت کتابوں کی فراہمی کا نظم اگر نہ قائم کیا جاتا، تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے، کہ تعلیم و تدریس کے سلسلے کو جاری رکھنے کی شکل ہی کیا ہوتی۔ عربی مدارس میں پڑھنے والے طالب العلموں کی مالی حالت یقیناً ان کتابوں کی خریداری کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا مسئلہ تھا۔ جس کے حل کی صورت شروع ہی میں سوچ لی گئی تھی، بحمد اللہ اس میں کامیابی ہوئی۔ اور بہت غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ دارالعلوم کا کتب خانہ اسی لئے دو مستقل شعبوں پر منقسم ہے۔ ایک شعبہ صرف ان ہی کتابوں کا ہے جس سے ہر سال طالب العلموں کو عاریۃً پڑھنے کے لئے کتابیں دی جاتی ہیں۔ اسی لئے عموماً اس شعبہ میں صرف درسی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ایک ایک درسی کتاب کے

نسخے سو سو اور سو سو سے بھی زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں، اور یہی شعبہ دارالعلوم کے کتب خانہ کا خصوصی شعبہ ہے۔ باقی دوسرا شعبہ عام کتابوں کا ہے۔ الحمدللہ کہ اس وقت تک اس شعبہ میں بھی پچاس ساٹھ ہزار کے لگ بھگ کتابیں جمع ہو چکی ہوں گی۔ اس شعبہ کی بنیاد بھی ابتدا ہی میں ڈال دی گئی تھی، مذکورہ بالا تجویز کے آخر میں جو یہ فقرہ ہے کہ

"تاکہ کتبخانہ کی توجہ سے جن کی کتابیں صندوق اور الماریوں میں رکھی ہوئی وقف خورش کرم دیمک ہیں، یہ شکل آسان ہو سکتی ہے"

الحمدللہ کہ یہ تحریک بھی کامیاب ہوئی، اور وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف حصوں سے دارالعلوم میں چھوٹے بڑے کتب خانے ان علمی خاندانوں سے منتقل ہو ہو کر پہنچتے رہے، اور پہنچ رہے ہیں۔ جن میں اسلامی علوم کا شوق باقی نہیں رہا ہے۔ امید ہے کہ "وقف خورش کرم دیمک" کی جگہ دارالعلوم کے کتب خانے میں وقف کر کر کے اپنے بزرگوں کی علمی یادگاروں کی حفاظت کی اس تدبیر سے آئندہ بھی لوگ غفلت نہ برتیں گے۔

اسی تجویز کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے وقف اور ہبہ کرنے ہی کا مشورہ نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ بجائے وقف کے توجہ دلائی گئی تھی کہ مدرسہ کی علمی خدمت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ "کرم دیمک والی الماریوں اور صندوقوں" سے نکال نکال کر دارالعلوم کے کتب خانے میں امانۃً و عاریۃً اپنی کتابوں کو لوگ محفوظ کرا دیں۔ یہاں ان کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی، اور اساتذہ و طلبہ کو ان کتابوں سے استفادہ کا موقع بھی ملتا رہے گا، مہتمم صاحب نے تجویز کے بعد اسی روداد میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"جن حضرات نے اس شیوۂ پسندیدہ کو اختیار کر کے کتب عربی و فارسی وقف مدرسہ فرمائیں، یا عاریتاً واسطے استعمال مدرسہ کے سپرد مہتمم کیں، فہرست ان کی آخر روداد میں مندرج ہے"

لہ تاب فرنگیوں کے جال میں ہے کہ ۱۹۳۶ء تک پچاس ہزار سے زائد کتابیں کتب خانہ میں موجود تھیں۔ ۱ھ
(اب ۱۳۸۵ھ میں یہ تعداد دو ستر ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ محمد طیب غفرلہ)

جو فہرست عاریۃً دار الشفا مدرسہ میں کتابوں کے رکھوانے والوں کی درج کی ہے، اس میں سب سے پہلا اسم گرامی خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اور کافی قیمتی کتابوں کا نام لیا گیا ہے، گویا اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنت حضرت والا ہی کی جاری کی ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ قیام دارالعلوم کے ابتدائی دنوں سے کتب خانہ کے دونوں ہی شعبوں (تدریسی و غیر تدریسی) کی طرف پوری توجہ کی گئی، ہر سال کی روداد میں اس اہم علمی ضرورت کی طرف مختلف الفاظ میں مسلسل اور مؤثر اپیلیں شائع ہوتی رہیں، جن کا بحمد اللہ اچھا خاصا اثر ہوا، گویا اپنے اپنے مطبع اور تجارتی کتب خانوں کی کتابوں کے چند نسخوں کا دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں داخل کرنا رفتہ رفتہ ایک رسم اور دستور کی صورت بن گیا، انتہا یہ ہے کہ علاوہ مسلمانوں کے اس سلسلہ میں غیر معمولی فراخ دلی کا ثبوت منشی نول کشور نے پیش کیا، ۱۲۸۶ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"امداد کتب کی نسبت جو سال گذشتہ لکھا گیا تھا، بہت سے اہل ہمت نے اس طرف توجہ فرمائی اور بارسال کتب قیمتی و کارآمد مدرسہ کی امداد فرمائی۔"

آگے اسی کے بعد ہے کہ

"بالخصوص منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ تر قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بعد مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی ہے۔"

صرف اسی روداد میں نہیں، بلکہ آگے کی رودادوں میں بھی، منشی نول کشور کی توجہ خاص کا اس سلسلہ میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۲۹۰ھ کی روداد میں ان کا اور ان کے عطیہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"ارباب شورہ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریا دلی کو کام فرمایا، اور چند کتب مفیدہ سے امداد مدرسہ میں ہمت فرمائی، فہرست ان کی ضمیمہ نمبر ۲ میں مندرج ہے، ان میں کو خاص کر نسخہ قاموس کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے، اور منشی صاحب نے خاص اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے اس سال میں طبع فرمایا ہے، لائق بیان ہے۔"

آخر میں یہ الفاظ بھی درج کئے گئے ہیں کہ

"مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا۔ یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے۔" صفحہ روداد سال ۱۲۸۹ھ

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ مدت تک دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ وطلبہ اپنی دینی وعلمی ضرورتوں کو اسی ایک غیر مسلم کے کتابی عطیہ کی مدد سے پوری کرتے رہے، قرآن سمجھتے رہے، حدیثوں کے لغوی مشکلات کو حل کرتے رہے، اور یہ تھا دور قاسمی کا وہ دارالعلوم جو سرزمین ہند میں ہندوستان کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔

اور معاملہ کتابوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا، ہندوستان کا یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو زبان کے معدودے چند اخبار بعض بعض مقامات سے نکلنے لگے تھے۔ سب کو تو نہیں، لیکن ایسے چند اخبار جن کے مالک مسلمان تھے۔ ان میں بعضوں کو توفیق ہوئی، اور مدرسہ میں بھی ایک ایک کاپی اپنے اپنے اخباروں کی ہدیۃً ارسال کرنے لگے، خصوصیت کے ساتھ اس سلسلہ میں کانپور کے اخبار نورالانوار کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے مالک منشی عبدالرحمٰن مالک مطبع نظامی تھے۔ نیز "نجم الاخبار" نامی میرٹھ سے جو نکلتا تھا، اس میں مدرسہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ تائیدی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ لیکن ایک تو ان اخباروں کے مالک مسلمان تھے، اس لئے ان کی طرف سے ایک ایک کاپی مدرسہ میں اگر پیش ہوتی ہو، تو اس پر تعجب نہیں ہوتا، ماسوا اس کے ہفتہ میں ایک بار نکلنے والے اخبارات تھے۔ بلکہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ یہی منشی نول کشور جو اپنے یہاں کی مطبوعہ کتابوں سے دارالعلوم کی ہر سال امداد کرتے تھے، اور ان ہی کے مطبع سے ایک روزنامہ "اودھ اخبار" نامی نکلتا تھا۔ جو غالباً ہندوستان کا پہلا روزنامہ تھا۔ منشی نول کشور کی طرف سے یہ اخبار بھی ہدیۃً دارالعلوم میں آتا رہا[1]۔ اسی طرح دیوبند کے نواح میں ایک قصبہ بڈھانہ کے

[1] ایک فہرست بھی اسی روداد میں آنے والے اخباروں کی دی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ اودھ اخبار کے سامنے یہ اضافہ بھی درج ہے کہ

"ان کا (یعنی منشی نول کشور کا) اخبار باوجود کہ روزانہ جاری ہوتا ہے اور بیش بہا ہے، عنایت فرماتے ہیں۔"

(باقی اگلے صفحہ پر)

وہاں کے ایک منچلے تھا کہ جن کا نام راؤ امر سنگھ تھا۔ "سفیر بوڑھانہ" کے نام سے ایک اخبار بھی اسی قصبہ سے نکالا کرتے تھے۔ اور اس کی ایک کاپی مدرسہ کے نذر بھی التزاماً کیا کرتے ۱۲۹۱ھ کی روداد میں ان دونوں (اودھ اخبار اور سفیر بوڑھانہ) کا ذکر کرتے ہوئے جن الفاظ میں شکریہ ادا کیا گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ ان کو نقل کر دیا جائے۔

"شکریہ مہتمان اخبار و مطابع" کا عنوان قائم کر کے عمومی شکریہ کے بعد اسی روداد میں ہے کہ،

"جناب منشی نول کشور صاحب مالک اودھ اخبار لکھنؤ، اور جناب راؤ امر سنگھ مالک اخبار "سفیر بوڑھانہ" کا بالخصوص کہ باوجود دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں۔ مگر آفریں، صد ہزار آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں، جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں"۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، آگے کے الفاظ پڑھئے،

"اور سب صاحبوں کے حق میں اور ان کے اخبارات کے حق میں دعا خیر کرتے ہیں، کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانجات کو دم بدم ترقی عطا فرمائے"۔

اور آخر میں یہ کہ

"ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے"۔ ص ۶۳ روداد ۱۲۹۱ھ

مدرسہ دیوبند کی پہلی مجلس شوریٰ جس کے جزو و کل درحقیقت سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے، اسی مجلس شوریٰ کے "جملہ ارباب شوریٰ" کی طرف سے شکریہ اور دعا خیر کے ان الفاظ میں غور کیجئے، اور سوچئے کہ حکومت متغلبہ و متسلطہ کی بڑی سی بڑی امدادی پیشکشوں کو اپنی پوری تاریخ میں جس مدرسہ نے کبھی آنکھ نہیں لگائی، اسی کا طرز عمل اسی ملک کے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ کیا تھا، اور کس قسم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میش بہائی کے سلسلہ میں یاد آگیا، اسی اودھ اخبار کا ذکر غالب نے بھی اپنے خطوط (مندرجہ اردوئے معلی) میں کیا ہے، کہ اس کو بھی منشی جی ہدیۃً یہ اخبار دیتے ہیں، لیکن محصول ڈاک ٹکٹوں کی شکل میں بیچارے غالب کو خود بھیجنے پڑتے تھے۔

تعلق کو وہ ان کے ساتھ قائم رکھنا چاہتا تھا۔

عہد قاسمی کی ان ہی قدیم رودادوں میں "دستور العمل چندہ" یا "ذکر آئین چندہ" کا عنوان قائم کرکے پہلی دفعہ اسی دستور اور آئین کی بابت الفاظ اس زمانہ کی ہر روداد میں جو ملتی ہے یعنی

"چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اور نہ خصوصیت مذہب وملت۔"

اسی کے ساتھ ان ہی رودادوں میں چندہ دینے والوں کی فہرست میں دیکھ لیجئے اسلامی ناموں کے بابہلو بہپلو، منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہر دواری لال، لالہ بیجناتھ، پنڈت سری رام، منشی موتی لال، رام لال، سیوارام سوار وغیرہ اسمار بھی مسلسل ملتے چلے جاتے ہیں اسرسری نظر ڈال کر مثالاً چند نام جو سامنے آگئے، وہ چن لئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دیوبند مسلمانوں کا خالص دینی مدرسہ تھا، اس مدرسہ کی امداد میں کسی ملت و مذہب کی خصوصیت کو قطعی طور پر ختم کرکے مسلمانوں کے سوا ملک کے دوسرے مذہبی اقوام و طبقات کے لئے دروازہ کو کھلے رکھنے کی پہلے ہمت ہی کیسے کی گئی، اور کسی مصلحت سے لکھنے کو اگر یہ لکھ بھی دیا جاتا تھا، تو عملاً غیر مسلم اقوام کی امداد اس دینی کام میں قبول ہی کیسے کی گئی، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہوتا ہے، کہ لینے والے لینے پر کسی وجہ سے آمادہ بھی ہو گئے تھے، تو یہ جانتے ہوئے کہ دیوبند کے مدرسہ میں مسلمانوں کے خالص دینی علوم پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، غیر اسلامی دائرے کے افراد کی طرف سے امدادی رقوم کیسے پیش ہو رہی تھیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ چندہ دینے والوں میں جیسا کہ چاہئے تھا، زیادہ اور بہت زیادہ تعداد مسلمانوں ہی کی تھی، مسلمانوں ہی کا یہ مدرسہ تھا، وہ اس کی امداد نہ کرتے، تو اور کون کرتا، لیکن باایں ہمہ جو مسلمان نہ تھے، وہ اس مدرسہ کی مدد کیوں کرتے تھے۔ مزید حیرت اس پر ہوتی ہے، کہ عموماً غیر مسلم افراد کے ان چندوں کی نوعیت وقتی چندے کی نظر نہیں آتی، بلکہ دوامی چندہ دینے والوں کی فہرست میں ان میں اکثر ناموں کو ہم پاتے ہیں۔ میرے لئے یہ سارے سوالات آج معمہ بنے ہوئے ہیں۔ آج کیا ہے۔ کل کیا تھا! آج کی تاریخ کل کی تاریخ سے کیوں بدل گئی، کیسے بدل گئی اور کس حد تک بدل گئی؟

اللہ اللہ دل ان باتوں کو سوچتا ہے، اور سوچ کر دم بخود ہو جاتا ہے۔ اف!

اس گھر کو آگ لگ گئی' گھر کے چراغ سے

شاید یہ صورت جتنی خوفناک شکلوں میں آج سرزمین ہند میں پیش آئی ہے' انسانی تاریخ میں اس کی مثالیں مشکل ہی سے مل سکتی ہیں' معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا۔ فانا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری زمانہ تقریری و تحریری مناظروں اور مباحثوں میں جو گذرا' جس کی بحث آگے آئے گی' شاید اس عجیب و غریب انقلاب کے بعض پوشیدہ اسباب سے اس بحث میں پردہ اٹھایا جائے۔ اس وقت تو "دارالعلوم دیوبند" کے ساتھ آپ کے تعلقات اور آپ کی خدمات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے نزدیک جو پہلو مستحق تھا کہ اسے اجاگر کیا جائے۔ اپنی معلومات کی حد تک اس کام کو گویا پورا کر چکا ہوں۔

یاد ہوگا کہ پندرھواں سال بھی ابھی مدرسہ کا پورا نہیں ہوا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر کی سرپرستی کی برکات سے وہ محروم ہو گیا' ان پندرہ سالوں میں بھی ابتداء کے چند سال عرض کر چکا ہوں' ایسے بھی گذرے ہیں' جن کے متعلق یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ قصبہ دیوبند کا یہ مقامی مدرسہ صحیح معنوں میں براہ راست سیدنا الامام الکبیر کے فیوض و برکات سے مستفید نہ ہو سکا' نام تو حضرت والا کا شروع ہی سے خصوصی ارکان کی فہرست میں شریک تھا۔ لیکن ہندگیر جامعہ بننے کے لئے آپ کی آغوش شفقت میں بعد کو آیا' پھر حج کا سفر بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے' اسی زمانہ میں ہوا' جسمانی امراض و آلام کے ہجوم اور حملہ کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ان ہی وجوہ سے پندرہ سال کی اس مدت کو پندرہ سال سے بھی کم ہی سمجھنا چاہئے' گویا دس سے بارہ سال تک کی مدت سے زیادہ اس کا تخمینہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ اسی محدود مدت میں ضلع سہارنپور کے ایک غیر معروف قصبہ کا مقامی مدرسہ جس کے پہلے سال کی آمدنی بھر مد کی کل چھ سو انچاس (۶۴۹) روپے چار آنے (۴؍) تھی' امداد طلبہ کی مد کو نکال دینے کے بعد اصل مدرسہ کی آمدنی درحقیقت کل چار سو ایک روپیہ ہوئی تھی' کل دو مدرس یعنی ایک عربی' اور ایک فارسی و ریاضی وغیرہ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ کل بیس طالب علم شروع میں شریک ہوئے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے سارے مصارف کے بعد بھی (۲۵۵) دو سو پچپن

خروج ہونے سے باقی رہ گئے (دیکھو روداد ۱۲۸۳ھ صفحہ) سیدنا الامام الکبیر کے ظل عاطفت میں آجانے کے بعد چند سال بھی اس مدرسہ پر نہیں گذرے تھے یعنی تاسیس مدرسہ کا بارھواں سال تھا، دارالعلوم کے اول صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے، طلبہ کی تعداد جو دو سو کے قریب پہنچ چکی تھی، اسی کی طرف اشارہ کر کے آخر میں یہ اطلاع بھی حاضرین جلسہ کو دی کہ ان میں ہندوستان کے سوا

"منجملہ پردیسیوں کے ایک ملک برہما کے رہنے والے ہیں، اور تین جزائر حبشان کے یعنی سمندر تاپو کے اور ایک ملک تبت کے ۔" صفحہ روداد ۱۲۹۵ھ

حیرت ہوتی ہے، کہ اتنی مختصر مدت میں فراخنائے ہند کے طویل وعریض رقبوں کو پھلانگ کر ایک قصباتی مدرسہ کی شہرت برہما، تبت اور جزائر ہند کے باشندوں تک کیسے پہنچ گئی تھی، خصوصاً اس زمانہ میں جب نہ اخباروں، اور برقی پیغاموں کے پھیلنے پھیلانے کا عام رواج اس ملک میں عموماً اور طبقہ علماء میں خصوصاً گویا نہیں ہوا تھا۔ اسی روداد میں ایک خبر یہ بھی دی گئی ہے، کہ ہندوستان کے اسی گمنام قصبہ دیوبند اور اس کے مدرسہ کی شہرت اس عہد کے اسلامی دارالخلافہ استنبول (قسطنطنیہ) تک پہنچ چکی تھی، اور اس امتیاز کے ساتھ پہنچ چکی تھی کہ دارالخلافت کے ایک بڑے سربرآوردہ عالم علامہ احمد حمدی آفندی نے ایک کتاب

"النجوم الدراری فی ارشاد الساری"

نامی تصنیف فرمائی تھی، کتاب طبع نہیں ہوئی تھی، مصنف نے صرف چار قلمی نسخے اپنی اس کتاب کے تیار کرائے تھے، جن میں دو نسخے تو خود دارالخلافت (قسطنطنیہ) کے کتب خانے میں داخل کئے گئے تھے، اور ایک نسخہ اس کا مصر بھیجا گیا تھا، چوتھا نسخہ اس کتاب کا قسطنطنیہ میں بیٹھ کر اسی مصنف نے خاص دیوبند کے اسی مدرسہ کے لئے لکھوایا تھا، اس زمانہ میں ترکی حکومت کا جو نمائندہ بمبئی میں رہتا تھا، یہ نسخہ اسی نمائندہ کے توسط سے دارالعلوم تک پہنچایا گیا۔ قلمی کتاب کے ساتھ خود علامہ احمد حمدی آفندی کا ایک مکتوب بھی فارسی زبان میں اس علمی ہدیہ کے ساتھ شریک تھا، جو اسی سال کی

روداد میں چھاپ کر شائع کر دیا گیا تھا۔ خط میں ان ہی باتوں کا تذکرہ کر کے کہ کل چار قلمی نسخے اس کتاب کے تیار کئے گئے تھے، جن میں ایک نسخہ آپ کے مدرسہ کے لئے اس لئے بھیجا جا رہا ہے کہ

"مدرسۂ آنحضرت کہ منبع فیض عموم ست، فرستادہ آمد تا یادگار آں بزرگوار بر محل خود باشد"

اگرچہ یوں بھی طور پر خط میں مدرسہ کے مہتمم مولوی رفیع الدین اور صدر حضرت مولانا محمد یعقوب، اور مجلس شوریٰ کے ایک رکن حاجی محمد عابد کے نام بھی مکتوب کے عنوان میں درج ہیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے جسے علامہ احمد حمدی آفندی نے اپنا مخاطب اول بنانا چاہا ہے، وہ حضرت سیدنا الامام الکبیر ہی کی ذات مبارک تھی، مکتوب کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔

"جناب فضائل مآب، مولوی محمد قاسم صاحب"

یہ "جناب فضائل مآب" کے الفاظ صرف حضرت والا کے اسم گرامی سے پہلے استعمال کئے گئے ہیں۔ باقی دوسرے بزرگوں کے نام کے ساتھ صرف "مولوی" کا لفظ ہے۔

کچھ بھی ہو، قاف تا قاف کی پرانی ضرب المثل کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن عصری تقریر دل میں ساحل باسفورس تا دیوار چین کا جو محاورہ مستعمل ہے، یہ واقعہ ہے کہ قریب قریب دس انگلیوں پر گنے جانے والے سالوں کے اندر اندر دیوبند کے قصبہ کا یہی مدرسہ، شاعرانہ رنگ میں نہیں، بلکہ فی الحقیقت اپنی شہرت و عظمت میں حیرت ہوتی ہے، کہ واقعی ان ہی حدود تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان کے لحاظ سے چین کی دیوار برما اور تبت ہی کے علاقے تو ہیں، اور باسفورس کے ساحل کے خوبصورت شہر استنبول (قسطنطنیہ) سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ علمی تحائف وہاں سے چلے آ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں تو اس کی توجیہ سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں، کہ مصر کے سوا زمین کے اس کرے پر حالانکہ بیسیوں اسلامی ممالک چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن قسطنطنیہ کے اس عالم کی اپنی کتاب کے لئے مصر کے بعد نظر انتخاب ہندوستان جیسے دور دراز ملک اور اس ملک میں بھی ضلع سہارنپور کی ایک قصباتی آبادی کے مدرسہ پر کیوں پڑتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا، اور مسلم و غیر مسلم باشندوں کا ایک ایسا ملک وہ بن چکا تھا، جس پر تیسری طاقت

حکمراں تھی، اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ جو اللہ کے لئے مٹنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا، اٹھانیوالا اسی کو سرکو اٹھار ہا تھا، اونچا کر رہا تھا، اور یہ سب جو کچھ تھا، اسی کی رفعت و بلندی کے مختلف مشاہداتی مظاہر تھے، من تواضع للّٰہ رفعہُ اللّٰہ کی گویا یہی ایک عملی تفسیر تھی، اس کے سوا بتایا جائے کہ آخر کیا سمجھا جائے؟ تاویل و توجیہ میں اور کیا کہا جائے؟

بہرحال گنے چنے، انہی چند سالوں میں کرایہ کے خام مکانوں سے نکل کر اپنی موجودہ تدریسی و اقامتی عمارت میں بھی منتقل ہوا، جس کی تفصیل دارالعلوم دیوبند کی تاریخ لکھنے والے کے فرائض میں داخل ہے، یعنی یہ سوالات کہ شروع میں دیوبند کا یہ مدرسہ کہاں قائم ہوا۔! جن مکانوں میں مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا، ان کی تعمیری نوعیت کیا تھی، کن کن لوگوں کے مکانات کرایہ پر لئے گئے، کرایہ کی مجموعی رقم کیا تھی، پھر کن دشواریوں کا احساس ارباب اہتمام و انتظام کو ہوا، اور طے پایا کہ مدرسہ کی مستقل عمارت بنائی جانی چاہئے، اس سلسلہ میں پہلے دیوبند کی جدید جامع مسجد جو اسی زمانہ میں بعض ارباب ہمم کی جدوجہد کی بدولت بن کر تیار ہوئی تھی، فیصلہ کیا گیا کہ اسی جامع مسجد کے آس پاس چند حجرے اگر بنا لئے جائیں گے وہی کافی ہوں گے، حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کے مہتمم اول نے اسی تجویز کے مطابق مسجد کے اردگرد کچھ حجرے تیار بھی کرا دیئے تھے، لیکن حال سے زیادہ جن کے سامنے مدرسہ کا مستقبل تھا، ہم آج جو کچھ دیکھ رہے ہیں، سب کچھ شاید اس کو پہلے ہی دکھایا جا چکا تھا، اپنی اسی اچھوتی بصیرت کی روشنی میں مدرسہ کے لئے پہلے زمین کا انتخاب کیا، زمین کیسے حاصل کی گئی، اور تقدیر کا وعدہ تدبیر کا قالب اختیار کر کے مسلسل کیسے سامنے آتا چلا گیا، ظاہر ہے "یہ دارالعلوم کی تاریخ" کے اہم اجزا ہیں، جب کبھی لکھنے والوں کو اس کی طرف توجہ ہوگی، دیکھ بھال کر کے ہر منزل کی روداد کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی حد تک زیادہ سے زیادہ گنجائش اسی کی ہے کہ ان چند سالوں یعنی ۱۲۸۳ھ آغاز تاسیس سے ۱۲۹۷ھ تک جس سال سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی، اس درمیانی وقفہ میں جو کچھ ہوا، اس کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

عرض کر چکا ہوں کہ تاسیس مدرسہ کے دوسرے سال ۱۲۸۴ھ میں حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کی

مہتمم سے سبکدوش ہو کر سفر حج پر روانہ ہو گئے، ان کی جگہ مولانا رفیع الدین صاحب کو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے مجبور کیا کہ وہ اہتمام کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ حاجی عابد حسین صاحب کی واپسی حجاز سے ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ اہتمام کی خدمت پھر انہی کے سپرد ہو گئی، ۱۲۸۸ھ تک وہی مہتمم رہے، پھر ۱۲۸۸ھ میں مجلس شوریٰ نے حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کو اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ صرف جامع مسجد کی تعمیر ان کے سپرد رہی، اور مدرسہ کے اہتمام و انتظام کا کام پھر مولانا رفیع الدین صاحب کے سر ڈالا گیا۔ اور اسی سال جو قیام مدرسہ کا چھٹا سال تھا، ایک طویل الذیل اپیل روداد میں شائع کی گئی، جس میں مدرسہ کے لئے مستقل عمارت کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا یہ ایک خاص ورق، اور اہم تاریخی وثیقہ ہے، اس میں پہلے تو مدرسہ کی مکانی دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے، کرایہ کے جن مکانوں میں اس وقت تک مدرسہ تھا، کچھ ان کی حالت، درسگاہ، طلبہ کی قیام گاہ، کتب خانہ کا مکان ان سب میں کافی فاصلہ، نیز درسگاہ کے تنگ غیر تدریسی مکان میں پڑھانے والے اور پڑھنے والوں کو جو دقتیں پیش آ رہی تھیں، مثلاً اجتماعی تدریس کی وجہ سے شور کا بلند ہونا، اور شور کو محسوس کر کے

"ہر شخص کو اس ضرورت سے کچھ آواز بلند کرنی ہوتی ہے، اور جتنی جتنی آواز بلند ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی شور بڑھتا ہے"

پھر قصبہ چھوٹے کی وجہ سے وسیع مکانوں کی دستیابی میں ناکامی، سب سے دلچسپ اطلاع یہ ہے، کہ قصبہ والوں کے خام کچے، ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو کرایہ پر مدرسہ نے جو لے لیا تھا، تو جہاں اسی دیوبند میں ایک طبقہ ان مسلمانوں کا تھا، جو سب کچھ مدرسہ پر نچھاور کر رہا تھا، وہیں روداد کے اس فقرے کو پڑھ کر کہ

"مکان مدرسہ کا اول تو کرایہ کا ہے، اور ہر سال نیا معاملہ کرنا ہوتا ہے، اور مالک مکان کے بسبب اس کے کہ حاجت مند جانتے ہیں، ہر سال کچھ نہ کچھ کرایہ زیادہ کرنا چاہتے ہیں"

صہ ۲ روداد ۱۲۸۸ ہجری

ان الفاظ کو پڑھ کر کم از کم میری گردن تو جھک گئی، مسلمانوں پر جو افتاد پڑی تھی، اور پڑتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی تہ میں ٹٹولنے سے کچھ اسی قسم کے اسباب کا نشان ملتا ہے، ماظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون کے قرآنی قانون کی یہی زندہ شہادتیں ہیں۔

بہر حال یہ اور اسی قسم کے متعدد اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں مجلس شوریٰ کی اس تجویز سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ

"ایک مکان وسیع، بافراغت، جس میں قریب ایک سو طلبہ بآرام تمام رہ سکیں، اور چار پانچ درسگاہ بھی ہوں، اور رفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اس میں ہو، تیار ہو۔" ص۳

آج دار العلوم دیوبند کی فلک پیما، کوہ ہیکل، عمارتوں کا سلسلہ طویل و عریض رقبہ میں پھیلا ہوا ہے یہی پہلی تجویز اس تناور درخت کا تخم اول تھی، تجویز شائع کر دی گئی، تعمیر کی مد میں رقوم آنے لگیں۔ ۱۲۸۹ھ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی عابد حسین صاحب حالانکہ مدرسہ کی مہتمی سے سبکدوش ہو چکے تھے، اور جامع مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے، انہوں نے اپنی اسی جامع مسجد کے اردگرد چند چھوٹے بڑے حجرے بنوانے شروع کر دیئے۔ حاجی صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ یہی حجرے دیوبند کے مدرسہ کے لئے کافی و وافی ہوں گے۔ اگرچہ ارباب شوریٰ نے حاجی صاحب کی اس رائے کی بظاہر مخالفت نہیں کی، بلکہ اسی ۱۲۸۹ھ کی روداد میں تعمیری مد کے زر اعانت کے متعلق یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ تعمیر کا کام ان ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے چاہئے کہ اس مد کی رقوم

"بخدمت حاجی صاحب ممدوح الصدر مہتمم جامع مسجد ہی کے ارسال فرمائیں۔" ص۸

لیکن سچ پوچھئے، تو مدرسہ کا مستقبل جس کے سامنے تھا، وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، نہ دیکھنے والوں کے لئے اس کا دکھانا بھی دشوار تھا، اور جب تک وہی سب کچھ دوسروں کو بھی نہ سوجھتا، جو وہ دیکھ رہا تھا، لوگ یہ کیسے باور کر سکتے تھے، کہ ضلع سہارنپور کی ایک قصباتی آبادی کا نام تعلیم و تعلم، درس و تدریس کی تاریخ میں ایک ایسی ٹھوس حقیقت کا قالب اختیار کرنے والا ہے کہ عام تعلیمی تاریخ نہ سہی لیکن اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کی ہندوستان ہی کی حد تک نہیں، بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سارے

عالم اسلام کی تعلیمی تاریخ کا یہ شعبہ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ حال، و مستقبل کے متعلق نقطۂ نظر کے اسی اختلاف کا اثر دلوں میں کشمکش کی ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کو پیدا کئے ہوئے تھا، جس پر زیادہ دن تک صبر شاید برداشت سے باہر ہو چکا تھا، حاجی صاحب مرحوم جامع مسجد کے اردگرد جو حجرے بنوا چکے تھے، دوسری مسجدوں کے حجروں کی طرح طلبہ کی اقامت گاہوں کا کام ان سے لیا جا سکتا تھا، اور یہی کام ان سے بعد کو لیا بھی گیا، آج تک لیا جا رہا ہے۔ اس لئے ان کی تعمیر میں مزاحمت تو مناسب نہ خیال کی گئی، جو کچھ وہ کر رہے تھے، چھوڑ دیا گیا کہ کرتے رہیں۔ اور خود مجلس شوریٰ نے جیسا کہ ۱۲۹۱ھ کی روداد میں مدرسہ کے مستقل اور وسیع مکان کی تعمیر والی تجویز کا ذکر کر کے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

"۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ ہجری صلعم بروز جمعہ عین جلسہ انعام طلبہ میں اس کے لئے گزارش کیا گیا" ص۳۵

کاغذی اپیل کے بعد باضابطہ "جلسہ تقسیم انعام" میں تعمیر والی یہ تجویز عام مسلمانوں کے مجمع میں پہلی دفعہ پیش کی گئی۔ لکھا ہے کہ

"برابر فرد چندہ پر دستخط ہوتے چلے جاتے ہیں، جس میں بہت سا روپیہ وصول ہو جاتا ہے"

چند ہی دنوں میں اتنی رقم فراہم ہو گئی کہ اسی سال

"ایک قطعہ نہایت وسیع واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا" ص۳۵ روداد ۱۲۹۱ھ

ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے، تمہید میں جو یہ الفاظ درج کئے گئے ہیں، کہ یہ

"آرزوئے دیرینہ جس کی سالہا سال سے امید تھی"

اسی سے سمجھ میں آتا ہے، کہ جامع مسجد کے اردگرد جو حجرے تعمیر ہو رہے تھے ۱۲۸۹ھ کی روداد میں جن کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ اس کی طرف

"جناب عمدہ اہل صفا، خیر خواہ خلائق جناب حاجی محمد عابد صاحب مہتمم سابق مدرسہ ہذا، حال مہتمم تعمیر جامع مسجد نے توجہ تام فرمائی، اور احاطۂ مسجد ہی میں جملہ حوائج ضروریہ درسگاہ

قیام گاہ طلبہ و دیگر ضروریات) کے لئے موقع مناسب کے مکان تجویز فرمائے" صلا

یہ شاید حاجی صاحب مرحوم کی ذاتی تجویز تھی، جس کی مزاحمت نہیں کی گئی تھی، لیکن تعمیر کی دیرینہ آرزو، جس کی سالہا سال سے امید تھی" اس کے مقابلہ میں گویا اس کی حیثیت گونہ اصرار بے جا ہی کی سی تھی، شاید اسی لئے جامع مسجد کے حجروں والی تجویز بجائے ارباب شوریٰ کے براہ راست حاجی صاحب مرحوم کی طرف روداد میں منسوب کی گئی ہے، مدرسہ کی تاریخ میں آئندہ بعض ناگفتہ بہ ہنگامی اختلافات جو پیش آئے، بظاہر ان کی ابتدار شاید اسی واقعہ سے ہوئی، کچھ نہ کچھ جس کی کسک آج تک قلوب میں باقی ہے، مگر میری بحث کے موضوع سے یہ مسئلہ ہی خارج ہے، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دور قاسمی میں مدرسہ کن منزلوں کو طے کر چکا تھا۔ مدرسہ کی مستقل تعمیر کے لئے ۱۲۹۱ھ میں زمین خرید لی گئی، اور ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں جیسا کہ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اطلاع دی گئی ہے "تقسیم اسناد و انعامات کا بھی جلسہ منعقد ہوا، جس میں غیر معمولی طور پر علاوہ دیوبند کے کافی تعداد باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کی بھی تھی، ان میں وقت کے بعض سربرآوردہ علمار، اور امرار بھی تھے" آخر میں لکھا ہے کہ

"کل اہالیان جلسہ اس موقع پر تشریف لائے، جہاں تعمیر مکان مدرسہ کی بنیاد کھدی ہوئی تھی، اول پتھر بنیاد کا جناب مولنا مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا، اور بعد میں جناب مولنا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب و مولنا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی[1]" صلا روداد ۱۲۹۲ھ

[1] تعمیر مدرسہ کی تاریخ کی یہ معلومات تو وہ ہیں جو براہ راست مدرسہ کی قدیم رودادوں سے فراہم کی گئی ہیں، دارالعلوم کی تاریخ کے لکھنے والے مزید معلومات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں، فقیر نے بقدر ضرورت چیزوں کا انتخاب کر لیا ہے، اس موقع پر انوار ثلاثہ کی اس روایت کا قدرتاً خیال آتا ہے جس کے بعض اجزا کا اسی کتاب میں مختلف موقعوں پر ذکر گذر بھی چکا ہے، انوار ثلاثہ کی اس روایت میں سنگ بنیاد کے متعلق یہ اضافہ پایا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے حضرت مولنا اصغر حسین صاحب کے نانا جو میاں جی منے شاہ صاحب کے نام سے مشہور تھے، وہی طلب کئے گئے اور پہلی اینٹ انہی کے دست مبارک سے رکھوائی گئی۔ لکھا ہے کہ میاں جی منے شاہ صاحب علاوہ سید ہونے کے خود بڑے بزرگ تھے۔ بلکہ میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو یاد آتا ہے کہ امیر شاہ خان مرحوم حضرت نانوتوی کے حوالہ سے یہ بیان کرتے تھے کہ میاں جی منے شاہ ایسے آدمی ہیں جن کے دل پر گناہ کا شاید خطرہ بھی نہیں گذرا" واللہ اعلم دوسری بات (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد مدرسہ کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا، دور دراز مقامات سے بھیجنے والے تعمیری مد میں رقوم مسلسل ارسال کر رہے تھے خصوصاً حیدر آباد دکن کے ارباب خیر نے تو گویا ایک مجلس ہی بنالی تھی، جو مدرسہ کی تعمیر کے لئے زر اعانت وصول کرتے تھے، اور بھیجتے جاتے تھے، اس باب میں اسلامیان دکن کی دلچسپیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ ۱۲۹۵ھ کی عام روداد کے علاوہ خاص حیدر آباد کے مسلمانوں کے امدادی چندوں کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ کتابچہ ۲۶ صفحوں کا مدرسہ کو شائع کرنا پڑا، جس کا ایک مطبوعہ نسخہ اس وقت میرے سامنے بھی ہے، تمہیدی عبارت اس "دکنی کتابچہ" کی یہ ہے، حمد و نعت کے بعد عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا،

"ان دنوں چند بزرگواران والاہمت مفصلۂ ذیل ساکنان بلدۂ خجستہ بنیاد حیدر آباد دکن نے اپنے وجود باجود کو ابتغاءً لوجہ اللہ ومرضاتہ تائید مدرسہ عربیہ دیوبند کے لئے گویا وقف کر دیا ہے، اور اس کی اعانت کے واسطے کمر ہمت چست باندھی ہے" صا

آگے ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مسلمانوں کو حیدر آباد کے غیور، اولوالعزم والا بادہ بانیوں کے نقش قدم پر چلنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ فراہمی چندہ کے لئے جیسے حیدر آباد میں ایک مستقل

(گذشتہ صفحہ سے) یہ ہے کہ میاں جی صاحب مرحوم کے بعد حضرت نانوتوی ہی کی ایماء پر حاجی عابد صاحب نے دوسری اینٹ رکھی، پھر حضرت گنگوہی نے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ روداد کی روایت اور اس روایت میں کتنا فرق ہے، ترجیح کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ تحریری وثیقہ کی روایت کا مقابلہ زبانی سینہ بسینہ والی روایت نہیں کر سکتی، اور تطبیق کی راہ اگر اختیار کی جائے تو اولیت کو بجائے حقیقی کے اضافی قرار دے کر کہہ یا جاسکتا ہے کہ میاں جی صاحب تو صاحب دل ہونے کی حیثیت سے اول تھے علماء میں حضرت مولانا احمد علی صاحب اول اور شوریٰ کی مجلس کے ارکان میں اول حاجی عابد صاحب تھے۔ سوانح ثلاثہ میں حاجی عابد صاحب مرحوم کے اختلافی نقطہ نظر کو بھی واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے لکھا ہے کہ جلسہ تقسیم انعام میں سیدنا الامام الکبیر نے جب سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شریک ہونے کیلئے حاضرین جلسہ کو دعوت دی تو حاجی صاحب خفا ہو کر اٹھ گئے، اور خفگی میں چھتہ کی مسجد میں جا کر بیٹھ گئے، سیدنا الامام الکبیر مجمع کو ساتھ لئے مدرسہ کی زمین کی طرف چل پڑے، مجمع آگے بڑھ گیا اور خود چھتہ کی مسجد میں پہنچ کر حاجی صاحب سے منت سماجت کی، جس پر وہ بدے پڑے دونوں بغل گیر ہوئے صفائی ہو گئی۔ ان کو ساتھ لیکر سیدنا الامام الکبیر بھی مجمع میں تشریف لائے، دلچسپ لطیفہ سوانح قاسمی کی روایت کا یہ ہے کہ یہاں جس کشتی مدرسہ کی زمین حاجی عابد صاحب مرحوم ہی کے نام خریدی گئی تھی، لکھا ہے کہ "بیع نامہ" ان ہی کے نام لکھوایا گیا تھا۔ اس میں یہ بھی ہے سب سے پہلے یہ قطعہ زمین کا یہ قطعہ خریدا گیا تھا۔

مجلس قائم کردی گئی ہے، چاہئے کہ دوسرے شہروں میں بھی اس کی پیروی کی جائے۔

مدرسہ کی تعمیر کا کام بھی جاری رہا، اور اسی کے ساتھ ان ہی دنوں میں وقتاً فوقتاً بعض اصلاحی اقدامات کی طرف بھی توجہ کی گئی، خصوصاً عربی اور دینی تعلیم کے ساتھ "معاشی ذرائع" کے سکھانے کا انتظام ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ شروع ہی سے اس کا خیال بھی سامنے تھا، اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں، کہ خالص دینی و عربی تعلیم کی حد تک اس کا تجربہ ہونے لگا کہ دنیا میں ان علوم کے جاننے والوں کی مانگ ہے۔ ۱۲۹۷ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ مدرسہ کی تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ لوگ نکمے ہو کر بیٹھ جائیں، حکومت قائمہ کے دفاتر کی نوکری معاش کے بے شمار ذرائع میں ایک مختصر ترین محدود ذریعہ ہے، لیکن اس کے سوا

"اور بھی اعلیٰ و افضل طریقے ہیں۔ مثلاً تجارت، زراعت، حرفت" ص۱۲

آگے یہ اطلاع بھی دی گئی ہے۔

"اس بات کے سننے سے اور بھی تعجب ہوگا، کہ خدا کے فضل و عنایت سے اکثر علاقہ (علاقۂ ملازمت) واسطے فارغ التحصیل طلبہ کے اطراف ہندوستان سے بمشاہرہ معقول مدرسہ ہذا میں آتے رہتے ہیں، اور نوکری ان لوگوں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے"

پھر اس زمانہ میں ریاست بھاول پور، اور گجرات کے کسی مقام لاجپور سے جو مطالبے آئے ہوئے تھے، ان کا تذکرہ کر کے اطلاع دی گئی ہے، کہ باوجود اس نوکری کے) ملنے کے دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبہ میں کوئی ان نوکریوں کے قبول کرنے پر اب تک آمادہ نہیں ہوا ہے۔

بہر حال بات وہی ہے، جس کا ذکر شاید پہلے بھی کر چکا ہوں، اور اپنے متعدد مقالات و مضامین میں اس خیال کو تقریباً ظاہر کیا ہے، کہ تقریباً اپنی صد سالہ زندگی میں دارالعلوم دیوبند سے دینی و علمی منافع جو حاصل ہوئے، وہ تو خیر بجائے خود ہیں، واقعہ یہ ہے، کہ معاشی حیثیت سے بھی مسلمانوں میں پست ماندہ طبقات کے خدا جانے کتنے گھرانوں کو اس کا موقعہ مل گیا کہ اگر دارالعلوم کے تعلیمی نظام سے استفادہ کا موقعہ ان کو نہ ملتا تو خوش حالی و فارغ البالی کی جو زندگی آج گذار رہے ہیں۔ ظاہر

اسباب کی رو سے شاید اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ معاشی منافع دارالعلوم کی بدولت جن لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدائے تاسیس سے اس وقت تک ان افراد کی تعداد شاید لاکھوں سے متجاوز ہو چکی ہو گی۔ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سلسلہ میں مستفید ہوئے ہیں۔ ان میں بعضوں کو تو کافی بلند ہونے کے مواقع مل گئے، جن کی داستان طویل ہے۔

قطع نظر اس عام معاشی منافع کے عہد قاسمی ہی میں بعض ایسے امور کی طرف جیسا کہ رودادوں سے معلوم ہوتا ہے، توجہ مبذول ہو چکی تھی، جن کو سیکھ کر خدا ہی جانتا ہے، کتنوں کو روزی کمانے میں سہولتیں میسر آئیں۔ مثلاً ۱۲۸۹ھ یعنی قیام دارالعلوم کے چھٹے سال ہی میں لکھا ہے کہ

"حافظ محمد کوثر علی صاحب خوشنویس ساکن نگینہ نے ..... تعلیم خوش خطی طلبہ اپنے ذمہ کر لی" صلا

ظاہر ہے کہ مطابع اور پریس، خصوصاً ہندوستان جہاں بجائے ٹائپ کے اس وقت تک لیتھو پریس ہی کے مطبوعات کو عوام بھی پسند کرتے ہیں، اور کتابوں کے نشر و اشاعت کے کام کرنے والوں کا بیان ہے کہ ٹائپ کے حساب سے لیتھو کی طباعت پر نسبتاً کم مصارف عائد ہوتے ہیں۔ اسی لئے خوشنویسی کا ہنر اس زمانہ میں روزگار کا ایک مستقل ذریعہ ہے، خصوصاً پڑھے لکھے عربی و فارسی کے جاننے والے خوشنویس چاہئے تو یہی کہ عام اردو خواں کاتبوں کے مقابلہ میں کتابت کے فرائض کو زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دیں۔ یہ ایک ایسا معاشی پیشہ ہے، جو علم کے ساتھ کافی مناسبت رکھتا ہے، اور علم سے اس پیشہ کے فروغ میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

اسی طرح ۱۲۹۵ھ کی روداد کے آخر میں ایک اعلان میں اس کی خبر بھی دی گئی ہے، کہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں "طب یونانی" کے پڑھانے کا نظم کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ

"مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول اس علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں" صلا

اور گو اس خیال کی تکمیل کی طرف بعد کو توجہ نہیں کی گئی، لیکن اس راہ میں جن بلند حوصلوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا اندازہ اسی اعلان کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اسی طبی تعلیم کے شعبہ کی طرف ارباب خیر کو متوجہ

کرتے ہوئے ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ

"اس فن لطیف کے لئے ایک بڑا کتب خانہ کتب و بیاض ہائے معتبرہ حکماء حاذق، واطبار کامل"

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ

"وآلات عمدہ جراحی وغیرہ طبیب وجراح تجربہ کار کا واسطے سکھانے طریقہ مطب و فن جراحی وغیرہ کے نہایت ضروری ہے" ص۲۳ روداد ۱۲۹۶ھ

دیکھ رہے ہیں، عہد قاسمی کے دارالعلوم کی امنگوں اور اولوالعزمیوں کا حال، وقت نے مساعدت نہ کی، باغ کے لگانے والے کے سامنے جو ارادے تھے، اولاً سب ظاہر نہ ہو سکے، اور ادھر اُدھر جن کا کچھ پتہ چل جاتا ہے، تو ان پر عمل کی توفیق میسر نہ آئی، ۱۲۹۱ھ کی روداد کے اس جزو کو ملاحظہ فرمائیے۔ اخبار و مطابع کے ان کارپردازوں کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے جو مدرسہ کی امداد اپنے اخبار اور کتابوں سے کرتے تھے۔ قسطنطنیہ کے ایک عربی اخبار "الجوایب" نامی کے متعلق یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"بلا اضافہ قیمت محض، بنظر خیر خواہی اس مدرسہ اسلامی و فائدہ طلبہ اہل اسلام کے عنایت کرتے ہیں" ص۵۳

سب سے بڑا فائدہ عربی زبان کے اس اخبار کا یہ بیان کیا گیا ہے، کہ

"طلبہ عربی خواں کو زبان دانی کا فائدہ علاوہ فائدہ اخبار کے کمال درجہ حاصل ہوتا ہے"

ص۵۳ روداد ۱۲۹۱ ہجری

عربی زبان دانی، اور اخبار بینی کے ان منافع کی طرف عہد قاسمی کے بعد کتنی توجہ کی گئی، اس کا جواب "صورت ببیں حالت مپرس" "باتیاں راچہ بیاں" کے سوا اور کیا دیا جا سکتا ہے؟

بہر حال دارالعلوم کی عمر کی یہ مدت جو عہد قاسمی میں گذری، خواہ جتنی بھی مختصر ہو، لیکن جو شہادتیں آپ کے سامنے گذر چکیں، ان کی روشنی میں دیکھئے بعد کو دارالعلوم نے تاریخ کے جس طویل دور کو

پیدا کیا، قریب قریب ایک صدی گویا ختم ہو رہی ہے، اس عرصہ میں طوعاً و کرھاً اس کے مختلف شعبوں میں جو ہر جہتی ترقیاں ہوئی ہیں۔ ان کا بھلا کون انکار کر سکتا ہے، لیکن بنیادی سالوں میں جن جن تخموں کو بونے والے بو کر چلے گئے، سچ تو یہ ہے کہ ابھی صحیح معنوں میں ان ہی کی نشو و نما میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، اسی لئے دارالعلوم کی حد تک اپنا خیال تو یہی ہے کہ نئی تجویزوں سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ عہد قاسمی کے کلیات کی روشنی میں عملی اقدامات کی طرف توجہ کی جائے، جو کچھ اس وقت تک سوچا جا چکا تھا، اسی کو عمل کا قالب عطا کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی کی تاریخ کا صحیح اور مفید مطالعہ وہی ہو سکتا ہے جس سے مستقبل کے سلجھانے میں مدد لی جائے ورنہ گذرے ہوئے واقعات کا اعادہ، واقعات ہی کا اعادہ کیوں نہ ہو، نتیجۃً ایک افسانہ سے زیادہ انصاف کی بات یہی ہے کہ وہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد قاسمی کی جن روداروں سے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کو مرتب کر کے شائع کرنے والے یعنی حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے تھے ان ہی کے بعض ذاتی اعترافات یہاں نقل کر دئیے جائیں۔ زبانی روایت تو اس باب میں ان ہی کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں یہ پائی جاتی ہے، فرماتے تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ دیوبند کا اہتمام کبھی خود نہیں فرمایا بلکہ اہتمام کیلئے مجھے طلب فرمایا، اور میں وہی کرتا ہوں، جو انہیں مکشوف ہوتا ہے۔"

صاف اور واضح لفظوں میں اپنے مافی الضمیر کی شرح خود مولانا رفیع الدین صاحب یہ کرتے تھے کہ

"علم ان کا (مولانا نانوتوی رح کا) عمل میرا ہے" ص۱۸۳

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے جسے موصوف نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج کیا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ واضح و روشن، خود مولانا رفیع الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خود نوشتہ تحریری شہادت ہے، جو ۱۲۹۵ھ کی روداد میں بہ ذیل تکمیل

کی وفات کے تذکرہ کے بعد نظم بند کی گئی ہے۔

حضرت مرحوم کے دینی جذبات عالیہ، اور عام اسلامی خدمات جلیلہ کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد مولانا رفیع الدین مرحوم نے لکھا تھا۔

"خصوصاً اس مدرسہ (دیوبند) کو کیونکہ اس چشمۂ فیض کے منبع اور اس آب حیات کے مصدر اور اس آفتاب عالمتاب کے مظہر آپ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) ہی تھے۔"

آگے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"اللہ اللہ اس کارخانہ خیر (یعنی مدرسہ) کی ترقی میں کیسی کیسی ہمتیں لگائیں۔"

اپنی اعترافی شہادت وہ یہ درج کرتے ہیں

"حق تو یہ ہے کہ اس شمس الاسلام ہی کے حسن سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ ملک ہند میں باوجود ضعف اسلام، و اسلامیان، علم دین کو کس زور شور سے پھیلایا کہ باید و شاید۔" ص

روداد ۱۲۹۶ھ

اس کے بعد، عہد قاسمی کی رودادوں کی تجویزوں کا حقیقی سرچشمہ حضرت والا کی فکر حکیمانہ کے سوا، خود ہی بتائیے، کہ اور کس چیز کو قرار دیا جائے۔ صراحۃً جو باتیں آپ کی طرف نہ بھی منسوب کی گئی ہوں، ماننا۔ یہی چاہئے کہ ان کی تہ میں بھی حضرت والا کے چشم و ابرو کے اشارے کام کر رہے تھے۔

آنچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم

خود پس آئینہ والے طوطی ہی کا جب یہ اقرار ہو، تو سمجھنے والے آپ ہی بتائیے کہ آخر وہ کیا سمجھیں۔

خلاصہ یہ ہے، کہ دین و دنیا قدیم و جدید علوم کی پیوستگی و وابستگی یعنی باہم ایک کو دوسرے کے ساتھ ہم رشتہ کرنے کے لئے نصاب کی ترمیم و اصلاح کا مسئلہ، انتشار و پراگندگی کی جگہ سرزمین ہند کی اسلامی تعلیم گاہوں کو جامعاتی قالب میں لانے کے لئے کسی ایک مرکز پر ان کو مجتمع کرنا، دینی مدارس کے طلبہ اور فارغین کے معاشی سوال کا حل، ان کلی مسائل کے ساتھ ساتھ دوسرے تعلیمی جزئیات مثلاً کتابوں کی حفاظت و طباعت و اشاعت کے متعلق کافی رہ نمائیاں ان معلومات سے حاصل ہو سکتی ہیں جو عہد قاسمی کی

روداددوں سے فراہم کر کے پیش کی گئی ہیں - بلکہ آج مسلمانان ہند کے سامنے سب سے بڑا سوال اس ملک کے دوسرے آبادکاروں کے تعلقات کی بنیاد پر جو پیدا ہو گیا ہے، چاہا جائے تو اس سوال کے حل کی راہیں بھی ان ہی معلومات کی روشنی میں ڈھونڈھی جا سکتی ہیں۔ لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔

واقعہ تو یہ ہے، سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے جس پہلو کو اب پیش کرنا چاہتا ہوں، ایک حیثیت سے یہ سمجھنا چاہئے، کہ جہنم بن کر جو چنگاری آج ملک میں بھڑک اٹھی ہے، یہ چنگاری کیسے پیدا ہوئی؟ شاید آئندہ جو کچھ عرض کیا جائے گا، اسی میں اس سوال کا جواب بھی آپ کو مل جائے۔

آپ دیکھ چکے، سنے سنائے افواہی قصوں، اور زبانی روایتوں ہی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے مقدس دینی ادارہ کے متعلق یہ تحریری وثیقہ آپ کی نظر سے گذر چکا کہ وقت اسی ملک پر وہ بھی گذر چکا ہے، کہ ہندوؤں کے اخباروں (اودھ اخبار اور سفیر بوڈھانہ) کے لئے یہ دعا کی جاتی تھی کہ

خدا

"ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے"

گذر چکا کہ زر اعانت یا چندہ کے متعلق بالالتزام ہر سال کی روداد میں یہی اعلان مسلسل کیا جاتا تھا

"چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اور نہ خصوصیت مذہب و ملت"

اعلان بھی یہی کیا جاتا تھا، اور عمل بھی اسی پہ ہوتا رہا، اسی بنیاد پر بخوشی ان ہندوؤں کی مالی امداد بھی قبول ہوتی رہی، جو ان کی طرف سے پیش ہوتی تھی، خصوصاً کتابوں کی شکل میں بار بار ان رودادوں میں اس کا اعتراف کیا جاتا رہا، کہ اس باب میں غیر معمولی فیاضیوں کا تجربہ ایک ہندو مالک مطبع ہی کے متعلق مدرسہ والوں کو ہوتا رہا۔ کتابوں کے سوا بھی اردو روزنامہ جو شاید ہندوستان میں وہی پہلا روزنامہ تھا، اسی سیر چشم، فراخ دل ہندو کی طرف سے ہدیۃً پیش ہوتا رہا، جیسا کہ چاہئے تھا۔ مدرسہ کی طرف سے بھی بار بار اس بذل و نوال کا شکریہ ادا کیا جاتا تھا۔ الغرض دنیاوی علوم و فنون کی تعلیم کے مدارس کا بار حکومت کے خزانے پر ڈال کر دینی و ملی تعلیم کے لئے ہندوستان کے قومی خزانہ سے استفادہ کا ارادہ جو کیا گیا تھا، اس میں باشندگان ملک کے دینی نظریات، اور مذہبی احساسات کی قید گویا اٹھا دی گئی تھی، اسی لئے

ہر طرح کے رنگ دے بھی رہے تھے، اور مدرسے بھی رہا تھا، بلکہ اس کا اظہار کرتے ہوئے کہ گو مقصود اصلی اس مدرسہ کے بانی کا دینی علوم ہی کی اشاعت ہے لیکن بقدر ضرورت فارسی اور کچھ حساب و کتاب یعنی ریاضی کی تعلیم کا بھی مدرسہ کے ابتدائی کلاسوں میں انتظام کیا گیا ہے بحث ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

"یہاں تک کہ بعض بعض ہندو لڑکے بھی پڑھتے ہیں" ص۱۳ روداد ۱۲۹۲ھ

"ہندو لڑکے پڑھتے تھے" ظاہر ہے کہ مطلب اس کا یہی ہو سکتا ہے، اور یہی ہے بھی، کہ خاص سہولتوں کی وجہ سے دیوبند کے مقامی ہندو باشندے بھی کبھی کبھی فارسی اور حساب وغیرہ کے پڑھنے اور سیکھنے کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کو مدرسہ کی ان ابتدائی کلاسوں میں شریک کر دیتے تھے جن میں ان مضامین کی تعلیم ہوتی تھی، اس سے کچھ اور ثابت ہوتا ہو، یا نہ ثابت ہوتا ہو، لیکن تعلقات کی شگفتگی کا اس سے زیادہ واضح ثبوت کیا ہو سکتا ہے، کہ دارالعلوم دیوبند جیسی خالص دینی و اسلامی درسگاہ میں ان بچوں کو کشادہ پیشانی شریک کر لیا جاتا تھا، اور کتنے کھلے دل کے ساتھ شریک کر لیا جاتا تھا، کہ روداد تک میں تذکرہ کر کے سارے مسلمانان ہند کو اس سے مطلع کیا جاتا تھا، اس سے بھی زیادہ عبرت آموز سبق اسی اطلاع سے یہ ملتا ہے، کہ مسلمانوں کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں جو مسلمانوں کے دین اور صرف دین کا خالص تعلیمی مرکز ہے، اس میں بغیر کسی دغدغہ کے اپنے بچوں کو ہندو شریک کرتے تھے، اور شریک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے تھے۔ دلوں اور دماغوں پر آج جو تالے چڑھا دئے گئے ہیں، ان کو دیکھئے، اور اندازہ کیجئے کہ اسی ہندوستان میں اسی آسمان کے نیچے اسی سرزمین پر اس تماشے کو بھی دیکھا جاتا تھا، اور بخوشی دیکھا جاتا تھا جس کا تصور کرنا بھی آج شاید دشوار ہے، ایسا کیوں ہوا؟ وہی ملک جس میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہی گردشیں بدلتے ہوئے موجودہ حالات تک کیسے پہنچا، ان سوالوں کا صحیح جواب تاریخ کے جن اوراق میں لکھے ہوئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ پھاڑ دیئے گئے، ان ہی لوگوں نے ان کو پھاڑ دیا جو دوسروں پر قومی تاریخ کے اوراق کے پھاڑنے کا مجرمانہ الزام لگاتے ہیں[1]۔

---

[1] شاید اب تو ندامت کے ساتھ کچھ سر جھک بھی رہے ہیں، ورنہ الفنسٹن وغیرہ نے ہندوستان کی (باقی اگلے صفحہ پر)

تاہم ان ہی چاک شدہ اوراق کے کچھ ٹکڑے کبھی کبھی ادھر اُدھر مل جاتے ہیں سب کے درج کرنے کی اور ان سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں' ان پر تفصیلی بحث کی تو اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے لیکن ان میں بعض ٹکڑوں کو خاص ترتیب سے درج کر دیتا ہوں۔ پڑھئے اور جو نتیجے ان سے پیدا ہوتے ہیں' ان کو خود سوچئے۔

کتاب کے مقدمہ میں بھی' اور اصل کتاب میں بھی اس کا تذکرہ مختلف مقامات میں گذر چکا ہے' کہ مسلمانوں کی حکومت ختم کر کے اس ملک کی سیاسی باگ ڈور جس قوم کے ہاتھ میں آگئی تھی' اس قوم کے ان حکمرانوں کی طرف سے پہلی کوشش تو اسی کی گئی کہ

"جس طرح سے ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے' اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔" (تاریخ التعلیم ڈاکٹر سید محمود منقول از مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۲۱۲)

اور اسی نصب العین کے پیش نظر منجملہ اور تدبیروں کے جوہری تدبیر "انگریزی تعلیم" تھی۔ لارڈ میکالے جنہوں نے اپنے ایک ووٹ سے ہندوستان کے مشرقی نظام تعلیم کو مغربی نظام کے قالب میں

(گذشتہ صفحہ سے) یہ تاریخ جس زمانہ میں لکھی ہے۔ عموماً اس زمانہ میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ سرزمین ہند کی "مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں ملتی" الفنسٹن صاحب کا دعوے تھا' مشہور جرمنی فلسفی شاعر کا قول نقل کیا جاتا تھا کہ تاریخ تو صرف روم اور یونان ہی کی تاریخ ہے' باقی قدیم قوموں میں مصر ہو' یا چین' یا ہندوستان کسی حالت میں ان کے حالات عجائبات سے زیادہ نہیں (سمتھ کی تاریخ قدیم ہند ص۱۲)

سمتھ ہی نے اپنی اسی کتاب میں یہ عجیب و غریب دعوے کئے ہیں کہ سکندر اعظم کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اسی کا نہیں بلکہ سومنات پر محمود غزنوی کی چڑھائی تک کے ذکر سے ہندوستان حتی کہ گجرات تک کی تاریخیں خالی ہیں' اسکا بیان ہے کہ ہندوستان پر باہر سے جو حملے ہوئے ان کے متعلق خاموشی کی ایک سازش پائی جاتی ہے (دیکھو تاریخ قدیم ہند ص۲۲ ترجمہ اردو) ان باتوں پر مجھے خیال آیا کہ آج کل یورپ والوں نے جو پھیلا رکھا ہے کہ مصر کی قدیم تاریخ کے جو وثائق مختلف شکلوں میں ملتے ہیں' ان میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان تعلقات کا ذکر نہیں ملتا جن کے قصے تورات اور قرآن میں پائے جاتے ہیں' خیال بھی گذرا کہ قدیم قوموں کی سازش ہی جب تھی جس کا سمتھ صاحب نے دعویٰ کیا ہے' تو مصری تاریخوں کا بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے خالی ہونا محل تعجب کیوں ہو۔ اگرچہ پچھلے دنوں بعض لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ مصری تاریخ میں بنی اسرائیل کے آثار کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن نہیں بھی ملتا تو خاموشی کی مذکورہ بالا سازش کے بعد ملنے کی توقع ہی کیا ہو سکتی تھی۔"

ڈھال دیا۔انہوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد اپنے والد کے نام جو خط لکھا تھا۔شاید پہلے بھی نقل کر چکا ہوں جس میں پیشگوئی کی گئی تھی کہ

"تیس سال بعد ایک بت پرست یعنی ہندو بنگال میں باقی نہ رہے گا" (روشن مستقبل ص۳۰)

اسی کا اندازہ کرنے کے لئے کہ انگریزی تعلیم کس حد تک اس نصب العین کے لحاظ سے بارآور ہو رہی ہے عموماً کام اور نتیجہ کا جائزہ بھی وقتاً فوقتاً لیا جاتا تھا۔سر چارلس ٹریلویلین جو اس مسئلہ سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے اور ترقی کر کے گورنری کے عہدے تک پہنچے تھے' انہوں نے لکھا تھا کہ

"کلکتہ چھوڑنے سے قبل میں نے تمام ان تعلیم یافتہ لوگوں کی فہرست بنوائی جو عیسائی ہوئے" ص۱۲۱ روشن مستقبل

اور گو عیسائیت کے قبول کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی تھی۔لیکن سلبی نتیجہ بہت زیادہ کامیاب تھا' لارڈ میکالے کے الفاظ میں جس کی تعبیر یہ تھی کہ

"کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے' کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا"

الغرض انگریزی تعلیم کا یہ "سلبی اثر" کہ "اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا" جہاں اس کا پتہ چلتا تھا' اسی کے ساتھ ایجابی نتائج کے متعلق لاٹ صاحب ہی نے یہ بھی لکھا تھا کہ پھر

"ان میں بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں' یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں"

"موحد ہو جاتے ہیں" بظاہر ان الفاظ سے اشارہ شاید ان ہندوؤں کی طرف کیا گیا ہے۔جو انگریزی تعلیم پانے کے بعد بنگال میں راجہ رام موہن رائے کے قائم کئے ہوئے "برہمو سماج" یا علاقہ بمبئی کے "پرارتھنا سماج" والی سوسائٹیوں میں شریک ہو کر موحدین جاتے تھے جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے جاننے والے ان سے کم و بیش واقف بھی ہیں' لیکن اسی سلسلہ میں اندرونی طور پر بے پاؤں ایک اور سیلاب بھی اس زمانہ میں جو دھمکیاں دے رہا تھا۔تاریخ کے اسی حصہ کے متعلق "خاموشی والی سازش" شاید اختیار کی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے عام مشرکانہ نام کا ازالہ کر کے یہ جو سمجھ لیا گیا تھا کہ قدرتاً لوگ عیسائی

مذہب کو قبول کرلیں گے، ایک تو یوں بھی صحیح نہیں تھا کہ عیسائیت کی توحید خود تثلیث کے معمہ میں الجھ کر چیستاں بنی ہوئی تھی، اور گو اس ملک میں اسلام کے نمائندے اسلام سے زیادہ خود اس ملک کی مشرکانہ اوہام ہی میں لفظوں کے ہیر پھیر سے غوطے کھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان نہ سہی، مسلمانوں کی آسمانی کتاب اور اس آسمانی کتاب کے لانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی کتابوں میں موجود تھی، اسی کے ساتھ ایک غیبی لطیفہ اس ملک میں ٹھیک اسی زمانہ میں حضرت مولنا سید شہید بریلوی اور ان کے رفقاء صدیقین و شہداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شکل میں اچانک ظاہر ہوا تھا۔ یہ حضرات خالص اسلامی توحید کے مجسم نمونہ بھی تھے، اور اسی کی منادی بھی ملک کے طول و عرض میں کمال جوش و خروش کے ساتھ کر رہے تھے۔

پس ہندوؤں کا وہ طبقہ، جو اپنے آبائی مشرکانہ دین کی صداقت سے جیسا کہ میکالے نے لکھا ہے ہٹ رہا تھا۔ ان میں عیسائیت، یا عیسائیت کے بغیر توحید کے قبول کرنے والوں کے ساتھ ساتھ واقعہ یہ پیش آیا تھا۔ ایک بڑا طبقہ تھا، جو اپنے ملک کے قالص توحیدی دین اسلام کو قبول کر رہا تھا، کس پیمانے پر قبول کر رہا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، کہ ۱۸۷۱ء میں تحفۃ الہند نامی مشہور کتاب ایک نو مسلم مولوی محمد عبید اللہ صاحب کی جو شائع ہوئی تھی، اس میں مولوی صاحب نے اپنے قصبہ پائل (متصل لودھیانہ پنجاب) اور اسی کے گرد و نواح میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد جو بتائی ہے قریب قریب سَو تو ہی پہنچ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزی حکومت کی بدولت ملک ایک نئے ماحول سے آشنا ہوا تھا اس ماحول کے دوسرے نتائج جو قصداً پیدا کئے جا رہے تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ قصد اور ارادہ کے بغیر اندر ہی اندر اسلام اور اسلامی توحید کی طرف بھی لوگ کھنچنے لگے۔ اسی کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی مصنف کتاب نے نقل کئے ہیں، کہ اعلان اسلام سے پہلے اپنے خاندانی پروہت برہمن سے اتفاقاً لکھا ہے کہ میں نے کہا کہ پروہت جی میں تو مسلمان ہو گیا۔ اس فقرے کو سن کر بجائے بگڑنے کے لکھا ہے کہ پروہت صاحب نے کہا کہ

"مہاراج جہاں ججمان وہیں پروہت" [1]

یعنی جو مرید کا دین وہی پیر کا دین بھی ہے۔ پہلے تو سمجھا گیا کہ یہ گفتگو دل لگی کے طور پر ہوئی لیکن بعد کو جیسا کہ مولوی عبید اللہ نے لکھا ہے کہ پروہت جی

"گھر بار چھوڑ کر مسلمان ہوئے" ملتا

مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں مختلف طریقہ سے اپنے بعض ذاتی مشاہدات و تجربات کا بھی تذکرہ کیا ہے جن سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ علانیہ دین اسلام قبول کرنے والوں کے سوا کافی تعداد اس زمانہ میں اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، جو بظاہر اپنی شکل و صورت سے مسلمان نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن واقعہ میں اسلام کو اپنا دین بنا چکے تھے، ایک دلچسپ قصہ اسی سلسلہ میں انہوں نے لاہور کا درج کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لکھا ہے کہ

"ایک مسافر ذی عزت، صاحب مکنت ساکن شاہ جہاں آباد (دہلی) سے ملاقات ہوئی، وے ظاہر میں سراوگی تھے، اور میں ان دنوں میں اپنا اسلام مخفی رکھتا تھا"

خلاصہ یہ ہے کہ اسی دہلوی مسافر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ درمیان میں کچھ مذہبی گفتگو چھڑی، تا اینکہ آخر میں اس سراوگی نے اقرار کیا، کہ

"میں مدت سے پردہ میں مشرف باسلام ہوں اور نماز پنجگانہ ادا کرتا ہوں" ص۵۵

لیکن مصلحۃً دوسروں پر اس کو ظاہر نہیں کیا ہے۔ اس قسم کے متعدد واقعات کا تذکرہ مختلف مقامات پر اس کتاب میں کیا گیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی حکومت اس ملک میں جب قائم ہوئی، تو اسلام کی طرف غیر معمولی رجحان باشندوں کے قلوب میں پیدا ہو گیا تھا۔ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں ایک موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ

---

[1] پروہت کا مطلب مولوی صاحب نے خود ہی یہ لکھا ہے کہ خاندانی پیروں کی یہ ہندوانہ تعبیر ہے شادی بیاہ اور مونڈن وغیرہ میں ان سے کام پڑتا ہے۔ ججمان یعنی مرید لوگ اپنے اپنے پروہتوں کو ان تقریبوں میں نذر نیاز دیتے ہیں ۱۲

"باوجودیکہ فرنگی لوگ کتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں، اس بات پر کہ لوگ ان کا دین (عیسائیت) اختیار کریں، چنانچہ پادریوں کو نوکر رکھنا، اور مدرسوں کا تعمیر کرنا، اور کتابوں کا تقسیم کرنا، اسی واسطے ہے۔"

پھر یہی نہیں وہی آگے لکھتے ہیں

"اور جو کوئی ان کا (فرنگیوں کا) دین اختیار کرتا ہے، اس سے نان و نفقہ کی بھی مروت کرتے ہیں۔"

مگر ان ہی کا بیان ہے کہ بجز "بے عقل حوادث زدہ" لوگوں کے عیسائی دین قبول کرنے والوں میں "کوئی ہزار میں ایک آدھ ہوتا ہے۔"

برخلاف اس کے اسلام کے متعلق وہی لکھتے ہیں کہ

"اسلام باوجودیکہ بہ سبب نہ ہونے سلطنت اہل اسلام کے اس ملک میں ضعیف ہوگیا ہے اور اکثر اہل اسلام کو ستی، و اہل مروت میں چنداں اسباب دنیاوی موجود نہیں رکھتے کہ کسی شخص مشرف باسلام کا روٹی اور کپڑا اپنے اوپر کرلیں۔"

مگر باایں ہمہ اپنے زمانہ کا یہ حال انہوں نے درج کیا ہے کہ اس ضعف اور بے نوائی و بے کسی کے باوجود "بہت سے آدمی اپنی حشمت دنیاوی چھوڑ کر دین اسلام کو اختیار کرتا، اور درویشی و مفلسی میں آنا غنیمت جانتے ہیں۔" مثلاً

واقعات جو سننے میں آتے ہیں، واقعی ان کو سن کر حیرت ہوتی ہے ایک طرف بہار کی ایک راجپوت ریاست کھیرا نامی کے راجہ کے بھائی جو بعد کو راجہ عبدالرحمٰن آف مرجا کے نام سے مشہور ہوئے، اور اس وقت ان کے خاندان کے لوگ مرجا میں موجود ہیں۔ تو دوسری طرف مولوی عبیداللہ صاحب نے ایک پہاڑی سردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے ان کا نام

"کنور جوالا سنگھ تھا۔"

اپنی متعدد بیویوں اور ملازم کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ شیخ غلام محمد اب ان کا نام ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جس قسم کی نئی ذہنی ہلچل انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اس ملک میں پیدا ہوئی، علاوہ ان یونیورسٹیوں کے، جن کے ذریعہ جدید مغربی علوم سے ملک کو آشنا بنایا جارہا تھا، بقول سرچارلس ٹریلین

"بالواسطہ کتابوں، اخباروں، یورپینوں سے بات چیت وغیرہ"

سے دلوں اور دماغوں پر جو رنگ قدرتی طور پر چڑھ رہا تھا، یا قصداً حکومت اپنے خاص باطنی اغراض سے چڑھا رہی تھی۔ اب اس کو کیا کہئے کہ خالی تو کئے جارہے تھے لوگوں کے دل اور دماغ بپتسمہ کے پانی سے بھرنے کے لئے، لیکن عین اسی زمانہ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس مقدس پانی سے دیکھا جارہا تھا وہ بھرتے چلے جارہے ہیں، جو اسلامی دین کے سرچشمے سے ابل رہا تھا، افسوس ہے کہ باوجود تلاش و جستجو کے حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی متعلقہ کتابوں میں اس قسم کی اجمالی اطلاعیں جو دی گئی ہیں، کہ جو دریائی سفر آپ کا دلی سے کلکتہ تک ہوا تھا۔ اس سفر میں مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کے قبول کرنے والوں کی تعداد بھی لاکھ سے متجاوز تھی لیکن اس اجمال کی تفصیل کیا تھی، بجز مولوی عبید اللہ صاحب مرحوم کی اسی کتاب "تحفۃ الہند" کے جس میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کا ذکر غیر معمولی احترام سے کیا گیا ہے، اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے، کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ سید شہید کی تحریک کے اثر پذیروں میں تھے۔ بس اس کے سوا اس زمانہ کی کسی تصنیف میں اب تک تفصیلات کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔

سوال یہی ہے کہ گورنری تک پہنچنے والے حکام جس حکومت کے فہرست ان لوگوں کی جب تیار کر رہے تھے، جو حکومت کی نت نئی تدبیروں کے زیر اثر اپنے آبائی دین سے روگرداں ہو کر عیسائی دین قبول کر رہے تھے۔ کیا اسی حکومت کی نظر اس پر نہیں پڑ رہی تھی کہ زمین تو حکومت اپنی بالواسطہ یا بلاواسطہ مصارف سے تیار کر رہی ہے، لیکن اسی کی تیار کی ہوئی زمین سے فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں، گویا پھل توڑنے کا موقعہ ان کو مل گیا ہے، جنہوں نے نہ درخت ہی لگائے، نہ ان درختوں کی

آبیاری ونشوونما میں کوشش کی تھی، مطلب یہی ہے کہ اپنے موروثی دین سے بدگمان اور بدظن کرنے کا کام تو حکومت انجام دے رہی تھی، اور اسی لئے دے رہی تھی تاکہ اس ملک کے باشندوں کا مذہب بھی وہی ہو جائے جو اس کے حکمرانوں کا ہے، یعنی لوگ عیسائی ہو جائیں۔ لیکن بیچ میں یکایک اس صورت حال سے اسلامی دین کے دائرہ کی وسعت میں جو مد دمل رہی تھی، اور جوق درجوق لوگ اس زمانہ میں حلقہ بگوش اسلام جو ہو رہے تھے، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے، کہ ان کی مدد شنی میں اپنی کدو کاوش کے اس عجیب وغریب نتیجے سے حکومت اندھی بنی بیٹھی رہ سکتی تھی۔

میں نے جو عرض کیا تھا کہ تاریخ کے اوراق پھاڑ دیئے گئے ہیں۔ ان پھٹے ہوئے اوراق میں ایک ورق یہ بھی ہے۔ اس زمانہ کی معمولی معمولی جزئیات سے بھی نتائج اس وقت جو پیدا ہو سکتے تھے، یا آئندہ جن کے پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ کتابیں اٹھا کر دیکھئے، سب ہی پر بحث کی گئی ہے اور حکمت ودانش کے دریا بہا دیئے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ فقیر نے کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس کا خطرہ بھی حکومت اور حکومت کے کارندوں کے دلوں پر کبھی نہیں گزرا، سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن حکومت کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کی نگاہوں میں کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ طریقہ عمل سے خواہ کچھ بھی باور کرایا جا رہا ہو لیکن یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا حکومت اس کے سلسلہ کو یوں ہی آگے بڑھنے کے لئے چھوڑ دیتی۔ عقل کا اقتضاء تو یہی ہے لیکن اس عقلی نتیجے کے لئے جن تاریخی شہادتوں کی ضرورت ہے، مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ تفصیلاً ان کے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ صرف چند گرے پڑے ٹکڑے مل گئے ہیں، انہیں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں، ان ہی کو جوڑ کر کچھ پڑھ سکتے ہوں تو پڑھ

(۱)

پہلی بات تو اس سلسلہ کی یہ ہے، کہ وہی کلکتہ جو اس زمانہ میں اس قسم کی کارروائیوں کا مرکز تھا، اسی شہر میں کچھ دن بعد یعنی ان ہی دنوں کے بعد جن میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اور شادیانے بجائے جا رہے تھے کہ

"تیس سال بعد بنگال میں ایک ہندو باقی نہ رہے گا "
بنگال ہی نہیں بلکہ پورے برِّ اعظم ہند کے متعلق توقعات قائم کی جارہی تھیں کہ
"جیسے ہمارے آباء و اجداد ایک دفعہ عیسائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی
سب کے سب ایک دفعہ عیسائی ہو جائیں گے "
انگریزی نظامِ تعلیم کے نفاذ میں کامیاب ہونے والے صاحبزادے لاٹ صاحب، اپنے بوڑھے مسیحی
باپ کو مژدہ سنا رہے تھے کہ
"کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا"
جس کلکتہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے، کہ اسی کلکتہ میں دیکھا جاتا ہے، کہ گوری
کھال، گورے رنگ کا آدمی یہ کہتے ہوئے کہ
"میری رگوں میں ایک بوند بھی غلامی کے خون کا نہیں ہے "
انگریزی زبان میں ہندوؤں کے ایک مجمع کو خطاب کر کے احسان جتلا رہا ہے، کہ انگریزی حکومت نے
انگریزی نظامِ تعلیم کو جاری کر کے ہندوؤں کی عام ذہنیت میں جو انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی، ان الفاظ میں
یاد دلاتے ہوئے کہ
مذہب کی تعلیم دلوں سے قریب قریب دور ہو چکی تھی، مغربی تعلیم اور مغربی تعلیم یافتہ
استادوں کا اثر اس قدر حاوی ہو گیا تھا، کہ ہند تعلیم یافتوں کا پچاس فی صدی حصہ
مادہ پرست اور روحانیت کا منکر، ۲۵ فیصدی سنشی دان (بتلائے شک) اور باقی ۲۵
فی صدی کٹر ہندو رہ گئے تھے "
صرف بنگال ہی نہیں، اس نے کہا
"کل ہندوستان میں تعلیم یافتہ جماعت کی یہی کیفیت ہو گئی تھی "
اسی نے کہا کہ اس زمانہ میں
"تعلیم یافتہ ہندوؤں کی چٹکی لی جاتی تھی، اور جب کبھی اہلِ مغرب کے سامنے اپنے

مذہبی عقائد اور قومی دھرم کا اظہار کرتے تھے، طعن و تشنیع کی صدا گوش زد ہوتی تھی۔"

اس کے بعد یہی مقرر یہ اطلاع دیتے ہوئے، کہ

"مگر اب زمانہ بدل گیا۔"

بدلے ہوئے زمانہ میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے، کہ اب

"زیادہ تر تعلیم یافتہ ہندو اپنے مذہب پر دل و جان سے فدا ہیں، اور لائق سے لائق جماعتوں میں اپنے عقیدوں کے ثابت کرنے میں مطلق شرم نہیں کرتے۔"

پھر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ ہندو مذہب کے شاستروں اور کتابوں کی کس مپرسی کا زمانہ گذر گیا، اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ

"قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا جا رہا ہے، غور سے وہ پڑھی جا رہی ہیں۔ بہت اعلیٰ درجہ کی کتابیں چھپ گئیں، اور چھپتی چلی جا رہی ہیں۔ بہتوں کا انگریزی اور دیسی بھاشاؤں میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اور زمانہ حال کی تحقیقاتی معلومات کے زیر اثر ان کی تشریح کی جاتی ہے۔" ص۳۰

یہ ہے تاریخ کے دریدہ اوراق کا ایک ٹکڑا۔ یہ اقتباسات جن صاحب کی تقریر کے ہیں، ان کا نام تھا، کرنل اسکاٹ صاحب، یہ کون تھے، کہاں کے تھے۔ ان تفصیلات کو تو چھوڑیے۔ لیکن کرنل کے نام کا جو جز ہے، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ کسی زمانہ میں شاید فوجی خدمت سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی صاحب ہیں، جو دنیا کی مشہور نام نہاد مذہبی سوسائٹی تھیاسوفیکل کے بانی تھے۔ میڈم بلیوٹسکی کی مددگار اور معاون تھیں۔ ہندوستان میں تو خود ان کی تشریف فرمائی ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ لیکن اس سوسائٹی اور اس کی شاخیں ۱۸۸۱ء سے بہت پہلے امریکہ اور یورپ میں قائم ہو چکی تھیں۔ سنا ہے یہی میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ میں ہندوستان کے "بودھ مذہب" کا پیرو ہوں۔ مسز اینی بیسنٹ ان ہی کرنل اسکاٹ کی ہندوستان میں جانشین بن کر نمایاں ہوئی تھیں۔ ہندو کالج بنارس جو اب ہندو یونیورسٹی ہے، اس کے سوا مسز اینی بیسنٹ ہی نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں نت نئے ناموں سے مختلف تعلیمی اور دینی ادارے جاری کئے۔ مدراس میں بمقام اڈیار میلوں میل کے رقبہ میں ہندو کے

کے کنارے ایک آشرم یا خانقاہ بھی ان کی قائم کی ہوئی اس وقت تک موجود ہے، جس میں گو دنیا کے اکثر مذاہب کی نمائندگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن دراصل چھاپ اس پر ہندو دھرم ہی کی ہے۔

بہرحال یہی کرنل اسکاٹ صاحب ہیں، جنہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے، ہندوؤں کی نئی انقلابی ذہنیت کا اعلان مذکورہ بالا الفاظ میں کیا۔ اور یہ سب کچھ فرمانے کے بعد آخر میں مجمع کے واقف کار شریف ہندو صاحبوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ یہ ذہنی انقلاب جو ہندوؤں میں پیدا ہوا، اور بیداری کی نئی لہر اپنے آبائی اور موروثی دین کے متعلق ان میں جو اٹھی، اور جو نتیجے اس سے پیدا ہوئے۔

"ان تسکین بخش نتیجوں کی تکمیل کہاں تک تھیاسوفیکل سوسائٹی کے ذریعہ ہوئی ہے، آپ خود کہہ سکتے ہیں، میرے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" صفحہ

تاریخ کے پھٹے ہوئے ورق کا تو یہ ایک ٹکڑا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۲)

تھیاسوفیکل سوسائٹی اور اس کی شاخیں امریکہ اور یورپ میں قائم ہو رہی تھیں، لیکن اس سوسائٹی اور اس کی مختلف شاخیں جن کا جال یورپ و امریکہ کے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے لئے سردار اور امام، حاکم، گرو اور استاد کی جگہ خالی تھی، کہ اچانک امریکہ و یورپ کے اخباروں میں ایک اعلان شائع ہوتا ہے، یہی کرنل اسکاٹ صاحب جو سوسائٹی کے بانی مبانی اور روح رواں تھے، ان ہی کا اعلان شائع ہوتا ہے، کہ ایک شخص، جو قطعی طور پر انگریزی زبان کے ایک حرف سے بھی آشنا نہ تھا۔ نہ یورپ کی دوسری زبانوں میں سے کسی زبان سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتا تھا، جس نے نہ یورپ ہی کو دیکھا تھا، اور نہ امریکہ کو اور شاید امریکہ و یورپ کے باشندوں سے اس کے تعلقات بھی نہ تھے، وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی عام بولی جانے والی زبانوں میں بجز گجراتی زبان کے اور کسی زبان کو نہیں جانتا تھا۔ خانگی طور پر متھرا کے بعض پنڈتوں سے البتہ سنسکرت زبان کی ادبی تعلیم اس نے کچھ

حاصل کی تھی۔ خود اس کی زندگی میں ایسی عام باتیں یعنی کہاں کا رہنے والا ہے، کس خاندان سے اسکا تعلق ہے، ان باتوں کا صحیح علم لوگوں کو نہ تھا اور باوجود بلیغ کوششوں کے آج تک اسکی زندگی کے یہ ابتدائی سوالات تقریباً کچھ نافیصل شدہ شکل ہی میں ہیں۔ سناٹا چھا گیا، دنیا میں سناٹا چھا گیا، جب تھیاسوفیکل سوسائٹی اور یورپ وامریکہ میں اس کی پھیلی ہوئی ساری شاخوں کی طرف سے یہ اعلان پڑھا گیا، کہ ہندوستان کے اسی شخص کو

"ہم اس سوسائٹی کا سردار اپنا بڑا گرو رہنما اور حاکم قبول کرتے ہیں۔"

(کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم ص۵۵)

یہ پراسرار شخصیت پنڈت دیانند سرسوتی مہاراج کی تھی، جو آریہ سماج کے مشہور بانی اور بزرگ سمجھے جاتے ہیں وہی غریب مشرقی اور مشرقیوں میں بھی مسکین ہندوستانی جس کے سینے تقریباً ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ سے چھیدے جا رہے تھے۔ بے دردی کے ساتھ برسانیوالے اس قسم کے تحقیری تیروں کے برسانے کے عادی تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ

"یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں ہندوستان وعرب کے سارے علم وادب کے برابر ہیں۔"

دلوں میں تیز تیروں کی ایسی انیاں چبھی ہوئی تھیں۔ کہنے والے کہتے پھرتے تھے کہ

"ایک انگریز نیم حکیم عطائی کے لئے (ہندوستانی طب) موجب ننگ وعار ہے۔"

صبح وشام قہقہوں کے ساتھ اس قسم کے فقرے دہرانے والے دہراتے رہتے تھے، کہ

"ان کو (ہندی معلومات نجوم وافلاک) کو پڑھ کر انگلستان کے زنانہ مدرسہ کی لڑکیوں کی ہنسی رک نہیں سکتی۔"

یہ فقرے لارڈ میکالے کی اس مشہور تعلیمی رپورٹ میں استعمال کئے گئے ہیں، جو ہندوستان کے متعلق لاٹ صاحب ممدوح نے تیار کرکے حکومت میں پیش کی تھی۔

اور یہ تو ادنیٰ نمونہ ہے، ان نکو ہیدہ کوششوں کا جن کے ذریعہ ہندوستان کے باشندوں کے

قلوب میں اپنی اور اپنے اسلاف کی ہیچ میرزی، کم مائگی کی تخم پاشی میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور نئی قائم ہونے والی حکومت لگا رہی تھی۔ درد کی یہ داستان کافی طویل ہے۔

یہاں مجھے کہنا یہ ہے، کہ جس یورپ وامریکہ کے متعلق یہ باور کرایا جا رہا تھا۔ کہ وہاں کے زنانہ مدرسوں کی لڑکیاں بھی اپنی ہنسی کو ہندوستانی دل ودماغ کے علمی اور فکری نتائج کو سن کر روک نہیں سکتیں، تاریخ کے ہزار ہا ہزار سال کی سر مغزیوں اور دماغ کاویوں کے بعد بھی علم کی جن شاخوں کے متعلق اس ملک کے باشندوں نے جو کچھ بھی سوچا سمجھا، لکھا پڑھا تھا، اعلان کر دیا گیا تھا، کہ یورپ وامریکہ کی موجودہ تحقیقاتی تالیفات وتصنیفات کے مقابلہ میں ان کی کوئی قدر وقیمت باقی نہیں رہی ہے، جہل وحماقت کے سوا وہ اور کچھ نہ تھے، سوچنے کی بات ہے کہ اچانک اسی جہل کدہ اور حمق زار ہند کی ایک انفرادی شخصیت کے علم وفضل کا صرف اعتراف ہی نہیں کیا گیا، بلکہ تھیا سوفیکل سوسائٹی جو اس زمانہ میں قدیم وجدید علوم ومعارف کے بڑے بڑے مستند ماہرین اور مسلم الثبوت فضلاء کی یورپ و امریکہ میں کافی باعظمت سوسائٹی سمجھی جاتی تھی، اسی سوسائٹی کا "بڑا گرو، رہنما، حاکم" تسلیم کر لیا گیا، ہندوستان کے اخباروں میں یورپ کے اخباروں سے منقول ہو کر جب یہ خبر شائع ہوئی ہوگی، ہندو قوم کے دل شکستہ، پست حوصلہ تعلیم یافتہ طبقات کے نفسیات پر اس خبر کا جو اثر مرتب ہو سکتا تھا، شاید موجودہ حالات میں ہم اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ملک کے اس سپوت فرزند کی علمی عظمتوں سے قلوب اگر لب ریز ہو گئے، تو جس طریقہ سے خبر کی اشاعت کی گئی تھی، اس کا یہ لازمی منطقی نتیجہ تھا خصوصاً جب یہ سوچا جاتا تھا کہ دوسروں سے کچھ لئے بغیر صرف اپنے خانہ ساز گھر کے علوم سے اس غیر معمولی وقار وعزت کے حاصل کرنے میں وہ ان ممالک میں کامیاب ہوا ہے، جہاں سمجھا جاتا تھا کہ جہل وحماقت، الٰہی اور نادانی کے سوا ہندوستان میں نہ پہلے کچھ تھا، اور نہ اب کچھ ہے۔

بہرحال دیکھا گیا کہ متھرا کے ایک نابینا پنڈت ورجانند جنہیں پندرہ روپے کی امداد کسی راجہ سے ملتی تھی، ان ہی کے خانگی پاٹھ شالہ کا ایک طالب علم یا برہمچری جس نے سنسکرت کے سوا کسی سے کچھ نہ پڑھا تھا، نہ سیکھا تھا۔ اچانک وہی، بمبئی کے جسٹس رانا ڈے کے کبھی مہمان بنا اور کبھی احمد آباد میں ایک دوسرے مرہٹہ

نج رائے بہادر پنڈت گوپال راؤ ہری دیش مکھ کی دعوت پر ایک مہینہ ان کے ساتھ راز و نیاز میں بسر کرتے ہیں۔ کلکتہ کے مشہور ممتاز تعلیم یافتہ افراد کیشب چندر سین مہرشی دیبندر ناتھ ٹیگور بابو راج نارائن بوس وغیرہ سب ان کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ الغرض جس بڑے شہر میں جاتے ہیں، وہاں کے تعلیم یافتہ ہندو جن میں پچھتر فی صدی افراد کا بقول اسکاٹ صاحب اپنے موروثی دھرم پر اعتماد باقی نہ رہا تھا اور اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لئے اطمینان کے کسی نئے سرمایہ کی تلاش میں تھے، ان کو دیکھا جا رہا تھا کہ وہ پنڈت جی کو شمع محفل بنا کر خود پروانے بن بن کر ان پر اس لئے ٹوٹ رہے ہیں، کہ ان کو اپنے گھر ہی میں ایک ایسی شخصیت مل گئی۔ جسے یورپ و امریکہ کے اہل علم و فضل اپنا گرو، اپنا رہنما، اپنا عالم تسلیم کر چکے ہیں، ان ہندو تعلیم یافتوں میں اس وقت تک زیادہ سے زیادہ ایسے اشخاص تو پیدا ہو چکے تھے۔ جنہوں نے شاگرد بن کر یورپ و امریکہ کی جدید یونیورسٹیوں سے سند حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، لیکن مغربی ممالک کی ان جدید یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں نے بھی جسے اپنا گرو اور استاد مان لیا ہو۔ ان ہی میں کیا شاید پورے مشرق میں پنڈت دیانند سرسوتی جی اس کی اپنی آپ مثال تھے۔

پنڈت جی کو یورپ کے ان نئے تعلیم یافتہ ہندو مفکرین، جن میں مذہبی اور سیاسی مختلف مذاق رکھنے والی ہستیاں تھیں، ان سے کیا کیا مشورے ملے، یا ان کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر خود پنڈت جی کے دماغ میں کس کس قسم کے نئے خیالات پیدا ہوئے۔ میرے لئے اپنی اس کتاب میں سب کی نہ تفصیل کا موقع ہی ہے، اور سچی بات یہ ہے، کہ درون پردہ کی ان سرگوشیوں تک ہر کہ و مہ کی رسائی آسان بھی نہ تھی، لکھنے والوں نے پنڈت جی کی سوانح عمریوں میں کچھ لکھا بھی ہے، تو مشتے از خروارے سے زیادہ نہ وہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

پنڈت جی کو یورپ و امریکہ کی تھیاسوفیکل سوسائٹیوں کے صدر الصدور بنا دیں اکبر بنانے کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کرنل اسکاٹ زمانہ تک ہندوستان سے باہر ہی رہ کر کام کرتے رہے۔ اس عرصہ میں دیکھا گیا، کہ پنڈت جی جو پہلے سنسکرت زبان میں تقریر کیا کرتے تھے، کلکتہ کے

بابو کیشب چندر سین کے مشورے کے مطابق ایسی عام فہم زبان میں تقریر کی مشق بہم پہنچائی، جسے تعلیم یافتہ طبقہ ہندوؤں کا سمجھ سکتا تھا، ان تقریروں میں کیا ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ رگ وید اور یجروید کی ان تفسیروں (بھاشیہ) سے ہوتا ہے، جسے لکھ لکھ کر اس زمانہ میں پنڈت جی شائع کرتے رہتے تھے، اور پروفیسر میکس مولر نے جن کو "عجائبات کا ذخیرہ" قرار دیا تھا۔ اور سنسکرت زبان و علوم کے مستند استاذ پروفیسر ڈاکٹر ایچ۔ ڈی گرد سولڈ ایم۔ اے نے اپنی رائے یہ دی تھی کہ

"سوامی جی وید کے وہی معنی لگا لیتے ہیں، جن سے ان کا مطلب نکلتا ہے (گویا ان کو وید کے الفاظ پر حاکمانہ تصرف کے اختیارات حاصل ہیں)۔" ص۱۹۹

گرد سولڈ صاحب ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"تفسیر کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ اپنے خیالات ان کتابوں میں داخل کر دیئے جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ مصنف کے خیالات کو کتاب کی عبارت سے اخذ کیا جائے۔"

پنڈت جی کی تفسیری خصوصیت کی تعبیر یہ کی تھی کہ وہ یعنی پنڈت جی

"جس عبارت سے جو مطلب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔"

جیسا کہ پنڈت پانڈورنگ صاحب ایم۔ اے نے جو سنسکرت کے مستند فاضل تھے، اپنی رائے پنڈت جی کی تفسیروں کے متعلق یہ ظاہر کی تھی۔

"ان کی تفسیر میں وید کا اصل مطلب تو نہیں ہے، بلکہ وہی مطلب ہے جس کو وہ چاہتے تھے، کہ وید میں ہونا چاہیئے۔" ص۲۱۲

واقعہ یہ ہے کہ تمدن و تہذیب، سیاست و تدبر تحقیق و تلاش کے جن نتائج تک یورپ پنڈت جی کے زمانہ میں پہنچ چکا تھا، صرف ان ہی کے متعلق نہیں بلکہ قیامت تک ان راہوں میں جن نتائج تک پہنچنے کا عقلی امکان ہے، یا آدمی جن کو فرض کر سکتا ہے۔ کھلے کھلے صاف صاف لفظوں میں پنڈت جی نے اصرار کے ساتھ اس دعوے کا اعلان کیا کہ ہمارے ویدوں میں سب کا ذکر موجود ہے، اور گذشتہ زمانہ میں وید کی ماننے والی قوم یہ سب کچھ کر کے ختم کر چکی ہے۔

ویدکی عبارتوں سے مطلب برآری کے حاکمانہ اقتدار کے بعد ظاہر ہے کہ پنڈت جی نے جو کچھ کیا اس کی بھی زیادہ کیا جاسکتا ہے، اور خواہ وید کی عبارتوں سے واقعی وہی مطالب نکلتے ہوں جنھیں پنڈت جی نکالتے تھے، یا نہ نکلتے ہوں لیکن اپنے آبائی دھرم کے دائرے سے ہندوؤں کا جو تعلیم یافتہ طبقہ باہر نکل چکا تھا، اور نکلنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی، جیسا کہ کرنل اسکاٹ صاحب کی شہادت گذر چکی، نکلنے کے بعد نکلے ہوئے بھی واپس ہونے لگے، اور آئندہ نکل جانے کا خطرہ بہت حد تک کم ہوگیا۔

بعد کو کرنل اسکاٹ صاحب اپنے مانے ہوئے گرو، حاکم ورہنما سے ملنے کے لئے ہندوستان بھی پہنچے۔ سہارنپور اور میرٹھ جو زیادہ تر پنڈت جی کی علمی جدوجہد کی آماجگاہ تھے۔ کرنل صاحب کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی دونوں مقامات میں باہم دونوں کی ملاقات ہوئی، یہ لکھتے ہوئے کہ

"۳۰ اپریل کو بمقام سہارنپور واقع ممالک مغربی وشمالی سوامی (پنڈت دیانند) سے پہلے پہل ہماری ملاقات ہوئی"

آگے کرنل صاحب کی ڈائری کے الفاظ ہیں

"ہمارے اور سوامی جی کے درمیان لمبی اور پرجوش بحثیں ہوئیں"

سہارنپور کے بعد لکھا ہے کہ

"۳، ۴، ۵، ۶، مئی کو میرٹھ میں ہوتی رہیں" ص۲۵

یہ قصہ کہ براہ راست ملاقات کے بعد اسکاٹ صاحب اور پنڈت جی کے تعلقات میں کیا تغیرات ہوئیں اور ان تبدیلیوں کا کیا مطلب تھا، یہ ارادی تبدیلیاں تھیں، یا بخت واتفاق کی پیداوار تھیں یہ سارے مسائل میرے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ اس موقعہ پر ذکر کرنے کی بات یہ ہے، کہ کرنل صاحب اور سوامی جی کی ملاقات سے چار پانچ سال پہلے، جب سارا ہندوستان پنڈت جی کے ان عجیب وغریب لکچروں، تقریروں کتابوں کے ذکر سے گونج رہا تھا۔ جن میں ثابت کیا جاتا تھا کہ آج یورپ والوں کے پاس توپ بندوق، دخانی گاڑی، دخانی جہاز تاربرقی جو کچھ دیکھا جارہا ہے، یا آئندہ جن اکتشافات

کی توقع کی جاتی ہے، یہ سب کچھ ہندوستان میں موجود تھا، ساری دنیا کا پایۂ تخت ہندوستان ہی تھا، یورپ و امریکہ افریقہ اور ایشیا کے سارے ممالک ہندوستان کے باجگذار مقبوضات تھے الخ لیک کر سنسکرت کے مجہول فقروں سے اسی قسم کے معلومہ نتائج پنڈت جی پیدا کرتے تھے، گو اس زمانہ میں اردو اور ہندی اخباروں کا چرچا زیادہ تو ملک میں نہ تھا۔ لیکن ہفتہ وار اخبار مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے تھے، جن میں پنڈت جی کی ان محیر العقول تقریروں کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔

ان تقریروں کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً پنڈت جی کی تصنیف کردہ کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں، ٹھیک ۱۸۷۵ء جو ہجری کے حساب سے ۱۲۹۲ھ کا سال تھا۔ بنارس سے بزبان ہندی ایک کتاب شائع ہوئی، اسی کا نام "ستیارتھ پرکاش" تھا۔ اور لکھا ہوا تھا "شری سوامی دیانند جیت" یعنی سوامی دیانند جی کی لکھی ہوئی ہے۔ نویدن یا بشارت کے عنوان کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔

"یہ پستک شری سوامی دیانند سرسوتی نے میرے دربہ (خرچ) سے رچی ہے۔ میرے ہی دربہ (خرچ) سے یہ ملات ہوئی (یعنی شائع ہوئی)"

نویدن کے عنوان سے یہ اعلان نئی قائم ہونے والی حکومت کی ایک بڑی خطاب یافتہ ہستی

"شری راجہ کرشن داس بہادر سی، ایس۔ آئی"

کی طرف سے کیا گیا تھا جن کی مہر بھی کتاب پر ثبت ہے،

جس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے سی۔ ایس۔ آئی راجہ صاحب بہادر نے باضابطہ اجرت دے کر یہ کتاب پنڈت جی سے لکھوائی اور اپنے ذاتی مصارف سے ان ہی راجہ صاحب نے اس کو طبع کرا کے شائع بھی کیا تھا۔

یوں تو اردو اور ہندی اخباروں کے ذریعہ پنڈت جی اور ان کے خیالات کی عام اشاعت سے لوگوں کی عام توجہ ان کی طرف منعطف ہو ہی چکی تھی۔ آج پنڈت جی نے سہارنپور میں یہ کہا، میرٹھ میں یہ بولے، کانپور میں یہ اشتہار شائع کیا۔ داناپور (بہار) میں ان کی تقریر اس موضوع پر ہوئی، ان عام

خبروں کے ساتھ ساتھ جوں ہی کہ یہ کتاب طبع ہو شائع ہو کر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچی' تو ایک طرف خود ہندوؤں اور ان کے مختلف فرقوں میں تہلکہ مچا ہوا تھا' ان کے دینی پیشواؤں' ان کی کتابوں' ان کے عقائد پر تنقید ہی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ شرفاء کے کان جن الفاظ کے سننے کے عادی نہ تھے' اور جن فقروں کو شاید بے غیرت سے بے غیرت آدمی بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا' نہ معلوم پنڈت جی نے اپنی کن مصلحتوں کی بنا پر انکے استعمال میں غیر معمولی فیاضی سے کام لیا تھا' خیر یہ تو جو کچھ تھا گویا پنڈت جی کا خانگی جھگڑا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ اپنی اسی کتاب میں پنڈت جی نے علاوہ ہندوؤں کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے دین' ان کی آسمانی کتابوں' اور ان کے پیغمبروں کی بھی خبر لی ہے۔ ستیارتھ پرکاش کا پہلا ایڈیشن ہندی زبان میں شائع ہوا تھا۔ اسی لئے براہ راست عام مسلمانوں کے مطالعہ میں وہ کتاب تو نہ آسکی' لیکن بعد کو اسی کتاب کے اردو ایڈیشن میں پڑھنے والوں نے وہ سب کچھ پڑھا جس کا شاید تصور بھی نہیں کرسکتے۔

کچھ بھی ہو ۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد پندرہ بیس سال کے اندر تھوڑے بہت سکون کی کیفیت ملک میں جو پیدا ہو گئی تھی۔ پنڈت دیانند جی کی تقریروں اور تحریروں کی بدولت پھر ملک میں نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جو باتیں پنڈت جی کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں پھیل رہی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ انوکھا اور نرالا بلکہ صحیح معنوں میں حد سے زیادہ طیش آفرین' بوکھلا دینے والا غیظ انگیز الزام یہ تھا جو ستیارتھ پرکاش میں آج بھی بایں الفاظ پایا جاتا ہے۔

"خدا اور مسلمان بڑے بت پرست اور پورانی (یعنی سناتن دھرمی ہندو) اور جینی یعنی جین مت کے پیرو چھوٹے بت پرست ہیں"۔ (سمولاس ۱۲ ـ ۱۱۲-

اسلام اور مسلمانوں کے دین پر تنقیدوں یا اعتراضات کے قصوں میں کہنے والے بہت کچھ کہتے چلے آرہے تھے' لیکن اس کی طرف تو شاید اسلام کے بڑے بڑے ائمہ اخصام کا دھیان کبھی کبھی نہیں گیا ہوگا کہ اسلام جیسے خالص توحیدی دین پر شرک کی بدترین شکل بت پرستی کا بہتان بھی کبھی باندھا جاسکتا ہے۔ اپنی ساری ذہنی بلند پروازیوں' اور افتراء و بہتان کی انتہائی چابکدستیوں کے باوجود یورپ والوں کے

حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔

لیکن پنڈت جی کی ذہانت واقعی قابل داد ہے کہ دن کی روشنی کیلئے جو سب کے سامنے پھیلی ہوئی تھی، دعویٰ لے کر اٹھے کہ نہ ہی صرف رات ہے۔ سخن سازی کہئے یا سینہ زوری کی یہ اپنی آپ مثال تھی ہندستان کی اسلامی آبادی پنڈت جی کے اس اعتراض سے تلملا اٹھی۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے پنڈت جی اور ان کی "آریہ سماجی" تحریک کا ذکر کرتے ہوئے، جو کچھ لکھا ہے صرف یہی لکھا ہے کہ

"ہندوؤں میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جو مسلمان جیسے موحدوں کو مشرک بتلانے لگا" ص۱۲۳

پنڈت جی کی اس ستم ظریفی کے نتائج و آثار کا تخمینہ آج مشکل ہے۔ لیکن اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں اس اچھوتے الزام کی پہلی آواز تھی۔ جو مسلمانوں کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اس زمانہ کے اخباروں کے پرانے فائل کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ شمال سے جنوب تک اور شرق سے مغرب تک ہندوستان کے طول و عرض میں ہلچل مچی ہوئی تھی، مسلمانوں کے ہر گھر میں اسی کا چرچا تھا۔

ادھر مدت کے بعد ہندوستان میں پادریوں کے بازاری واعظوں کے ساتھ ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ کے سلسلہ میں اس ملک کی ایک رسم کہن نے تازہ جنم لیا تھا، قصہ تو اس کا طویل ہے مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے، کہ مناظرہ یعنی مختلف عقائد و اعمال رکھنے والے مذہبی فرقوں کا تحریراً یا تقریراً واقعی اس لئے بحث و مباحثہ کرنا تی الوسع حق تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے اس کا سلسلہ جاری ہے، اور جاری رہے گا۔ لیکن مناظرے کے مقابلہ میں دوسرا اصطلاحی لفظ "مکابرہ" کا جو پایا جاتا ہے جس میں بحث کرنے والوں کے سامنے صرف "ہم بڑے کہ تم بڑے" کے سوا اور کوئی بلند نقطۂ نظر نہیں ہوتا۔ ہر فریق پہلے ہی سے طے کئے ہوتا ہے اگر کچھ بھی ہو، بہر حال فلاں مذہب کو غالب کر کے دکھانا ہے۔ اسی پر کوشش مرکوز رہے گی، گویا مذہب کی طرف سے وہی فرض انجام دیا جاتا ہے، جو کام آج کل کی عصری عدالتوں میں وکلاء اور بیرسٹروں کا طبقہ انجام دیتا ہے جس کی فیس لے لی جاتی ہے۔ اسی کی حمایت سمجھا جاتا ہے کہ وکیلوں

اور سیر سشروں کا منصبی فریضہ ہے۔

دوسرے ممالک سے اس وقت بحث نہیں لیکن ہندوستان کی دینی تاریخ کی ممتاز ہستی شنکر آچاریہ کی مذہبی معرکہ آرائیوں کی داستانیں جن کتابوں میں ملتی ہیں، ان کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے سارا ملک مذہبی اور دینی کشتی گیروں کا گویا دنگل بنا ہوا تھا[۱] اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں تو مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے درمیان اس قسم کی مکابرانہ یا دکیلانہ کش مکشوں کا پتہ نہیں چلتا، لیکن پنڈت دیانند سرسوتی جی کے گرو متھرا نواسی پنڈت ورجانند کے جو حالات سوامی دیانند کی سوانح عمریوں میں ملتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے پنڈتوں میں شاید موروثی طور پر مذہبی مباحثوں کا ذوق منتقل ہوتا چلا آتا تھا[۲]، پنڈت دیانند سرسوتی نے

[۱] کہتے ہیں کہ بدھ مذہب اور جین مت کے ماننے والے اہل علم و فضل سے سارے ہندوستان میں گھوم گھوم کر شنکر اچاریہ نے مقابلہ کیا تھا، بڑی بڑی راجے مہاراجے اپنی سرپرستی میں گفتگو کراتے تھے، اور شکست خوردہ بودھی اور جینی دوانوں کے متعلق واللہ اعلم بالصواب یہ قصے کہاں تک صحیح ہیں، کہ کھولتے ہوئے گرم تیل کے کڑاہوں میں ان کو تلوا دیا جاتا تھا، سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی ہے کہ سنگدلی اور قساوت قلبی میں انسانیت گرتے ہوئے اس حد تک بھی پہنچ سکتی ہے، شنکر آچاریہ کے ان مباحثوں کا تذکرہ "دگ وجے" یا "شنکر وجے" سنسکرت زبان کی جن کتابوں میں کیا گیا ہے۔ براہ راست ان کتابوں تک تو میری رسائی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان ہی کتابوں کے حوالے سے بیان کرنے والوں نے کچھ باتیں بیان کی ہیں۔ پچھلے مورخین کا ایک طبقہ ان دونوں کتابوں کے تاریخی استناد کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس موقعہ پر ضمناً ایک بات کا خیال آگیا، ویدانتی وحدت الوجود جسے ہندوستان کے مذہبی حلقوں میں کافی حسن قبول حاصل ہوا۔ کہتے ہیں کہ شنکر آچاریہ ہی نے ویدیا گیتا کے بعض اشارات کو بنیاد بنا کر ایک مستقل نظریہ کا قالب عطا کیا۔ سنی ہوئی افواہی روایات سے متاثر ہونے والے بعض مسلمانوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے صوفیوں میں وحدت الوجود کا خیال ہندوستان کے اسی ویدانتی نظریہ کا عکس ہے، مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ خود شنکر آچاریہ ملیبار میں اس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جب اسی ملیبار میں تقریباً دو سو سال پہلے اسلام پھیل چکا تھا، اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی کافی اشاعت ہو چکی تھی۔ ۱۲

[۲] انگریزی زبان میں پنڈت دیانند سرسوتی جی کی ایک ضخیم سوانح عمری باوا چھجو سنگھ کی لکھی ہوئی پائی جاتی ہے، اسی کتاب کے حوالے سے کتاب "سوامی دیانند جی اور ان کی تعلیم" میں پنڈت ورجانند سرسوتی جی کے گرو کے متعلق اس قسم کے قصے نقل کئے گئے ہیں کہ مسٹر الکزنڈر کلکٹر سے پنڈت ورجانند نے مل کر یہ درخواست کی کہ کرشن شاستری جو ان کا مقابل تھا، اس سے میرا مباحثہ کرایا جائے، دو سیٹھ جو خاندان کرشن شاستری کا طرفدار تھا اس پر (باقی اگلے صفحہ پر)

جو کچھ بھی پڑھا تھا، پنڈت ورجانند ہی سے پڑھا تھا۔

پنڈت ورجانند کی سیرت و کردار سے ان کا متاثر ہونا محل تعجب نہیں ہو سکتا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ جب شروع شروع میں پڑھ کر وہ باہر نکلے پتہ چلتا ہے کہ پنڈتوں سے مناظرہ اور مباحثہ ہی میں گذرتا تھا، خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں پنڈت دیانند جی نے ریاست جے پور میں اپنے کارنامہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"وہاں (یعنی جے پور میں) میں نے پرتھم وشنومت کا کھنڈن کر کے (یعنی اس کو غلط ثابت کر کے) شیومت کی استھاپنا کی (یعنی اس کو مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا)"

جے پوری میں وشنومت کے ایک پنڈت رنگاچاریہ نامی سے "شاستر ارتھ" یعنی مباحثہ یا موچھوں کی لڑائی کا پنڈت جی نے چیلنج دے رکھا تھا، اور بے چارے رنگاچاریہ کو پنڈت جی اس زمانہ میں لکھا ہے کہ رنڈاچاریہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔[۱]

بہرحال کہنا یہ ہے کہ پنڈتوں کے خاص دائرے کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن مسلمانوں کی حکومت کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں میں مکابرہ اور مجادلہ کا بازار کبھی گرم ہوا ہو۔ نہ عوام ہی میں اس نوعیت کے عام مذاق کا پتہ چلتا ہے، اور نہ سلاطین و امراء کی دوسری بازیوں کے ساتھ مذہبی نمائندوں کی گتھم گتھا کی اس بازی کا کسی نے ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ اکبر تک کے زمانہ میں بھی حالانکہ سب ہی کچھ ہوا۔ مذاہب عالم کے نمائندے اکٹھے کئے گئے، لیکن بادشاہ کی سرپرستی میں مناظرہ کا کوئی دنگل قائم ہوا تھا کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔

(گذشتہ صفحہ سے) پانچسو روپے کی پوری رقم مجھے دلائی جائے"۔ یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ ورجانند جو مذہب کے شیو فرقہ کے پنڈت تھے۔ ان کا مقابلہ دوسرے فرقہ وشنومت کے پنڈت سے ہوا اور ورجانند کو شکست ہوئی۔ شکست کے بعد نفرت اور غصہ کی حالت یہ تھی کہ وشنومت کی کتابوں کو ورجانند اپنی چارپائی کے نیچے ڈال دیا کرتے تھے، اور وشنومت کی ایک کتاب "سدھانت کومدی" کے مصنف کے متعلق ورجانند اپنے چیلوں کو حکم دیتے تھے کہ اس مصنف کے نام پر بھی اور اس کی تصویر پر بھی جوتیاں لگائیں۔ دیکھو سوامی دیانند اور ان کی تعلیم صفحہ مصنفہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی ۱۲

[۱] یہ ساری باتیں آپ کو اسی کتاب "سوامی دیانند اور ان کی تعلیم" میں کتابوں کے حوالے سے مل جائیں گی۔ ۱۲

مسلمانوں کے اقتدار کے ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے پادریوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں بیٹھ کر دوسروں کے عقائد و اعمال پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ جن کے بعد قدرتاً ان سے مقابلہ کے لئے بھی لوگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن عموماً یہ پادری جن میں زیادہ تر دیسی کالے رنگ والے پادری ہوتے تھے، جن کا علمی سواد بھی معمولی ہوتا تھا، اور کیا کہا جائے۔ لیکن جو واقعہ تھا، اس کا کیسے انکار کیا جائے کہ جن خاندانوں سے ان دیسی پادریوں کا عمل کرتے ہیں عیسائی مشنری کے لوگ کامیاب ہوا کرتے تھے، ایک تو موروثی روایات ہی ان کی عموماً پست ہوتی تھیں ثانیاً محض رفع حاجت کے لئے دین قبول کرنے والوں سے کردار کی بلندی کی توقع عام طور پر کرنی بھی نہ چاہیے۔

ہندوستان کے مروجہ مذاہب و ادیان پر اعتراضات کی ایک فہرست تیار کر لی گئی تھی، یہی فہرست ان کو رٹا دی جاتی تھی جس کا اعادہ کوچہ و بازار میں وہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دل دکھانے والی اعتراضوں کے ان گراموفونوں کی طرف اسلام کے سنجیدہ علماء توجہ کم کیا کرتے، سچی بات یہ ہے کہ ان سے گفتگو یا بحث و مباحثہ کو علمی وقار کے مناسب بھی عموماً خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

صرف غدر سے پہلے فنڈر نامی ایک مغربی نژاد پادری جو عربی اور فارسی یعنی مسلمانوں کی زبانوں کا ماہر تھا۔ جب وہ دندنانے لگا، اور شورش زیادہ بڑھی، تو پس پردہ گو ایک اور صاحب تھے لیکن گفتگو کرنے کے لئے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مشہور بانی حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی میدان میں اتر آئے تھے ۱۸۵۴ء میں ایک تاریخی مناظرہ بمقام آگرہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا جو ہوا تھا اس میں ایک طرف یہی فنڈر، اور دوسری طرف مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم تھے، اس مذہبی مناظرہ میں جیسا کہ مشہور ہے، فنڈر کو شکست فاش ہوئی تھی۔ مولانا رحمت اللہ نے عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کافی کتابیں عیسائیوں کے موجودہ تثلیثی دین کی تنقید و تردید میں لکھیں، جن میں بعض مصر میں بھی شائع ہوئیں، بلکہ سنا ہے کہ ان کی کتاب دعوت الحق کسی زمانہ میں مصر کے دینی مدرسوں کے نصاب میں بھی شریک تھی۔

سنجیدگی اور متانت ووقار کی گنجائش ہی کیا تھی گویا جیسی روح تھی ویسے ہی فرشتے۔ ہمارے مصنف امام نے بازاری پادریوں کا ذکر کر کے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"اسی زمانہ کے درمیان میں دہلی میں پادریوں کے وعظ کا چرچا تھا، اور مسلمانوں میں سے بعضے بے چارے اپنی ہمت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ نہ کرتا تھا۔" ص۲۲

اس عدم توجہ کا راز زیادہ تر یہی تھا کہ صحیح علمی طریقہ سے بحث ومباحثہ پادری کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ مغالطہ بازیوں مضحکہ انگیزیوں پر ان کی ساری کارروائیوں کا دارومدار تھا۔ لیکن بایں ہمہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کی تحقیر وتوہین میں بھی بازاری پادری اپنی ہرزہ درائیوں ژاژخائیوں کو آخری حد تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

سیدنا الامام الکبیر کے سینے میں جو دل تھا جب تک وہی دل اور دل کا وہی درد کسی میں نہ ہو، اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ حضرت والا پران یاوہ گوئیوں کی ان خبروں کو سن سن کر کیا گذر رہی تھی، کیا کیا جائے، ان دریدہ دہنوں کے منہ کس طرح بند کئے جائیں، منہ لگانے کے لائق ہوتے، تو خود ہی میدان میں اتر آتے۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ شروع میں جب ضبط کا یارا نہ رہا، تو جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیرؒ) نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو۔"

اور یہ کہ

"جہاں وہ لوگ (یعنی مسلمانوں کے وکلاء) بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو۔" ص۲۲

یہ قصہ کس زمانہ کا ہے مصنف امام نے اس کی تصریح تو نہیں کی ہے، لیکن بظاہر یہ اسی زمانہ کی بات ہے، جب منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع مجتبائی میں ۱۲۷۵ھ کے بعد ان ہی کے اصرار سے حضرت والا نے

تصحیح کا کام اپنے ذمہ لیا تھا، اور دلی میں دوبارہ قیام آپ کا اسی تعلق سے کچھ دنوں تک رہا تھا۔ کیونکہ عموماً اسی زمانہ میں شاگردوں کا ایک گروہ آپ کے گرد جمع ہوگیا تھا۔

مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ حسب ارشاد گرامی آپ کے شاگردوں نے بھی پادریوں کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کیا، بات نے غالباً طول کھینچا، اور باضابطہ مناظرہ یعنی دنگل کا چیلنج پادریوں کی طرف سے دیا گیا، اس زمانہ میں ایک کالے پادری ماسٹر تارا چند نامی کی دلّی میں خاصی شہرت تھی۔ مشہور ہوا کہ عیسائیوں کی وکالت ماسٹر تارا چند صاحب ہی کریں گے۔ اس خبر سے لوگوں میں گونہ تشویش پیدا ہوئی۔ خبر حضرت والا تک بھی پہنچی، حالانکہ ساری زندگی میں اس قسم کے بازاری غل غپاڑے مچانے والوں سے آویزش کا موقعہ بھی آپ کو کبھی نہیں ملا تھا، اور آپ کی بلند علمی شان کے مناسب بھی نہ تھا کہ اس قسم کے بازاری لوگوں کو اپنا مخاطب بنائیں۔ لیکن۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دلّی میں کسی وجہ سے اس مباحثہ کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی، حالانکہ خود اسی دلی میں عیسائیوں کے مناظرہ کے امام مولوی منصور علی صاحب موجود تھے۔ موجود ہی نہ تھے بلکہ مصنف امام نے خبر دی ہے کہ مناظرہ جب ہوا، تو دنگل میں دوسروں کے ساتھ یہ امام فن مناظرہ بھی مسلمانوں کی طرف سے وہاں حاضر تھے، مولوی منصور علی صاحب کا ان الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے کہ وہ

"فن مناظرہ بائبل کتاب میں یکتا ہیں"

اور یہ کہ

"بائبل (توریت و انجیل وغیرہ) کے گویا حافظ ہیں، اور ان کا طرز مناظرہ بھی جداگانہ ہے، آپ ان ہی کے (یعنی مولوی منصور علی صاحب کے) شاگرد بمقابلہ پادریوں کے دہلی میں وعظ کیا کرتے ہیں"

مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی مولوی منصور علی صاحب سے "اسی زمانہ سے (یعنی جس زمانہ میں یہ مناظرہ ہوا) ملاقات ہوئی" صفحہ ۲۲

بہرحال باوجود ان تمام باتوں کے صورت حال کچھ ایسی تھی کہ خود سیدنا الامام الکبیر کا فیصلہ ہوا، یا دوسروں نے آپ کو آمادہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو پادریوں کے اس مناظرہ میں حضرت والا کی شرکت ضروری ہے،

اللہ اللہ جو طے کئے ہوئے تھا کہ اپنے آپ کو خاک میں ملا کر رہوں گا، تاکہ مجھے کوئی نہ جانے اور جو کہتا ہو کہ جانوروں کے بھی گھونسلے ہوتے ہیں، لیکن میرے لئے یہ بھی نہ ہوتا، ساری زندگی جس کی اسی آرزو میں کٹی کہ کاش! کوئی میری ہوا تک نہ پاتا، عرض کر چکا ہوں، بار بار اسی کو دہرا چکا ہوں، وہ جتنا گھٹنا چاہتا تھا، بڑھانے والا اسی نسبت سے اس کو بڑھا رہا تھا، اس نے امامت سے انکار کیا، امام بنایا گیا۔ اس نے گوشہ گیری سے چھپنا چاہا، ہندوستان کے سحر البیان خطیبوں میں وہی شمار کیا گیا، وہ پڑھانا نہیں چاہتا تھا، لیکن سارے ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی دینی علوم کے پڑھنے پڑھانے کی سنت اسی سے زندہ ہوئی، جو کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا، اسی لئے غیر تو غیر خود مولویوں کے دائرے کے اختلافی مباحث و مسائل سے بھی اس نے بہت کم دلچسپی لی، لیکن آج ایک غیر مذہب کے مجادل و مکابر کا مقابل بن کر وقت کا تقاضا ہو رہا ہے کہ وہی میدان میں اترے۔ بقول شیفتہ

کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے۔

افسوس ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں پہلی دفعہ یہ صورت دلی میں جو پیش آئی تھی، جیسا کہ چاہئے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ مصنف امام کے بیان سے بس اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ بہرحال آپ پادری تارا چند سے گفتگو کرنے پر تو آمادہ ہو گئے، شرط صرف یہ رکھی گئی، کہ تارا چند ہی کو میرے نام اور میری شخصیت کا علم ہو، اور نہ عام پبلک کو۔ ایک عامی مسلمان کی حیثیت سے میں حاضر ہو جاؤں گا اور جو کچھ سمجھ میں آئے گا، عرض کروں گا۔ مصنف امام کی سوانح عمری میں اسی مناظرے کے متعلق یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں یعنی

آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) بے کسی صورت و شکل بنائے

اور اپنا نام چھپا جا موجود ہوئے "

ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے، آگے وہی اسی پادری تاراچند کا ذکر ان الفاظ میں کرکے کہ

" ایک پادری تاراچند نام تھا "

دلی سامنے آیا، اور رٹے رٹائے اعتراضوں کا زہر جیسا کہ دستور تھا، اسی کا آموختہ سنانے لگا، جواب دینے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے ایک ایسا آدمی کھڑا ہوا، جو ظاہری شکل و صورت سے مولوی بھی معلوم نہ ہوتا تھا، اور نہ پادریوں سے بحث و مباحثہ کرتے ہوئے دلی والوں نے کبھی اس کو دیکھا تھا، خود تاراچند پادری کے لئے بھی اس کی شخصیت اجنبی تھی، جوابی تقریر جس وقت ختم ہوئی، جیسا کہ چاہئے تھا، مجلس پر سناٹا چھایا ہوا تھا، مصنف امام کی خبر کے الفاظ ہیں کہ

" اس سے (یعنی تاراچند پادری سے) گفتگو ہوئی، آخر وہ بند ہوا، اور گفتگو سے بھاگا " ۲۲

امام فن مناظرہ مولوی منصور علی صاحب کا سیدنا الامام الکبیر سے تعارف نہ تھا۔ قدرتاً تقریر اور جواب کے نئے رنگ نئے ڈھنگ کو دیکھ کر حضرت سے آکر ملے، ظاہر ہے کہ ان سے اپنے آپ کو چھپانے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، حضرت والا اور مولوی صاحب سے پھر دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے، ان کو بڑی خوشی ہوئی، کہ ان کی پشت پناہی کے لئے ایک غیر معمولی علمی قوت میسر آگئی۔ آئندہ بھی ان کا ذکر آئے گا۔

دوسری خداداد دولتوں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی " فطرت فائقہ " اور " جبلہ بدیعہ " کا ایک نیا پہلو تھا، جو پہلی دفعہ تاراچند پادری سے گفتگو کرنے کے بعد دلی کے مسلمانوں کے سامنے آیا، صحیح طور پر دلی کے اس پہلے مباحثہ کی تاریخ تو معلوم نہ ہو سکی، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ قرائن کا اقتضاء یہی ہے، کہ ۵۷ء کے خلفشار کے فرو ہونے کے بعد جب گونہ امن اور اطمینان کا ماحول ملک میں پیدا ہوا، اسی زمانہ کی یہ بات ہے،

ادھر پادریوں کے رد و قدح، بلکہ اسلام کی تحقیر و توہین، اور مسلمانوں کی دل آزاری، اذیت رسانی کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ان ہی کی دیکھا دیکھی، جہاں تک میں جانتا ہوں، مراد آباد کے ایک گمنام آدمی

پنڈت لوگ جو تھوڑی بہت اردو فارسی زبانوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات اور روایات کا مطالعہ کر سکتے تھے ان کے دل میں بھی ہوک اٹھی، اور مسلمان جنہوں نے اپنے ایام حکومت میں آج تک ہندوؤں کے دین و دھرم کی تنقید یا تردید، جرح و اعتراض کو موضوع بنا کر کوئی مستقل کتاب ہی لکھی تھی، اور اپنی محدود معلومات کی بنا پر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ضمناً بھی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ان کی کتابوں میں مشکل ہی سے کیا گیا تھا۔ بلکہ برعکس اس کے کافی ذخیرہ ایسا موجود ہے، جس میں ہندوؤں کے دین و آئین کے متعلق ہمدردی اور حسن ظن ہی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ابوالفضل کی آئین اکبری ہی میں نہیں، بلکہ نقشبندیہ طریقہ جو اتباع سنت اور دینی صلابت میں تمام دوسرے صوفیانہ طریقوں میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، جس رنگ کو حضرت مجدد الف ثانی کی مجددیت نے بہت زیادہ نکھار کر چمکا دیا ہے، اسی نقشبندی مجددی طریقہ کے سرخیل حضرت مرزا جان جاناں اور ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں کے کلام میں ڈھونڈھنے والوں کو آج بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ مل سکتا ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

کچھ بھی ہو، دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کی دل آزاری، اولاً اسلامی دین کی روح کے بھی خلاف ہے، اور مسلمان مصنفوں نے اس روح کی رعایت کسی اور مذہب و دین کے ساتھ کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن ہندو دھرم کے ماننے والوں کو انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس باب میں مسلمانوں سے شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اس قوم سے مسلمانوں کا تعلق تقریباً ہزار سال سے قائم ہے، اور تعلق بھی حاکمیت و محکومیت کا، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، عام طور سے ہمارے مصنفین اس سلسلہ میں احتیاط ہی سے کام لیتے رہے، اور مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ جب تک مسلمانوں کا دور حکومت ہندوستان میں رہا، شاید ہندو مصنفین نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ناشائستہ کلمات کے استعمال سے پرہیز ہی کیا کم از کم میری واقفیت یہی ہے، جن زبانوں سے میں واقف نہیں ہوں، ان میں کچھ کہا گیا ہو۔ تو یہ الگ بات ہے۔

پہلی دفعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ نوک جھونک کا مسئلہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔

کمپنی قائم ہونے والی حکومت ہی کے عہد میں شروع ہوا۔ پنڈت اندرمن مرادآباد میں بیٹھے کچھ لکھا کرتے تھے اور مرادآباد ضلع ہی کے مشہور قصبہ کچھرایوں کے ایک عالم مولانا محمد علی صاحب ان کے مقابلہ میں ہندو مذہب کی تعلیمات و روایات پر تنقید کرتے تھے۔ مولانا کچھرایوی کی کتاب "سوط اللہ الجبار" شاید کسی مسلمان مصنف کی پہلی کتاب ہے جس میں دل کھول کر پنڈت اندرمن کے کلوخ کا جواب سنگ سے دیا گیا ہے۔ ان کے بعد غدر سے پہلے ایک نومسلم بزرگ کی کتاب "تحفۃ الہند"[1] شائع ہوئی۔

لیکن پنڈت اندرمن کی کچھ تو کم علمی، اور اس سے بھی زیادہ بے چارے کی ناداری و مفلسی، ساتھ ہی قلم تو خیر کسی حد تک ان کا چلتا تھا، مگر پبلک جلسوں میں بولنے یا تقریر کرنے کی صلاحیت کلیۃً نہیں رکھتے تھے۔ آئندہ خود ان ہی کا ذاتی اعتراف نقل بھی کیا جائے گا۔ ان کے افلاس اور بے کسی ہی کا نتیجہ یہ تھا، کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے نہیں، بلکہ مرادآباد ہی کے چند مقامی مسلمانوں کی درخواست پر مرادآباد کے مجسٹریٹ نے ان کی کتابوں کے ضائع کرنے کا حکم دے دیا۔ اور پانچسو روپئے جرمانہ

---

[1] خود اس کتاب میں مصنف نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہ اپنے موروثی دھرم کو چھوڑ کر دین اسلام انہوں نے کیوں قبول کیا۔ ہندو مذہب کی روایات پر بھی تنقید کی ہے، اور اسی کے ساتھ اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں شرک و بدعات کے جراثیم بری طرح جو پیوست ہو گئے تھے، ان پر بھی کافی حملے کئے گئے ہیں لکھا بھی ہے کہ مخاطب اس کتاب کے صرف ہندو نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمان بھی چونکہ ہیں۔ اسی لئے بجائے تحفۃ الہنود کے کتاب کا نام میں نے تحفۃ الہند رکھا ہے۔ البتہ اس کتاب کے آخر میں کوئی شیخ سلیم نامی صاحب کی ایک نظم بھی شریک کر دی گئی ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ یہ شیخ سلیم کون تھے، کہاں کے تھے۔ نظم کب لکھی گئی کس نے لکھوائی، لکھوانے کی ضرورت کیا تھی؟ ان سارے سوالوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ زبان بھی اس میں جو استعمال کی گئی ہے۔ شمالی ہند کے مسلمان عموماً اس زبان ہی کو استعمال کرتے ہیں، اور نہ پورے طور پر اس کو وہ سمجھ سکتے ہیں، ہاں تلسی داس کی رامائن کے سمجھنے والے ہندوؤں کی سمجھ میں خوب اچھی طرح آسکتی ہے۔ یہی مشہور نظم ہے جس کی ٹیپ کا بند "کہو یہ کون دھرم ہے" عجیب بات کہ قریب قریب ان ہی وزن کے لگ بھگ جنوبی ہند میں ایک نظم جنوبی ہند کے مسلمانوں کی عام بولی میں بھی شائع ہو کر پھیلی جس کے ٹیپ کا شعر یہ تھا۔ "یاد ہوئے گر تمہیں ہم کو بتاؤ برہمن + کاہے کو پھیرتے ہو ناحق پوجی پتھر تمن"۔ دکنی بولی کی اس نظم کا رنگ بھی وہی شیخ سلیم والی "نظم" کا سا ہے۔ تعدادوں ہی کو ہندوؤں کی قلوب میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ تحفۃ الہند میں یہ نظم ۱۲۹۲ھ میں چھپی، اور دکنی بولی والی نظم بمبئی میں ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوئی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی تاریخ میں یہ دونوں نظمیں شمالی و جنوبی ہند کی خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں ۱۲

جرمانہ سے طلب کیا گیا۔ لکھتے ہیں کہ مقدمہ کی اپیل کی گئی اور جج نے جرمانہ کے متعلق فیصلہ میں لکھا کہ "چونکہ وہ (ملزمین) غریب ہے اس لئے چار سو روپے معاف کئے گئے" جرم اس پر ثابت ہے اس لئے سو روپے بحال ہے۔[1]

ممکن ہے کہ اندرمن جیسے کچھ دوسرے نا پرساں حال گمنام لوگ دیگر طرف سے بھی اسلام کے خلاف تقریراً یا تحریراً لڑنے یا لکھنے کا سلسلہ نئی حکومت اور نئے قانون کی وجہ سے جاری رہا ہو لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، اس ملک کے عام آباد کاروں میں نہ کسی قسم کی ہلچل ہی پیدا ہوئی اور نہ عوام کی توجہ ہی ان مذہبی جھگڑوں رگڑوں کی طرف جیسا کہ چاہئے منعطف ہوئی۔

مگر جوں ہی کہ پرانے پنڈتوں کے اس حلقہ سے نکل کر جس کا سب سے بڑا مشغلہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے عقائد اور مسلمات کے منڈن اور کھنڈن (تائید و تردید) کے سوا اور کچھ نہ تھا، اچانک اسی حلقہ کے محدود دائرہ سے نکل کر یورپ و امریکہ کی تھیا سوفیکل سوسائٹیوں کے گرد و حالم کی شہرت کے ساتھ میدان میں پنڈت دیانند سرسوتی جی تشریف لائے۔ جن کو ہندوؤں کے بڑے بڑے سرکاری حکام اور لیڈروں کی سرپرستی بھی حاصل تھی، اور اچانک وہی جو ابھی چند دن پہلے وشنومت کے مقابلہ میں ہندوؤں کے شیومت والے فرقہ کی حمایت میں اپنے علم اور بیانی قوت کا زور دکھا رہے تھے، ان کو دیکھا گیا کہ دنیا کے سارے مذاہب ہی دنیا کے ماننے والوں پر برس رہے ہیں، ان کے مذاہب کی بھی اور ان کے پیشواؤں کی بھی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔

نہ گھر والوں کو چھوڑتے ہیں اور نہ باہر والوں کو، ایک طرف ہندوستان کے مقامی مذاہب سناتن دھرم، جین مت، بودھ مت والوں کو جو جی میں آتا تھا کہتے چلے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی کتاب قرآن اور ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں تحقیقات ایسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں، جنہیں ان سے پہلے نہ کانوں نے سنا تھا، اور نہ آنکھوں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا، دنیا دم بخود تھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور کیوں ہو رہا ہے مسلمان اور ہندو

---

[1] منقول از نامہ شاستر غازی محمود دھرمپال ص ۲۹۳ انہوں نے یہ الفاظ دیانند جی کی سوانح عمری سے نقل کئے ہیں ۱۲

توقیر مجبور تھے، معذور تھے، نہتے تھے، لیکن جس قوم کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت کی باگ تھی، اسی حکومت کے اس شاہی فرمان کی سیاہی بھی شاید ابھی خشک نہ ہوئی تھی، جس میں وقت کے حکمران نے اپنے آپ کو عیسائی مذہب کی پشت پناہ قرار دیتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ

"ہم کو مذہب عیسائی کے صدق کی نسبت یقین کلی حاصل ہے اور جو تسلی خاطر اس سے ہوتی ہے، اس کا بکمال شکر گزاری اعتراف ہے۔"

۱۸۵۸ء کی شورش کے بعد ملکہ وکٹوریہ کا جو عام فرمان باشندگان ہند کے نام شائع ہوا تھا۔ یہ فقرہ اسی میں موجود ہے، مگر با ایں ہمہ خدا ہی جانتا ہے کہ پنڈت جی کو آزادی کا ایسا پروانہ کیسے اور کہاں سے مل گیا تھا کہ اسی عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کے متعلق وہ ایسی باتیں نہ صرف عام مجمعوں میں کہنے پر جری تھے، بلکہ لکھ لکھ کر چھاپتے تھے، جنہیں نقل کرتے ہوئے آدمی کی انگلیاں کانپنے لگتی ہیں، آج بھی ستیارتھ پرکاش میں وہ موجود ہیں[1]۔ لیکن وہی حکومت جو غریب اندرمن کی کتابوں کو معمولی ایک اخبار جام جمشید نامی کے مطالبہ پر ضائع کر چکی تھی اسی کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ حالانکہ یہ کتاب ہندی اردو گورمکھی اور انگریزی زبان میں مسلسل شائع ہوتی رہی[2]۔

---

[1] مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر لکھا گیا ہے کہ "وہ غصہ ور تھا..... اس کی جنگلی آدمیوں کی سی خصلت تھی" یا یہ "ناممکن باتیں یسوع کی جہالت پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اسے (یعنی یسوع) کو کچھ بھی تمیز ہوتی تو ایسی بچوں جیسی وحشیانہ باتیں کیوں کہتا" یا یہ کہ "یوسف نجار بڑھئی تھا، اس لئے عیسیٰ بھی بڑھئی تھا، کئی ایک برس تک بڑھئی کا کام کرتا رہا بعد پیغمبر بنتا بنتا خدا کا بیٹا بھی بن بیٹھا" یہ اور اسی قسم کے الفاظ حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں، اسی طرح موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام لے کر لکھا ہے "اس کا چال چلن غصہ وغیرہ بدصفات سے پر ہے، وہ انسان کی جان کشی کرنے والا، جو چور کے مانند بدکار سزا سے گریز کرنے والا تھا"..... وہ دغلی بھی ضرور ہوگا" العیاذ باللہ "زناکار" تک کا لفظ ان کے متعلق استعمال کیا گیا ہے، عیسائی مذہب کو ردی مذہب، لمبے چوڑے گھوڑے پر عیسائی مذہب، وحشیانہ مذہب یہ سب جاہلوں کی باتیں ہیں، بجز چند ایک کے تمام خرافات سے بھرا ہوا، حد یہ ہے کہ عیسائیوں کے خدا تک کو نہ چھوڑا گیا۔ "وہ ایک گوشت خور شریر آدمی کے مانند ہے۔" ستیارتھ پرکاش کے باب ۱۳ میں یہ سارے الفاظ آپ کو مل جائیں گے۔ دل پر جبر کر کے خروار سے چند دانے بمشکل مجھ سے چنے گئے۔

[2] ۱۹۱۱ء تک بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیتالیس ہزار نسخے مختلف زبانوں میں اس کتاب کے شائع ہو چکے تھے، ہندی اڈیشن گیارہ مرتبہ اردو اڈیشن دس مرتبہ انگریزی چار مرتبہ گورمکھی چار مرتبہ اس وقت تک چھپ چکا تھا۔ ۱۲

یوں تو پنڈت جی کے لیکچروں کا یہ سلسلہ کئی سال سے جاری تھا۔ ہندؤوں اور عیسائیوں وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مناظرے اور مباحثے بھی ہوتے تھے۔ مناظرے اور مباحثے کے سلسلہ میں مدراس کے رہنے والے ڈاکٹر مرڈک ایم، اے نے اپنی کتاب "ویدک ہندوازم اینڈ آریہ سماج" میں پنڈت جی کے طریقہ کار کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ

"مباحثہ میں ان کا (یعنی سوامی دیانند کا) طریقہ یہ تھا کہ تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی اپنے ساتھ رکھتے تھے، جب وہ بآواز بلند اپنے مخالفوں کی ہنسی اڑاتے اور قہقہہ لگاتے تھے، تو اس کام میں یہ لوگ (منڈلی والے) ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔"

(منقول از سوامی دیانند اور ان کی تعلیم)

لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، پنڈت جی کی کتاب ستیارتھ پرکاش ۱۸۷۵ء عیسوی مطابق ۱۲۹۲ھ میں بنارس سے شائع ہوئی، اور جو کچھ پنڈت جی زبانی اپنی تقریروں میں اب تک بکتے پھرتے تھے، اسی نے مستقل تحریری لباس بھی پہن لیا، حکومت میں اس کی رجسٹری بھی کرائی گئی تھی، راجہ جے کرشن داس سی، ایس، آئی کے دستخط سے اسی اڈیشن میں یہ عبارت چھپی ہوئی ہے

"میری اور سے اس پستک کی رجسٹری قانون، ۲۰ ۱۸۶۷ء کے انوسار ہوئی ہے، سوائے میرے دیری آگیا کے اس پستک کے چھاپنے کا کسی کو ادھیکار نہیں ہے۔"

اسی سال ادھر یہ کتاب شائع ہوئی، اور ٹھیک اسی سال یعنی ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں ایک عام اعلان اخباروں میں بھی کیا گیا، اور علیحدہ اشتہارات بھی مختلف زبانوں میں تقسیم کئے گئے، عنوان تو ان اعلانوں اور اشتہاروں کا تھا

"میلہ خدا شناسی"

اصل مضمون تو مجھے نہ مل سکا، خلاصہ اس کا جیسا کہ کتاب "گفتگوئے مذہبی" میں لکھا ہے، یہ تھا کہ

"پادری نولس صاحب انگلستانی، پادری شاہ جہاں پور، اور منشی پیارے لال کبیر پنتھی ساکن موضع چاند پور متعلقہ شہر شاہ جہاں پور نے مل کر ۱۸۷۶ء میں ایک میلہ بنام میلہ خدا شناسی

موضع چاندا پور میں جو شہر شاہجہاں پور سے چھ کوس فاصلہ پر لب دریا واقع ہے' مقرر کیا اور

تاریخ میلہ ربیع شیرانی" ص۱۲

یہ پادری نولس صاحب انگلستانی اور منشی پیارے لال کبیر پنتھی کون تھے' دونوں کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی' مختصر لفظوں میں اس کی کچھ تفصیل "مباحثہ شاہ جہاں پور" نامی رسالے میں جو کچھ کی گئی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے' کہ پادری نولس صاحب درحقیقت شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے' ہیڈ ماسٹری کے ساتھ ساتھ مشن کا کام بھی شاہ جہاں پور کے اطراف و نواح کی آبادیوں میں گھوم پھر کر کیا کرتے تھے' اسی سلسلہ میں "چاندا پور" جو شاہ جہاں پور کے متصل قصباتی آبادی تھی' وہاں بھی پادری صاحب کا دورہ ہوا کرتا تھا۔ چاندا پور کے ایک خوش حال اور خوش باش باشندے منشی پیارے لال صاحب جو کبیر پنتھی تھے' ان کی تقریروں میں شریک ہوا کرتے تھے' پادری صاحب اور منشی جی میں تعارف پیدا ہوا' میل جول بڑھا' پادری صاحب کے توسط سے معلوم ہوتا ہے' کہ انگریز حکام تک بھی منشی جی کی رسائی ہونے لگی۔ صاحب رسالہ نے لکھا ہے' کہ

"پادری صاحب کی ملاقات سے ان کی عزت و توقیر بھی بڑھ گئی" ص۳

غالباً ان الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے' کچھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے' کہ منشی پیارے لال نے عیسائی دین تو قبول نہیں کیا' لیکن پادری اس حد تک ان کو متاثر کرنے میں غالباً کامیاب ہو چکے تھے' کہ منشی پیارے لال کے

"خیر خواہوں نے دیکھا کہ منشی صاحب اپنی حالت دیرینہ کی طرح اپنے آبائی عقیدہ کو بھی پارینہ سمجھنے لگے" ص۳

الغرض بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو پادری نولس صاحب کی تحریک اور کچھ منشی پیارے لال کے احباب اور دوستوں کے مشورہ سے طے پایا کہ چاندا پور کے متصل منشی پیارے لال کی زمینداری میں ایک گاؤں سارنگ پور نامی میں جہاں بقول مصنف رسالہ "مباحثہ شاہ جہاں پور" منشی جی کی

"مملوکہ زمین اور باغات"

تھے' اور ان کی اسی ملوکہ زمین و باغات کے درمیان ایک بڑی ندی بہتی تھی جس کا نام اسی رسالہ میں

"دریائے گرا"

بتایا گیا ہے' اسی ندی کے کنارے

"میلہ خدا شناسی"

کے نام سے ایک میلہ کیا جائے اور یہ کہ علاوہ عام لوگوں کے خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے

"علماء مذاہب مختلفہ کا مناظرہ ہو"

خدا شناسی کے اس میلہ جاسے کا بظاہر مقصد تو یہ رکھا گیا کہ علماء مذاہب مختلفہ کے باہمی مناظرہ و مباحثہ سے

"تحقیق مذہب بھی ہو جائے گی"

یعنی دنیا کے مروجہ مذاہب میں "سچا مذہب" جو منشی جی کے لئے قابل تسلیم ہو' اس کا پتہ بھی چل جائے گا' مگر ظاہر ہے کہ زمیندار طبقہ کے ایک سرمایہ دار آدمی کے لئے صرف یہی وجہ کافی نہیں ہو سکتی تھی' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں میلہ کا سبز باغ بھی ان کو دکھایا گیا' شاید باور کرایا گیا کہ بیسیوں میلے ہندوستان میں معمولی معمولی بنیادوں یا حیلوں پر جمتے ہوئے بالآخر عظیم الشان میلوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں' اپنی افتی شور زمینوں کو ان ہی تدبیروں سے لوگ "بہشتی ٹکڑہ" اسی زمانہ میں بنا رہے تھے۔

"اس میلہ سے کچھ اور فائدہ کی صورت ہو گی"

منشی جی کے خیر خواہوں کے مشورے کا یہ جزو جسے "مباحثہ شاہجہانپور" والے رسالہ کے مصنف نے نقل کیا ہے۔ اس سے تو کچھ یہی سمجھ میں آتا ہے۔

کچھ بھی ہو' میلہ کی پہلی روداد جو میرٹھ کے مطبع ضیائی کے کارپردازوں محمد ہاشم علی اور محمد حیات صاحبان کی مرتب کی ہوئی ہے' اور "گفتگوئے مذہبی یا واقعہ میلہ خدا شناسی" جس کا نام رکھا گیا تھا' اس میں اگرچہ منشی پیارے لال کے متعلق لکھا ہے کہ

"دولت مند اور وہاں کے (یعنی چاندا پور کے) رئیس ہیں" ص۲

تاہم ان کی طرف سے میلہ کے قیام کا انتظام ہی نہیں بلکہ جیسا کہ اسی رسالہ میں خبر دی گئی ہے کہ

"سب کو کھانا اور خیمے وغیرہ انہیں (یعنی منشی پیارے لال) کی طرف کو ملے تھے"

اس خبر میں "سب" کا لفظ اگرچہ حد سے زیادہ مجمل ہے۔ ہر شخص جو میلہ میں شریک ہوا تھا سب کو کھانا منشی جی کی طرف سے دیا جاتا تھا، اس کو واقعہ قرار دینا تو مشکل ہے۔ لیکن "سب" کے لفظ کو مذاہب کے نمائندوں ہی کی حد تک محدود رکھا جائے، تو ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ مسلمانوں کے جن جن نمائندوں کا ذکر اس رسالہ میں بضرورت کیا گیا ہے، میرے خیال میں بیس پچیس تک تو ان ہی کی تعداد پہنچ جاتی ہے۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ پادریوں کا بھی کافی مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ منشی جی خود ہندو تھے۔ قدرتاً ہندو مذہب کے نمائندوں کی تعداد بھی چاہئے تو یہی کہ کم نہ ہو، میلہ دو دن تک رہا، ایسی صورت میں ناشتہ نہ بھی کم از کم کھانا سب مہمانوں کو چار وقت تو ضرور کھلایا گیا ہوگا۔ روداد ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی نمائندوں کے سوا دوسرے ہندو مسلمان معزز مہمان بھی میلہ میں موجود تھے، جن میں عدالت کے وکلاء اور حکومت کے حکام مثلاً ڈپٹی کلکٹر وغیرہ بھی تھے چاندا پور کی بستی شاہجہاں پور کے شہر سے لکھا ہے کہ

"پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر لب دریا واقع ہے"

موٹر وغیرہ سریع السیر سواریوں کا زمانہ نہ تھا کہ میلہ میں شریک ہونے والوں کے متعلق یہ توقع کی جائے کہ کھانا کھانے کے لئے شہر چلے آتے تھے۔ اسی لئے کم و بیش میرا تخمینہ یہی ہے کہ تین چار سو آدمیوں کو فی وقت منشی جی کو کھانا کھلانا پڑا ہوگا۔ جہاں بھی معمولی لوگ نہ تھے۔ دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ تکلف ہی سے کام لیا ہوگا۔ پھر مزید برآں خیمہ و خرگاہ اور دوسری قسم کی آسائشوں کی فراہمی میں منشی جی پر چاہئے تو یہی کہ کم مالی بار عائد نہ ہوا ہوگا، اسی سے سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ میلہ کے پیچھے محرکات معمولی نہ تھے، اب یا یہ مان لیا جائے کہ "تلاش حق" کا کوئی غیر معمولی جذبہ منشی جی میں مشتعل پذیر ہوا تھا، جس سے اس درجہ متاثر ہو گئے تھے کہ خرچ کے متعلق کم و بیش کا سوال ہی ان کے سامنے باقی نہ رہا تھا، اگرچہ آئندہ ان کے جس طرز عمل کا ذکر آ رہا ہے اس سے اس خیال کی چنداں تائید نہیں ہوتی، یا پھر مادی منافع کا جو سبز باغ ان کو دکھایا گیا تھا، ان منافع کی امید پر بطرز بیوپار یا تجارتی کاروبار کے ان مصارف کا بار انہوں نے اٹھایا تھا،

بہر حال کتابی شہادتوں کی حد تک تو بس ان ہی دو باتوں کا پتہ چلتا ہے، اور دلیل و شہادت کے بغیر کسی تیسرے احتمال کے اظہار کی جرأت کیسے کی جائے۔

دوسرے میلہ کی روداد سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ "یہ میلہ" حکومت کے امتزاج اور رضامندی سے منعقد کیا گیا تھا، اسی روداد میں جس کا نام "مباحثہ شاہ جہاں پور" ہے، سیدنا الامام الکبیر کے ایک تلمیذ سعید مولنا فخر الحسن گنگوہی کے قلم کی مرتب کی ہوئی یہ روداد ہے، اسی میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال صاحب نے

"مسٹر رابرٹ جارج کری صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہان پور سے اجازت حاصل کر کے پارسال (یعنی ۱۸۷۶ء) ۷ رمئی کو جس شباب کی گرمی میں یہ میلہ منعقد کیا الخ" ص

صرف اجازت ہی نہیں بلکہ نظم و ضبط کی تمام ضرورتوں کے لئے پولیس کے سوا اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کرسیوں مونڈھوں وغیرہ کا انتظام بھی غالباً حکومت ہی کی طرف سے کیا گیا تھا[1]،

الغرض شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر جناب پادری نولس صاحب کی ابتداءً اور مسٹر رابرٹ جارج کری کلکٹر شاہ جہاں پور کی اجازت و رضامندی اور ان کی اخلاقی و نقد سے مالی امداد سے یہ میلہ دریائے گرّا کے کنارے سانگیور گاؤں میں منعقد ہوا، ان ہی دو ابتدائی اور انتہائی قوتوں کے درمیان چاند پور کے رئیس اور دولت مند منشی پیارے لال صاحب تھے، جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ پادری نولس کی دوستی کی بدولت حکومت میں عزت و توقیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

قابل توجہ اور مستحق فکر و نظر یہ مسئلہ بھی ہے، جیسا کہ مولنا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے کچھ اشارہ بھی کیا ہے کہ پہلی دفعہ میلہ کے انعقاد کی تاریخ ۷ رمئی مقرر کی گئی، جب بقول ان ہی کے ہندوستان میں گرمی کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے، گرمی بھی صوبہ یو۔پی کے بالائی اضلاع یعنی روہیل کھنڈ کی

---

[1] میلہ خدا شناسی نامی روداد میں لکھا ہے کہ تقریباً دو ڈھائی سو کرسیاں وغیرہ اس خیمہ میں (جس میں مباحثہ ہوتا تھا) علاوہ بچھائی گئیں ص۳۲ جس زمانہ کی یہ بات ہے اس عام تمدن اس ملک کے باشندوں کا جو تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ شہر سے دور ایک صحرائی مقام میں حکومت کی امداد کے بغیر دو ڈھائی سو کرسیاں کسی اجلاس میں مہیا ہو سکتی تھیں ۱۲

موسم بھی گرم اور مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے نسبتاً خون کی گرمی، اس گئے گذرے زمانے میں بھی ناقابل توجہ نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ امیر الامرا نجیب الدولہ اور حافظ الملک رحمت خاں، اور محمد علی خاں روہیلہ کے سرحدی پٹھانوں کی نو آبادی جو ان ہی کے قومی نام کی طرف منسوب ہو کر روہیل کھنڈ کہلانے لگی تھی، گذرے ہوئے دنوں کی گرمی کے سوا چند سال بھی تو نہیں گذرے تھے کہ ۵۷ء میں سب سے زیادہ ابال کا تجربہ اسی علاقہ کے مسلمانوں کے بچے ہوئے خون میں حکومت کو ہو چکا تھا۔

قدرتاً یہ سوال دلوں میں اگر پیدا ہو، کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظرہ اور مباحثہ تو خیر کوئی نئی بات نہ تھی، ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس میلہ سے پہلے ان دونوں مذہبی جماعتوں میں کافی مقابلے ہو چکے تھے۔ شاید کوئی شہر بلکہ قصبہ اس زمانہ میں ایسا ہوگا، جس میں پادریوں سے پنجہ آزمائی کے لئے مسلمانوں میں بھی کچھ افراد نہ پائے جاتے ہوں، عرض ہی کر چکا ہوں کہ اپنی ترازو کے وزنی پلڑے کو دکھا کر گنجڑے بھی تک پادریوں کے اعتراض کے جواب پر اس زمانہ میں آمادہ ہو چکی تھیں، مولوی نعمان بن لقمان وہی جو اپنے آپ کو "وکیل سرکار ابد قرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے مشہور کئے ہوئے تھے ان کا شعر

معاذ اللہ فرزند خدا کہتے ہو عیسیٰ کو

تو دادا کون ہے ان کا بتائے جس کا جی چاہے

پادریوں کا مذاق اڑانے کے لئے زبان زد عام ہو چکا تھا۔ اس نوعیت کے بیسیوں لطیفے نقل کئے

لہ صرف یہی نہیں بلکہ اسی رسالہ واقعہ میلہ خدا شناسی میں یہ لکھتے ہوئے کہ گرمی کا موسم تھا گرمی ہی کا وقت تھا" یہ اطلاع دی ہے کہ "مکان جلسہ ایک صحرا شہر سے دور سایہ کے لئے خیمہ یا درخت آم جس کا سایہ آدھا آدھی دھوپ، غرض تپش سے بچنے کا کوئی عمدہ سامان نہ لو سے بچنے کے لئے کوئی مکان۔ صلا

ٹہ بانی ندوۃ العلما حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس اللہ سرہ العزیز سے خاکسار نے سنا تھا کہ کلکتہ میں بھی ایک دفعہ پادریوں اور مسلمانوں کے مولویوں سے مقابلہ کی ٹھہری، طے ہوا کہ بند کمرے یا ایسے مکان میں جلسہ ہو۔ جہاں عوام کی رسائی نہ ہو، طرفین کے لوگ جمع تھے، باہر ایک دربان مقرر کر دیا گیا تھا کہ آنے والوں سے نام پتہ پوچھ کر پہلے اندر کے لوگوں کو اطلاع دے، تب جلسہ میں شرکت کی اجازت دی جاتی تھی، بجز مشہور پادریوں اور مولویوں کے اس اجلاس میں دوسرے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں عربی لغت کی مشہور کتاب منتہی الارب کے مصنف (باقی اگلے صفحہ پر)

جاتے ہیں۔ گویا لوگ مولویوں اور پادریوں کی چھیڑ چھاڑ کے عادی ہو چکے تھے اب اس میں کوئی ندرت وجدت باقی نہ رہی تھی، برعکس اس کے منشی پیارے لال کا یہ میلہ جو اپنے موضوع بحث کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھا۔ "مذاہب و ادیان کی تحقیق" کے لئے بھی یہ میلہ جایا جا سکتا تھا، بجائے خود یہ ایک اچھوتا خیال اور نیا اقدام تھا، اور اس سے بھی زیادہ اہم خصوصیت اس میلہ کی یہ تھی کہ دو فریق مسلمانوں کے مولوی، اور عیسائیوں کے پادری ہی میں سب کی مقابلہ نہ تھا، بلکہ بقول مصنف رسالہ "واقعہ میلہ خدا شناسی" کہ اس مذہبی میلہ یا مناظرہ کی مجلس میں

"مناظرہ کرنے والے تین فریق قرار پائے تھے، مسلمان۔ عیسائی۔ ہندو" صـ

جہاں تک میں جانتا ہوں ہندوستان کو وطن بنانے کے بعد مسلمان اس ملک میں جس زمانہ میں آباد ہوئے تھے، صدیوں پر صدیاں گزر چکی تھیں، لیکن تاریخ کے اس طویل عہد میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب اور دین کے موضوع پر اس قسم کے مناظرے اور مباحثے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی زمانہ میں نہیں جب اس ملک کی حکمرانی کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، بلکہ محکوم بن جانے کے بعد اور جو صورتیں بھی ان کے ساتھ پیش آئی ہوں لیکن فریق بن کر مسلمانوں کے دین پر اعتراض اور تنقید کرنے اور ان کے مولویوں سے مناظرہ و مباحثہ کرنے کے لئے ہندو کسی مجلس میں اب تک کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ مراد آبادی پنڈت اندرمن کے قصے بھی صرف رسالوں اور کتابوں کی حد تک محدود تھے، اور پچھلے دنوں سے پنڈت دیانند سرسوتی جی نے اپنی تنقیدی یا تحقیری زور آزمائیوں کے سلسلہ میں مسلمانوں اور ان کے دین کو بھی جو گھسیٹ لیا تھا، تو تنہا بیشتر ناقص رد و قدح ہی کی حد تک ان کے تقریری و تحریری ہنگامے محدود تھے، بالعمل مناظرہ کی کسی مجلس میں پنڈت جی کا مسلمانوں اور ان کے علماء سے مقابلہ کی نوبت میرا علم یہی ہے کہ ابھی تک

(گذشتہ صفحہ سے) مولوی عبدالرحیم صفی پوری جو اپنی ظرافت اور عملی وجوہ سے بدنام بھی تھے، یہ بھی پہنچے، دربان نے نام اور پتہ پوچھا کہہ دیا کہ "مسیح کا دادا" یعنی یہ سمجھا کر اندر والوں سے کہہ دو، دربان تو آگے روانہ ہوا، اور مولوی عبدالرحیم اس کے پیچھے پیچھے بغیر اجازت دراتے چلے گئے، دربان نے جلسہ میں کہا کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسیح کا دادا کہتا ہے آنے کی اجازت چاہتا ہے، پادریوں میں غل مچا۔ مولوی عبدالرحیم ساتھ ہی گھس آئے تھے، نہایت اطمینان سے کہنے لگے، جب مسیح کا باپ ہو سکتا ہے تو دادا میں کیا خرابی ہے، زور کا قہقہہ لگا۔

نہیں آئی تھی، اور تاریخ میں شاید یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندو کو بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں دریائے گرّا کے ساحل پر منعقد ہونے والے اس صحرائی میلہ میں کھڑا کیا گیا تھا۔

ایسی صورت میں یہ وسوسہ دلوں میں اگر پیدا ہو کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں اس میلہ کے لئے جس میں پہلی بار مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو ایک دینی فریق بن کر شریک ہوئے تھے روہیلکھنڈ ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا، اور فرض بھی کیا جائے کہ منشی پیارے لال جیسے فیاض، مہمان نواز، سیر چشم رئیس بجز چاندا پور کے اور دوسری جگہ نہیں مل سکتے تھے۔ لیکن مناظرے کے لئے بجائے صحرائی علاقہ کے منشی جی کے وطن چاندا پور کا مستقر ضلع شاہجہان پور میں کیا ایسا میدان یا ایسی جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں اس میلہ کو منعقد کیا جائے۔ شہر ہونے کی وجہ سے جو آسانیاں شریک ہونے والوں کو میسّر آسکتی تھیں۔ یقیناً سانگھیور جیسے کوردہ گاؤں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چاندا پور سے شاہجہان پور کا فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ گویا شہر کی نواحی آبادی ہم اس کو کہہ سکتے ہیں۔ منشی جی اپنے قصبہ سے شہر میں ضرورت کی چیزیں باآسانی مہیا کر سکتے تھے۔ جیسے سانگھیور تک آخران ہی کو چیزیں پہنچانی پڑیں۔ مصوصاً بے چارے مسلمان لڑنے مرنے کے مسئلہ میں یوں ہی بدنام ہیں، اور جیسا کہ اسی رسالہ "واقعہ میلہ خداشناسی" کے مصنف نے ایک موقعہ پر لکھا بھی ہے کہ پادریوں میں مشہور بھی تھا کہ

"مسلمانوں کو جواب نہیں آتا لڑنے کو دوڑتے ہیں" ص۱۹

مسلمانوں پر اس الزام کی شہرت پادریوں ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھی، بلکہ خود پنڈت دیانند جی بھی مسلمانوں کی طرف اسی قسم کی زیادتیوں کو منسوب کیا کرتے تھے۔ رڑکی میں پنڈت جی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان جو واقعات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل اپنے موقعہ پر آگے آرہی ہے، اس موقعہ پر بھی پنڈت جی نے رڑکی چھاؤنی کے مجسٹریٹ کے سامنے کہا تھا کہ مسلمانوں سے مجھے

"فساد کا خوف ہے"[1]

[1] حضرت مولانا تھانوی رح کے حوالے سے رڑکی کی سرگذشت قصص الاکابر میں درج کی گئی ہے۔ یہ فقرہ پنڈت جی کی طرف اسی میں منسوب کیا گیا ہے۔ ۱۲

رسالہ "ترکی بہ ترکی" میں بھی پنڈت جی کے متعلق لکھا ہے کہ

"فساد کا کھٹکا زبان پر آتا تھا" [illegible]

بہر حال لڑنے کے دوڑنے یا فساد برپا کرنے کے یہ الزامات جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے بجائے خود ان کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن پادریوں اور پنڈتوں دونوں کے دلوں میں کچھ بھی خطرہ اگر اس کا تھا تو حیرت ہوتی ہے کہ اس خطرہ کے باوجود بقول اسی رسالہ ترکی بہ ترکی کے مصنف کے

"فساد ہوتا تو چاندا پور میں ہوتا، جہاں کی بات کی حکام کو خبر بھی ہوتی تو بدیر ہوتی" [illegible]

لیکن اب اسے کیا کہئے کہ وہی خطرات جنھیں پادری بھی اپنے دلوں میں پاتے تھے، اور پنڈتوں کے پنڈت سوامی دیانند جی مہاراج کا بھی وہی قلبی تاثر تھا۔ ان خطرات کے باوجود "چاندا پور" جیسی جگہ کا انتخاب اس "مذہبی مقابلہ" کے لئے کیا گیا۔ اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ میلہ کے لئے خدا ہی جانتا ہے کس مصلحت یا مجبوری کے زیر اثر گرم ترین موسم مئی کے مہینے کو ترجیح دی گئی، اور تاریخ بھی ۸ مئی مقرر کی گئی، حساب سے معلوم ہوتا ہے چاندنی راتیں گذر چکی تھیں۔ اسی لئے قدرتاً رات میں بھی جلسہ کی گنجائش نہ تھی۔ "واقعہ میلہ خداشناسی" میں خاص طور پر اسی بے ضابطگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا بھی ہے

"گرمی کا موسم تھا، گرمی ہی کا وقت تھا" (یعنی جلسہ کا وقت دن کے اس حصہ میں مقرر کیا گیا تھا جس میں گرمی شدت پذیر ہو جاتی ہے)"

آگے ہے کہ

"مکان جلسہ ایک صحرا شہر سے دور، سایہ کے لئے خیمہ یا درخت آم جس کا سایہ آدھا سایہ آدھی دھوپ"

اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ ممکنہ حد تک گرمی کی تکلیفوں سے بچنے کی ممکنہ تدبیریں جو کی جا سکتی تھیں ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی، جیسا کہ اسی میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

"نہ تپش سے بچنے کا کوئی عمدہ سامان، نہ لو سے بچنے کے لئے کوئی مکان"

لوگوں کی تکلیف جب حد سے گذر گئی تو فوری طور پر یہ کیا گیا تھا جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے کہ

"قنات خیمہ کو جس کو بمنزلہ دیوار خیمہ کہیئے"

ان ہی قناتوں کے پردوں کو

"اٹھا کر پتلی پتلی چوبوں پر استادہ کیا، جس سے سایہ میں وسعت ہو گئی اور بہت سے شائق اس میں آکھڑے ہوئے"

لیکن باوجود اس کے قنات کے پردوں کا یہ سایہ بھی کافی نہ ہوا، اسی رسالہ میں ہے کہ

"بہت کثرت سے آدمی تھے۔ شوق گفتگو میں نہ لو کا خیال تھا، اور نہ دھوپ کا۔ جہاں جہاں تک آواز کے پہنچنے کا احتمال تھا آدمی ہی آدمی تھے"

بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، سوچ کر یہ سب کچھ کیا گیا تھا، یا بے سوچے کچھ اس قسم کے اتفاقات پیش آ گئے، لیکن اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس ہجوم کے جس کا ذکر صاحب رسالہ نے کیا ہے ان ہی کو یہ خبر بھی دینی پڑی کہ

"اگر یہ خرابیاں (زمانی و مکانی) نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا" ص۲۳

میرے پاس کوئی تحریری وثیقہ تو نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی خیال گذرتا ہے، اور صاحب رسالہ کی اطلاع کا یہ حصہ یعنی "آدمی ہی آدمی تھے" غالباً اس میں زیادہ اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوگی جو چاند پور قصبہ اور اس کے اردگرد کے گاؤں اور کھیڑوں کے رہنے والے تھے، کیونکہ اس سخت موسم میں دور دور سے لوگوں کا پہنچنا آسان نہ تھا، خود شہر شاہجہاں پور بھی جب پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھا تو سواری پر آنے والوں کے سوا تپش اور لو کے موسم میں پیادہ پا آنے والوں کے پہنچنے کی مشکل ہی سے توقع کی جا سکتی ہے۔ صاحب رسالہ نے سچ لکھا ہے، کہ "یہ خرابیاں نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا" جلسہ تھا ہی اس رنگ کا کہ لوگ دور دور سے آتے خود یہی میلہ دوسری دفعہ اسی مقام پر صرف تاریخ کی تبدیلی سے جب منعقد ہوا، یعنی بجائے مئی کے مارچ کی ۱۹ اور ۲۰ تاریخ رکھی گئی تو اس دوسرے سال والے میلہ کی روداد میں اس کا تذکرہ بھی کیا

لکھا ہے کہ

"علاوہ ساکنان شاہ جہاں پور، نواح شاہ جہاں پور، تلہر، میرٹھ، دلّی، خورجہ، سنبھل، مراد آباد، رامپور، بریلی، دیوبند تک سے بعض بعض شائقین تشریف لائے تھے۔" ص۵

مباحثہ شاہ جہاں پور

اس کا بھی پتہ اسی روداد سے چلتا ہے، کہ سال گذشتہ کی طرح منشی پیارے لال صاحب ان نو آنیوالے مہمانوں کی مہمانی برداشت نہ کر سکے بلکہ لکھا ہے کہ

"موتی میاں نے مہمان نوازی کو کام فرمایا، خاطر تواضع سے سب کو مکلف کھانا کھلایا۔" ص۵

اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ روہیل کھنڈ کے مختلف مرکزی مقامات سے دوسرے سال جو لوگ آئے تھے، وہ عموماً مسلمان تھے، اسی لئے بے چارے موتی میاں کی موروثی سیر چشمی اور دریا دلی کام آئی۔[1]

---

[1] موتی میاں کا ذکر خدا شناسی کے ان دونوں میلوں کی روداد میں کیا گیا ہے۔ میلہ خدا شناسی والی روداد میں لکھا ہے کہ ان کا اصلی نام محمد ظاہر تھا عرف میں موتی میاں کے نام سے مشہور تھے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ "موتی میاں رئیس شاہ جہاں پور جو مولوی مدن صاحب کی اولاد میں سے ہیں... اور یہ کہ بالفعل عہدہ آنریری مجسٹریٹی پر ممتاز ہیں، میلہ میں مذہبی مباحثہ جو ہونے والا تھا، ہندوؤں کی طرف سے تو منشی پیارے لال بانی میلہ ہی ذمہ دار تھے، اور عیسائیوں کی نمائندگی پادری نولس صاحب منشی جی کے دوست سے ہوتی تھی۔ شاید حکومت نے اسی لئے ایک مسلمان یعنی موتی میاں کو جلسے کے نظم کا ذمہ دار بنایا تھا، لکھا ہے کہ "سرکار کی طرف سے موتی میاں اہتمام مقرر ہوئے تھے" پہلے سال کے میلہ کے بھی، اور دوسرے سال کے بھی۔ باقی یہ جو موتی میاں کی روایاتی سیر چشمی کی طرف جو اشارہ کیا، اس کا تعلق ان کے جد اعلیٰ مولوی مدن صاحب سے ہے۔ غالباً یہی مولوی مدن صاحب ہیں، جن کا ذکر داڑھی والے شعر یعنی سہ بڑھائی شیخ نے داڑھی جب گرچہ سن کی سی + مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ کیا گیا ہے۔ مغل حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر طوائف الملوکی کے دور سے ہندوستان جب گذر رہا تھا، اس زمانہ کی چند اہم شخصیتوں میں ایک یہ مولوی مدن صاحب بھی تھے عمار السعادات نامی کتاب میں ہے کہ مولوی مدن کا شاہ جہاں پور کے قریب قصبہ شاہ آباد میں مقام تھا۔ مشہور تھا کہ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ ایک زمانہ تک لکھنؤ کے نواب وزیر صفدر جنگ کے مشیر اور محرم اسرار تھے۔ صفدر جنگ کے مرنے کے بعد ناظم بنگالہ مہابت جنگ کے پاس مرشد آباد چلے گئے۔ وہاں بھی بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ ساری دولت (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال دوسرے سال والے میلہ کے متعلق تو نہیں، لیکن شروع شروع میں یہ میلہ جن خاص
خصوصیتوں سے چاتا تھا قرینہ کا اقتضاء یہی ہے کہ چاند اپور اور اس کے اردگرد کے دیہاتیوں کے سوا باہر
سے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، اور گو چاند اپور اور اس کے اطراف و نواح کی آبادیوں کے متعلق کوئی
صحیح ذاتی علم مجھے نہیں ہے۔ لیکن یو۔پی کے عام حالات کے لحاظ سے خیال یہی گذرتا ہے کہ پہلے سال کے
میلے میں مسلمانوں سے زیادہ، بہت زیادہ تعداد چاہئے تو یہی کہ دیہاتی ہندوؤں کی ہی ہو۔ میرے پاس اس
کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دریائے گنگا کے ساحل پر یہ صورت حال جو پیش آگئی تھی کسی سوچے ہوئے
باضابطہ پروگرام کا نتیجہ تھی۔ لیکن اب اتفاق کیلئے بابا ہی اتفاق[1] سے جو تدبیریں اختیار کی گئی تھیں ان کا

(گذشتہ صفحہ سے) معاملات میں مہابت جنگ ان ہی سے رائے لیا کرتا تھا۔ بنگال کی حکومت جب ختم ہوگئی تو پھر
لکھنؤ کے نوجوان حکمران شجاع الدولہ سے تعلق قائم ہوا۔ شاہ آباد ضلع شاہجہان پور چونکہ لکھنؤ سے کافی فاصلہ پر تھا۔ اسی
لئے لکھنؤ کے پاس ایک آبادی خالص پور میں مولوی مدن نے مکان تعمیر کرالیا۔ جہاں کہیں رہے جود و کرم کی بارش برساتے
رہے۔ خالص پور کے قیام کے زمانہ میں صاحب عماد السعادات کا بیان ہے کہ ہر سال در انجا عرس حضرت غوث الثقلین
می کردہ" اس عرس میں کیا ہوتا تھا۔ اسی مورخ کے الفاظ میں اس کا جواب سنئے، لکھا ہے

"جوق جوق علماء و طلبہ علوم و فوج فوج مشائخ و اولاد شیوخ از اطراف و اکناف..... دراں عرس جمع
می شدند"

لیکن اطراف و اکناف کا مطلب آپ نے سمجھا؟ وہی اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"مثل عظیم آباد، سہسرام، جونپور، الہ آباد، و اودھ و شاہ آباد و شاہجہان پور و کوڑہ جہان آباد و کالپی و
اٹاوہ و فیروز آباد و سندیلہ و کاکوری و لکھنؤ و سلون و بریلی و ڈلمؤ"

لطیفہ یہ تھا کہ لکھنؤ کے شمال و جنوب، مشرق و مغرب سے یہ آنے والے جو آتے تھے تو پہلی کا کرایہ آمد و رفت دونوں کا شاہ صاحب
کی سرکار کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ آخر میں لکھا ہے کہ "تا سہ روز عجیب انبوہے و طرفہ تماشائی بود کہ یاد نمی
داشت چند نفر بقال ترازو در دست گرفتہ می نشستند از صبح تا شام جنس راغن کردہ بمردم می دادند، بعضے رذیل
الطبعان دو بارہ و بعضے سہ بارہ بگیرند می گرفتند بقالاں دم نمی زدند زیرا کہ حکم مہربان سرکار شاہ صاحب می یافتند"
بہر حال لکھا ہے کہ تخمیناً سی ہزار آدم فراہم می آمدند" گویا تین دن تک ۳۰ ہزار آدمیوں کو راشن شاہ صاحب کی سرکار سے
تقسیم ہو جاتا تھا۔ کیا کیا چیزیں ملتی تھیں ان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے جو مصنف نے بیان کیا ہے کہ جوگیوں، بیراگیوں کو
علاوہ جنس و خوراک کے نقد بھی گانجہ بھانگ چرس پینے کے لئے دیا جاتا تھا۔ ملخصاً عماد السعادات

[1] یہ لفظ میرا نہیں ہے، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں جن بعض خاص حالات جب پیش آئے (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ منطقی اور لازمی نتیجہ تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف اظر وقہ یا اعجوبہ یہ ہے کہ یہ عجیب وغریب میلہ جو اپنے نام اور عنوان ہی کے لحاظ سے شہرت پذیری کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتا تھا۔ پھر باضابطہ اشتہاروں اور اخباروں سے عام اعلان اس میلہ کے انعقاد کا سارے ہندوستان میں نہ سہی، لیکن یوپی میں کیا جا چکا تھا۔ لیکن رسالہ "واقعہ میلہ خدا شناسی" میں یہ عجیب وغریب اطلاع درج کی گئی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر تک جب یہ خبر پہنچی کہ شاہ جہاں پور کے پاس "مذہبی میلہ" قائم ہونے والا ہے، جس میں مختلف ادیان کے نمائندوں میں بحث ومباحثہ بھی ہوگا تو آپ نے اپنے دوست اور عزیز مولوی محمد منیر صاحب کو جو اس زمانہ میں بریلی رہتے تھے۔ یہ ارقام فرمایا کہ

"کیفیت مناظرہ اور محل نزاع سے اطلاع دیجئے"

اور مولوی منیر صاحب نے غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے براہ راست شاہ جہاں پور کی پولیس کے انسپکٹر جن کا نام مولوی عبد الحئی تھا، ان ہی سے واقعہ کی پوری تفصیل دریافت کی تو انسپکٹر صاحب جزئیات کی تفصیل ترک فرماتے بجائے اس کے جواب میں لکھا تو یہ لکھا کہ

"یہ قصہ بے اصل ہے، اظہار کے آنے کی کچھ حاجت نہیں" صلا

مولوی عبد الحئی صاحب شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس کی شخصیت سے میں واقف نہیں ہوں مگر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ جواب ان کی طرف سے مولوی منیر صاحب کو جو دیا گیا۔ آخر اس کا منشاء کیا تھا۔ بظاہر نام سے وہ مسلمان آدمی معلوم ہوتے ہیں، اور جب تک کسی شخص کا حال معلوم نہ ہو حسن ظن ہی سے کام لینا ایمان اور اسلام بلکہ شاید شرافت کا بھی اقتضاء ہے۔ مگر کیا کیجئے، یاد ہوگا کہ اس زمانہ کی

(گذشتہ صفحہ سے) جن سے پتہ چلا کہ بظاہر گو عیسائیوں، مسلمانوں، ہندوؤں تین مذہبی فرقوں میں مقابلہ ہے، لیکن درحقیقت عیسائی اور ہندو اندرونی طور پر ملے ہوئے ہیں۔ آگے اس کی تفصیل بھی کی جائے گی۔ "مباحثہ شاہ جہانپور" میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال سے موتی میاں نے "ترش رو ہو کر فرمایا کہ میں آئندہ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا۔" پھر مسلسل کارروائیوں کے رنگ و روغ کو دیکھتے دیکھتے جس نتیجہ تک موتی میاں پہنچے تھے غصہ میں اسے چھپا نہ سکے اور بولے "یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔" صلا

پولیس ہی کے ایک افسر تو وہ صاحب بھی تھے، جن کا نام بھی مسلمانوں ہی کے ناموں کی طرح "مخدوم بخش" تھا، اور قصبہ دیوبند میں حکومت کی طرف سے "کوتوال شہر" تھے۔ پنچایت کے ذریعہ دیوبند والوں کو مقدمات کے باہمی تصفیہ پر سیدنا الامام الکبیر نے جس زمانہ میں آمادہ فرمایا تھا، تو باوجود "مخدوم بخش" ہونے کے حضرت والا کو مخاطب کر کے ان ہی کوتوال صاحب نے کہا تھا کہ

"میں ابھی سرکار میں رپورٹ کرتا ہوں، کہ مولویوں نے سرکار کے خلاف میں محمدی جھنڈا کھڑا کیا ہے۔" (سوانح مخطوطہ ص۱۱)

کچھ بھی ہو، ایک ایسا معاملہ جس کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ شاہ جہاں پور کے انگریز کلکٹر مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب کی باضابطہ منظوری نہیں حاصل تھی، بلکہ قرائن کا اقتضاء ہے کہ اس مذہبی میلہ کو سرکار کے اشارہ یا سرپرستی کا شرف اگر حاصل نہ تھا تو حکومت کی عملی ہمدردیاں اس کے انعقاد میں معلوم ہوتا ہے کسی نہ کسی حد تک ضرور شریک تھیں۔ بلکہ "واقعہ میلہ خدا شناسی" والے رسالہ میں خلقت کے ہجوم کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقعہ پر جو یہ لکھا ہے کہ

"سپاہیان پولیس اگر نہ روکتے تو (عوام الناس) سب اندر (خیمہ مباحثہ ہی) میں پہنچتے" ص۱۲

اس سے جیسا کہ ظاہر ہے یہی ثابت ہوتا ہے، کہ نظم و انتظام کے لئے جیسے شاہ جہاں پور کے مقامی رئیس اور آنریری مجسٹریٹ موتی میاں کو حکومت نے ذمہ دار بنایا تھا، اسی طرح شاہ جہاں پور کی پولیس بھی ذمہ دار ٹھہرائی گئی تھی، کہ میلہ میں کسی قسم کی بے ترتیبی اور گڑبڑ نہ پیدا ہو، اب آپ ہی بتائیے کہ اسی پولیس کے ایک ممتاز افسر انسپکٹر صاحب کو بھی اس کی خبر نہ تھی کہ اس میلہ میں کیا ہونے والا ہے اور کس مقصد سے یہ میلہ یہاں قائم کیا جا رہا ہے، کسی طرح یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔؟

بہر حال حقیقت تو یہ ہے، کہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب کی یہ اطلاع خدانخواستہ اگر کارگر ہو جاتی، اور ہو جاتی کیا معنی، وہ تو کارگر گویا ایک حیثیت سے ہو ہی چکی تھی۔ اسی رسالہ کی تمہید میں ہے، کہ جب میلہ کے انعقاد کی خبر مشتہر ہوئی، تو شاہ جہاں پور کے مسلمانوں نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کو واقعہ کی نوعیت سے مطلع کرتے ہوئے قدم رنجہ فرمانے کی زحمت

دی تھی۔ دوسرے ذرائع سے بھی حضرت والا تک مسلسل خبریں پہنچ رہی تھیں۔ جب شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ پہنچا، تو نانوتہ جہاں اس زمانہ میں مقیم تھے۔ پیادہ پا وہاں سے روانہ ہوئے، ایک شب کے لئے دیوبند میں قیام فرمایا۔ یوں ہی ایک ایک رات راستہ میں مظفر نگر، اور میرٹھ میں گذارتے ہوئے دہلی پہنچے، دلّی میں شاہ جہاں پور کے انسپکٹر مولوی عبدالحئی صاحب کا یہ پیغام آپ تک پہنچا کہ

"علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں"

جیسا کہ چاہئے تھا، وہی اثر اس پیغام کا آپ پر پہلا مرتب ہوا کہ شاہ جہاں پور جانے کا جیسا کہ لکھا ہے

"ارادہ سست ہوگیا"

مگر ایک طرف انسپکٹر صاحب کا یہ پیغام تھا، اور دوسری طرف عام پھیلی ہوئی میلہ کی مشتہرہ خبر یعنی شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ، اسی دعوت نامہ کی بنیاد پر آپ کا چل پڑنا کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھیک اسی سال یعنی ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں بنارس سے ستیارتھ پرکاش پنڈت دیانند کا شاہکار پریس سے باہر آیا تھا، جس میں دنیا کے سارے مذاہب و ادیان کو جیسا کہ آپ سن چکے وہ کچھ سنایا گیا تھا، جسے دنیا کے کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

ادھر یہ کتاب پریس سے باہر آتی ہے، اور اسی سال شاہ جہاں پور کے ایک ایسے میلہ کے انعقاد کی خبر پھیلتی ہے، جس میں مذاہب و ادیان کے نمائندوں کے درمیان اعلان کیا گیا تھا کہ مباحثہ اور مناظرہ ہوگا، اعلان ایک ہندو رئیس کی طرف سے تھا، اور اطلاع دی گئی تھی کہ پہلی دفعہ ہندو مذہب کے نمائندے بھی اس اکھاڑے میں اتریں گے یا اتارے جائیں گے۔

نانوتہ تو خیر ذرا ایک مضافاتی آبادی تھی، لیکن میرٹھ مظفر نگر دہلی وغیرہ جیسے شہروں میں جو چہ میگوئیاں اس سلسلہ میں ہو رہی ہوں گی، ہم ان کا شاید آج صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے، خصوصاً میرٹھ تو ایک حیثیت سے سوامی دیانند کا گویا گڑھ ہی تھا۔ میرٹھ ہی سے، پنڈت جی کے قائم کئے ہوئے نئے "سماج" یعنی آریہ سماج کا آرگن "آریہ سماچار" نامی اخبار نکلتا تھا، کچھ ان ہی باتوں کا اثر غالباً یہ ہوا کہ گو شاہ جہاں پور کے

سفر کا ارادہ سست پڑ چکا تھا، لیکن جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے دہلی سے

بہ نظر احتیاط ایک خط شاہ جہاں پور کو لکھا کہ آپ بلاتے ہیں، اور مولوی منیر صاحب (جن کے

ذریعہ انسپکٹر صاحب کا پیغام پہنچا تھا وہی) یوں لکھتے ہیں (یعنی علماء کے آنے کی کچھ حاجت

نہیں) اس لئے تردد ہے" ص۳۱

جن صاحب کے نام حضرت والا کا گرامی نامہ تھا، ان کو خاص طور پر تاکید کی گئی تھی کہ اس مذہبی میلہ

کی واقعی نوعیت کیا ہے۔

"مفصل لکھئے"

میلہ ۷ مئی کو منعقد ہونے والا تھا، اور یہ خط دہلی سے شاہ جہاں پور اتنے تنگ وقت میں پہنچا کہ انعقاد

میلہ کی تاریخ سے کل تین دن پہلے یعنی ۴ مئی کو اسی دن

"۴ مئی کو (شاہ جہاں پور سے) اول تو ایک تار برقی آیا"

یہ وہ زمانہ تھا کہ تار کے پڑھنے والے دلّی جیسے شہر میں بھی بآسانی ہر جگہ نہیں میسر آتے تھے، ۴ مئی کا دن

بھی گزر گیا، اور پتہ نہ چلا کہ تار کا مضمون کیا ہے، بمشکل تلاش کرنے کے بعد انگریزی جاننے والے

کوئی صاحب ملے تب

"قریب شام یہ معلوم ہوا کہ "ضرور ہی آؤ" "

یہی اس تار برقی کا مضمون ہے۔ شام کو یہ خبر ملی، اور دوسرے دن یعنی ۵ مئی کو تار کے سوا ایک خط بھی

شاہ جہاں پور کا ملا جس میں لکھا تھا کہ

مولوی عبد الحی (انسپکٹر پولیس شاہ جہاں پور) کو غلطی ہوئی، آپ آئیں، اور مولوی سید

ابو المنصور صاحب کو ساتھ لائیں" ص۳۱

یہ سید ابو المنصور صاحب وہی امام فن مناظرہ کے لقب والے صاحب ہیں۔ پادریوں سے مقابلہ اور مناظرہ

میں جنہوں نے اس زمانہ میں خاص شہرت حاصل کی تھی، ان کو خاص طور پر اپنی رفاقت میں لانے کی

وجہ شاہ جہاں پور کے اس خط میں یہ بتائی گئی تھی کہ

"پادری نول (نولس) صاحب کو جو بڑے لسّان اور مقرر ہیں، یہ دعویٰ ہے کہ بمقابلہ دین عیسوی دین محمدی کی کچھ حقیقت نہیں" صٓ

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی طلبی میں پادریوں کا مقابلہ شاید خود شاہ جہاں پور والوں کے پیش نظر بھی نہ تھا، اور بظاہر اس لئے آپ کو بلانے کی چنداں کوئی خاص وجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ اولاً مناظرہ کہنے یا مکابرہ کے جو اکھاڑے اس زمانہ میں پادریوں کی بدولت قائم ہو گئے تھے، بجز ایک دفعہ کے جس کا ذکر کر چکا ہوں، یعنی تارا چند نامی پادری سے دلّی میں اور وہ بھی باخفاء نام آپ کی گفتگو ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس قسم کی دور از کار اور لاحاصل قصوں میں کبھی دلچسپی ہی نہیں لی تھی اور دلّی والا مباحثہ اولاً ایک مقامی معاملہ تھا، ثانیاً اخفاء نام کی وجہ سے آپ کی طرف اس کے منسوب ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔

تاہم انسپکٹر صاحب شاہ جہاں پور کی مخالفت کے باوجود خود شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا آپ کی تشریف آوری پر اصرار اور کیسا اصرار؟ کہ خط ہی نہیں، بلکہ جس زمانہ میں تار پڑھنے والے دلّی جیسے شہر میں بھی بآسانی نہیں مل سکتے تھے، اس زمانہ میں تار کے ذریعہ سے آپ کی طلبی جو اس زمانہ کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی بجائے خود خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

مگر کوئی تحریری وثیقہ، یا ایسا بیان اب تک مجھے نہیں مل سکا، جس کی روشنی میں اس سوال کا صحیح جواب دوں۔

یہ صحیح ہے کہ جن خصوصیتوں کے ساتھ یہ میلہ چاندا پور میں منعقد ہو رہا تھا، وہ دینی اور مذہبی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مذہب اور دھرم کا معاملہ اس ملک کے باشندوں کی سب سے زیادہ دکھتی رگ ہے، ابھی چند سال ہی تو گذرے تھے کہ ۵۷ء میں حکومت کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ حقیقی اسباب و محرکات کچھ ہی ہوں، لیکن پھٹا تھا تو زخم صرف "چربی لگے ہوئے کارتوس ہی کے قصے سے" مذہبی زخم ہی سے چوٹ لگائی گئی تھی، جس سے سارا ملک گونج اٹھا اور فتنہ و فساد کی آگ بالآخر اسی "گونج" نے اختیار کی۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ

چند سال پہلے جس ملک میں یہ تماشا دیکھا جا چکا تھا' اسی ملک کے ایک ایسے علاقہ میں جیسا کہ روہیلکھنڈ ہے' اور اس کے بھی کسی شہر میں نہیں' بلکہ ایک صحرائی مقام میں جمع کیا جاتا ہے۔ باشندگان ملک کے مختلف مذاہب و ادیان کے نمائندوں کو' جن میں پادری عیسائیوں کے نمائندوں کے متعلق تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ لوگ گونہ عادی ہو چکے تھے' بقول سر سید مرحوم

"پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذاہب کے مقدس لوگوں کو' اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے' جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی" ص ۲۵ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید)

یہ تو خیر روزمرہ کا مشغلہ ہی بن چکا تھا۔ بار بار ایک ہی چیز سے انسان کب تک بھڑکتا رہے۔ لوگوں میں گویا پادریوں کے طرز عمل کی طرف سے گونہ جمود کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی لیکن سوال اس نئے فریق کا تھا' جو پہلی دفعہ اس دنگل میں اترا' یا اتارا گیا تھا۔ میری مراد ہندوؤں سے ہے۔

انصاف کی بات یہی ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں ہندوؤں کا اسلامی دین اور اس دین کے پیشواؤں کے ساتھ جو سلوک بھی ہو' اس عہد کے متعلق تو بہت کچھ کہنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے' لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی کم از کم ہندو مذہب کے فضلاء اور مذہبی زندگی بسر کرنے والے اس باب میں عموماً احتیاط ہی سے کام لینے کے عادی تھے" تحفۃ الہند" نامی کتاب جو ۱۸۵۱ء میں لکھی گئی ہے' یعنی ہنگامۂ غدر سے چھ سال پہلے اس کتاب میں بھی مصنف کتاب کے نو مسلم مصنف مولوی عبید اللہ صاحب نے اس زمانہ کے بعض واقعات کا ذکر کیا ہے' جن کا تجربہ اظہار اسلام سے پہلے ان کو ہوا' جن سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے' منجملہ دوسرے قصوں کے ایک قصہ جوان ہی کے ساتھ پیش آیا' خلاصہ جس کا یہ ہے کہ اظہار اسلام سے پہلے بھی مذہبی امور کے متعلق اپنے بھائی برادری کے لوگوں سے گفتگو کرنے کے مواقع پیش آتے رہتے تھے' ایک دفعہ ایک ایسے وقت ان جید پنڈت سے جو ہندو مذہب کے چھ شاستروں کا عالم تھا' اس سے بھی ان کی گفتگو

ہوئی لکھا ہے کہ

"اس پنڈت کو میرا (در پردہ) مسلمان ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ یہ جانتا تھا کہ یوں ہی مناظرہ کرتا ہے" صلا

اسی لئے منہ دیکھی بات کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، سلسلہ گفتگو میں اسی پنڈت سے ایک دفعہ مولوی عبید اللہ نو مسلم کا یہ مکالمہ ہوا۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - پنڈت جی آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان اپنے دین و طریق پر قائم رہیں، تو ان کی مکت (نجات) ہوگی یا نہیں؟

شاستری پنڈت - ہاں کیوں نہیں ہوگی۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - مسلمانوں کا دین حق ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت - ہاں! ان کے لئے حق ہے۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - ان کے (یعنی مسلمانوں کے) دین کی اصل قرآن شریف ہے، سو قرآن شریف سچی کتاب ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت - کیوں نہیں سچی ہی کتاب ہے۔

مولوی عبید اللہ نے لکھا ہے کہ اس آخری سوال کو ذرا زیادہ زور دے کر میں نے پھر ان سے پوچھا کہ واقعی تم قرآن کو سچی کتاب مانتے ہو، ان کا بیان ہے کہ پنڈت جی نے جواب میں دہرا کر پھر یہی کہا کہ

"ہاں قرآن سچا ہے" صلا

ہے تو یہ ایک انفرادی بات، لیکن جس خاص طریقہ سے خاص موقعہ پر یہ گفتگو ہوئی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ پنڈت جی جو کچھ اس وقت کہہ رہے تھے، یہی ان کا بھی مذہبی عقیدہ تھا، اور خواہ واقعہ کے لحاظ سے یہ خیال غلط ہو، یا صحیح[1] لیکن کہا جا سکتا ہے کہ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قرآن کو سچی کتاب مان لینے کے بعد پھر پنڈت جی کا یہ خیال کہ اسلامی رہنمائی ان کے لئے یعنی صرف مسلمانوں کے لئے حق ہے، اسی لئے مسلمانوں کی نجات کے لئے تو یہ دین کافی ہے لیکن (باقی اگلے صفحہ پر)

ہندؤں کے اعلیٰ طبقات برہمنوں اور پنڈتوں کا احساس اسلام کے متعلق کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

سب سے پہلے دیانند کے زمانہ میں ہندو قوم کی اس موروثی روایت کے برخلاف اسلام اور اسلام کی کتاب، اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں نئی جرأت اور جسارت اس قوم میں پیدا کی گئی تھی نئی بات تھی، نیا جوش تھا۔ یہ میلہ چاند اپور میں ٹھیک اسی زمانہ میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اسی سال پنڈت جی کی کتاب ستیارتھ پرکاش پریس سے باہر آئی تھی۔ مذہبی مباحثہ کے سلسلے میں ہندؤوں کے نئے عنصر کا جو اضافہ اس میلہ میں ہوا تھا، اور جن حالات میں ہوا تھا، اور جن خطرات کا اندیشہ ایسی صورت میں کیا جا سکتا ہے، کیا حکومت جس کی طرف سے باضابطہ اس میلہ کے انعقاد کی اجازت دی گئی تھی، اس اندیشہ کی رعایت اس کے فرائض میں داخل نہ تھی۔؟

حیرت تو اس پر ہوتی ہے، کہ یہی پادری دوسروں کو جو جی میں آتا تھا، جیسے سناتے تھے اسی طرح دوسروں سے بھی سب کچھ سننے کے عادی ہو چکے تھے، آخر ستیارتھ پرکاش میں عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کو جو کچھ کہا جا چکا تھا، جب حکومت کے ساتھ پادریوں کا طبقہ بھی اس کو سن کر خاموش تھا، ستیارتھ

(گذشتہ صفحہ سے) مسلمانوں کے سوا دوسرے ادیان و مذاہب کی طرف جو لوگ منسوب ہیں۔ ان کی نجات کیلئے اسلامی دین کا قبول کرنا ضروری نہیں بلکہ اسلام قبول کئے بغیر بھی ان کی مکتی (نجات) ہو جائے گی، حق پوچھئے تو یہ پنڈت جی کے اس دعوے کی تردید ہے، یعنی قرآن نئی کتاب ہے۔ ان کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے۔ مولوی عبیداللہ صاحب مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی کو میں نے مطلع کیا کہ جناب والا جس کتاب (قرآن) کو آپ نئی کتاب بتلا رہے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ اسلام کے سوا جس دین کی بھی کوئی پیروی کرے گا، اس سے اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا یعنی و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ کا جو مطلب ہے۔ بہر حال اسلام کو دین العرب اور پیغمبر اسلام کو رسول العرب یا رسول الامیین قرار دینے والے درحقیقت نہ اسلام ہی کو حق مانتے ہیں، اور نہ اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک عجیب انکشاف تحفۃ الہند ہی کے مصنف کے بیان سے یہ ہوتا ہے کہ برہمنوں نے عام ہندوؤں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ گیتا میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اپنا دین اگر چہ رائی کے سمان یعنی خردل کے دانہ کے برابر ہو، اور دوسروں کا بہت سمان یعنی پہاڑ کے برابر ہو جب بھی اپنا دین نہ چھوڑنا چاہئے صفحہ ۱۳۳ واللہ اعلم گیتا میں یہ بات پائی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن اس سے اس کا تو پتہ چلا کر مذہب کے متعلق کتنے غلط نقطہ نظر کو ہندوؤں میں پھیلا دیا گیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ مذہب نہ کسی خاص قوم کی وراثت ہے اور نہ کسی مخصوص امت کی ذاتی جائداد۔ بلکہ پیدا کرنے والے خالق نے اپنے بندوں کو ان کی زندگی کے جس قدرتی آئین اور دستور العمل سے آگاہ کیا ہے، انسانیت اپنے صحیح انجام تک جس کی پابندی کئے بغیر نہیں پہنچ سکتی (باقی اگلے صفحہ پر)

پرکاش ۱۸۸۴ء میں چھپ کر پبلک کے سامنے آئی تھی۔ مولوی ابوالوفا ثناء اللہ جنہوں نے آریوں کے ساتھ مناظرانہ کش مکش میں کافی حصہ لیا تھا، وہی اپنی کتاب "حق پرکاش" میں جو ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی اسی بات کی یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"ہندؤوں نے اپنے مضمون کے متعلق (یعنی ستیارتھ پرکاش کے جس حصہ میں ہندؤوں کے مختلف فرقوں پر اعتراضات کئے گئے تھے) ان کی طرف سے اس کتاب (ستیارتھ پرکاش) کے متعدد جوابات دیئے ہیں چنانچہ بعض کے نام یہ ہیں۔ دیانند تمر بھاسکر، دیانند بھاگر، دیانند بھاؤ پرکاش۔"

آخر میں لکھتے ہیں کہ

- "عیسائیوں کا جواب کوئی سننے میں نہیں آیا۔"

مولوی صاحب کو عیسائیوں کی اس عجیب و غریب خاموشی پر حیرت ہوئی ہے، اپنے اسی استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ

"مشنریو! کہاں ہو" (حق پرکاش صـ)

کم از کم اس سے اس کا تو پتہ چلا کہ بتیس[۳۲] سال تک کوئی جواب عیسائیوں کی طرف سے دیانند جی کی کتاب کے اس حصہ کا نہیں دیا گیا تھا، جس میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ عیسائیوں، اور ان کے دین کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا گیا تھا۔

مگر یہی بے حس پادری جن کے کان پر ستیارتھ پرکاش کے فقروں سے بھی جوں نہیں رینگی، وہی نام نہاد خداشناسی کے اس میلے میں اتنے ذکی الحس بن کر شریک ہوئے تھے کہ ایک موقعہ پر بائبل کی تحریف کا قصہ چھڑا۔ خود پادری نولس نے یہ تسلیم کر لیا کہ "انجیل میں یہ فقرہ باہر سے بڑھا دیا گیا ہے[ل]۔" ان کے اس

(گذشتہ صفحہ سے) اسی کا نام مذہب اور دین ہے اصولاً اول سے آخر تک ہر قوم و ہر امت میں اسی دین کو خدا کے فرستادہ حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام پہنچاتے رہے ہیں۔ اسی کی آخری مکمل ترین شکل کا نام الاسلام ہے جو پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے تاریخ کے آخری دور میں دنیا کو دیا گیا ہے ۱۲

ل تفصیل کے لئے تو "میلا خداشناسی چاندپور" کی روداد ہی کو پڑھنا چاہئے، خلاصہ یہ ہے کہ انجیل کے اس (باقی اگلے صفحہ پر)

اعتراف پر سیدنا الامام الکبیر نے ان ہی سے صرف اتنی بات پوچھی کہ

"ایک پیالے پانی میں ایک قطرہ پیشاب کا گر جائے تو وہ قطرہ سارے پانی کو ناپاک بنا دیتا ہے"

بے ساختہ زبان مبارک سے یہ تشبیہی فقرہ کیا نکلا کہ پادریوں کے حلقہ میں غل مچ گیا کہ

"انجیل خدا کا کلام ہے، اس قابل نہیں کہ اس میں ناپاکی ملائی جائے"

حالانکہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے رہے کہ باہر سے ملائے جانے والے جزو کو میں نے پیشاب کی تشبیہ دی ہے۔ انجیل کو تو پاک پانی ہی ٹھہرا رہا ہوں، لیکن پادریوں نے شور اور ہنگامہ کر کے استاد با لآخر اس تشبیہ کو واپس لیتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ

"یہ مثال نہ سنئے، دوسری مثال سنئے" ص۳۲ مباحثہ شاہجہاں پور

الغرض ہندو بھی اب وہ ہندو نہ تھے، جو سوامی دیانند سے پہلے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص میلہ کی حد تک پادری بھی اپنی مصنوعی بردباری و حلم کے جذبات کے برخلاف دوسرے رنگ میں آ کر شریک ہوئے تھے۔

رہا تیسرا فریق مسلمانوں کا، سوا ان کی آتش مزاجیوں، اور دینی معاملات میں ان کی اشتعال پذیریوں کے پھیلائے ہوئے عام چرچوں کے سوا، جب ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ اس مذہب کی کتابیں عموماً جس زبان میں ہیں یعنی سنسکرت زبان تک کے متعلق یہ یاد کرایا جا رہا ہو کہ

"عام طور پر مسلمان اس کو (سنسکرت زبان کو) بت پرستوں کی زبان سمجھتے رہے، اسی لئے ان کے نزدیک وہ (سنسکرت زبان) قابل نفرت ہی رہی" [۱] (دلسنت اسمتھ صاحب کی تاریخ قدیم ہند اردو ترجمہ ص۱)

(گذشتہ صفحہ سے) اور ترجمہ کر جو پہلی دفعہ مرزا پور میں مشنری والوں نے چھاپا تھا اسی کو لے کر سیدنا الامام الکبیر کے اشارے سے امام فن مناظرہ مولوی ابوالمنصور صاحب کھڑے ہوئے اور یوحنا کی انجیل باب ۵ درس ۷ میں جو فقرہ پایا جاتا ہے کہ تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ کلام اور روح القدس اور تینوں ایک ہیں" اسی پر حاشیہ خود مرزا پور کی مشنری والوں کی طرف سے لکھا گیا تھا کہ یہ فقرہ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پایا جاتا" گویا پادریوں کی یہ اعترافی شہادت تھی۔ خود پادری نولس نے بھی تصدیق کی کہ واقعی یہ الحاقی فقرہ ہے۔ دیکھو ص۳۲

[۱] اس میں شک نہیں کہ یورپ کی جدید علمی تحقیقات میں مختلف قدیم زبانوں اور ان کے حروف کے (باقی اگلے صفحہ پر)

بجائے خود یہ، یا اسی نوعیت کے پھیلائے ہوئے دوسرے الزامات یا اتہامات کی واقعی حقیقت جو کچھ بھی ہو، لیکن جس زمانہ میں یہی سمجھا بھی جاتا تھا، اور یہی سمجھایا بھی جاتا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلہ میں دیانت کی جسارتوں کی بہت افزائیوں کے بعد لا کر کھڑا کر دینے کا منطقی انجام خود ہی سوچنا چاہیے کہ کیا ہو سکتا تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کھڑے کرنے والوں نے چاندا پور کے اس میلہ میں جن مختلف ادیان و مذاہب کے نمائندوں کو لا کر جمع کیا تھا، پہلے سے کچھ اسی قسم کے انجام کا تصور کر کے قدر اشناسی کے نام نہاد نام سے اس میلہ کے جانے کا نظم چاندا پور میں کیا تھا۔ پہلے بھی شاید کہہ چکا ہوں کہ اس کی کوئی واضح شہادت ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ جب اس میلہ کی ان دونوں رودادوں کو پڑھتا ہوں جن میں دو سالوں کی کارروائیوں کو معتبر و مستند صاحبان ہوش و گوش نے مرتب کر کے شائع کر دیا تھا، اور جہاں تک میں جانتا ہوں، واقعات جن کا تذکرہ ان رودادوں میں کیا گیا ہے، ان پر نہ اسی زمانہ میں کسی نے کسی قسم کی تنقید کی تھی، اور نہ آج تک ان کے خلاف کوئی آواز کسی طرف سے بلند ہوئی ہے، ان واقعات کے جاننے کے بعد نیتوں کے متعلق میرا خیال تو یہی ہے کہ اپنے حسن ظن کو مشکل ہی سے محفوظ

(گذشتہ صفحہ سے) پڑھنے کا عام مذاق خصوصاً یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں جو پایا جاتا ہے مسلمانوں کے زمانہ میں اس مذاق کی عمومیت کا پتہ نہیں چلتا۔ سنسکرت ہی کیا یونانی زبان اور اس زبان کے حروف کے جاننے والے اور پڑھنے والے مسلمانوں میں کم ہی پیدا ہوئے ہیں، لیکن باوجود اس کے جیسے یہ مسلم ہے کہ یونانیوں کا سارا علمی سرمایہ جو یورپ والوں تک پہنچا، اس سرمایہ کی منتقلی میں واسطہ کا کام زیادہ تر مسلمانوں ہی نے انجام دیا ہے۔ اسی طرح سنسکرت زبان کے جاننے والے یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں معدودے چند افراد مثلاً البیرونی وغیرہ ملتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے علوم و فنون طب و نجوم ہیئت فلسفہ اور اس ملک کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے کافی فائدہ اٹھایا ہے، تقریباً اسی قدر جتنا نفع یونانیوں کے علوم و فنون سے ان کو پہنچا ہے، ایسی صورت میں سنسکرت زبان کے جاننے والوں کی کمی کو نفرت کا نتیجہ قرار دینا بجز تہمت تراشی کے اور بھی کچھ ہے۔ نفرت ہوتی تو پھر ہندوستان کے علوم و فنون کو مسلمان ہاتھوں ہاتھ کیوں لیتے، بغداد کا دار الحکمت ان کی کتابوں سے کیوں بھر جاتا!

بت پرستی کا لطیفہ احمد صاحب نے جو پیش کیا ہے، میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یونان کی بت پرستی کیا ہندوستان کی بت پرستی سے کچھ کم تھی ؟

رکھنے میں کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں روداد یں عام طور پر ملتی ہیں' ان کو پڑھئے۔

اس میں شک نہیں کہ میلہ میں شرکت کی دعوت "خدا شناسی" ہی کے نام پر دی گئی تھی' اشتہار جس میں میلہ کے قائم کرنے کی غرض وغایت بیان کی گئی تھی' پہلے بھی نقل کر چکا ہوں' اس کا مضمون یہ تھا'

"میلے کے نام سے آپ کو میلہ کی غرض وغایت معلوم ہو گئی ہوگی' مگر مزید وضاحت کے لئے عرض ہے' کہ اصلی غرض "تحقیق مذہبی" ہے' اور اشتہار کا منشا یہ ہے' کہ میلہ میں ہر مذہب کے آدمی آئیں' اور اپنے دلائل سنائیں' قواعد کی تفصیل آئندہ طے ہوگی"!

لیکن ہوا کیا؟ پہلا سال جس میں باوجود توقع کے پنڈت دیانند سرسوتی جی شریک نہ ہو سکے' حالانکہ اسی سال ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش شائع ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے سارے مذاہب پر اعتراض کیا گیا تھا' یوں بھی سارے ہندوستان میں ہلچل وہ اسی زمانہ میں مچائے ہوئے تھے' اور اپنے ساختہ پرداختہ مذہب جس کا نام انہوں نے ویدک دھرم رکھ دیا تھا' چیلنج کرتے پھرتے تھے' کہ سارے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں صرف یہی ایک سچا دھرم اور صادق دین ہے۔ لیکن اب اسے کیا کہئے' کہ نہ صرف پنڈت جی ہی اس میلہ میں غائب تھے بلکہ شاہ جہان پور کے قریب ہی اسی روہیل کھنڈ میں منشی اندرمن جو زبان سے تو نہیں' لیکن قلم سے ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی میلے کے اس پہلے سال میں ہم نہیں پاتے بلکہ بجائے ان دونوں کے ہندو مذہب کی نمائندگی یا وکالت کرنے کے لئے جو آئے تھے' وہ اسی قسم کے لوگ تھے' کہ نہ ان رودادوں ہی میں ان کے ناموں کا اس زمانہ میں تذکرہ کیا گیا ہے' اور نہ باوجود تلاش کے کسی دوسرے ذریعہ ہی سے اس وقت تک مجھے کچھ نشان پتہ ان بے چاروں کا چل سکا۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کون لوگ تھے' اور ان کی علمی حیثیت کیا تھی؟ دو دن تک جلسہ ہوتا رہا' ان پورے دو دنوں میں ان کی طرف سے کوئی گویا اٹھا ہی نہیں' اسی سال کی روداد میں ہے کہ دوسرے دن آخری جلسہ میں پادری نولس صاحب نے کہا کہ "اب بھائی ہندو اپنا بیان کریں"۔ یہ سن کر بے چارا ایک پنڈت اٹھا ہی تھا کہ اچانک بقول صاحب روداد کے

"ایک دیسی پادری جو بڑے پادری صاحب (نولس صاحب) کے قریب ہی بیٹھے تھے اور

ان کے اٹھنے بیٹھنے سے یہ نمایاں تھا کہ بعد پادری نول صاحب کے انہیں کا رتبہ ہے ،

وہی پادری صاحب (یعنی پادری نولس صاحب) کی طرف جھک کر کان میں کچھ فرمانے لگے" ص۳۸

کان میں کیا کہا گیا، دوسروں کے لئے اس کے جاننے کی صورت ہی کیا تھی۔ البتہ یہ دیکھا گیا کہ بجائے پنڈت صاحب کو تقریر کے اس مقام سے جہاں وہ آکر کھڑے ہوئے تھے ہٹا دیا گیا، اور کان میں جھک کر بولنے والے پادری کو نولس صاحب نے پنڈت جی کی جگہ تقریر کرنے کا حکم دیا، وہ تقریر بھی کیا تھی، کچھ مجذوب کی سی بڑ تھی جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ وقت ٹالنے کے سوا بظاہر پادری صاحب کی اس تقریر کا شاید کوئی دوسرا منشاء معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لکھا ہے کہ اسی کے بعد دو بج گئے ، اور جب دوسرے دن کا آخری اجلاس ختم ہو رہا تھا جس کے بعد میلہ ہی اس سال کا ختم ہو جاتا۔ اسی تنگ وقت میں دیکھا گیا کہ وہی پنڈت جی جو بٹھا دیئے گئے تھے، وہ آئے اور بجائے تقریر کے جس کے لئے وہ کھڑے ہوئے تھے دیکھا گیا کہ ایک تحریر پڑھ رہے ہیں

"وہ تحریر ناگری میں لکھی ہوئی تھی" ص۳۹

ناگری تو حرف تھا، باقی زبان سو لکھا ہے کہ

"اکثر الفاظ زبان سنسکرت کے تھے"

جسے مسلمان کیا جس علاقہ میں تحریر سنائی جا رہی تھی، اس علاقہ کے ہندو بھی عموماً نہیں سمجھ سکتے تھے لکھا ہے کہ ان پنڈت جی کے بعد

"ایک فقیر سروپ سنگھ آئے، اور ایک تحریر طویل جو بخط ناگری لکھی ہوئی تھی، لائے اور پڑھنی شروع کی، اکثر الفاظ سنسکرت کے تھے اور اسی زبان کے دوہرے اس میں مرقوم تھے" ص۴۰

گویا یہ دونوں تحریریں پڑھی تو ضرور گئیں لیکن جب کسی نے ان کا مطلب ہی نہ سمجھا تو بجز اس بات کے کہ ہندوؤں کے نمائندوں نے بھی مباحثہ میں حصہ لیا، خانہ پری کی حد تک اتنی بات تو صادق آگئی اور کوئی مآل یا مقصد ان تقریروں کا معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں! ایک سال بعد جب یہی میلا اسی میدان میں جما تو بالکل گذشتہ سال کے برعکس اس سال پنڈت دیانند سرسوتی جی بھی تشریف لاتے ہیں، اور پنڈت اندرمن کو بھی ہم مجلس میں جلوہ فرما دیکھتے ہیں۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ گذشتہ سال ان دونوں صاحبوں میں سے ایک بھی نہ آیا۔ اور اس سال آئے تو دونوں ہی آئے اور کس شان کے ساتھ آئے!

"مباحثہ شاہجہانپور" نامی دوسرے سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہفتہ پہلے سے پنڈت جی چاندا پور پہنچے ہوئے تھے، مباحثہ کی مجلس میں منشی پیارے لال کی طرف سے بزبان اردو پانچ سوالات اس مطالبہ کے ساتھ پیش کئے گئے کہ پہلے ان سوالوں کا جواب دیا جائے، لکھا ہے کہ

"حسب بیان بعض معتبرین سوالات مذکورہ پنڈت دیانند کے تجویز کئے ہوئے تھے" ص۵۲

اسی کے بعد یہ بھی ہے کہ

"جو شخص خود سوالات کرے گا، اور وہ بھی اس طور پر کہ ایک ہفتہ پہلے اسی کام کے لئے آیا ہوا ہو" ص۵۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میلہ کے بانی منشی پیارے لال رئیس چاندا پور کا تعلق جیسے شاہجہانپور مشنری اسکول کے ہیڈ ماسٹر پادری نولس صاحب سے تھا، اسی طرح پنڈت جی سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے، منشی جی بے تعلق نہ تھے۔ بلکہ اسی روداد سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرے سال کے اس میلے کے برخواست ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نمائندے علماء وغیرہ تو شاہ جہاں پور

"حسب خواہش مولوی محمد طاہر صاحب (یعنی مولوی مدن والے موتی میاں کے) مکان پر فروکش ہوئے" ص۸۵

اور انہیں کے مہمان بھی رہے، اپنی موروثی روایت کے مطابق موتی میاں نے ان کی خاطر مدارات میں خاندانی خصوصیات کا اظہار جس پیمانے پر کیا تھا، اس کا اندازہ صاحب روداد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

"ان کی مہمان نوازی اور دل جوئی، اس وقت آنکھوں میں پھرتی ہے" ص۸۵

مگر اس کے برخلاف سارنگپور سے جہاں کے باغ میں میلا جایا گیا تھا' بجائے شہر یعنی شاہ جہاں پور آنے کے لکھا ہے کہ

"پنڈت صاحب یعنی سوامی دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن چاند اپور کو چلے گئے" ص۳

یہ بھی اسی میں ہے کہ موتی میاں نے بعض لوگوں کی تحریک سے جن میں سیدنا الامام الکبیر کا اشارہ بھی تحریک تھا۔ منشی اندرمن کے پاس شاہ جہاں پور سے اپنا خاص آدمی چاند اپور یہ دعوت نامہ دے کر روانہ کیا کہ

"آپ براہ کرم بہمراہی پنڈت دیانند صاحب تشریف لا کر قبول دعوت سے مرہون منت فرمائیں۔"

غرض بلانے کی یہی تھی کہ بعض تشنہ مسائل پر پنڈت جی اور منشی اندرمن سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ دعوت نامہ میں اس کی اطلاع بھی دے دی گئی تھی' مگر جواب میں منشی اندرمن نے بجائے شاہ جہاں پور کے لکھا کہ اپنے مولویوں کو لے کر آپ ہی چاندا پور آئیے' جہاں منشی پیارے لال کے مہمان بن کر منشی جی بھی اور پنڈت جی بھی فروکش تھے۔

ان ساری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی اور منشی اندرمن دونوں ایک طرح سے منشی پیارے لال کو اپنا سرپرست سمجھتے تھے[1]۔ ایسی صورت میں طرفین کے متعلق بے گانگی کا خیال خود ہی سوچنا چاہیے کہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

مگر باوجود اس کے میلہ جو پہلی دفعہ دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا' اسی میں دونوں کا نہ آنا' اور ان کی جگہ گمنام پنڈتوں کا پہنچنا' آخر اس کی توجیہ کیا کی جائے۔ پنڈت جی کے ساتھ جب ہم جانتے ہیں کہ کام کرنے والوں کی کافی تعداد تھی۔ ڈاکٹر مرڈک صاحب ایم۔ اے کی شہادت بھی گذر چکی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "سوامی جی تعریف کرنے والوں کی ایک جماعت اپنے ساتھ رکھتے تھے" بلکہ کتاب "جواب ترکی بہ ترکی"

[1] منشی اندرمن کے جوابی خط میں یہ بھی تھا کہ "جن آپ کے (یعنی مولوی طاہر عرف موتی میاں کے) مکان پر نہیں آتا' ہاں! منشی گنگا پرشاد رہتے تھے جن کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر بمقام شاہ جہاں پور ہو گئی ہے' تو ان کے مکان پر آ سکتا تھا" ص۳ مباحثہ شاہ جہاں پور شاید ان منشی گنگا پرشاد سے بھی منشی جی کا وہی سرپرستی کا تعلق تھا جو منشی پیارے لال تعلقہ دار چاندا پور کے زیر سایہ ان کو حاصل تھی۔ ۱۲

سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کو آگے بڑھا کر کام نکالنا یہ بھی سوامی جی کے مختلف طریقوں میں ایک خاص طریقہ تھا، میرٹھ کے ایک آریہ منشی اندرلال تھے۔ اس کتاب میں ان ہی کے سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، مگر یہ کہتے ہوئے کہ

"کون نہیں جانتا کہ پنڈت جی (یعنی سوامی دیانند جی) منشی جی (اندرلال) کے سر پول پر ہیں" ص۸

اس موقعہ پر یہ مشہور شعر

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

"جواب ترکی بترکی" کے مصنف نے استعمال کیا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ پہلے میلے میں پنڈت جی اور منشی جی کی عدم شرکت کی تہ میں کچھ اسی قسم کی بات تھی۔ اگر واقعی مذہب کی تحقیق میلے کی غرض تھی تو ہندوؤں کی طرف سے جن سربرآوردہ ذمہ دار لوگوں کی شرکت کی توقع کی جا سکتی تھی، وہ اس میلے سے غیر حاضر کیوں ہوئے، اور ان میں جو آئے بھی، تو گو ابتدا میں ہندوؤں کی طرف سے منشی پیارے لال صاحب نے پہلی جو تقریر کی، وہ عام فہم تھی، لیکن اٹھنے کے بعد جن پنڈت صاحب کو بٹھا دیا گیا، اور پادری نولس کی سرگوشی دوسرے پادری سے جو گویا ان کے نائب تھے جب ہوئی تو اس کے بعد ہندوؤں کے نمائندوں نے اولاً تقریر ہی نہ کی، بلکہ ان کی طرف سے تحریر پڑھی گئی، اور تحریر بھی اسی زبان میں جسے جلسہ کے عام شرکا بھی نہ سمجھتے تھے، اور نہ دوسرے مذاہب کے نمائندے اس زبان سے واقف تھے۔ اسی طرح دوسرے سال پنڈت دیانند جی اور منشی اندرمن حسب توقع تشریف تو ضرور لائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سال کے میلے میں جیسا کہ "مباحثہ شاہجہاں پور" میں لکھا ہے

"ہنود میں سوائے پنڈت صاحب کے اور کوئی صاحب اول سے آخر تک کھڑے ہی نہیں ہوئے" ص۱۲

اور ان کی تقریر کا رنگ جو رہا اس کا اندازہ اسی روداد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

"ان کی زبان میں الفاظ سنسکرت بہت ملے ہوئے تھے بلکہ اکثر جملے کے جملے سوائے کے

کا وغیرہ حروف ربط کے سنسکرت ہی ہوتے تھے" ص۱۲

جس کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا یہی ہوا کہ

"سوائے دو چار آدمیوں کے حاضران جلسہ میں سے ان کے مطلب کو کوئی نہ سمجھا ہوگا"

ان دو چار آدمیوں کا حال یہی تھا کہ سوط اللہ الجبار کے مصنف بچھرایوں کے مولنا محمد علی صاحب

جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ہندو دادبیات کا کافی مطالعہ کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے سیدنا الامام الکبیر

نے ان سے کہا

"یہ نیاز مند تو پنڈت جی کی تقریر کچھ سمجھا نہیں، اس لئے اب آپ ہی کو تکلیف کرنی پڑے گی"

مگر مولانا محمد علی صاحب نے جواب میں کہا کہ

"میں بھی پورا پورا نہیں سمجھا"

دل چسپ لطیفہ اسی روداد میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے عین اس وقت جس وقت پنڈت صاحب تقریر کر رہے تھے اپنی

کرسی سے اٹھ کر آہستہ سے منشی اندرمن صاحب سے یہ کہا کہ آپ اگر خود کچھ نہیں بیان فرماتے

تو یوں ہی کیجئے کہ آدھے وقت میں تو پنڈت صاحب جو کچھ ان کو بیان کرنا ہو کر لیا کریں اور

آدھے وقت میں آپ اس کا ترجمہ کر دیا کریں، جو ہم بھی کچھ سمجھیں"

اردو اور فارسی زبان کے مصنف منشی اندرمن یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جلسہ کے حاضرین جس زبان کو

سمجھتے ہیں ہم اس سے ناواقف ہیں۔ اس لئے انہوں نے مولنا کی پیش کش کے جواب میں فرمایا کہ

"سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کبھی لکچر دینے کا اتفاق نہیں ہوا، جو لوگ یہ کام کرتے رہتے ہیں انہیں

سے ہو سکتا ہے، اس لئے میں معذور ہوں" ص۱۳

یوں منشی جی بھی کترا گئے، حاصل یہی ہوا کہ شریک ہوئے اور بظاہر کچھ گفتگو میں ہندوؤں نے حصہ

ضرور لیا، لیکن میلے کے ان دونوں سالوں میں نتیجہ کے لحاظ سے ہندوؤں کی حیثیت گویا صفر ہی بن کر رہ گئی تھی۔

اور یہ حال تو مباحثہ میں حصہ لینے والے فریقوں کا تھا کہ مسلّم ایک فریق کا وجود قریب کالعدم ہی کے رہا۔ اب سنئے انعقاد میلہ اور مباحثہ میں حصہ لینے والے حضرات جب "مجلس مباحثہ" میں جمع ہو گئے، تو پادری نولس صاحب کی طرف سے گفتگو کی شرطوں، اور قیدوں کا سوال اٹھایا گیا، اور سب سے پہلے اس سلسلہ میں وقت کے مسئلہ کو اہمیت دی گئی، اصولاً خود سیدنا الامام الکبیر بھی تحدید وقت کے قاعدے کے حامی تھے۔ حضرت نے پادری نولس سے کہا بھی تھا کہ تعین وقت کی وجہ یہ ہے، کہ

"مبادا کوئی شخص مفت مغز زنی کرنے لگے، اگر وقت محدود نہ کیا جائے گا، تو ایسا شخص بے وجہ مغز کھائے گا، اور اس کے سوا (دوسروں کو) بولنے کی گنجائش نہ ملیگی" منشور صداقت

آپ ہی کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی، کہ واقعی دین کی تحقیق مقصود ہے تو ایک صورت اوقات کی تعیین و تقسیم کی یہ ہو سکتی ہے کہ

"مباحثہ تین دن تک اس طور پر ہے کہ ایک روز ایک مذہب والا اپنے دین کے فضائل گھنٹہ دو گھنٹے بیان کرے، اور پھر اس پر دوسرے مذہب والے اعتراض کریں اور جواب سنیں" ۱

اور کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو یعنی مباحثہ کے تینوں فریق (ہندو، مسلمان عیسائی) کے لئے ایک ایک دن نہیں دیا جا سکتا، تو آپ ہی نے دوسری متبادل تجویز پادری صاحب کے سامنے یہ رکھی کہ

"درس (یعنی تقریر) کے لئے کم از کم ایک گھنٹہ، اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے دیئے جانا مقرر ہوں، اور سوال و جواب (تنقیدی اعتراضوں) کے لئے دس منٹ سے بیس منٹ تک" ۱ ص۲

لیکن ہوا یہی کہ پہلے سال کے میلے میں تو خیر

"مدت وعظ (درس) پندرہ منٹ' اور سوال و جواب کی مدت ۱۰ منٹ قرار پائی "

لکھا ہے کہ

"اگرچہ اس امر میں مولوی محمد قاسم صاحب نے چاہا کہ مدت وعظ اور بڑھا دی جائے ' اور یہ بھی فرمایا کہ اتنے عرصہ میں حقیقت مذہب کما حقہ ثابت نہ ہو سکے گی مگر عیسائیوں نے نہ مانا " ص

تاہم ۱۵ منٹ کی مدت بھی غنیمت تھی۔ دوسرے سال کے میلے میں تو حد ہی کر دی گئی' کہ

"پادری نولس صاحب نے کہا کہ ہر ایک شخص کے درس و سوال و جواب کے لئے ۵ منٹ کی مدت مقرر ہو "

گھنٹہ دو گھنٹے کی جگہ درس یعنی تقریر' اور سوال و جواب (تنقیدی اعتراضوں) دونوں کے لئے پندرہ منٹ اور دس منٹ بھی' بلکہ یہ حکم کہ سب کچھ تقریر بھی' اور سوال و جواب بھی' ان سارے قصوں کو ۵ منٹ میں ختم کر دیا جائے' لکھا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے لاکھ کہا گیا کہ

"۵ منٹ میں تو کچھ بھی بیان نہیں ہو سکتا "

سمجھایا جاتا تھا کہ

"دنیوی جھگڑے جو فروع سمجھے جاتے ہیں' ان میں بھی مقنوں پنچایت و بحث ہوتی ہے' یہ تحقیق مذہب ۵ منٹ میں کیونکر ہو سکتی ہے " ص

مسلمانوں کے نمائندے یہی کہتے رہے کہ

"ہم لوگ بھی تو اس جلسہ کے ایک رکن ہیں' ہماری رائے کی رعایت ضرور ہے " ص مباحثہ شاہجہان پور

سیدنا الامام الکبیر بار بار فرماتے کہ

"پہلے سے کون اپنے مطالب کو ناپ تول کر لاتا ہے' جو وقت قلیل محدود الطرفین میں بیان کرے " ص

لکھا ہے کہ ایک دفعہ تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

"جس مذہب میں ایک دو فضیلت ہو، تو وہ دو چار منٹ میں بیان کر سکتا ہے، پر جس کے مذہب میں ہزاروں فضائل ہوں، وہ اتنے تھوڑے عرصہ میں کس طرح بیان کر سکتا ہے" ص۴۹

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ پہلے ہی میلہ میں خود پادری نولس صاحب جنہوں نے بضد ہو کر ۵ منٹ سے زیادہ درس یا تقریر کے لئے دینے سے انکار کیا تھا، وہی خود جب درس دینے کیلئے کھڑے ہوئے اور ۵ منٹ ختم ہو گئے، اپنے خیال میں پادری صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کی تقریر پوری نہ ہو سکی تو لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب وغیرہ کی طرف مخاطب ہو کر کیا کہتے ہیں"

سنئے کیا کہتے ہیں؟

"اگر آپ صاحب مہربانی فرما کر کچھ اور مہلت دیں، تو ہم کچھ اور بیان کر لیں"

مولویوں کے عام طبقہ کی طرف سے پادری صاحب کی اس درخواست کے جواب میں جو کچھ کہا گیا تھا، اس کا ذکر تو میں کسی دوسرے موقعہ پر کروں گا، لیکن سیدنا الامام الکبیر نے آگے بڑھ کر اس وقت فرمایا تھا کہ

"پادری صاحب ہم آپ کی طرح نہیں کہ اجازت ہی نہ دیں، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ آپ پندرہ منٹ کی جگہ بیس منٹ بیان کریں، پچیس منٹ بیان کریں، تیس منٹ بیان کریں، آپ حسب دل خواہ بیان کر لیں" ص۴۳ میلہ خدا شناسی

مگر اس تجربہ کے بعد بھی دوسرے میلہ میں جب وقت کا مسئلہ چھڑا تو انہیں پادری نولس صاحب نے ۵ اور منٹ کو گھٹا کر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں پانچ منٹ کر دیا، اگرچہ اسی دوسرے میلے میں دوسرے دن ایک اور پادری صاحب کو نولس صاحب نے اپنی امداد کے لئے طلب کیا تھا، جن کا نام پادری اسکاٹ تھا، اور مشہور تھا کہ وہ منطق کی کسی کتاب کے مصنف ہیں، ایسی اچھی کتاب فن منطق میں لکھی ہے کہ حکومت کی طرف سے مشہور تھا کہ پانسو روپے انعام کے طور پر ان کو دیئے گئے ہیں، بہرحال کہنا یہ ہے کہ جب یہی پادری اسکاٹ آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ تقریر و درس کے لئے کل ۵ منٹ کا وقت دیا گیا ہے تو انہوں نے

اس کی مخالفت کی اور کہا

"درس کے لیے ایک گھنٹہ سے کم نہ ہونا چاہیے' اس باب میں مسلمانوں کی رائے ٹھیک ہے"

اسکاٹ صاحب بار بار کہتے تھے کہ

"ایک گھنٹہ سے کم میں کوئی کیا بیان کرے گا" ص۴۹

خیر یہ قصے تو وقت کی تحدید و تعیین کے متعلق تھے' گویا میلہ خدا شناسی کے اشتہار میں جن شرائط کی تفصیل کا وعدہ کیا گیا تھا' ان میں ایک شرط کا انجام تو یہ ہوا۔ دوسری شرط جس کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میلے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی' لیکن دوسرے میلے میں دیکھا جاتا ہے کہ تمام شرطوں میں اسی کو اہم ترین شرط قرار دیا جا رہا ہے یعنی یہ چاہا گیا کہ مباحثہ سے پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ کس ترتیب سے بحث ہوگی' مباحثہ شاہ جہاں پور سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے رہے کہ واقعی مقصد اس میلہ کا اگر اثبات تحقیق مذہب ہے تو اس کی طبعی ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ

"اول ذات باری میں گفتگو ہو کہ وہ ہے یا نہیں' اور ہے تو ایک ہے یا متعدد' پھر صفات باری میں گفتگو ہو کہ صفات مخصوصہ ذات خالق کیا کیا ہیں' اور کون کون سی صفات اس میں پائی جاتی ہیں کون سی نہیں پائی جاتیں' پھر تجلیات باری میں گفتگو ہو"

تجلیات باری کا کیا مطلب ہے' اس کی طرف اجمالی اشارہ کے بعد فرمایا گیا کہ

"نبوت میں گفتگو ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہے کہ نہیں' اور کون ہے کون نہیں' اس کے بعد احکام میں مباحثہ ہو کہ کون سا حکم اصول مذکورہ پر منطبق ہو سکتا ہے اور کون سا حکم منطبق نہیں ہو سکتا' اور کون سا قابل تسلیم ہے" ص۵۲

---

[1] بحث کی حد تک آپ نے آخر میں اس سوال کو بھی فہرست مباحثہ میں شریک کر دیا تھا' لیکن اسی کے ساتھ جو اصل حقیقت اس باب میں ہے اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت والا نے یہ بھی اسی کے ساتھ فرمایا تھا کہ اگرچہ بروئے انصاف "بعد ثبوت نبوت شخص معین و صحت روایت" یعنی ثابت ہو جائے فلاں شخص نبوت کے دعوے میں صادق ہے' اس کی طرف جو حکم اور جو بات بھی صحیح ذریعہ سے منسوب ہو' بہرحال فرمایا گیا تھا کہ ان دونوں باتوں سے مطمئن ہو جانے کے بعد عقل نارسا سے احکام کی بھلائی اور برائی کی تفتیش امر لاطائل بلکہ نازیبا ہے (باقی ص۳۹۵ پر)

مگر بجائے اس ترتیب کے آغاز جلسہ ہی میں جیسا کہ لکھا ہے کہ منشی پیارے لال بانی جلسہ نے ایک کاغذ اردو لکھا ہوا پیش کیا کہ یہ پانچ سوال ہماری طرف سے پیش ہوتے ہیں سیدنا الامام الکبیر کے پیش کردہ سوالات کے درج کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے' ان سوالوں کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے

(۱) دنیا کو پرمیشور (خداوند تعالیٰ) نے کس چیز سے بنایا' اور کس وقت اور کس واسطے۔ (۲) پرمیشر کی ذات محیط کل ہے یا نہیں' (۳) پرمیشور عادل ہے' اور رحیم ہے' دونوں کس طرح۔ (۴) وید' بائیبل' اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے۔ (۵) نجات کیا چیز ہے' اور کس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔

یہی وہ سوالات ہیں' جن کے متعلق عرض کرچکا ہوں' سمجھا جاتا تھا کہ پنڈت دیانند جی نے ایک ہفتہ پہلے منشی اندرمن کے ساتھ چاندا پور پہنچکر کافی غور و خوض کے بعد مرتب کرکے منشی پیارے لال کے حوالہ کیا تھا۔

حیرت ہوتی ہے' کہ دوسرے میلہ میں بھی کل دو ہی دن خداشناسی پر بحث کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے لیکن ان دو دنوں میں بھی اب اسے کیا کہئے کہ تحدید وقت' اور سوالات کی ترتیب ہی کے قصوں میں جیسا کہ مباحثہ شاہجہانپور میں لکھا ہے کہ

"روز اول اصرار اور انکار ہی میں وقت جلسہ گذر گیا اور گفتگو نہ ہونے پائی" ص۱۵

خود سوچنا چاہئے کہ جہاں اتنی بے دردی کے ساتھ غیر ضروری' اور ذیلی رگڑوں جھگڑوں میں وقت کو

(گذشتہ صفحہ سے) پھر کی بات اسی کے بعد یہ فرمائی گئی کہ عقل سے یہ کام یعنی احکام کی برائی بھلائی کا پتہ میں لانا ممکن ہوسکتا تھا تو انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہی کیا تھی' اور نبی کا کہنا جب واجب التعظیم ہوگا تو پھر جو کچھ وہ فرمائیں بسر و چشم۔ ص۳۵ مباحثہ شاہجہانپور

لہ پنڈت جی کو شاید اپنے اسی سوال پر سب سے زیادہ ناز تھا۔ سیدنا الامام الکبیر کی "تجلیات باری" پر بحث کرنے سے غرض ان کے اسی سرمایہ ناز سوال کی بیخ کنی مقصود تھی۔ کائنات حق تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے" اسی میں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے کہ خدا نے عالم کو کس چیز سے بنایا تفصیل کے لئے حضرت والا کی کتابوں کو یا نہ ہوسکے تو فقیر کی مختصر کتاب "الدین القیم" کو دیکھ لیا جائے ۱۲

ضائع کیا جائے، وہاں آدمی اپنے اس ظن کو کہاں تک قائم رکھ سکتا ہے کہ "خداشناسی" کے نام پر لوگوں کو جو جمع کیا گیا تھا۔ واقعی مقصد اس اجتماع کا "خداشناسی" ہی کی صحیح راہ کا پتہ چلانا تھا، سیدنا الامام الکبیر تو کبھی کبھی ان ہی حالات کو دیکھ دیکھ کر فرمایا بھی کرتے تھے، کہ واقعی خداشناسی اگر مطلب ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہوتا، مباحثہ شاہجہان پور میں حضرت والا کا یہ فقرہ نقل بھی کیا ہے، کہ ایک دفعہ منشی پیارے لال کو مخاطب کر کے آپ نے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، صرف حیلہ اور بہانہ ہے، حضرت والا کے بجنسہ الفاظ یہ تھے کہ

"منشی صاحب آپ نے دیکھا پادری صاحب نے کیسے کیسے حیلے اور بہانے کئے"

سوالات کی ترتیب کے قصے میں بھی آپ نے اسی حیلہ اور بہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"اگر اثبات و تحقیق مذہب پر نظر ہے تو ترتیب عقلی (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو ہم نے کل عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں تو منشی پیارے لال صاحب ہی کے فرمانے کا اتباع ٹھیک ہے"

کل دو دن ان میں بھی کامل ایک دن کو اس قسم کے لایعنی مشاغل میں صرف ہوتے ہوئے دیکھ کر سیدنا الامام الکبیر نے جب یہ تجویز پیش کی کہ ایک دن بڑھا کر تین دن کر دیجئے، اور اس پر جیسا کہ لکھا ہے،

"پادری نولس کا یہ کہنا کہ ہم کو زیادہ فرصت نہیں آج اور کل ہی ٹھہر سکتے ہیں"

سیدنا الامام الکبیر سے نہ رہا گیا، جھنجھلا کر آپ نے پادری نولس کو خطاب کر کے کہا تھا

"یہ بات (یعنی عدیم الفرصتی کا عذر) ہمارے کہنے کی تھی، باوجود افلاس و بے سروسامانی قرض دام لے کر اپنی ضرورتوں پر خاک ڈال کر ایک مسافت دور دراز قطع کر کے یہاں پہنچے ہیں، اور اس پر یہ قول ہے کہ جب تک حسب دل خواہ فیصلہ نہ ہو جائے گا، نہ جائیں گے"

اپنے اس حال کو بیان کرنے کے بعد جس میں جہاں تک میرا خیال ہے، واقعہ ہی کا اظہار کیا گیا تھا جس کی تائید کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" کی اس اطلاع سے بھی ہوتی ہے کہ چاندا پور ہی نہیں، بلکہ اس کے بعد رڑکی میں پنڈت دیانند سرسوتی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان جو معرکہ پیش آیا دونوں کی مرتبہ روداد میں سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے چھپ کر شائع نہ ہو سکیں، لکھا ہے کہ

"بوجہ تہی دستی یہ امید ہی نہیں کہ روداد مباحثہ کو چھاپیں، ورنہ چاندا پور، اور رڑکی کا واقعہ ہی کیوں آج تک یوں پڑا رہتا" ص۳

ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں چند ورقوں کے ان مختصر رسالوں کی چھپائی کا سرمایہ مہیا نہیں ہو سکتا تھا، اسی زمانہ میں کیوں تعجب کیجئے اگر نانوتہ سے چاندا پور تک پہنچنے کے لئے قرض دام سے کام لینا پڑا ہو۔

بہر حال اپنے اس حال کو پیش کر کے پادری صاحب سے فرمایا گیا تھا کہ اب آپ اپنے حال کو ملاحظہ فرمائیے کہ

"آپ صاحب تو اسی کام کے نوکر، آنے جانے میں کوئی دقت نہیں" ص۲۲ مباحثہ شاہجہانپور

لیکن باایں ہمہ جیسا کہ آگے لکھا ہے

"پادری صاحبوں پر کچھ اثر نہ ہوا"

خیر اس حد تک تو جو کچھ کیا جا رہا تھا، اس سے صرف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ "تلاش حق" اور "تحقیق مذہب" کے نصب العین کا اعلان کر کے لوگوں کو جو بلایا گیا تھا، ان نئے نئے شاخسانے نکال نکال کر حیلوں اور حوالوں سے اسی کو پس پشت ڈالنے کی کوشش ہو رہی تھی، لیکن قصہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، عرض کر چکا ہوں کہ مباحثہ کے فریق بظاہر خدا شناسی کے اس میلے میں تین تھے، ہندو مسلمان عیسائی لیکن ان دونوں میلوں میں سے پہلے میلے میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہندوؤں کی طرف سے ابتدا میں منشی پیارے لال صاحب بانی میلہ نے اردو ہی میں تقریر شروع کی، لیکن پادری نولس اور ایک دوسرے پادری جن کا مرتبہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے بعد ہے، ان دونوں کی باہمی سرگوشی کے بعد بجائے تقریر کے ہندوؤں کی طرف سے پڑھنے والوں نے ایسی تحریریں پڑھیں جن کی زبان کے سمجھنے والے پورے

میلے میں تین چار آدمی سے زیادہ نہ تھے، یہ تو خیر بجائے خود تھا، دلچسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ پہلے میلے میں دوسرے دن یہ سوال اٹھایا گیا کہ مباحثہ کے ہر فریق کی طرف سے گفتگو میں حصہ لینے والوں کی تعداد معین کر دی جائے۔ بات معقول تھی تسلیم کر لی گئی، طے ہو گیا کہ ہر فریق کی طرف سے پانچ پانچ آدمی اس کام کے لئے چُن لئے جائیں، مسلمانوں نے تو پانچ آدمی اپنے چن لئے، مگر ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا،

"ہمارا ہر فرقہ جدا ہے، ہر ایک فرقہ میں سے پانچ پانچ آدمی چاہئیں "

مطلب جس کا یہی ہوا کہ دو فرقے بھی اگر ہندوؤں کی طرف سے جلسہ میں شریک تھے، تو ان کی تعداد مجموعی طور پر اس طریقہ سے دس ہو گئی، لیکن اس کا پتہ نہ چلا کہ کتنے فرقے ہندوؤں کے قرار پائے، بہرحال مطالبہ پیش ہوا، لکھا ہے کہ

"چنانچہ اسی کے موافق قرار پایا" صلا میلہ خدا شناسی

اس میلے کی حد تک تو معاملہ اسی پر ختم ہو گیا۔ لیکن دوسرے میلہ میں جو کچھ دیکھا گیا، اس کا سراغ ان اطلاعات سے ملتا ہے، جنھیں اس میلہ کی روداد میں ہم پاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ شرائط وغیرہ کے طے و تصفیہ کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ایک سبجکٹ کمیٹی بنا دی جائے۔ جس کے لئے ہر فریق کے چند اشخاص چن لئے جائیں۔ یہی کیا گیا۔ ہندوؤں کی طرف سے سبجکٹ کمیٹی میں بجائے منشی پیارے لال بانی جلسہ اور ان کے ایک رفیق منشی مکتا پرشاد کے پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن پہلے شریک کئے گئے تھے، لیکن جب تعین اوقات وغیرہ کے مسئلے پر گفتگو ہونے لگی، تو لکھا ہے کہ

"پادری صاحب یہ چال چلے کہ منشی پیارے لال اور مکتا پرشاد کو بھی رکن شوریٰ قرار دیا جائے اور یہ کہا کہ وہ بانی مبانی جلسہ ہیں، ان کی رائے لینی بھی ضروری ہے "

یہ بات بھی مان لی گئی، جب یہ سب کچھ ہو لیا، تب سنئے، بیان کیا ہے، کہ پادری نولس صاحب نے سب کو خیمہ میں بلا لیا، اور وہی پرانا حربہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلہ میں اول سے آخر تک استعمال ہوتا رہا ہے وہی ہتھیار نکل آیا، یعنی پادری نولس نے کہا۔

"اعتبار کثرت آراء کا چاہیئے" ص ۱

ادھر پادری صاحب کی طرف سے یہ اعلان ہوا، اور اس کے بعد اول سے آخر تک مسلمانوں کو مسلسل جس چیز کا تجربہ ہوتا رہا۔ مباحثہ شاہجہان پور میں بار بار مختلف پیرایوں میں اس کا اظہار کیا گیا ہے، مثلاً تحدید وقت ہی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال

"بوجہ توافق پنہانی اور نیز پنڈت صاحب بھی اُن کی (پادری صاحب کی) ہاں میں ہاں ملانے لگے" ص ۶

آگے اسی کے بعد تقریباً اسی واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"غرض جس بات کو پادری نولس صاحب کہتے تھے، حضرات ہنود بھی ہاں میں ہاں ملا دیتے اور تسلیم کرتے تھے" ص ۶

ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ منشی پیارے لال کو براہ راست مخاطب کر کے سید الامام الکبیر کو یہ کہنا پڑا،

"منشی صاحب ہم کو آپ سے بڑی شکایت ہے کہ ہم اور پادری صاحب دونوں آپ کے بلائے ہوئے، دونوں آپ کے مہمان ہیں، آپ کو لازم تھا کہ دونوں کو برابر سمجھتے، مگر جب آپ ڈھلتے ہیں، انہیں کی طرف ڈھلتے ہیں، جب تائید کرتے ہیں، ان ہی کی کرتے ہیں، انہیں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں" ص ۴۹

اور مولوی محمد طاہر یعنی مولوی مدن والے موتی میاں جو میلے کے مہتمم تھے۔ انہوں نے تو کھرے کھرے صاف و صریح الفاظ میں منشی پیارے لال سے کہا ہے کہ ترش رو ہو کر کہا کہ

"میں آئندہ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا، اس کے کیا معنی کہ مسلمان جو کہتے ہیں، ان کے کہنے پر تو التفات بھی نہیں کرتے، اور پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہو"

اور اسی موقعہ پر موتی میاں کی زبان سے بے ساختہ وہ فقرہ نکل گیا تھا، جسے پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، یعنی

"یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے" ص ۸

منشی پیارے لال ان باتوں کو سنتے تھے اور عذر و معذرت کے بارد الفاظ میں مختلف قسم کی مجبوریوں کا ذکر کر دیتے بہر حال خدا شناسی کے میلے کے پہلے سال ہی میں جو دیکھا گیا تھا، جیسا کہ اس سال کی روداد کے مرتب کرنے والوں نے لکھا ہے کہ

"اگرچہ بظاہر مناظرہ کرنے والے تین فریق قرار پائے تھے، مسلمان، عیسائی، ہندو، مگر درحقیقت اصل گفتگو مسلمان اور عیسائیوں میں تھی۔" ص۳

کھل کر اس کا جو مطلب تھا، وہ دوسرے سال کے میلے میں لوگوں کے سامنے اس شکل میں آ گیا کہ عیسائی اور ہندو دونوں کو ایک فریق بنا کر مسلمانوں کے مقابلہ میں گویا کھڑا کر دیا گیا ہے، اور وہی ہندوستان جہاں کچھ ہی دن پہلے عیسائی پادریوں کی تبلیغی جد و جہد کے مقابلہ میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ

"ہر ہندوستانی (خواہ مسلمان ہو یا ہندو) عیسائیت کے عروج اور ترقی کو اپنے مذاہب کی بربادی سمجھتا تھا، اسی لئے رد نصاریٰ میں جو کتابیں چھپتی تھیں، ان کو ہندو مسلمان سب پڑھتے تھے۔"

اور صرف پڑھتے ہی نہ تھے، بلکہ رد نصاریٰ میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، عموماً جن کے لکھنے والے مسلمان ہی ہوتے تھے، لکھا ہے کہ ان ہی کتابوں کو ہندو اپنے پریسوں میں چھپوا کر اشاعت کرتے تھے اس سلسلہ کی ایک مشہور کتاب "غایۃ الشعور تیغ الحج المبرد" جسے لکھنؤ کے ایک عالم مولوی محمد شاہ لکھنوی نے لکھی تھی، یہ کتاب

"منشی نول کشور نے ۱۲۹۰ھ میں چھپوائی" "فرنگیوں کا جال ص۳۰"

چھپوائی کے لفظ کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ طباعت کے سارے مصارف منشی نول کشور نے خود برداشت کئے تھے

اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مثال اسی سلسلہ کی اسی کتاب میں یہ نقل کی گئی ہے کہ ٹانڈہ (پنجاب) ضلع ہوشیار پور کے ایک صاحب جن کا نام مولوی شیخ احمد تھا، اور پادریوں نے جو طوفان ملک میں برپا کر رکھا تھا، جانتے تھے کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ منجملہ دوسری سیاسی چالوں کے ایک

چال یہی ہے اسی نے لکھا ہے کہ

"ان کا طریقہ تھا، جس جگہ شام کو پادری جاتا، اسی جگہ پر صبح کو جاتے اور وہ (یعنی پادری) پھنسانے کا جو جال بچھا کر آتا اس کو پاش پاش کرتے"

سننے کی بات یہ ہے کہ یہی شیخ احمد صرف مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ

"ہندو مسلمانوں دونوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی تلقین کرتے" صلہ فرنگیوں کا جال

اللہ اللہ وہی ہندوستان جہاں ۱۲۹۰ھ میں دیکھا گیا تھا کہ رد نصاریٰ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو اپنے خرچ سے ہندو چھاپ رہے ہیں، وہیں چند ہی سال کے ہیر پھیر میں یہ کیسا دردناک انقلابی نظارہ تھا کہ عیسائی پادری اور ہندوؤں کے پنڈت ایک صف میں بیٹھے ہیں، اور مسلمان دوسری صف میں اپنی دیدۂ عبرت نگاہ سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو تجویز بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی ہے، اس کو مسترد کرنے میں عیسائیوں کے پادری اور ہندوؤں کے پنڈت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گویا کوئی اندرونی معاہدہ کئے ہوئے ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں، میلہ کس نام سے جمع کیا گیا تھا، اور اس سے کام کیا لیا جا رہا تھا، اور یہ قصے تو شرائط و قیود کے تھے، باقی میلے کا حقیقی موضوع یعنی خدا شناسی پر مباحثہ، سو جہاں تک واقعات معلوم ہوتا ہے، اور مباحثہ شاہ جہاں پور میں لکھا بھی ہے کہ

"قلت فرصت کا بہانہ کر کے مباحثہ کو مختصر کر دینا" صلہ

پادری زیادہ تر اسی کے درپے تھے، بمشکل تھوڑا بہت وقت جو ملا بھی، اس میں سچ پوچھئے، تو سر جوڑ کر کسی مسئلہ کی تحقیق و تلاش کا جو عام طریقہ ہے، اس سے گریز ہی کی کوشش کی گئی، ہمارے مصنف امام نے اس میلہ کا جہاں تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے، وہاں شرائط و قیود کے اجمالی ذکر کے بعد جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"آخر گفتگو ہوئی، طرز گفتگو کی نہ تھی، بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا" صلہ

سوانح قدیم

اس سے ان کی غرض یہی ہے کہ حق کی تلاش و جستجو کا اس قسم کی مجلسوں میں جو علمی یا طبعی طریقہ ہے، وہ اختیار نہ کیا گیا، بلکہ وہی بات کہ اپنی اپنی باری پر بولنے یا لکھی ہوئی تحریروں کے پڑھنے کا صرف موقعہ لوگوں کو دیا گیا، مگر یہ گفتگو جو بطرز گفتگو نہ ہوئی "آپ سن ہی چکے" کہ ایک مستقل فریق یعنی ہندوؤں کی طرف سے اگرچہ ابتدائی تقریر منشی پیارے لال کی اسی زبان میں شروع ہوئی جسے میلہ والے سمجھ سکتے تھے، لیکن پادری نولس اور ان کے نائب دوسرے پادری کی سرگرمی کے بعد یہ قصہ بھی ختم ہو گیا، اور منشی پیارے لال والی تقریر جو بھی گئی، اس کا رنگ بھی جو کچھ تھا، اس کا اندازہ اسی نمونہ سے ہو سکتا ہے، جو پہلے سال کے میلے کی روداد میں درج ہے، لکھا ہے، کہ منشی جی نے کھڑے ہو کر ایک تحریر پڑھی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ

"میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا، اور ان کے پنتھ میں جاگتے سوتے، برابر ساتا چلتا رہتا ہے۔" ص۸

اسی سے سمجھا جا سکتا ہے، کہ میلہ کے انعقاد کا جو نصب العین بتایا گیا تھا، خود منشی جی کو اس سے کتنی دلچسپی تھی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخص کے دینی احساسات اتنے سطحی اور پست ہوں، اسی میں ایسے عظیم الشان مقصد کے لئے میلہ قائم کرنے کا تصور پیدا ہی کیسے ہو سکتا ہے، اسی روداد میں لکھا ہے، کہ جب جلسہ ختم ہو رہا تھا، تو منشی جی نے ایک دوسری تحریر بھی پڑھی جس میں

"گوشت کے حلال ہونے پر اعتراض تھا۔" ص۱۱

جس کے معنے یہی ہوئے، کہ دین اور مذہب کی حقیقی روح اور انسانی فطرت کی گہرائیوں میں جو پوشیدہ سوالات کا حل مذہب ہے، منشی جی بے چارے کو ان باتوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اور "باورچی خانہ میں لا کر مذہب کو بند کر دینا" اس عامیانہ خیال سے آگے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

بہرحال یہ بھی غنیمت تھا کہ جو کچھ بھی انہوں نے پڑھا، ایسی زبان میں پڑھا جسے سننے والے سمجھ تو رہے تھے، لیکن ان کے سوا ہندوؤں کی طرف سے پہلے میلے میں بھی اور دوسرے میلے میں بھی "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" کے سبق کی مشق کی گئی۔ پہلے میلے میں "فقیر سر بنگ" کے

تمام سے جس تحریری بیان کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے متعلق روداد میں لکھا ہے کہ اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ

"ہندؤوں کی نسبت دربارہ اعمال و اقوال کچھ دور دیک تھی" ص۴

انتہا تو یہ ہے کہ دوسرے سال کا میلہ جس میں خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ لکھا ہے اشتہاروں اور اخباروں کے ذریعے سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اب کی پادریوں کے سوا بڑے بڑے نامی گرامی پنڈت بھی آئیں گے، مشہور تھا کہ

"مجمع بڑے بڑے ودیا نیتوں اور مشاہیر کا ہوگا" ص۲ مباحثہ شاہ جہاں پور

اور اس میں شک نہیں کہ شہرت کے مطابق وقت کی سب سے بڑی مشہور ہستی خود پنڈت دیانند سرسوتی جی ہی میلہ میں جلوہ افروز ہوئے، اور ان کے ساتھ منشی اندرمن بھی موجود تھے۔ اپنی چند خاص کتابوں کی وجہ سے ان کا نام بھی کافی اونچا ہو چکا تھا، مگر عرض ہی کر چکا ہوں کہ منشی اندرمن مجمعوں میں تقریر سے معذوری کا عذر کر کے جیسے آئے تھے، اسی طرح واپس ہو گئے، رہے پنڈت جی سو آپ سن چکے کہ "کے کا" کے سوا سننے والے ان کی تقریر کا ایک لفظ نہ سمجھ سکے۔ عام طور پر چونکہ یہ مشہور تھا کہ پنڈت جی کا یہ عقیدہ ہے، کہ مادہ اور روح یہ دونوں بھی خدا ہی کی طرح غیر مخلوق ہیں، اور کمہار یا بڑھئی وغیرہ کاریگروں پر خدا کو قیاس کر کے کہتے ہیں کہ جیسے مٹی کے بغیر کمہار برتن، اور لکڑی کے بغیر بڑھئی کرسی نہیں بنا سکتا، اسی طرح مادہ کے بغیر خدا بھی عالم کی کارسازی پر قادر نہیں ہے، اسی وجہ سے لکھا ہے،

"ہاں ایک دو بات اس قسم کی سمجھ میں آئیں، کہ جیسے کمہار گھڑا وغیرہ برتن بناتا ہے"

اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے

"مگر ان دو ایک بات کے سوا اور کچھ کسی کی سمجھ میں نہ آیا" ص۱۲

الغرض ایک مسلم فریق کی نوعیت دونوں میلوں میں کچھ ایسی رہی، کہ اس کی طرف سے جو کچھ بیان کیا گیا مطلب اس کا یہی تھا کہ گویا کچھ بیان نہیں کیا گیا، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ پھر ان کو خدا شناسی کی تحقیق

کے اس میلے میں شریک ہی کیوں کیا گیا تھا یا خود وہ کیوں اس میں شریک ہوئے اگر وہی بات کہ خدا شناسی کا یہ میلہ خداشناسی کے لئے رچایا بھی گیا ہو؟

سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے تو خیر یہ طرز عمل جس وجہ سے بھی اختیار کیا گیا ہو، روداد کے پڑھنے سے تو حیرت ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ پیش پیش پادریوں کا فریق اس میلے میں تھا، لیکن ان کے نمائندوں میں بھی پادری نولس صاحب جن کے متعلق مشہور تھا کہ

"بڑے لسان، اور مقرر ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ بمقابلہ دین عیسوی دین محمدی کی کچھ حقیقت نہیں" ص۳

اور اگر پادریوں کے عام بیانات اور تقریروں کو سن کر جن میں خود پادری نولس صاحب بھی تھے، سیدنا الامام الکبیر نے فرمادیا تھا کہ

"پادریوں میں کوئی اس قابل نہیں معلوم ہوتا جس سے بظاہر کچھ اندیشہ خاطر ہو، ہاں ان کی بے انصافی سے دل افسردہ ہوتا ہے" ص۲۱ میلہ خداشناسی

لیکن بایں ہمہ دوسرے پادریوں کے مقابلہ میں پادری نولس صاحب کی تعریف بھی حضرت والا نے ان الفاظ میں کی تھی

"پادری صاحبوں کی طرف سے وہ لوگ کھڑے ہوئے تھے جن کو گفتگو کا سلیقہ نہ تھا، الفاظ سے اوقات کی خانہ پری کر دیتے تھے۔ مگر ہاں آج ہماری طبیعت محظوظ ہوئی، پادری صاحب (یعنی نولس صاحب) بہت خوش تقریر اور صاحب سلیقہ ہیں" ص۳۲ میلہ خداشناسی

مگر ان لسان مقرر جن کی خوش تقریری اور حسن سلیقہ کا سیدنا الامام الکبیر نے اعتراف بھی فرمایا تھا، انہوں نے دونوں میلوں میں وقت تو کافی لیا۔ پندرہ منٹ کی مدت کی توسیع کی التجا بھی بے شرمی کے ساتھ ان کی طرف سے جو پیش ہوئی تھی، اس کا ذکر تو کر ہی چکا ہوں لیکن بایں ہمہ دونوں میلوں میں انہوں نے جو کچھ فرمایا، کیا عرض کیا جائے کہ کیا فرمایا

دین عیسوی کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ بیان کی کہ دین عیسوی کی کتاب انجیل،

"دو ڈھائی سو زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے" ص۸

جس پر مولوی ابو المنصور نے چبھتا ہوا فقرہ کہا بھی کہ

"تو یوں کہو کہ اٹھارہویں صدی سے پہلے پہلے انجیل آسمانی کتاب نہ تھی" ص۹

مولوی صاحب نے جب دعویٰ کیا کہ انجیل کے ترجموں کی کثرت اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد ہی ہوئی ہے، تو پادری صاحب نے مان بھی لیا کہ

"ہاں ترجموں کی کثرت تو اٹھارہویں صدی ہی میں ہوئی ہے" ص۹

اور اس سے بھی دلچسپ برہانی استدلال پادری نولس صاحب کا کرشمہ تھی کہ بنیادی عقیدۂ تثلیث کے ثبوت میں یہ تھا کہ

"دیکھو درخت ایک ہے پر اس میں جڑ بھی ہے، شاخیں بھی ہیں، پتے بھی ہیں" ص۳۸

اور بھی کئی چیزوں میں تین پہلو نکال کر کہنے لگے کہ اس سے بڑھ کر تثلیث کے ثبوت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے، اسی پر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ تثلیث ہی کیا، مثالوں ہی پر بات ٹھہری تو درخت ہی میں

"ہزاروں شاخیں، ہزاروں پتے، ہزاروں پھول، اور پھر ہر شاخ و برگ اور پھل پھول میں کس قدر رگیں اللہ نکلتی ہیں" ص۳۲

فرمایا کہ

"خیر پادری صاحب نے تثلیث ہی پر کیوں قناعت فرمائی۔ تربیع، تخمیس بلکہ تسدیس، تسبیع، و تثمین، بلکہ تالیف وغیرہ"

سب ہی کو عقیدہ بنا کر اسی قسم کی بیش پا افتادہ مثالوں سے بآسانی ثابت کر دیا جا سکتا ہے۔

یہ حال تو پادری نولس کی استدلالی قوت کا تھا، اور ان پر کسی نے جب اعتراض کیا کہ مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے میں آیا ہوں، تو آپ بنی اسرائیل کے سوا دوسروں میں مسیحیت کی تبلیغ کیوں کرتے پھرتے ہیں، شاید اس لطیفہ کی طرف کہیں پہلے بھی اشارہ گذرا ہے کہ اپنے ہاتھ

کی چھتری یا لاٹھی کی طرف اشارہ کر کے پادری صاحب نے فرمایا

"دیکھو! یہ لکڑی بھی ہے اور لاٹھی بھی ہے۔ لکڑی عام ہے اور لاٹھی خاص۔"

پس نتیجہ یہ ہوا کہ

"عیسیٰ علیہ السلام خاص بنی اسرائیل ہی کے لئے آئے تھے، مگر جہاں خاص ہوتا ہے وہاں عام بھی ہوتا ہے۔"

کہنے والے نے سچ کہا تھا کہ جب پادری نولس عیسائی ہو چکے تو انسان جوان سے عام ہے وہ بھی عیسائی ہو گیا، اب تبلیغ کی حاجت ہی کیا رہی۔ میں ان تفصیلات کو اس لئے نقل کر رہا ہوں، تاکہ اندازہ ہو کہ "خدا شناسی" کیا واقعی اس میلے کی غرض تھی، کیا ایسے عظیم اور اہم ترین موضوع پر گفتگو کرنے کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔

اور یہ مختصر داستان تو پادری نولس صاحب کی تھی، اب سنئے اسکاٹ صاحب جن کو دوسرے میلہ میں خاص طور سے میلے میں آنے کے بعد دعوت دی گئی تھی، وہی صاحب جن کو حکومت کی طرف سے پانسو روپے کا انعام منطق کی کسی کتاب کے ارقام فرمانے پر ارزانی ہوا تھا۔ ان کی آمد آمد کی خبر جب میلے میں گرم ہوئی، اور اسکاٹ صاحب کی خواہش پر پادری نولس نے ۵ منٹ کے طے شدہ وقت کی جگہ چاہا کہ ایک گھنٹہ تقریر کا وقت کر دیا جائے اس وقت سیدنا الامام الکبیر نے برہم ہو کر پادری نولس سے کہا تھا کہ

"کل ہم بہ ہزار منت آپ سے اس بات کے خواستگار رہے کہ کم سے کم درس کے لئے ایک گھنٹہ عنایت کیجئے، ہمارے التماس اور عجز و نیاز پر تو آپ نے نظر نہ فرمائی، آج اگر کسی کے کہنے سے اپنا نفع نظر آیا تو آپ ہم سے اسی بات کے خواستگار ہوتے ہیں جس کا ہم سے انکار کر چکے ہیں۔"

اور ذرا تیز و تند لہجے میں فرمایا کہ

"جو ہو چکا سو ہو چکا، اب کیا ہوتا ہے، نہ وقت مقررہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور نہ پادری

اسکاٹ صاحب کو اجازت ہو سکتی ہے' یہ بات وقت شرائط کی تجویز کے ساتھ گئی'
اب کچھ نہیں ہو سکتا' ورنہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم باوجودیکہ رکن مباحثہ ہیں' مباحثہ کے
حساب سے کالعدم ہیں' جو کچھ ہوئے آپ ہی ہوئے"

خیر یہ تو ایک ذیلی بات تھی سیدنا الامام الکبیر نے خلاف دستور یہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا' اسے تو چھوڑیئے' کہنا یہ ہے کہ اسکاٹ صاحب کے علم وفضل سے پادری نولس صاحب اس قدر متاثر تھے' کہ سیدنا الامام الکبیر کے اصرار کو دیکھ کر بولے

"آپ پادری اسکاٹ صاحب کو ڈرتے ہیں"

گرچہ جواب بھی وقت پر خود سیدنا الامام الکبیر نے ان کو دے دیا تھا کہ

"خدا کی عنایت سے پادری اسکاٹ کے استاد ہوں' تو ان سے بھی نہ ڈروں' بلکہ انشاء اللہ
تمام پادری بھی اکٹھے ہو جائیں تو نہیں ڈرتا"

پھر اصرار کی وجہ بھی آپ نے ظاہر کر دی

"مجھ کو فقط یہ جتلانا تھا کہ بات مقرر کر کے کون قائم رہتا ہے اور کون پھر جاتا ہے"

پادری نولس صاحب کی بے انصافی اور استبداد کے پردے کو چاک کرنے کے بعد ان کی التجا کی پذیرائی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

"گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ' دو گھنٹہ جس قدر چاہیں آپ درس مقرر کریں اور جسے چاہیں درس کے
لئے مقرر کریں" ص۳۸

بہرحال کہنا یہ ہے کہ آئے تو اسکاٹ صاحب اس دھوم دھام سے' اور اپنے دین کی سچائی کے ثبوت میں سب سے بڑی منطقی دلیل جو پیش کی وہ یہ تھی کہ

"جب تک عیسائیوں کی عملداری ہندوستان میں نہ تھی' ہندوستان میں کیسی کیسی غارتگری
اور فتنہ و فساد اور رہزنی ہوا کرتی تھی' جب سے عیسائیوں کی عملداری ہوئی' کس قدر امن
وامان ہو گیا' سونا اچھالتے چلے جاؤ' کوئی پوچھتا نہیں' دیکھو گناہوں میں کتنی کمی آگئی" ص۴۷

جواب میں تو اس کے جیسا کہ واقعہ تھا، سیدنا الامام الکبیر ہی نے فرما دیا تھا

"یہ امن وامان عیسائی عملداری کی برکت نہیں ہے، اس امن وامان کی علت بجز پاس ملک اور آرزوئے ترقی تجارت اور کچھ نہیں، مذہب سے اس بات کو کچھ علاقہ نہیں" مباحثہ شاہجہاں پور

اور گناہوں کی کمی کا جو ذکر پادری اسکاٹ نے کیا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے: حضرت والا نے ام الخبائث (شراب) اور ام الجرائم زنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ شراب خواری جو حالانکہ مذہباً ان کے یہاں بھی ممنوع ہے،

"نصرانیوں میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جو اس گناہ سے بچا ہوا ہو"

اور رہا ام الجرائم زنا سو آپ نے دریافت کیا

"کیا پادری صاحبوں کو لندن کے اخباروں کی اب تک خبر نہیں، کہ وہ کیا لکھتے ہیں، اور ہر روز کئی سو بچے ولد الزنا پیدا ہوتے ہیں اور صبح کو راستوں پر پڑے ہوئے ملتے ہیں"

خیر سوال وجواب کی تفصیلات تو اصل روداد میں پڑھئے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پادری نولس کی تقریر کے محوری عناصر اور اسکاٹ صاحب کے بیان کی روح جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے کیا ان سے واقف ہونے کے بعد دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ چاندا پور کا یہ میلہ خداشناسی کے لئے قائم کیا گیا تھا یا بقول سیدنا الامام الکبیر "پاس ملک" کے جذبات ہی کی یہ کارفرمائیاں تھیں ؟

اور بڑے پادری صاحبوں نے تو خیر جو کچھ کہا کہا۔ میرے رونگٹے تو اس وقت کھڑے ہو جاتے ہیں، جب سوچتا ہوں کہ سرزمین روہیل کھنڈ کے صحرائی مقام کے اسی میلہ میں جس میں موسمی حالات کی وجہ سے کم از کم پہلے سال شہر کے لوگوں کو شرکت کا موقعہ قدرتاً کم ہی ملا تھا، زیادہ تر قرب وجوار کے دیہاتوں کے لوگ میلہ میں بھرے ہوئے تھے، کہ مباحثہ کی اس مجلس میں دیکھا گیا کہ ایک کالا پادری مولاداد نامی اپنی کور بختی میں کور بختی کا اضافہ (العیاذ باللہ) ان گندے الفاظ سے کر رہا ہے یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے نبوت کا ذکر کر کے اپنی زبان اور اپنے دہن کو ان نجس الفاظ سے

آلودہ کر رہا تھا کہ (استغفر اللہ)

"بھنگیوں کا لال گورو بھی ایسا ہی کہتا تھا"

اور اسی پر اس تیرہ نصیب نے اکتفا نہیں کیا، بلکہ خود اپنے آپ کو رسوا کرنے کے لئے انجیل کی ایک آیت کا غلط ترجمہ کرکے کہنے لگا کہ

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ میرے بعد جو آئیں گے چور اور بٹ مار ہوں گے" ص ۱۹

قطع نظر اس سے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر افترا پردازی کر رہا تھا، اور اسی وقت امام فن مناظرہ مولنا ابو المنصور نے ٹوک بھی دیا تھا کہ انجیل کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، اس میں تو

"یہ نہیں ہے کہ جو میرے بعد آئینگے چور اور بٹ مار ہونگے"

بلکہ برعکس اس کے اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ

"جو مجھ سے پیشتر آئے، وہ چور اور بٹ مار تھے"

لیکن اس کو تو جانے دیجئے، سوچئے اس بات کو جس ماحول میں یہ جلسہ ہو رہا تھا، اچانک اسی جلسہ میں ایک دریدہ دہن کالے پادری کی زبان سے نکلے ہوئے ان فقروں کا انجام کیا ہو سکتا تھا۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ ان کے مقرروں کو تقریر کے لئے وقت نہیں دیا جا رہا تھا، ان کی پیش کردہ ترتیب کے مطابق بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ہندوؤں کے نمائندہ پنڈتوں کو بھی ملا کر پادریوں اور ہندوؤں کی ایک صف قائم کر لی گئی تھی۔ ان کے عہد حکومت پر لعنت و ملامت کرتے ہوئے، برطانوی راج کی قصیدہ خوانی ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، وہ برداشت کرتے چلے جاتے تھے، لیکن اس سیاہ سینہ، سیاہ دل کالے پادری کی نجس اور گندی زبان سے ان کو اب جو کچھ سنایا گیا تھا، کیا اس کو وہ برداشت کر سکتے تھے، ہوش و حواس ان کے اس کے بعد کیا بجا رہ سکتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے، کہ اسی قسم کا کوئی واقعہ چنگاری بن کر اڑا ہے، اور آبادیوں، ملکوں، قوموں کو اس نے

جلا کر خاک سیاہ کر دیا ہے۔ اب میں کیا عرض کروں، دوسروں کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن خداشناسی کے ان دونوں میلوں کے مشتملات اور جو کچھ ان میں کہا گیا اور کیا گیا، سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشقی القوم مولاداد کی تقریر کے ان الفاظ کو جب سوچتا ہوں، تو کچھ ایسا خیال گذرنے لگتا ہے کہ دیوبندی حلقہ میں مکہ معظمہ کے نیم مجذوب کی وہ پیش گوئی جس کا پہلے بھی کہیں شاید ذکر گذرا ہے، یعنی غدر کے بعد حکیم عبدالسلام ملیح آبادی مکہ معظمہ گئے تھے، وہاں ان سے ایک صاحب جو نیم مجذوب سے آدمی تھے، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ

"بہت شدومد سے یہ فرمادیا کہ تم یہیں (مکہ) میں رہو، ہندوستان مت جاؤ، اس واسطے کہ وہاں انقلاب ہو رہا ہے، جو غدر سابق سے بڑھ کر ہوگا۔" ص۲۳۱ ارواح ثلثہ

مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام نے جیسا کہ اسی کتاب ارواح ثلثہ میں لکھا ہے، اس کو سن کر فرمایا تھا کہ

"یہاں کچھ نہیں ہوگا۔"

لیکن غدر کے اٹھارہ انیس سال بعد نام نہاد خداشناسی کے نام سے قائم کئے جانے والے میلوں میں جو کارفرمائیاں ہوئیں، اور جن کا اب تک ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے، کیسے کہا جائے کہ مکہ کے نیم مجذوب کی واقفیت جس کا ذریعہ خواہ کچھ ہی ہو، کشفی ہو، یا غیر کشفی، کلیۃً بے بنیاد تھی، آخر وہ بے چارے نیم مجذوب ہی تو تھے۔ بجائے "کل" کے واقعہ کا "کچھ حصہ" ہی ان کے سامنے آیا، اور اسی کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کرلی ہو، تو جو کچھ ہو رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے کیا وہی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی تھی، جو اس نیم مجذوب آدمی نے کی۔

واقعہ اب گذر چکا ہے، اور اسی طرز سے گذرا، جیسا کہ ہمارے مصنف امام نے فرمایا۔ بارود کے میگزین میں چنگاری ڈالی جا چکی تھی، لیکن دھماکہ کیوں نہیں ہوا، میں اسی کو اب کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اور اسی سے معلوم ہوگا کہ شاید یہ ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا، ارحم الراحمین نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا، خدا کی اسی رحمت کا باشندگان ہند کے ساتھ کس شکل میں ظہور ہوا۔ آئیے اور

واقعات کی روشنی میں اسی کا تماشا کیجئے۔ ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید

بات ذرا طویل ہوگئی لیکن جو کچھ بتانا چاہتا تھا شاید ان تفصیلات کے بغیر اسے ذہن نشین بھی نہیں کرا سکتا، یاد ہوگا، گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ پہلی دفعہ چاندا پور کے اس مذہبی میلے کی شہرت ہوئی، سیدنا الامام الکبیر اس زمانہ میں اپنے قدیم آبائی وطن نانوتہ میں تھے۔ وہیں آپ کے پاس خطوط پہنچے، آپ پیادہ پا چل پڑے، دیوبند مظفر نگر میرٹھ ہوتے ہوئے دلی پہنچے، یہاں آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس مولوی عبدالحئی نے کہلا بھیجا ہے کہ قصہ بے اصل ہے، علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں۔ دلی میں جس وقت یہ خبر آپ کو ملی تو شاہ جہاں پور کے سفر کا ارادہ مضمحل ہوگیا، لیکن شاہ جہاں پور والوں کے تار اور خط کے بعد آپ کا وہی ارادہ جو سست پڑ چکا تھا، نئے سرے سے پھر تر و تازہ ہوا، لکھا ہے کہ

"۵ مئی کو بعد عشاء بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند (ضلع سہارنپور) و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور ریل پر پہنچے" ص۳

ریل سے مراد یہ ہے کہ اسٹیشن پر پہنچے، کیونکہ آگے ہے کہ

"ادھر سے حسب وعدہ مولوی سید ابو المنصور صاحب دہلوی امام فن مناظرہ اہل کتاب بمعیت مولوی سید احمد علی صاحب دہلوی، و میر حید رعلی صاحب دھلوی تشریف لائے، اور سب مل مل کر گیارہ بجے ریل میں سوار ہو کر روز شنبہ ۶ مئی کو بعد عصر شاہ جہاں پور پہنچے"

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تشریف آوری کی تاریخ اور وقت سے شاہ جہاں پور والوں کو غالباً آپ نے قصداً اطلاع نہ دی تھی، اسی لئے اسٹیشن پر استقبال کے لئے کوئی نہ آسکا۔ شاہ جہاں پور والوں کو تو اس کی بھی خبر نہ ہوگی کہ آپ آئیں گے بھی یا نہیں آئیں گے، اس کو مغتنم موقعہ خیال کر کے

لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) نے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرائے میں گذر کر کے علی الصباح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے۔"

اور یہی طے کر کے سفر کے دوسرے رفیقوں کو تو اجازت دے دی کہ بجائے سرائے کے شہر چلے جائیں، اور خود جیسا کہ "میلہ خداشناسی" نام والی روداد میں لکھا ہے، سرائے جاتے ہوئے اسٹیشن سے اپنے ساتھ رفقاء و تلامذہ کی جماعت میں سے صرف اپنے عاشق زار، جاں نثار خادم شیخ الہند مولانا محمود حسن کا خود انتخاب فرمایا تھا۔ یا ساتھ چلنے کی اجازت ان کو مل گئی، اس کے الفاظ ہیں کہ اسٹیشن شاہ جہاں پور پر

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) سب ساتھیوں کو چھوڑ کر مولوی محمود حسن صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر چپکے سے شہر کو ہو لئے قصہ مختصر رات کو ایک سرائے میں آرام فرمایا۔"

الغرض اسٹیشن سے سرائے تشریف لے گئے، شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی ساتھ تھے۔

اس سلسلہ میں کچھ اور روایتیں بھی پائی جاتی ہیں مگر وہ ثبوت کے لحاظ سے اس درجہ کی نہیں ہیں اس لئے انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے، یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پہلے میلے کے موقعہ پر شاہ جہاں پور کے اسٹیشن پر یہ پا کر شہر سے کوئی آدمی استقبال وغیرہ کے لئے نہیں پہنچ سکا، روداد میں لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے اپنے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرائے میں گذر کر کے علی الصباح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے۔"

"اپنے آپ کو چھپانے کی" فطری آرزو آج بھی آپ پر اسی طرح مسلط ہے، جیسے ساری زندگی اسی تمنا اور اسی کوشش میں بسر ہوئی، اسی آرزو کے زیر اثر سفر کے معزز رفیقوں، اور اپنے چہیتے شاگردوں سے جدا ہونے پر بھی آمادہ ہو گئے، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی کش مکش کے بعد حضرت والا کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ سفر کے ان رفیقوں اور شاگردوں نے کیا ہو گا، اگر روداد والی ہی روایت صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بمشکل حضرت مولانا محمود حسن کو ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی، ذرا اس اخفاء کے جذبہ کی شدت کو

ملاحظہ فرمائیے کہ سرائے میں بھی اپنے آپ کو بجائے مشہور نام کے "خورشید حسین" غیر معروف تاریخی نام سے روشناس کرایا گیا۔ تاکہ دریافت کرنے والوں کو پوچھنے کے بعد بھی پتہ نہ چلے، مگر جیسے اخفار ذکر کی کوشش بندے کی طرف سے مسلسل جاری تھی، اسی بندے کے رفع ذکر کا فیصلہ اس کا مالک کئے ہوئے تھا۔ بعد کو جو کچھ ہوا وہ تو خیر آپ سن ہی چکے لیکن سرائے کی اس رات میں بھی کیا ہوا، روداد میں لکھا ہے کہ

"مگر ایک دو شخص (باشندگان شاہ جہاں پور کو خبر ہو ہی گئی، قریب دو بجے رات کے سرائے میں جاکر مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو جا گھیرا"

خدا ہی جانتا ہے کہ خورشید حسین نام کے پردے کو چاک کرکے "مولانا محمد قاسم" تک پہنچنے میں یہ بیچارے کیسے کامیاب ہوئے، بہر حال کسی نہ کسی طرح پہنچے، لکھا ہے کہ

"پس از اصرار، ناچار مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کے مکان پر تشریف لے گئے" صلا

یوں سرائے سے اٹھ کر آپ شاہ جہاں پور والوں کے گھر تک تو کسی نہ کسی طرح آگئے، ۶ مئی کا دن گذر چکا تھا، کل ۷ مئی کو میلہ کے افتتاح کی تاریخ تھی، چاندا پور کا فاصلہ عرض کر چکا ہوں، اگر کافی تھا، سرائے میں تو جو کچھ چاہتے کر سکتے تھے، لیکن شہر والوں میں پہنچ جانے کے بعد کون راضی ہو سکتا تھا کہ آپ گرمی کے اس موسم میں پانچ چھ کوس کا فاصلہ پیادہ پا طے کریں۔ لیکن روداد کی روایت میں بھی اور ارواح ثلثہ میں مولانا احمد حسن امروہوی کی زبانی جو روایت درج کی گئی ہے، دونوں ہی میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں،

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) صبح کی نماز پڑھ کر پیادہ پا ہی، چاندا پور میں جا پہنچے" صلا

گویا میلے کی خبر پا کر جیسے پیادہ پا آپ نانوتہ سے دیوبند بارہ کوس کا فاصلہ طے کرکے پہنچے تھے، اسی طرح ریل سے اترنے کے بعد شاہ جہاں پور سے چاندا پور تک جو پانچ چھ کوس کا فاصلہ تھا اس کو بھی پیادہ پا ہی

لے فرمایا' اور اسی پیادہ پائی کی وجہ سے شاید وہ لطیفہ پیش آیا۔ جس کا ذکر میلے میں بھی اور میلے کے بعد بھی اب تک لوگ مزے لے لے کر کرتے ہیں۔

عرض کرچکا ہوں کہ میلہ چاند اپور ہی میں نہیں بلکہ اسی کے قریب ایک کھیڑے سارنگپور تائی سرزمین میں قائم کیا گیا تھا' جہاں سے ایک ندی جو "دریائے گرا" کے نام سے مشہور ہے گذرتی ہے۔ حالانکہ مئی کا مہینہ تھا' لیکن ندی پایاب نہیں ہوئی تھی' شاید اس کے ساحل کے انتخاب میں آب رسانی کی سہولت بھی میلہ قائم کرنے والوں کے پیش نظر ہو۔ شاہ جہاں پور سے سارنگپور جاتے ہوئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں یہی ندی ملتی تھی۔ مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ جو اب رفیق سفر ہو چکے تھے' کی روایت میں ہے کہ

"راستہ میں ایک دریا پڑتا تھا"

غالباً یہ وہی دریائے گرا تھا چونکہ بقول حضرت امروہوی

"مولانا پیدل تھے"

شاید سواری میں یہ صورت پیش نہ آتی' بہرحال پیادہ پا چلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دریا جس میں پانی تھا' اس کو عبور کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ

"مولانا پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے' جس سے پاجامہ بھیگ گیا"

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ میں شریک ہونے کے لئے قصداً کوئی خاص قسم کا بانا آپ نے ایسا اختیار نہیں کیا تھا' جس کی وجہ سے امتیازی نظر لوگوں کی آپ پر پڑے' بلکہ پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں کہ ضلع سہارنپور کے شیخ زادوں اور شرفاء کا جو عام لباس تھا۔ اسی لباس میں عموماً رہتے بھی تھے' اور آج بھی اسی لباس میں جا رہے تھے۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ پیدل چلنے کی وجہ سے آپ کو دریا میں اترنا پڑا' پانی اتنا تھا کہ پاجامہ آپ کا بھیگ گیا۔ حضر ہی میں جس کے پاس بیان کر چکا ہوں' بقول حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

"نہ کوئی صندوق تھا' نہ کپڑوں کی کوئی گٹھری" ارواح ثلثہ ص۱۸۶

توسفر میں بھلا اس کے بعد نامہ کپڑوں کے ہونے کی کیا توقع کی جاسکتی تھی، حضرت شیخ الہند فرمایا بھی کرتے تھے کہ

"عموماً اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا، جو حضر میں پہنے ہوتے تھے"

مگر اسی کے ساتھ وہی کہا کرتے تھے کہ

"البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہو گئے، تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار دیئے اور خود ہی دھو لئے" ملخصاً

دریا میں اترنے کے بعد پاجامۂ مبارک جب بھیگ گیا تو آپ کی یہی دائمی رفیق "نیلی لنگی" بے چاری کام آئی مولانا امروہوی کی روایت میں ہے کہ

"مولانا نے پار اتر کر لنگی باندھی، اور پاجامہ اتار کر نچوڑ کر پیچھے لاٹھی پر جیسے گاؤں کے رہنے والے ڈال لیا کرتے ہیں، ڈال لیا"

اور اسی شان کے ساتھ آپ میلے کے میدان میں پہنچ گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دریا پار کرنے کے بعد میلہ کا میدان کچھ زیادہ دور نہ تھا، اتنا وقفہ نہ گذر سکا کہ بھیگا ہوا پائجامہ آپ کا خشک ہو جاتا، در اصل یہی مجبوری تھی کہ بجائے پائجامہ کے "نیلی لنگی" ہی کے ساتھ آپ میلہ میں شریک ہو گئے، مگر جیسے قصد اور ارادۃً نمائش کے لئے نیلی لنگی نہیں باندھی گئی تھی، اسی طرح اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی خاص قسم کے لباس کا پابند اپنے آپ کو بنا کر عموماً کسی مجمع یا محفل کی شرکت سے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ جب تک وہی زبردستی اپنے اوپر عائد کیا ہوا لباس فراہم نہ ہو جائے، مجمع میں جانا ان کے لئے گویا ناممکن ہوتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں، چاہا تو آپ نے بھی تھا کہ جس لباس کے پہننے کے عادی تھے اسی کے ساتھ میلے میں شریک ہوں، لیکن بھیگ جانے کی وجہ سے بجائے پاجامہ کے لنگی باندھنی پڑی، تو ہچکچائے بغیر آپ لنگی ہی کے ساتھ مجمع میں علماء کے تشریف فرما ہوئے۔ بلکہ خدا شناسی کے اسی میلے کے پہلے سال کی روداد کے آخر میں بریلی کے رہنے والے ایک ہندو کا یہ بیان جو نقل کیا گیا ہے کہ

"مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی میلے سے کپڑے نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی بیان

کرنے کھڑا ہوا" ملک

ان الفاظ سے سیدنا الامام الکبیر کی طرف یہ ہندو وزیٹر اشارہ کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خشک ہو جانے کے بعد پائجامہ پہن لیا گیا تھا، اور حسب دستور لنگی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ یہی "نیلی لنگی" بعد کو "تاریخی نیلی لنگی" بن گئی۔ اسی کا تذکرہ فرماتے ہوئے حکیم الامت حضرت تھانوی رہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

"مباحثہ شاہ جہاں پور میں مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا، بڑے بڑے جبا و قبا والے موجود تھے، اور حضرت مولانا (نانوتوی) اسی معمولی کرتہ اور لنگی میں تھے" (قصص الاکابر الہادی ماہ جمادی الثانی ۳۵ھ ص)

مطلب یہی ہے کہ قیمت "مغز" کی ہوتی ہے، چھلکے کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو "بے مغز" پھلوں کو کون خریدتا ہے۔

کچھ بھی ہو، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ روک دینے کی جو کوشش شاہ جہاں پور کے پولیس انسپکٹر مولوی عبدالحئی صاحب کی طرف سے کی گئی تھی، وہ کوشش کامیاب ہوئی، شاہ جہاں پور والوں نے اس کو مولوی عبدالحئی کی غلطی قرار دیا، اور ان کے علی الرغم سیدنا الامام الکبیر تماشا شناسی کے اس میلے تک بہرحال پہنچ ہی گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحئی صاحب کے طرز عمل کی تعبیر "غلطی" کے لفظ سے شاہ جہاں پور والوں نے جو کی تھی، میری سمجھ میں تو اس کا مطلب بھی نہیں آتا۔ گذر چکا کہ دلی اور شاہ جہاں پور کے درمیان تار اور خط کے ذریعہ اس مسئلہ میں سوال و جواب مہر رہی کو پیش آیا، اور میلہ کے افتتاح کی تاریخ ۷ رمئی تھی۔ اتنے قریب زمانہ میں شاہ جہاں پور کی پولیس کے ایک ذمہ دار افسر کا اس میلہ اور اس کی تفصیلات سے ناواقف رہ جانا جو اسی کے علاقہ میں منعقد ہو رہا تھا جس کی نگرانی بہرحال ان کے فرائض میں تھی، بلکہ نقل ہی کر چکا ہوں کہ میلے میں پولیس موجود تھی۔ دوسرے سال کے میلے میں تو ان کے نام مولوی عبدالحئی کی تصریح کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے، کہ وہ بھی میلے میں موجود تھے (مباحثہ شاہجہانپور ص۳۳)، پھر ان کا سرے سے قصہ ہی کو بے اصل ٹھہرانا، اور اس کو بے اصل ٹھہراتے ہوئے اپنی یہ رائے پیش کرنا کہ "علماء کے آنے کی حاجت

نہیں" بتایا جائے کہ اعتراض کا کیا مطلب سمجھا جائے۔ اور غلطی کے لفظ کے اطلاق کی گنجائش کس جز میں کس طریقہ سے نکالی جائے۔

کچھ بھی ہو، میرا ذاتی احساس تو یہی ہے کہ خدانخواستہ "مولوی عبدالحی کی غلطی" اگر صحیح ہو جاتی اور ان کی اطلاع سے سفر کا جو ارادہ سست ہو گیا تھا، وہ ختم ہو جاتا۔ یعنی سیدنا الامام الکبیر ان کی رائے کے مطابق دلی سے بجائے شاہ جہان پور جانے کے گھر واپس ہو جاتے، تو ظاہر ہے کہ جس قصہ کو بے اصل ٹھہرایا گیا تھا، واقع میں بے اصل تو تھا نہیں۔ خدا شناسی کا یہ میلہ چاندا پور میں منعقد ہو کر رہتا، اور پہلے سال کے میلہ میں جیسے ہندوؤں کی طرف سے اسی قسم کے نمائندے اور وکلاء شریک ہوئے تھے، جن کے نام کا اب تک پتہ نہ چلا۔ کچھ اسی قسم کے گمنام، خام کار، ناتجربہ کار چند مولوی مسلمانوں کی طرف سے بھی اس میلہ میں ادھر ادھر اکٹھے ہو جاتے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس میلہ کا کیا انجام ہوتا۔ انشاء اللہ کم بخت مولا داد کالے پادری کی شرر افشانی جس رنگ میں ہوئی تھی مسلمانوں کے جذبہ وصبر کی کتنی بڑی آزمائش تھی، شعلہ سامانیوں کی جو آگ اس دریدہ دہن موذی کے الفاظ میں دبی ہوئی تھی، کیا ان غریب مولویوں کے بس کی بات تھی کہ بھڑکنے سے اس کو روک دیتے۔

یہاں تو حال یہ تھا کہ جس وقت ۱۵ منٹ وقت درس و تقریر کے لئے مقرر کرنے کے بعد پادری نولس کو اپنی تقریر کی توسیع وقت کی ضرورت محسوس ہوئی، اور انتہائی وضاحت سے کام لیتے ہوئے وقت کے ہی مسئلہ میں مسلمانوں کے جن نمائندوں کی مسلسل تجویزوں اور درخواستوں کو انتہائی لاپروائی کے ساتھ برابر ٹھکراتا ہی چلا جاتا تھا۔ ان ہی سے التجا کرنے لگا کہ مزید پندرہ منٹ اور تقریر کرنے کا موقعہ اسے دیا جائے۔ تو علاوہ سیدنا الامام الکبیر کے مسلمانوں کے نمائندوں کی اس جماعت میں حالانکہ بعض کافی سرد و گرم چشیدہ، آزمودہ کار ہستیاں موجود تھیں، تاہم لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر کے سوا جتنے بھی تھے ان کی

"رائے نہ تھی کہ ان کو (پادری نولس کو) مہلت دی جائے"

سب مولوی اور جوان کے ساتھ وہاں تھے یہی کہتے تھے کہ

"جب وہ ہم کو مہلت نہیں دیتے تو ہم کیوں دیں"
انتقام کا جذبہ پوری قوت سے ابھر آیا تھا، دل کی بھڑاس نکالنے کا موقعہ سمجھا گیا تھا کہ یہی ہے آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ

"اچھا ان کا (نولس صاحب کا) مضمون بھی ناتمام ہی رہے" ص۲۹

مگر آپ سن چکے، ذکر کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے عام سوریوں کے اس فیصلہ کے برعکس پادری نولس کو بخندہ جبینی مزید وقت صرف کرنے کی اجازت دی، جس کا نتیجہ بھی اسی وقت اس رنگ میں سامنے آیا کہ مقررہ وقت سے زیادہ وقت لے کر جو کچھ کہنا تھا پادری نولس صاحب کہہ چکے تو دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کھڑے ہیں، اور مسکراتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ

"لیجئے پادری صاحب اب ہم کو بھی تیس منٹ کی اجازت دیجئے"

چارہ کار ہی اب پادری صاحب کے لئے کیا تھا، اپنے دام میں خود گرفتار ہو چکے تھے، منت سماجت حق و انصاف جس مسئلہ کے حل میں بے کار ثابت ہو چکا تھا ٹھیک وقت کی ایک کارآمد سوجھ سے وہی مسئلہ کتنی سہولت کے ساتھ حل ہو گیا، لکھا ہے کہ

"لاچار ہو کر پادری صاحب کو بھی اجازت دینی پڑی"

میرے خیال میں اس حکم اور علم کی یہ ایک مثال تھی جس کے متعلق قرآن میں ایک سو زائد مقامات پر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ دین میں مقام احسان تک پہنچنے میں جو کامیاب ہوتے ہیں، یعنی المحسنین ہی کو حکم و علم کی یہ نعمت ارزانی ہوتی ہے، اس لاہوتی دولت کی صرف معلومات والے علماء میں توقع نہ رکھنی چاہئے۔

احسانی حکم و علم کے آثار کا تجربہ کچھ اسی ایک واقعہ کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسی میلے میں مسلسل ایسے مواقع پیش آتے رہے جن میں دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے ضمیر کی یہی روشنی چمک اٹھی اور تاریکیوں کا ازالہ ہو گیا۔ اسکاٹ صاحب منطقی پادری کے قصے میں جب ان کی خواہش کے مطابق یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان کو تقریر کا بھی موقع دیا جائے، اور وقت کم از کم ایک گھنٹہ ملنا چاہئے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس مسئلہ کے پیش ہونے پر خلاف دستور سیدنا الامام الکبیر اس کی مخالفت کرتے رہے،

بڑے رد و کد کے بعد راضی بھی ہوئے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ منشی پیارے لال وغیرہ کی سعی و سفارش سے آپ راضی ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی وقت کی ایک سوجھ ہی کا تقاضا تھا، قصہ تو طویل ہے تفصیل کے لئے اصل روداد ہی کا مطالعہ کیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ پہلے سال کے میلے میں دوسرے دن جب مباحثہ کی مجلس میں لوگ جمع ہوئے اور طے ہو چکا تھا، کہ ہر فریق کی طرف کے صرف پانچ پانچ آدمیوں کو بولنے کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن اتفاقاً ایک صاحب جن کا نام قاضی سرفراز علی تھا، لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور کے بڑے رئیسوں میں تھے، غدر میں مالی حالت ان کی خراب ہو گئی تھی، پادریوں سے مقابلہ اور مناظرہ کا ذوق رکھتے تھے، وہی ایک لکھی ہوئی تحریر لائے۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اپنی تحریر کے سنانے کا موقعہ ان کو بھی دیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر نے اپنی جگہ ان ہی کو کھڑا کر دیا، ان کو دیکھ کر پادری نولس نے کہا کہ کیا

"آپ بھی ان ہی پنجتن میں ہیں جو اس کام کے لئے مخصوص ہوئے ہیں"

جواب میں قاضی صاحب نے جب کہا کہ ان میں تو میں نہیں ہوں، لیکن فلاں صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ

"ان کو اجازت ہے اور یہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں"

جس پر نولس نے نہایت سختی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ

"ان کو اجازت نہیں ہو سکتی"

بے چارے قاضی صاحب کو کھڑے ہونے کے بعد بیٹھ جانے پر مجبور کیا۔

اس سال تو خیر یہ بات گذر گئی، میلہ جب دوسرے سال منعقد ہوا، اور اب کے بھی پانچ پانچ آدمی ہر فریق کی طرف سے مقرر ہو چکے تھے، لیکن بعد کو یہی اسکاٹ منطقی پادری نولس صاحب کے بلانے پر جب پہنچے، اور چاہا گیا کہ گفتگو میں ان کو بھی حصہ لینے کے لئے موقعہ دیا جائے، اور ایک گھنٹہ تقریر کے لئے اسکاٹ صاحب طالب ہوئے، یہی موقعہ تھا کہ قاضی سرفراز علی صاحب کے واقعہ کا بھی جواب دیا جائے۔ نیز پھلاؤدہ والے مولانا محمد علی بھی اسی عرصہ میں پہنچ چکے تھے، جن کا نام

مسلمانوں کی طرف سے مقرر کئے ہوئے پانچ آدمیوں کی فہرست میں نہ تھا، قاضی سرفراز علی کے جلسے میں تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے مزید کسی آدمی کو بولنے کی اجازت پادری نہیں دیں گے حالانکہ سیدنا الامام الکبیر ان کو بھی گفتگو میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ درحقیقت اسکاٹ صاحب کے قصہ میں رد و کد کا راز یہی تھا، اسی لئے راضی ہو جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا بھی کہ

"پادری اسکاٹ صاحب جب داخل مناظرہ کئے جاتے ہیں تو ہم ظفیبہ مولوی محمد علی صاحب کو شامل کریں گے" ملہ مباحثہ شاہجہاں پور

تو سبق دقت، اور پادری اسکاٹ صاحب کی شرکت کے مسئلہ میں جب حضرت والا کے پاس پادری نولس صاحب کی طرف سے منشی پیارے لال بُنگ و دو کر رہے تھے، تو ایک دفعہ منشی جی سے سیدنا الامام الکبیر نے فرما بھی دیا تھا:

"منشی صاحب مجھ کو کسی بات پر خواہ مخواہ اَڑ نہیں، مگر ہاں پادری صاحب کو اس کج رائی پر کہ ہم منتیں کریں اور وہ تسلیم نہ کریں، اسی لئے بالفعل ہماری طرف سے یہی جواب ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا آپ ان کو سنا دیں۔"

آخر میں یہ سمجھاتے ہوئے کہ اس قسم کی معمولی باتوں کی کوئی قدر و قیمت میری نظر میں نہیں ہے، منشی جی کے کان میں یہ بات بھی آپ نے ڈال دی تھی کہ

"باقی جو کچھ ہو گا وقت پر دیکھا جائے گا" ۲۹ؔ

وقت جب آیا تو دیکھا بھی گیا کہ جو کچھ پادری نولس نے چاہا سب ہی کچھ منظور کر لیا گیا۔

اور یہ تو اس احسانی حکم و علم کی ایسی جزئی مثالیں ہیں، جن کا شاید ذکر بھی نہ کرتا۔ اگر اس راہ کے ان چند کلی نتائج کے ذہن نشین کرانے میں مدد نہ ملتی، جنہیں اب پیش کرنا چاہتا ہوں، اور یہ ایسے کلی نتائج ہیں جن سے سیدنا الامام الکبیر کی سیرت ہی کا ایک خاص پہلو نمایاں نہیں ہوتا، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی ہند آج جن مشکلات سے دوچار ہے، چاہا جائے تو ان مشکلات کے حل میں بھی ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ مذہب کے نام سے شاہ جہاں پور کے علاقہ میں اس میلہ کے انعقاد کا جو اعلان کیا گیا تھا، اس میں شک نہیں کہ اس کے متعلق کبھی کبھی سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے اس قسم کے الفاظ جنھیں نقل بھی کر چکا ہوں نکل جاتے تھے، مثلاً یہی بات کہ

"اگر اثبات و تحقیق مذہب پر نظر ہے تو ترتیب عقلی (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو کل میں نے عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں، تو غرض پیارے لال کے فرمانے کا اتباع ہے" ملخصًا

کہنے والے چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ میلے کے مقصد کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے دل میں بھی شک پیدا ہو جاتا تھا، اسی بنا پر ان کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ

"بہتر ہے کہ ہر فریق میں سے چند آدمی منتخب کئے جائیں"

دوسرے فرقوں کے نمائندوں نے بھی مسلمانوں کی یہ تجویز مان لی، اور عرض کر چکا ہوں کہ پانچ پانچ آدمی طے ہوا کہ ہر فریق سے تقریر کرنے کے لئے چن لئے جائیں۔ اور اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے پانچ آدمی جو مقرر ہوئے، ان میں دوسروں کے ساتھ ایک نام سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تھا۔ لیکن بایں ہمہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ اس میلے کی بنیاد میں آج جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں، جن کے مختلف پہلوؤں کی طرف اب تک اشارے کرتا چلا آیا ہوں، ایسی کوئی صاف اور صریح شہادت میرے پاس نہیں ہے، جس پر اعتماد کر کے یہ دعویٰ کروں کہ سیدنا الامام الکبیر نے ان میلوں میں جو کچھ کہا یا جو کیا، اس میں ان امور کا خیال بھی آپ کے سامنے کسی نہ کسی حیثیت سے تھا، بلکہ بیان کرنے والوں نے جو چیزیں مجھ تک پہنچائی ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلا میلہ ہو، یا دوسرا، ہر ایک میں آپ کی شرکت مذہب ہی کے نام پر ہوئی۔ اسی کے نام پر اس میلے میں لوگ بلائے گئے تھے، پس مذہب ہی کے نام پر آپ ان میلوں میں داخل بھی ہوئے، اور ان میلوں سے نکلے بھی تو اسی خیال کے ساتھ نکلے کہ "مذہبی کاروبار" کے سوا ان کے پیچھے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، پس باہر سے تو مذہب ہی کے نام نے آپ کو کھینچا تھا، باقی آپ کے اندر کیا تھا، جو بیٹھ جانے کے

بعد بھی آپ کو اٹھا اٹھا دینا تھا' دوسرے سال کے میلے کی اطلاع لکھا ہے کہ جب آپ تک پہنچی تو پہلے میلہ میں پادریوں کی بے انصافیوں کا خیال کر کے لکھا ہے کہ

"تہی دستی میں مفت کی زیر باری' اور بے فائدہ تضیع اوقات ہے' ارادہ جانے کا نہیں کیا"

ص۱۸ مباحثہ شاہ جہاں پور

مگر بیٹھ جانے کے بعد پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے' کیوں اٹھ کھڑے ہوئے' اپنے ذاتی نام و نمود کا تو خیر اس شخص کے متعلق سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے' جس کی ساری زندگی اسی کے دبانے میں گذری' عرض ہی کر چکا ہوں کہ پہلی دفعہ میلے میں شاہ جہاں پور تک نو رفقار کے ساتھ پہنچے' لیکن ریل سے اترنے کے ساتھ ہی ہم سفروں کو شہر روانہ کر دیا' اور خود تنہا حضرت شیخ الہندؒ کو ساتھ لے کر شب گذاری کے لئے کسی سرائے میں تشریف لے گئے' اور سرائے میں بھی اسی لئے کہ مشہور نام سے پتہ چلانے والے پتہ چلا لیں گے۔ "خورشید حسین" اپنے تاریخی نام کے ساتھ داخل ہوئے' میلے میں جب ہر فریق سے طے ہوا کہ پانچ پانچ آدمیوں کا انتخاب تقریر وغیرہ کرنے کے لئے کیا جائے' اور مسلمانوں کی طرف سے پانچ ناموں میں سے ایک نام آپ کا بھی تھا تو اس وقت بھی فہرست جو بنی لکھا ہے کہ

یہ (مولوی محمد قاسم) نام ان کا نہیں لکھا گیا' بجائے مولوی محمد قاسم کے حافظ خورشید حسین صاحب لکھا گیا" ص۲۳ میلہ خداشناسی

مطلب وہی تھا کہ تقریر کی وجہ سے شہرت میلے میں اگر ہو گی بھی تو خورشید حسین کی ہو گی' محمد قاسم کی نہ ہو گی' اف! کسی کے "نام" پر جو اپنا سب کچھ لٹا اور مٹا چکا تھا۔ اپنا اور اپنے نام کا سوال ہی اس کے لئے کیا باقی رہا تھا۔ حالانکہ یہ دل کی بات تھی' دوسروں کو کیا معلوم کہ نانوتہ سے اٹھارہ انیس کوس پیدل چل کر دیوبند پہنچنے والا' اور وہاں سے سرگرداں مظفر نگر' میرٹھ' دلی ہوتا ہوا' شاہ جہاں پور' شاہ جہاں پور سے پیادہ پا سارنگپور کے اس میدان تک دعا کرتا ہوا کیوں پہنچا تھا' پہلی دفعہ بھی پہنچا' اور ارادہ ملتوی کرنے کے بعد دوسرے میلے میں بھی آدھمکا' ظاہر ہے کہ اس کا تعلق دل کی باطنی کیفیت سے تھا۔

تاہم جو کچھ اندر بھرا ہوا تھا کبھی کبھی وہی چھلک پڑتا تھا کس کی آبرو اور عزت کا سوال اسکو بے چین اور بے قرار کئے ہوئے یہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں لئے پھرتا تھا۔

پہلے سال کی روداد میں تو نہیں لیکن دوسرے سال والے میلے کی روداد مباحثہ شاہ جہاں پور نامی والے میں نقل کیا ہے کہ شاہ جہاں پور کے اسٹیشن سے تو سیدنا الامام الکبیر کو مولوی حفیظ اللہ خاں وغیرہ شہر لے گئے، اور اس دفعہ شاہ جہاں پور کی یہ رات بجائے سرائے کے مولوی عبدالغفور صاحب رضا کے مکان پر گذری، لیکن کیا پوری رات گذری؟ لکھا ہے کہ

"مناظرین اسلام آخر رات ہی سے راہی میدان مباحثہ ہوئے"

اللہ اللہ یہ پچھلی رات کا وقت، سننے کی بات ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ میدان مباحثہ

"جو شاہ جہاں پور سے چھ سات کوس کے فاصلے پر تھا"

اس فاصلہ کو طے کرنے کے لئے

"سب صاحب سوار"

جا رہے تھے، لیکن

"مولوی محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ پیادہ پا" صفحہ

راستہ میں پھر وہی ندی غالباً گرّا نامی آئی، اس کے بہتے ہوئے پانی میں طہارت و وضو سے فارغ ہوئے، مارچ کا مہینہ تھا، ۱۹ر تاریخ تھی، وضو کر کے بیان کیا ہے کہ

"نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی"

گڑگڑا کر کسی کے قدموں پر سر رکھ کر مانگنے والا کیا مانگ رہا تھا، جس سے مانگ رہا تھا، اور جو مانگ رہا تھا، ان دونوں کے درمیان کا یہ راز تھا۔ لیکن آگے چند اوراق کے بعد صاحب روداد نے یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے جب سے شاہ جہاں پور کا ارادہ کیا تھا، جس سے ملتے تھے یا جس کو اہل دعا سمجھتے تھے، استدعاء دعا کرتے تھے"

آگے اس کے بعد لکھا ہے کہ

"خود یہ کہتے تھے کہ ہر چند ہماری نیت اور ہمارے اعمال اسی قابل ہیں کہ ہم مجمع عام میں ذلیل و خوار ہوں"

سیاسی حیثیت سے ذلت و خواری جو کچھ ہو چکی تھی وہ بجائے خود تھی۔ لے دے کر مسلمانوں کی دینی زندگی کا کچھ وزن باقی تھا، اب اس مذہبی سلسلے میں اس وزن کے زوال کا خطرہ سامنے آ گیا تھا، اللہ اللہ جگر شق ہو جاتا ہے، جُرم اور جرم کی سزا و عقوبت کے استحقاق کا اقرار کرتے ہوئے، عرض کرنے والے کے اس معروضہ کو جب ہم پڑھتے ہیں۔

"مگر ہماری ذلت و خواری میں دین برحق کی ذلت"

اور آہ کہ اسی کے بعد یہ جگر شگاف، روح گداز الفاظ نقل کرنا چاہتا ہوں لیکن نقل نہیں ہوتے۔

"اس رسول پاک کی ذلت متصور ہے، جو تمام عالم کا سردار اور تمام انبیاء کا قافلہ سالار ہے" ملے

یہی باطنی احساس، اور آپ کا اندرونی جذبہ تھا، جو آپ کو تڑپائے ہوئے تھا، خود بھی تڑپتے تھے، اور دوسروں کو بھی تڑپاتے تھے۔ اور یہ دعا یعنی

"الٰہی! ہماری وجہ سے اپنے دین، اور اپنے حبیب پاک، شہ لولاک کو ذلیل و خوار مت کر، اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اور طفیل میں ہم کو عزت و افتخار سے مشرف فرما"

لکھا ہے کہ

"خود بھی یہی دعا کرتے تھے، اور اوروں سے بھی یہی دعا کراتے تھے"

تگ و دو کشش و کوشش، اضطراب اور بے چینی کے ان سارے قصوں کی تہ میں دل کی جو لگن، قلب کا جو سوز، روح کا جو قلق پوشیدہ تھا، اس کا کچھ اندازہ دعا کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، بس ایک ہی نام تھا، جس کی عزت کے لئے جینے والا جی رہا تھا، اور اسی کے نام کی حرمت پر وہ مر گیا،

رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہ۔

کچھ بھی ہو، میلے تک یہی آپ کا باطنی جذب کھینچ کھینچ کر لاتا رہا، لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میلے میں پہنچنے کے بعد اس قسم کے تماشے جو آپ کے سامنے پیش ہوئے کہ پنڈت صاحبان تو اپنی پنڈتائی کے کمالات کی نمائشوں میں مصروف ہیں سنسکرت الفاظ کے استعمال کے شوق کو پورا کر رہے ہیں، اور عیسائیوں کی طرف سے کالے پادری جو شریک تھے، بقول صاحب روداد "میلہ خدا شناسی" ان کی تقریروں کا حال یہ تھا کہ

"قالب میں الفاظ کے ایسے معانی ڈالنے کی نوبت نہ آئی تھی، الفاظ ہی سے خانہ پری اوقات کرتے تھے" (صـ ۲۱)

خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کالے پادریوں کی تقریروں پر تنقید یاد ہوگا کچھ اسی قسم کے الفاظ میں فرمائی تھی، باقی ان کے لسان اور طرار مقرر پادری نولس صاحب سوائے مضحکہ خیز مغالطوں، مثلاً لکڑی اور لاٹھی والے عام و خاص، یا جڑ شاخ پتہ والے تثلیثی مغالطہ وغیرہ کے سوا زیادہ وقت تو ان و قوانین کی ترتیب، ہی میں خرچ کر رہے تھے، اسی طرح منطق کی کتاب پر پانسو روپے سرکاری انعام پانے والے پادری اسکاٹ صاحب وہ حکومت برطانیہ کی بھاٹ خوانی کو عیسائی مذہب کی وکالت قرار دے رہے تھے، الغرض یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے والات سنجیدہ نفوس کو کبیدہ و افسردہ کرنے کے لئے کافی تھے، دوسرے سال میلے کے منعقد ہونے کی خبر پانے کے بعد اپنی شرکت کو بے وقعہ اور تضییع اوقات، سیدنا الامام الکبیر نے استعارۃً جو قرار دیا تھا، تو اسباب آپ کے احساس کے اسی قسم کی باتیں تھیں۔

بایں ہمہ اسی عجیب و غریب میلے کی بدولت جس کے انعقاد کے در پردہ محرکات خواہ کچھ ہی ہوں، ایک مغتنم موقعہ بھی سامنے آگیا تھا، دنیا کے دو بڑے مذہب عیسائیت، اور ہندو دھرم کے ماننے والوں کو ایک ساتھ مخاطب بنانے، اور دین کے آخری پیغام اور اس پیغام کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روشناس کرانے کا اس سے زیادہ موزوں ترین وقت اور کیا ہو سکتا تھا، کہا تو یہی جاتا تھا کہ

"تحقیق حق" کے لئے ایک ہی جگہ شانہ سے شانہ ملا کر سب بیٹھے ہیں، میلے میں پہنچنے کے بعد اس اتفاقی اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے خیال ہی کا بظاہر یہ نتیجہ معلوم ہوتا ہے، کہ پنڈت اور پادری تو جن مشغولیوں میں بھی ہوں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کو ہم دیکھتے ہیں، کہ شرائط و قیود کے قصوں سے بالا ہو کر اپنی توجہ کو اپنی تبلیغی نصب العین پر مرتکز کر کے صرف اسی کوشش میں مصروف ہیں، کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اپنے خیالات کے پیش کرنے کا موقعہ ان کو دیا جائے۔ پہلے تو آپ نے اسی لئے چاہا تھا کہ تقریر کے لئے کافی وقت حاصل کیا جائے، لیکن اس میں جب کامیابی نہ ہوئی، تو جلسہ کے اندر، جلسہ کے باہر جس طرح بھی آپ سے بن پڑا، جو کچھ سنانا چاہتے تھے، اس کو سناتے ہی چلے گئے، اسی سے اندازہ کیجئے، کہ دوسرے سال کا میلہ، جس میں پنڈت دیانند سرسوتی جی اور منشی اندرمن بھی شریک تھے اور جلسہ سے پہلے سبجکٹ کمیٹی میں یہ طے ہو چکا تھا کہ پہلی تقریر درس کر تام ستارج پنڈت جی کی ہوگی اور عام مجمع میں تقریر کے لئے مقررین پہنچے، تو لکھا ہے کہ

"پنڈت صاحب (سوامی دیانند جی) سے کہا گیا کہ مجلس شوریٰ میں آپ کہہ چکے ہیں کہ آج ہم درس دیں گے سو آپ بیان کریں"۔

لیکن مجلس شوریٰ کے اس طے شدہ فیصلے کے برخلاف بیان کیا ہے کہ

"انہوں نے (پنڈت جی نے) پہلو تہی کی" ۔

پادری نولس بھی حیران ہو گیا، مگر کسی طرح پنڈت جی کو فیصلہ کے مطابق عمل پر آمادہ نہ کر سکا، تو لکھا ہے کہ مجبور ہو کر اس نے سیدنا الامام الکبیر سے کہا کہ جب پنڈت جی شروع نہیں کرتے، تو آپ ہی بیان کیجئے، یہاں کیا تھا، اول ہو یا آخر آپ کے سامنے تو صرف حق کی تبلیغ تھی، صرف یہ فرماتے ہوئے کہ

"انصاف کا مقتضیٰ اسی کا تھا کہ سب کے بعد ہم بیان کرتے، کیونکہ ہمارا دین سب سے پچھلا ہے"۔

جو کچھ پادری نولس نے کہا تھا، بلا چون وچرا آپ نے منظور فرما لیا۔

اسی طرح توسیع وقت کی جو تجویز آپ کی طرف سے پیش ہوئی تھی۔ جب کثرت رائے سے مسترد ہو گئی، تو اس وقت پادری نولس سے فرمایا کہ

"ہمارے بار بار کہنے سے افزائش وقت کو تسلیم نہ کیا تو خیر اس کو قبول کیجئے کہ بعد اختتام وقت جلسہ یعنی چار بجے کے بعد کل ہم ایک گھنٹہ وعظ کہیں گے آپ بھی محفل میں شریک ہوں، اور بعد ختم وعظ کے اعتراض کرنے کا بھی اختیار ہے"

غرض آپ کی یہ تھی کہ پادری نولس صاحب ہی اس میلے کی سب سے زیادہ ممتاز اور سربرآوردہ ہستی تھے، ان کی شرکت کی وجہ سے دوسرے بھی خارج از وقت والی میری تقریر میں شریک ہو سکیں گے اسی لئے آخر میں یہ بھی آپ نے فرما دیا تھا کہ اعتراض کا حق صرف پادری نولس ہی کی حد تک میں محدود نہیں کرتا ہوں۔

"بلکہ جس صاحب کے دل میں آئے وہ اعتراض کریں، ہم جواب دیں گے" ۔ ص

آپ دیکھ رہے ہیں، جلسہ کے اندر حالانکہ نقد بار ہے کے لئے پنڈت جی کی جگہ پہلے آپ کا کھڑا ہونا طے شدہ فیصلے کے خلاف تھا۔ لیکن آپ نے اس کی پروا نہ کی، اور تقریر کرنے پر آمادہ ہو گئے، اسی طرح جب آپ کو محسوس ہوا کہ دل کا حوصلہ وقت کی قید و بند کی پابندیوں میں نہ نکلے گا، تو خارج از جلسہ آپ نے نولس کو راضی کیا کہ بیان کرنے کا موقع آپ کو دیا جائے، اور وہی سب کچھ جلسہ سے باہر کیا جائے جیسے جلسہ کے اندر کرنا چاہئے تھا۔

دوسرے میلے میں تو اس حد تک تبلیغ، اور حق رسانی کا یہ ولولہ آپ میں اشتعال پذیر ہو گیا تھا کہ دوسرے دن جلسہ کے اندر تقریریں اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر میں پنڈت دیانند سرسوتی جی نے حشر و خیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، جلسہ صبح سے ہو رہا تھا، پنڈت جی نے بالکل آخر میں جب گیارہ بج رہے تھے اس مسئلہ کو چھیڑا تھا، لکھا ہے کہ ان کے بعد سیدنا الامام الکبیر اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے تقریر کے مقام پر جب پہنچے، تو پادریوں نے اعلان کیا کہ گیارہ بج چکے۔

"بس جلسہ کا وقت ہو چکا"۔

حضرت والا کی بے کلی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی، صاحب روداد نے نقل کیا ہے، کہ جلسہ والوں کو خطاب کر کے

مولوی صاحب رسیدنا الامام الکبیرؒ نے فرمایا کہ دو چار منٹ ہماری خاطر سے اور ٹھیریئے چند درگاہ جھٹ پٹ پنڈت جی کے اعتراض کا جواب عرض کئے دیتا ہے؛ ۱؎

لیکن پادری کسی طرح دو چار منٹ کے لئے ٹھیرنے پر آمادہ نہ ہوئے، اس وقت آپ سے نہ رہا گیا، اور شاید یہ زندگی میں پہلا موقعہ تھا، کہ پنڈت دیانند سرسوتی جی کو شخصی مخاطب بنا کر حضرت والا کہتے گئے کہ

"پنڈت صاحب آپ ہی ٹھیر جائیں، وقت جلسہ ہو چکا ہے تو کیا ہوا، دو چار منٹ خارج از جلسہ ہی سہی!!

مگر حیرت ہوتی ہے، اتنے غیر معمولی اصرار کے باوجود پنڈت جی بھی چند منٹ کی گنجائش نہ نکال سکے، لکھا ہے کہ

"پنڈت جی نے بھی نہ مانا اور یہ فرمایا کہ بھوجن کا وقت آگیا ہے، اب ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا۔"

۱؎ مباحثہ شاہجہاں پور

پنڈت جی تو یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گئے، سیدنا الامام الکبیر نے جب دیکھا کہ پنڈت جی تو خیر ہاتھ سے نکل گئے، تو نہایت اضطراب میں بیان کیا ہے، کہ پنڈت جی کے ہمدم و ہمراز

"منشی اندرمن صاحب کا ہاتھ پکڑ کر یہ فرمایا کہ منشی صاحب! پنڈت صاحب تو نہیں سنتے، آپ ہی سنتے جائیں"

ہاتھ اگر پکڑ نہ لیتے تو شاید منشی جی بھی پنڈت جی کے پیچھے پیچھے چل دیتے، لیکن دست گرفتہ ہو جانے کی وجہ سے شاید مجبور ہو گئے، اور سیدنا الامام الکبیر جو کچھ سنانا چاہتے تھے ان کو سنا کر رہے۔

اور یہ قصہ تو دوسرے میلے کا ہے، پہلے سال ہی کے میلے میں آپ کے جوش تبلیغ کی شدت بڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ چکی تھی، جب میلے کے دونوں ختم ہو چکے، اور اپنی فرودگاہوں میں لوگ

واپس ہوئے کہ طے یہ تھا کہ کل میلہ کے میدان سے لوگ روانہ ہو جائیں گے، اسی عرصہ میں جیسا کہ پہلے سال کی روداد میں لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے موتی میاں صاحب سے کہا یوں جی چاہتا ہے کہ پادری نولس صاحب سے تنہائی میں ملئے اور دعوت اسلام کیجئے"

آپ نے کچھ اس طریقہ سے اپنے دل کی آرزو بیان کی کہ موتی میاں حضرت والا کے منشا کے مطابق پادری نولس کے خیمے میں اسی وقت چلے گئے، اور کہا کہ

"ہمارے مولوی صاحب آپ سے تنہا ملنا چاہتے ہیں"

نولس بخوشی ملنے پر آمادہ ہو گیا اور یوں حضرت والا تنہا نولس صاحب کے پاس ان کے خیمہ میں پہنچے ان تمہیدی فقرات کے بعد یعنی

"ہم آپ کے اخلاق سے بہت خوش ہوئے اور چونکہ اخلاق باعث محبت ہو جاتے ہیں اور محبت باعث خیر خواہی ہو جایا کرتی ہے تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ دو کلمے آپ کی خیر خواہی کے آپ سے کہیں اور آپ سنیں"

نولس نے کہا کہ "ضرور سنائیے" تب جیسا کہ خود ہی بیان کیا کرتے تھے، پادری کے سامنے تبلیغ کا حق ان الفاظ میں ادا کیا، یعنی فرمانے لگے کہ

"دین عیسوی سے توبہ کیجئے، اور دین محمدی اختیار کیجئے، دنیا چند روزہ ہے۔ اور عذاب آخرت بہت سخت ہے"

"بیشک" اس لفظ کے سوا، نولس کی زبان سے کچھ نہ نکلا، وہ خاموش بیٹھا رہا، تب آپ نے فرمایا کہ

"اگر ہنوز آپ کو تامل ہے، تو اللہ سے دعا کیجئے کہ حق واضح کر دے"

یہ بھی تاکید کی گئی کہ

"اگر آپ اخلاص سے دعا کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ضرور حق کو روشن کریگا"

تب جواب میں نولس صاحب نے کہا کہ

"میں روز دعا کرتا ہوں، کہ یا اللہ میرے دل کو روشن کر دے"

کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے پادری صاحب کو ہدایت کی کہ

"یوں دعا کیجئے، کہ ان مذاہب مختلفہ میں جون سا مذہب حق ہو، وہ روشن ہو جائے اور حق و باطل تمیز ہو جائے"

نولس نے یہ سن کر کہا کہ

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ آپ نے میرے حق میں اتنا فکر کیا، اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا" صہ

بہر حال اس میلے سے جس میں ہر طرح کے لوگ مذہبی احساسات کو بیدار کر کے شریک ہوتے ہیں، اس سے تبلیغی نفع حاصل کیا جا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے اجلاس ہی میں اس کی طرف ذہن مبارک منتقل ہو گیا تھا، کیونکہ لکھا ہے، کہ پہلے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد ہی

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے واعظین (یعنی مسلمانوں کی طرف سے مولوی جو شریک ہوئے تھے اور وعظ کہہ سکتے تھے ان ہی) کو فرمایا کہ میلہ میں متفرق ہو کر وعظ بیان کرنا چاہئے"

بیان کیا ہے کہ آپ کی اس تجویز کے مطابق

"واعظین (اسلام) نے جا کر بجز مولوی منصور علی صاحب کے علی الاعلان منادی اسلام و ابطال عیسائیت کو بیان کرنا شروع کیا"

عصر کے بعد سے مغرب تک میلے میں وعظ کہنے والے علماء پھیل گئے تھے، صاحب روداد نے لکھا ہے کہ

"قبل مغرب تک تمام میلے میں عجب کیفیت رہی اور عنایت ایزدی سے کوئی پادری مقابل نہ ہوا"

گویا جو پیشہ پادریوں کا تھا، حضرت والا کے اشارہ سے مسلمان مولویوں نے وہی کام میلہ میں شروع کیا، خیال یہ تھا کہ گورے نہ سہی ان کے سکھائے ہوئے کالے پادری ہی مقابلہ میں آئیں گے لیکن بقول

صاحب روداد گورے پادری ہوں یا کالے

"خدا معلوم کہاں جان چرائے پڑے رہے"۔ ص۲۱ واقعہ میلہ خدا شناسی

عصر سے مغرب تک سارے میلے میں یہی چرچا ہوتا رہا، مغرب کے بعد اندھیرا ہو چکا تھا، لوگ اپنی اپنی فرودگاہوں میں چلے گئے، علماء اسلام بھی جیسا کہ لکھا ہے، اپنے خیمہ میں

"صلاح و مشورہ کرتے رہے، اسی حالت میں عشاء کی نماز پڑھ کر اور کھانا کھا کر سو رہے"۔

دوسرے دن بھی محفل مناظرہ منعقد ہونے والی تھی، صبح ہوئی، نماز صبح کے بعد دیکھا گیا کہ ابھی اجلاس میں دیر ہے، اس لئے پھر حضرت نے موزیوں سے کہا کہ کل کی طرح آج بھی عام منادی اسلام کی میلہ میں کرنا چاہئے، یہی کیا گیا، صاحب روداد نے لکھا ہے کہ

"چنانچہ ان حضرات نے میلہ میں جا کر کما ینبغی حق اسلام ادا کیا۔ جزاہم اللہ عن جمیع المؤمنین خیر الجزاء"۔ ص۲۲

بیان کیا ہے کہ دوسرے دن بھی

"۹ بجے تک برابر وعظ و درس کا شور تمام میلہ میں رہا"۔

بہر حال اعلان اور اشتہار کے مطابق اس میلہ میں کارروائیاں ہو رہی ہوں، یا نہ ہو رہی ہوں لیکن پہنچ جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے ایک طرف تو اس کی کوشش کی کہ تبلیغ حق کا فائدہ اس سے اٹھا لیا جائے۔ دوسروں کو بھی میلے کی افادیت کے اس پہلو کی طرف متوجہ فرمایا، اور خود ذاتی طور پر جو کچھ بھی کر سکتے تھے، آپ دیکھ چکے کہ کوئی دقیقہ آپ نے اس راہ میں اٹھا نہ رکھا تھا، لیکن آپ کے احسانی علم و علم کے آثار اسی حد تک محدود نہ تھے، بلکہ آپ کی اس خداداد نعمت کا مظاہرہ سچ پوچھئے تو ان تقریروں میں ہوا، جن کا ذکر دونوں میلوں کی روئدادوں میں کیا گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ میلہ کے درون پردہ محرکات سے ناواقف رہتے ہوئے آپ کی ہر تقریر ٹھیک مقتضی حال کے مطابق ہر اجلاس میں کیسے ہوتی رہی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ جن اشتباہی تاریکیوں کا تذکرہ اس میلے کے متعلق کر چکا ہوں، اگر یہ

مان لیا جائے کہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے یہ تاریکیاں نہ تھیں، اور اس میلہ کو صرف ایک مذہبی میلہ ہی سمجھتے ہوئے آپ تقریر فرماتے رہے، تو اب اس کی توجیہ کیا کی جائے؟ کہ ان تاریکیوں سے کامل آگاہی کے بعد بھی جہاں تک میرا خیال ہے، ان سے زیادہ برمحل تقریروں اور عین موقع کے مناسب بیانوں کا ہم شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر اجلاس میں آپ نے وہی کہا جو کہنا چاہئے تھا، اور اس طریقہ سے کہا کہ نتیجہ ان میلوں کا جب سامنے آیا تو دیکھا گیا کہ اس نتیجہ سے وہ قطعاً مختلف تھا، جس کی توقع اس قسم کے میلہ کے بعد کی جا سکتی تھی۔ میں ان تقریروں کو پڑھتا ہوں اور مبہوت ہو کر رہ جاتا ہوں، اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ورار طور عقل قرار دے کر چپ ہو جاؤں، عقل و قیاس کو اس کی توجیہ سے معذور پاتا ہوں۔ اس باب میں میرے جو احساسات ہیں، شاید صحیح طور پر ان کی تعبیر جیسی کہ چاہئے مجھ سے بن بھی نہ آئے، لیکن اپنی حد تک کوشش کرتا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی مرتبہ سوالات کی ایک فہرست مجلس مباحثہ میں اس تجویز کے ساتھ پیش ہوئی تھی، کہ علمی طور پر مذہبی موضوع پر بحث و تحقیق کا یہی طبعی طریقہ ہو سکتا ہے، لیکن آپ کی مجوزہ فہرست کی جگہ کثرت رائے سے اہل مجلس نے یہی طے کیا کہ سوالات کی جو فہرست منشی پیارے لال کی طرف سے پیش ہوئی ہے، سمجھا جاتا تھا کہ سوامی دیانند جی کے مرتب کئے ہوئے سوالات تھے، اسی کے مطابق بحث ہو۔ اس رنگ کو دیکھ کر چارہ کار ہی کیا تھا، کہ اکثریت کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا جائے، لیکن پھر بھی دونوں میلوں میں جلسوں کے اندر، یا باہر جہاں کہیں بھی جتنی دیر آپ کو بیان و تقریر کے مواقع ملتے رہے، عموماً ان میں وہی باتیں ہوتی تھیں جن کا ذکر آپ کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مباحثہ شاہجہاں پور نامی والی روداد میں بایں الفاظ کیا ہے لکھا ہے، کہ

اُس تقریر میں آٹھ باتیں تھیں۔ خدا تعالیٰ کا ثبوت، اُس کی وحدانیت، اُس کا واجب الاطاعت ہونا، نبوت کی ضرورت، نبوت کی علامات اور صفات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، آپ کی خاتمیت، آپ کے ظہور کے بعد انہیں کے اتباع میں نجات کا

مختصر ہو جاتا" ص۳۳

اگرچہ روداد میں ایک ہی تقریر کے مشتملات کا تجزیہ کیا گیا ہے لیکن جس حد تک آپ کی دوسری تقریروں اور بیانات کا جو حصہ ان روداد وں میں نقل کیا گیا ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان ہی ہشتگانہ عنوانوں کو محور بنا کر آپ تبلیغ کا حق ادا فرماتے رہے۔ دین کے ان اصولی عنوانوں میں سے ہر ایک کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے خصوصی افکار اور ان کی اچھوتی تعبیروں کی تفصیل کا صحیح اور موزوں مقام تو کتاب کا دوسرا حصہ ہے جو حضرت والا کے

"نظریات فائقہ"

کی تشریح و توضیح ہی کے لئے انشاء اللہ مرتب کیا جائے گا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس جلیل علمی و دینی خدمت کی سعادت کسے حاصل ہوتی ہے اور توفیق ربانی کس کا انتخاب اس مہم کے لئے کرتی ہے، بجائے خود یہ ایک مستقل کام ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ٹھیک عصری تقاضوں کے مطابق دین کی تفہیم کا اس سے بہتر طریقہ شاید اس زمانہ میں سوچا بھی نہیں جا سکتا، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان اچھوتے اور نئے خیالات کا لباس بھی نیا کر دیا جائے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کام کس کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

بہر حال "سیرت طیبہ" کے اس حصہ میں ان تقریروں اور بیانات کے صرف اس پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے شاہجہاں پور کا دہی میلہ جسے آپ دیکھ چکے کہ اپنے دامن میں ہندوستان تک کی چنگاریوں کو چھپائے ہوئے تھا، سوچا گیا ہو یا نہ سوچا گیا ہو لیکن میلہ کے جلسوں کی کارروائیوں کی رفتار ہی ایسی تھی، کہ غدر کے بعد غدر سے بھی زیادہ مہیب فتنے کا ہندوستان خدانخواستہ اگر شکار ہو جاتا، تو جو کچھ کہا جا رہا تھا، اور کیا جا رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے شاید وہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوتی۔ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، تفصیل کے ساتھ اسے پیش کر چکا ہوں۔ آپ دیکھ چکے کہ پہلی دفعہ اسی میلے میں ہندوستان کے باشندوں کے ایک طبقہ یعنی ہندوؤں کے نمائندوں کو اسی ملک کے دوسرے دینی فرقہ مسلمانوں سے جدا کر کے عیسائی مذہب کے وکلاء یعنی پادریوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا، آج اس ملک میں اکثریت و اقلیت کا جو عفریت گرج رہا ہے، اس کی پرچھائیاں غالباً پہلی دفعہ اسی میلہ میں

احساسات کے سامنے نمایاں ہوئی تھیں' اور کون کہہ سکتا ہے' کہ اٹھارہ انیس سال پہلے جس ملک میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر عیسائیوں پر حملہ کیا تھا' اسی ملک میں انتقام کے اس تماشے کو کیا روکا جا سکتا تھا' کہ خود ہندو مسلمان باہم دست و گریبان ہیں۔ مگر اب اسے کیا کہئے' کہ وہ تماشہ تو کیا ہوتا' نتیجہ کی شکل میں جو نظارہ سامنے آیا' وہ اس سے مختلف اور قطعاً مختلف تھا' جس کی توقع میلہ کے بعد کی جا سکتی تھی' کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ وار ہی نہیں کہ خالی گیا' بلکہ جو کچھ آپ پڑھیں گے' اس کو پڑھ کر شاید ہر پڑھنے والا یہی کہہ سکتا ہے کہ وار کو الٹ دیا گیا' گویا کہا جا سکتا ہے کہ لڑائی کے قانون ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ کی عملی تعبیر ایک دفعہ شاہ جہان پور کے اس میلے میں بھی قدرت کی طرف سے کی گئی' اور اب اسی دلچسپ سرگذشت کی میں تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

نہ ماننے والوں تک حق کے پہنچانے کا جو میدان اس میلے میں سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا تھا' یہ واقعہ ہے کہ کسی کی رو رعایت کئے بغیر اگرچہ آپ سب کچھ اپنی ان تقریروں میں فرماتے رہے' عبادت کا مستحق صرف کائنات کا خالق ہے' اس مسئلہ کی تشریح و تبلیغ کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں آپ اعلان کرتے رہے کہ خالق کے سوا مخلوقات خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی ہو' جب مخلوق ہیں تو ان کی عبادت نہ نقلاً جائز ہو سکتی ہے' اور نہ عقلاً' آپ نے عیسائیوں اور ہندوؤں دونوں طبقوں کو خطاب کر کے کہا تھا۔

> "ایسی صورت میں سوا خدا خالق کائنات کے' اوروں کی عبادت جیسے ہنود و نصاریٰ کرتے ہیں' بالکل خلاف عقل و نقل ہو گی۔"

پھر اس اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے بھری مجلس میں آپ بار بار اس کا اعادہ فرماتے رہے' کہ

> "خاص کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سری رام چندر' اور سری کرشن کو معبود کہنا یوں بھی عقل میں نہیں آ سکتا' کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے۔ پاخانہ[1]' پیشاب' مرض اور موت سے

---

[1] یہی لفظ تھا' جس پر پادری نولس صاحب نے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ پاخانہ پیشاب کا لفظ فرمائیں موتی میاں جو جلسہ کے مہتمم تھے انہوں نے یہ سن کر کہا کہ پاخانہ پیشاب نہ کہئے بول و براز کہئے۔ مشاہداتی اگر صحیح ہیں)

مجبور تھے" ص۱۱ میلہ خدا شناسی

اور جیسے جیسے کھرے کھرے الفاظ میں "اسلامی توحید" کی منادی آپ کرتے رہے اسی طرح یہ مسئلہ کر

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں (یعنی سارے انبیاء و رسل میں) افضل سمجھتے ہیں اور بعد

خداوند عالم انہیں کو جانتے ہیں" ص۲۵ میلہ خدا شناسی

اور یہ کہ

"حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں افضل و اعلیٰ پایا" ص۲۱

پہلے سال کے میلے میں آپ نے ان ہی الفاظ میں اپنے دعوؤں کو پیش کیا، اور دوسرے سال کے میلہ

میں بھی یہ دعوے کرتے ہوئے کہ

"یہ بات واجب التسلیم ہے کہ آپ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمام انبیاء کے

قافلہ سالار اور سب رسولوں کے سردار اور سب سے افضل اور سب کے خاتم ہیں" ص۲۳

استدلال کا جو حق تھا، اسے ادا فرمایا، اور یہ میلہ جو ہندوؤں، عیسائیوں، مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا بار بار مختلف

پیرایوں میں ان کے کان میں یہ ڈالتے رہے کہ

"آج کل نجات کا سامان بجز اتباع نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ

نہیں" ص۴ مباحثہ شاہجہاں پور

قطعاً غیر مشتبہ دو ٹوک الفاظ میں سناتے رہے کہ

"کوئی شخص اس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر اوروں کا اتباع کرے، تو

بیشک اس کا یہ اصرار اور یہ انکار از قسم بغاوت خداوندی ہوگا، جس کا حاصل کفر و الحاد

ہے" ص۴ مباحثہ شاہجہاں پور

اور یہ فرماتے ہوئے کہ اب دین محمدی ہی کا وقت ہے، سب کو سنا دیا گیا کہ

(گزشتہ صفحہ سے) ایک دوسرے موقعہ پر بھی تمثیل میں پاخانہ کا لفظ سن کر پادری صاحب نے کہا تھا "میں جانوں پاخانہ کی مثال اچھی نہیں۔ ص۳۲"

"عذابِ آخرت اور غضبِ خداوندی سے نجات اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر ہے۔

جن براہین اور دلائل کی روشنی میں ان اعلانات کو دونوں میلوں میں آپ نے پیش کیا تھا، آج بھی اپنی دل آویزیوں میں شاید وہ اپنی آپ نظیر ہیں، جن کے لئے ان روداد وں کا مطالعہ کرنا چاہئے یا انتظار کیا جائے، سیرتِ قاسمی کے دوسرے حصہ کا جس میں ان ہی باتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش انشاء اللہ تعالیٰ کی جائے گی، اس باب میں سیدنا الامام الکبیر ایک مستقل فکری نظام کے بانی اور موجد ہیں، جدت طرازیوں کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس شدید نفرت کے جو انگریز اور انگریزی حکومت کی طرف سے آپ کے قلب مبارک میں تھی، عرض ہی کر چکا ہوں کہ ساری عمر آپ نے بٹن صرف اسی لئے استعمال نہیں فرمایا کہ بٹن کو انگریزوں کی برآمد کی ہوئی چیزوں میں آپ شمار فرماتے تھے۔ لیکن رسالتِ محمدیہ کی مذکورہ بالا خصوصیتوں کو سمجھاتے ہوئے، دوسرے وجوہ واسباب کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے انگریز وائسراؤں کا نام لے لے کر ایک سے زائد موقعوں پر تمثیلاً فرماتے تھے کہ

"جیسے اس زمانے میں باوجود تقررِ گورنر جنرال لارڈ لٹن، گورنر سابق لارڈ نارتھ بروک کے احکام کی تعمیل پر اگر کوئی شخص اصرار کرے اور لارڈ لٹن کے احکام کی تعمیل سے انکار کرے تو باوجود اس کے کہ لارڈ نارتھ بروک بھی سرکار ہی کی طرف سے گورنر تھا اس وقت یہ اصرار بیشک منجملہ بغاوت اور مقابلہ سرکاری سمجھا جائے گا" ملٹ مباحثہ شاہ جہاں پور

کتنا دلچسپ لطیفہ ہے کہ بٹن کو جس نے کبھی اس لئے استعمال نہیں کیا، کہ انگریزوں کا آوردہ ہے، وہی دینی ضرورت کے لئے لٹن انگریزی نام کو بے تحاشا دھڑلے کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔

بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ماننے والوں کے ایسے مجمع میں جس میں مسلمان ہی مسلمان ہوں آدمی سب کچھ کہہ سکتا ہے لیکن سوچنا چاہئے کہ ماننے والوں کے ساتھ جس محفل میں نہ ماننے والوں کی بھی کافی تعداد ہو، اور کافی کیا معنی، اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے عرض کر چکا ہوں کہ اکثریت اس میلے میں نہ ماننے والوں ہی کی تھی، جو یہاں صرف سن لینے ہی کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ تنقید و اعتراض کا

حق بھی غیر اسلامی مذاہب کے نمائندوں کو حاصل تھا۔ مگر دیکھ رہے ہیں، آپ کی تقریروں پر کسی قسم کے دباؤ کا ہلکا سا اثر بھی محسوس ہوتا ہے، یقیناً خالص مسلمانوں کے مجمع میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا، وہی سب کچھ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کی اس بھیڑ میں بے دھڑک کسی رنگ آمیزی کے بغیر آپ فرماتے رہے، مداہنت کی تو خیر گنجائش ہی کیا تھی، سچی بات تو یہ ہے، کہ اس معاملہ میں آپ نے رواداری اور مسامحت سے بھی کام نہ لیا، یہی نہیں، بلکہ جہاں ایک موقعہ پر آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

"دو مذہبوں کو تو ہم یقیناً دین آسمانی سمجھتے ہیں، ایک دین یہود اور دوسرے دین نصاریٰ" ص۲۸

اسی کے مقابلہ میں ہندوؤں کے سامنے ان کے ہندو دھرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"اس کی نسبت اگرچہ یقیناً ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین بھی آسمانی ہے" ص۲۸

گویا ہندو دھرم کے مقابلہ میں عیسائی دین کے ترجیحی پہلو کے اعتراف کی یہ ایک شکل تھی لیکن ایک دوسرے موقعہ پر جب توحید کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، ارشاد ہو رہا تھا کہ خالق کائنات کی وحدت کا عقیدہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے

"کسی ملت اور مذہب والوں کو اس سے انکار نہیں"

اپنے اسی عام دعوے کی تشریح میں ہندوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے جہاں یہ فرمایا تھا، کہ

"وہ اگرچہ بت پرست اور اوتاروں کے پوجنے والے ہیں، پر جوتی سروپ نرنکار ایک ہی کو کہتے ہیں" ص۱۲

وہیں عیسائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ

"رہے نصرانی، وہ اگرچہ شرک میں سب سے اول نمبر ہیں، اور مشرک تو مشرک صفات ہیں، پر نصرانی تو مشرک ذات ہیں، یعنی ذات کے مرتبہ میں تین خداؤں کے قائل ہیں" ص۱۲

مطلب جس کا یہی ہوا، کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں عیسائیوں کا جرم زیادہ سخت اور زیادہ شرمناک ہے حالانکہ جس زمانہ میں یہ فرمایا گیا تھا، یاد ہوگا اسی زمانہ میں ہندوؤں کے آریہ سماجی گروہ کے پیشوا

پنڈت دیانند کہتے پھرتے تھے کہ "دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑے بت پرست مسلمان ہیں" لیکن سیدنا الامام الکبیر کا مقام اس قسم کی مخاصمتوں، یا بے جا جانب داریوں سے بلند اور بہت زیادہ بلند تھا، جس قوم یا مذہب میں آپ کے نزدیک واقعہ کی رو سے جو کچھ پایا جاتا تھا، صرف اس کا اظہار کر رہے تھے۔ نہ آپ عیسائیوں کو خوش کرنا چاہتے تھے، اور نہ ہندوؤں سے انتقام کا مسئلہ آپ کے سامنے تھا۔ اپنے عقیدے کی رو سے جو چیز جس رنگ میں آپ کے سامنے تھی، سننے والوں کے رجحانات سے آزاد ہو کر اسی کو پیش کر رہے تھے۔

تاہم دونوں میلوں کی روداد میں آپ کے بیانات اور تقریروں کے اثر کو جن الفاظ میں پہنچانے والوں نے ہم تک پہنچایا ہے آئیے اور دیکھئے، وہ کتنا حیرت انگیز اور سوچئے تو عبرت خیز ہونے کے ساتھ ساتھ آج بھی اسلامی ہند والوں کے لئے کتنا سبق آموز ہے۔

ظاہر ہے کہ چاندا پور کے اس میلے میں جو مذہب کے نام سے قائم کیا گیا تھا، اس میں شریک ہونے والے عموماً ہندو مسلمان اور عیسائی تھے۔

مسلمان جس حد تک حضرت والا کی تقریروں سے متاثر ہوئے ہوں ان کے متعلق تو خیر پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ بقول صاحب روداد

"مسلمانوں کی جو کیفیت تھی سو تھی" صلا۲ میلہ خدا شناسی

غالباً اسی کیفیت کی تفصیل کی گئی ہے کہ

"لوگوں پر کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت" صلا۲۵

مسلمانوں کے دل کی باتیں تھیں جو کچھ وہ چاہتے تھے، وہی ان کو سنایا جا رہا تھا، ان کے عقائد اور مسلمات دلائل و براہین کے زیوروں سے آراستہ پیراستہ ہو کر ان کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔ جو حال ان پر طاری ہوتا، اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ جوش میں ایسے الفاظ اگر ان میں سے کسی کی زبان پر جاری ہو گئے ہوں، جیسے اس وقت میں ایک کالے پادری نے خواہ مخواہ اپنی غلط متعلق دانی کا ثبوت پیش کیا، اور

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا چاہا تو لکھا ہے کہ

"مولوی احمد علی صاحب ساکن نگینہ نے روکا اور یہ کہا کہ کس کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہو،

حق واضح ہوگیا، پھر کیا ہے کہ اٹھتے ہو" ص۳۹ میلہ خدا شناسی

اسی طرح عیسائیوں میں جو کالے پادری تھے ان کے متعلق تو نہیں، لیکن نولس صاحب اور اسکاٹ صاحب جو یورپین نژاد پادری تھے، ان کے متعلق اس قسم کی باتیں خلاف رخصت ہوتے ہوئے نولس صاحب نے حضرت والا سے کہا تھا

"آپ کے اخلاق سے میں بہت خوش ہوا، پھر نام و نشان مکان پوچھا"

یا بیان کیا ہے کہ

"تھوڑی دیر بعد موتی میاں صاحب نے آکر فرمایا، پادری کہتے تھے کہ گو یہ صاحب یعنی مولوی محمد قاسم صاحب ہمارے خلاف کہتے تھے، پر انصاف کی بات یہ ہے کہ ایسی تقریریں اور ایسے مضامین ہم نے نہ سنے تھے" (میلہ)

یا ان ہی موتی میاں کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ انہوں نے

"مولوی محمد قاسم صاحب سے فرمایا کہ پادری اسکاٹ صاحب آپ کی تعریف کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں، یہ مولوی نہیں یہ صوفی مولوی ہے"

ص۸ مباحثہ شاہجہاں پور

اس سے بھی زیادہ دلچسپ بیان ایک یورپین پادری نینگ نامی کا ہے۔ بریلی کے رہنے والے مولوی عبدالوہاب سے ایک دن اس نے اقرار کیا کہ خدا شناسی کے اس میلہ میں میں بھی شریک تھا، کہتا تھا کہ بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک دبلا پتلا آدمی میلے کپڑے، یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے۔ لیکن تقریر سننے کے بعد اپنے تاثر کا اظہار مولوی عبدالوہاب کے سامنے اسی نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

"ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔"[1] ص۲۷ میلہ خدا شناسی

مگر با ایں ہمہ ان ہی روداروں میں عام پادریوں (خواہ گورے ہوں یا کالے) کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت والا کی تقریر کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ

"پادریوں کی یہ حالت کہ ششدر و بے حس و حرکت" ص۲۸ میلہ

یا خاص پادری نولس صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قصہ کوتاہ مولوی محمد قاسم صاحب کی خوش بیانی اور پادری صاحب کی افسردگی قابل دید تھی" ص۳۵ میلہ خدا شناسی

اور اس کا تجربہ تو عموماً کیا گیا کہ اختتام وقت کو بہانہ بنا کر عموماً اکثر تقریروں میں پادریوں نے کوشش کی، کہ جس طرح ممکن ہو، سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کو مکمل ہونے نہ دیا جائے۔ پادری نولس نے تو یہ حد کر دی کہ پہلے میلے کے پہلے اجلاس ہی میں آپ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر وہ اس دیدہ دلیری پر اتر آیا کہ دوسرے دن کا اجلاس جب شروع ہوا اور سیدنا الامام الکبیر نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ

"پادری صاحب کے ذمہ ہمارے کل کے اعتراض باقی ہیں، بغرض اتمام کلام ان کا جواب اول چاہیئے"

تو انتہائی بے شرمی سے کام لیتے ہوئے، بغیر کسی حجاب کے لکھا ہے کہ پادری نولس نے جواب میں کہا کہ

"کل کی بات کل کے ساتھ گئی" ص۳۶

پادری صاحب کی اس سینہ زوری کہئے، یا منہ زوری پر لکھا ہے کہ مسلمانوں میں کافی برہمی پیدا ہو گئی تھی،

---

[1] اسی پادری نے یہ بھی اسی موقع پر کہا تھا کہ تقدیر کے مسئلے کو پادری چھیڑتے ہیں جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں رہتی، پادری نولس نے لاچار ہو کر یہ باتیں شروع کی تھیں، کہتا تھا کہ پر اس شخص (یعنی سیدنا الامام الکبیر) نے ایسا ان سب کو اڑایا کہ پتہ نہ لگنے دیا۔ ۱۲

لیکن سیدنا الامام الکبیر نے مجمع کو تھاما' اور اعلان کیا کہ

"صاحبو! کل کے ہمارے اعتراضوں کا جواب پادری صاحب عنایت نہیں فرماتے ہم کو پادری صاحب کے انصاف سے یہ توقع نہ تھی مگر جب نہیں مانتے تو کیا کیجئے بمجبوری ہم صبر کرتے ہیں' اور تازہ گفتگو کی اجازت دیتے ہیں۔" ملا میلہ خدا شناسی

بجائے مباحثہ و مناظرہ کے میلہ کو حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا جائے سیدنا الامام الکبیر کے اس نقطۂ نظر کی تائید آپ کے اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے۔

اس طرح دوسرے میلے کے موقعہ پر بھی حالانکہ حضرت والا کی طرف سے کہنے والوں نے لاکھ کہا کہ

"دو چار منٹ چار بجنے میں باقی ہیں' ان ہی میں ہم کچھ کہہ لیں گے"

مگر بیان کیا ہے کہ

"پادریوں نے ایک نہ سنی"

اور جلسہ سے اٹھ کر جانے لگے' اور اس بے ترتیبی سے اٹھ کر بھاگے' کہ بقول صاحب روداد

"سراسیمگی اور پریشانی میں جو رنج پنہانی کے باعث پادریوں کو لاحق تھی' پادری نوٹ اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے' ان کے اٹھانے کا بھی ان کو ہوش نہ رہا" ملا مباحثہ

اسی موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر نے جب اعلان کیا کہ پادری نہیں ٹھہرتے ہیں' تو نہ ٹھہریں۔ ہم اپنی طرف سے بیان کئے دیتے ہیں' تو اپنی تہذیب کا یہ نمونہ پادریوں نے پیش کیا کہ

"بغرض برہمی جلسہ شور کرنا شروع کر دیا" ملا

بہر حال عیسائیوں کا جو عنصر میلہ میں شریک تھا' اس پر تو سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا جو اثر مرتب ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ مذکورہ بالا تمثیلی واقعات سے ہو سکتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں جیسے پادری تھے' ظاہر ہے کہ یہی حیثیت ہندوؤں کی بھی اس مذہبی میلہ میں تھی' بلکہ آپ سن چکے کہ بہ تدریج مسلمانوں سے الگ ہوتے ہوئے ہندو دھرم کے نمائندوں کا

یہ طبقہ تقریباً عیسائیوں ہی میں مدغم و مندمج ہو چکا تھا۔ لیکن عام ہندوؤں کے تاثرات آپ کی تقریروں سے عیسائیوں کے تاثرات و احساسات سے اس درجہ مختلف ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی کمان سے جو تیر نکل رہے تھے، دو مخالف طبقات میں ان ہی کے تاثیری نتائج میں اختلاف اور اتنا شدید اختلاف کیسے پیدا ہو گیا تھا۔

سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا جو رنگ تھا، اسے بھی دیکھ چکے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں عیسائیوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی دل دہی، یا جانب داری کی کوشش کی جاتی تھی، تقریروں کا خلاصہ ان رودادوں میں آج بھی موجود ہے، جو بھی ان کو پڑھے گا، وہ اسی نتیجہ تک پہنچے گا، اور یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اس قسم کی وقتی سخن سازیوں سے سیدنا الامام الکبیر کی تقریریں قطعاً منزہ اور پاک ہیں۔ اعتراضات آپ نے کئے، تو دونوں ہی پر کئے، اور ترجیحی پہلوؤں کی طرف جو اشارے آپ کی تقریروں میں کئے گئے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی کسی ایک فرقہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ جس مذہب میں اس نوعیت کی جو چیز پائی جاتی ہے۔ جہاں جہاں اس کے ذکر کا موقعہ ملا ہے، انتہائی فراخ چشمیوں کے ساتھ ان کا اقرار کیا گیا ہے۔ نمونہ کی مثالیں پیش بھی کر چکا ہوں۔

میلہ میں شریک ہونے والے عام ہندوؤں کے ان عجیب و غریب تاثرات کی تفصیل تو آگے آ رہی ہے، مگر ان کے ذکر سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ دو مختلف مذاہب کے ماننے والے فرقوں کے تاثر پذیری کے اس اختلاف کی آخر توجیہ کیا کی جائے، خود ان تقریروں اور جو کچھ ان تقریروں میں بیان کیا جاتا تھا، اس میں تو اثر پذیریوں کے اس اختلاف کا سراغ نہیں ملتا، پھر کیا سمجھا جائے؟

کیا حضرت والا کے باطنی تصرفات کا نتیجہ اس کو قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں جن معلومات کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ توجیہ بھی ناقابل لحاظ نہیں ٹھیرائی جا سکتی۔ اپنے وقت میں باطنی تصرفات و کرامات کی مرکزی ہستی حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت جس کے متعلق یہ ہو کہ ولایت کی باطنی نعمت سے نوجوانی ہی میں

سرفراز ہو چکے تھے۔ اسی سے اس باطنی نعمت کے ثمرات و آثار کا ظہور آخر محل تعجب کیوں ہو۔ صحیح طور پر تو یاد نہیں رہا کہ براہ راست حضرت شیخ الہند سے خاکسار نے سنا تھا یا بالواسطہ یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ ایک خاص موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کو خدا شناسی کے میلے کی ان ہی تقریروں میں سے کسی تقریر میں اپنے قلب کے اس لاہوتی رخ سے کام لینا پڑا تھا[۱]۔ بلکہ ان ہی روداروں میں

[۱] جہاں تک یاد پڑتا ہے، واقعہ کی نوعیت یہ بیان کی گئی تھی، کہ بے بس ہو کر پادری نولس نے تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا اور کہنے لگے کہ تقدیر کی تعلیم دینے کی وجہ سے اسلام اپنی افادیت کو کھو چکا ہے، جو کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ بندہ اسی کے کرنے پر جب مجبور ہیں، تو دین کی تبلیغ و تکلیف کا فائدہ ہی کیا باقی رہا، پہلے سال کی روداد میں اس کا تذکرہ کیا بھی گیا ہو شاید کسی موقعہ پر خود میں نے بھی اس کی طرف کہیں اشارہ کیا ہے، لکھا ہے کہ نولس صاحب نے جب تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑا، تو سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ پادری صاحبوں کا دستور ہے کہ جب کچھ بن نہیں پڑتی تو مسئلہ تقدیر کو لے بیٹھتے ہیں یہ آخری چال اور آخری تدبیر ان صاحبوں کی ہوتی ہے، پادری صاحب کی مغلوبیت کی یہ نشانی ہے جو اس مسئلہ کی نوبت آئی۔ اسی کے بعد آپ نے کہا کہ مگر بنام خدا ہم بھی انشاء اللہ اس کا جواب شافی دیتے ہیں" ملکا صاحب روداد نے آپ کی اس تقریر کو نقل بھی کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند سے جو روایت اس باب میں مجھ تک پہنچی ہے وہ یہی ہے کہ ہم جواب شافی دیتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ جب حضرت الاستاذ نے تقریر شروع کی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک گرہ مسئلہ کی کھلتی چلی جاتی ہے ایک لاینحل عقدہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ خواص ہی نہیں، جلسہ میں عوام کا جو مجمع تھا، ہر ایک مطمئن نظر آتا تھا۔ اختتام جلسہ کے بعد میں نے اور مولوی احمد حسن امروہوی نے آپس میں کہا کہ آج حضرت نے عجیب و غریب تقریر کی ہے اس کو فوراً قلم بند کر لینا چاہئے، جب ہم دونوں قلم بند کرنے کے لئے بیٹھے اور آپس میں گفتگو ہونے لگی، تو پتہ چلا کہ بعض پہلو اس تقریر کے بعد بھی ہم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ حضرت الاستاذ کا اس کا ذکر ہم لوگوں نے کیا اور عرض کیا کہ جلسہ میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی اس مسئلہ کے متعلق باقی نہ رہی، مگر بحث کے بعد بعض الجھنیں نظر آتی ہیں کہ ہنوز باقی ہیں۔ اس پر کہتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ تقریریں عام طور پر یہی کیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی سمجھ پر وہ منطبق ہو، لیکن بضرورت کبھی یہ بھی کر لیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی سمجھ ہی کو تقریر کے مطابق بنا لیا جاتا ہے، گویا اشارہ کیا گیا کہ جلسہ میں شاید اسی قسم کے تصرف سے کام لیا گیا تھا، اسی سلسلہ میں مولوی حبیب الرحمن صاحب جس کا اسی روداد میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ اختتام جلسہ کے بعد ایک صاحب جو مرزا موحد کے نام سے مشہور تھے وہ پادری نولس کے خیمہ میں پہنچے۔ شاید پہلے سے دونوں میں جان پہچان تھی، کیونکہ مرزا صاحب رد نصاریٰ کی مہم کے سر گرم داعیوں میں تھے۔ بہر حال پادری نولس سے مرزا صاحب نے کہا کہ "تقدیر کا ثبوت تو توراۃ میں موجود ہے، پھر آپ نے اسلام ہی کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کر کے کیوں اعتراض کیا" نولس صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں دو فرقے ہیں، میرا تعلق عیسائیوں کے اس فرقہ سے ہے جو تقدیر کا منکر ہے مگر مرزا موحد کے سوا ظاہر ہے کہ دوسرا کیا تھا، اور ایک توراۃ کیا خدا کا اعتقاد جس مذہب میں بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

شاہ جہاں پور کے تصنیف صاحب کا جو قصہ نقل کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم منصف صاحب مسلمان تھے، یا ہندو۔ میلے کے کسی جلسہ میں وہ بھی آکر شریک ہوئے۔ اتفاقاً اس وقت گفتگو انجیل کے اسی فقرے کے متعلق ہو رہی تھی، جس میں مسلمانوں کے مولوی تو مدعی تھے کہ یہ جعلی فقرہ ہے، بعد کو بڑھا دیا گیا ہے۔ ثبوت میں وہ خود انجیل کے اس مطبوعہ نسخہ کو پیش کر رہے تھے، جس کے حاشیہ میں چھاپنے والے پادریوں کی طرف سے لکھ دیا گیا تھا کہ

"یہ الفاظ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پائے جاتے"

خود پادری نولس صاحب نے بھی اقرار کر لیا تھا کہ

"بیشک یہ فقرہ زائد ہے، اور جو کچھ پادریان مرزاپور نے حاشیہ پر لکھا صحیح و درست ہے" ص۲۲ مباحثہ شاہ جہاں پور

اسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، ایسا وثیقہ جس میں جعلی فقرہ ثابت ہو جائے کہ باہر سے ملا دیا گیا ہے بطور مثال کے اسی کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر فرما رہے تھے کہ تماشا ہے کہ مقدمات دنیاوی میں تو ایسی دستاویزیں قابل اعتبار نہ رہیں، حالانکہ متاع دنیا اہل عقل کے نزدیک

"چنداں قابل اہتمام نہیں، اور مقدمۂ دینی میں ایسی دستاویز مخدوش لائق اعتبار ہو جائے" ص۲۲

لکھا ہے کہ یہ فقرہ زبان مبارک سے جس وقت نکل رہا تھا، تو دیکھا گیا کہ ہزاروں انسانوں کے اس مجمع میں منصف صاحب جو بیٹھے ہوئے تھے سیدنا الامام الکبیر ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، پادری نولس کو خطاب کر کے فرما رہے ہیں کہ

"اس مقدمہ میں ہمارے آپ کے حکم منصف صاحب ہی رہے، اور ان کے مقدمات اور جھگڑے بھی یہی فیصل کرتے ہیں"

صرف یہی نہیں بلکہ براہ راست منصف صاحب کی طرف رخ کر کے یہ بھی ارشاد فرمایا جا رہا تھا کہ

بلکہ نسخہ موجودہ پایا جاتا ہے کسی رنگ میں مسئلہ تقدیر کا ماننا اس کے لئے ناگزیر ہے، ملا التفصیل فی المطولات ۱۲

"کیوں منصف صاحب آپ ہی فرمائیں۔ اگر کوئی دستاویز جعلی آپ کے یہاں آئے، اور اس کا جعل کھل جائے، خود مدعی اقرار جعل کرے یا اور کسی طریقہ سے اس کا جعلی ہونا ثابت ہو جائے تو قانون سرکاری اس کی نسبت کیا ہے اور آپ اس مقدمہ میں کیا فیصلہ فرمائینگے؟"

غریب منصف حیران تھا کہ اس سارے مجمع میں کسی سابقہ معرفت کے بغیر میری منصفی اور میری شخصیت کا علم ان صاحب کو کیسے ہو گیا۔ لکھا ہے، کہ واپسی کے بعد شاہ جہاں پور پہنچ کر منصف صاحب لوگوں سے کہتے تھے، کہ

"میں ان کو (سیدنا الامام الکبیر کو) نہیں جانتا تھا، اور وہ مجھ کو نہیں جانتے تھے۔ خدا جانے انہوں نے مجھ کو کاہے سے پہچان لیا جو بار بار میری طرف مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ منصف صاحب آپ ہمارے حکم ہیں، آپ اوروں کے مقدمے فیصل کرتے ہیں، ہمارا مقدمہ بھی آپ ہی فیصل کیجئے۔" ص۴۲

بچھرایوں والے مولانا محمد علی صاحب سے بھی منصف صاحب کی جب ملاقات ہوئی، تو ان سے بھی اپنے تعجب کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

"مجھ کو بڑا تعجب ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اور میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، پھر نہ معلوم انہوں نے کس طرح مجھ کو پہچان لیا۔" ص۴ مباحثہ شاہجہانپور

بہر حال نہیں کہا جا سکتا کہ یہ منصف صاحب ہندو تھے یا مسلمان، لیکن منطق کی کتاب کے مصنف پانسو روپے انعام پانے والے پادری اسکاٹ صاحب تو قطعاً مسلمان نہ تھے۔ عیسائی، اور عیسائیوں کے پادری تھے، حضرت والا کی تقریروں سے متاثر ہو کر ایک دفعہ نہیں، بلکہ روداد سے معلوم ہوتا ہے، کہ بار بار مختلف موقعوں پر کہتے پھرتے تھے کہ

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) مولوی نہیں صوفی مولوی ہیں۔" ص۴۳

سمجھا جائے، تو ان الفاظ میں گویا حضرت والا کے اسی باطنی پہلو کا اعتراف پوشیدہ نظر آتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ مٹاتے ہوئے جس نے اپنے آپ کو اس حد تک مٹا دیا ہو، کہ تقریر سے پہلے اپنے آپ کو ان

الفاظ میں روشناس کرا رہا ہو کہ

"میری خستہ حالی پر نظر کیجئے، اس سے بھی کیا کم کہ مجھ کو بھی بمنزلہ ایک بھنگی سمجھئے"

اور کہہ رہا ہو کہ

"شادی کرنے والے کا بھنگی ہونا احکام دنیا کے احکام کے قبول کرنے اور تسلیم کرنے میں مانع نہیں، اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ سنانے والا بھنگی ہے، غریب ہے یا امیر، عام لوگ ہوں یا نواب، بھنگی کی زبان سے احکام پادشاہی سن کر سر نیاز خم کرتے ہیں" مذاکرہ مباحثہ

ذات و صفات کے اختیار میں جس کی کوشش اس نوبت تک پہنچ چکی ہو، کہ پادری نولس جو حضرت کے علم و بیان سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا، مداح تھا، اس نے جب آپ سے آپ کا نام و نشان دریافت کیا تو لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہی بتایا گیا کہ خورشید حسین نام ہے ضلع سہارنپور کا رہنے والا ہوں میلہ خدا شناسی جو نہیں جانتے ہیں، ان سے کیا کہئے! لیکن راہ کے چلنے والے تو یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ جو واقعی "عبداللہ" بن جاتا ہے، دیکھا یہی گیا ہے کہ "گفتۂ او گفتۂ اللہ" اس کے لئے اجر نقد بنا ہوا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ بد اعتقادی کے اس زمانہ میں اس کو خواہ مخواہ خوش اعتقادی قرار دینے پر اگر اصرار کیا جائے، تو یوں بھی ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو جوگویا تاریخ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں "مذہبی مباحثہ کے لئے پہلی دفعہ خدا شناسی کے اس میلہ میں لاکر کھڑے کئے گئے تھے۔ پہلے سے خاص اغراض اس میلے کے پیچھے مان بھی لیا جائے کہ پوشیدہ نہ ہوں۔ پھر بھی عام حالات میں ہندو مذہب، اور ہندوؤں کے پیشواؤں کے متعلق جن خیالات کے اظہار کی توقع مسلمانوں کے عام مولویوں سے پادریوں کا طبقہ کر سکتا تھا، اور واقعہ یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے روک دیئے جانے میں اگر خدا نخواستہ کامیابی ہو جاتی، اور اس میلے میں مولوی جیسے کالے پادری ادھی جس نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں اپنی یاوہ گوئیوں، اور ہرزہ سرائیوں سے مسلمانوں کے قلوب کو خواہ مخواہ اذیت پہنچائی تھی کچھ اسی طرح کے ہلکے پھلکے، خام کار، ناتجربہ کار مولوی ادھر ادھر سے اکٹھے ہو جاتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان سے پادریوں کی امید پوری نہ ہوتی خصوصاً ایک ایسے زمانے میں جب پنڈت دیانند سرسوتی کے طرز عمل سے

زمین بھی تیار ہو چکی تھی، اور عرض کر چکا ہوں کہ نئی قائم ہونے والی حکومت کے بعد کتابیں بھی ہندو مذہب کی تنقید و اعتراض کے متعلق شائع ہو چکی تھیں، اور شمال و جنوب دونوں علاقوں میں مسلمانوں میں بولی جانے والی زبانوں میں کسی شیخ سلیم نامی صاحب کی "کتھا سلونی" یعنی ع کہو یہ کون دھرم ہے، ترجیع بند والی نظم اور دکنی زبان میں صفدر تخلص رکھنے والے کسی گمنام شاعر والی مسدس جس میں ٹیپ کا شعر ے

یاد ہووے گر تمہیں ہم کو بتاؤ برہمن

کاہے کو پوجتے ہو ناحق پوجتی پتھر تمن

عام طور پر ملک کے طول و عرض میں پھیلائی جا چکی تھی، چاہئے تو کہہ سکتے ہیں، کہ کافی ہتھیار مسلمانوں میں گویا تقسیم ہو چکے تھے۔ ان حالات میں کیسے کہا جا سکتا ہے، ان بانٹے ہوئے ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت خداشناسی کے اس میلے میں نہ آتی۔ آخر مولا داد پادری مسلمانوں کو جب وہ سب کچھ سنا سکتا تھا، جو اس نے سنایا، تو ان مولویوں کو بھی کون روک سکتا تھا، اگر ہندوؤں کو وہی سب کچھ سنانے لگتے، جس کے سنانے کی توقع پادری کر سکتے تھے۔

اب یہ خدا کی طرف سے بات تھی، کہ روکنے کی تدبیروں کے باوجود سیدنا الامام الکبیر رک نہ سکے، اور ایک ہی میلے میں نہیں، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں بھی عملاً آپ شریک ہوئے، شریک ہوئے کیا معنی؟ سچی بات تو یہ ہے، کہ اول سے آخر تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا میلہ ہو، یا دوسرا، گویا سمجھنا چاہئے، دونوں ہی میں آپ ہی آپ تھے، جو کچھ کہا، آپ ہی نے کہا، اور جو کچھ کیا، آپ ہی نے کیا، اس سلسلہ میں اور جو کچھ آپ نے کہا سنا، وہ تو خیر بجائے خود ہے، خاص کر ہندوؤں کے دین، اور دینی پیشواؤں کے ذکر کے جو مواقع پیش آئے، ان میں خود سوچنا چاہئے، اپنے اس کلی عقیدے کو پیش کرتے ہوئے کہ

"ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اور ادیان و مذاہب اصل سے غلط ہیں، دین آسمانی نہیں ہیں"

جو یہ اعلان کر رہا ہو کہ

"دین ہنود اس کی نسبت اگرچہ ہم یقیناً نہیں کہہ سکتے، کہ اصل سے یہ دین بھی آسمانی ہے"

لیکن جیسے یقیناً نہیں کہہ سکتے، ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا، کہ

"مگر یقیناً یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین اصل سے جعلی ہے۔ خدا کی طرف سے نہیں آیا۔"

اسی کے بعد ان قرآنی شواہد کو پیش کرتے ہوئے، جن میں اطلاع دی گئی ہے کہ خدائی نمائندوں سے کسی قوم و ملت کو ان کے پیدا کرنے والے نے محروم نہیں رکھا، بھرے مجمع میں یہ کہہ رہا ہو کہ

"پھر یہ کیوں کر کہہ دیجئے کہ اس ولایت ہندوستان میں جو ایک عریض و طویل ولایت ہے کوئی ہادی نہ پہنچا۔"

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ اضافہ

"کیا عجب ہے کہ جس کو ہندو صاحب اوتار کہتے ہیں، اپنے زمانہ کے نبی یا ولی یا نائب نبی ہوں۔"

اور اسی کے ساتھ قرآنی آیت جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن میں بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ایسے بھی انبیاء و رسل ہیں جن کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے یعنی منهم من قصصنا علیك ومنهم من لم نقصص علیك کو تلاوت کر کے اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ فرما رہا ہو کہ

"کیا عجب ہے کہ انبیاء ہندوستان بھی ان ہی نبیوں میں سے ہوں، جن کا تذکرہ آپ سے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) نہیں کیا گیا۔"

پھر یہی نہیں، بلکہ جیسے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقدیس و تنزیہ کی ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد کی گئی، غلط عیسائیت یا کرسچانیٹی کی بدولت، یا غلط یہودیت کی راہ سے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ایسی باتیں جو منسوب ہو گئی ہیں جن کا انتساب ان کی برگزیدہ ذات کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، ان آلودگیوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کو پاک کر کے دنیا میں پیش کرنا، یہ مسلمانوں کا دینی فرض ہے، ٹھیک اسی طرح ہندو مذہب کے جن پیشواؤں کی طرف ناسزا باتیں منسوب ہو گئی ہیں، ان سے تزکیہ و تطہیر کے فرض کو بہی خواہی اور احترامی جذبات کے ساتھ ان الفاظ میں ادا کر رہا ہو کہ

"جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دعویٰ خدائی نصاریٰ نے منسوب کر دیا ہے، اور دلائل عقلی و نقلی اس کے مخالف ہیں، ایسے ہی کیا عجب ہے کہ سری کرشن اور سری رام چندر کی طرف بھی یہ دعویٰ

(خدائی وغیرہ کا) بدروغ منسوب کردیا گیا ہو"

اور جیسے بنی اسرائیل کے بعض انبیاء حضرت داؤد وحضرت لوط علیہما السلام کی طرف یہود نے ناگفتہ بہ باتیں منسوب کی ہیں لیکن ان سے ان بزرگوں کا تبریہ، وتنزیہ مسلمانوں کا دینی عقیدہ ہے، اسی طرح ہندو مذہب کے جن پیشواؤں کی طرف منسوب کرنے والوں نے کچھ اسی قسم کی نکوہیدہ، ناگفتہ باتیں منسوب کردی ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے، جو عیسائی پادریوں کو یہ سنا رہا ہو کر

"کیا عجب ہے کہ سری کرشن وسری رام چندر بھی ان عیوب مذکورہ سے مبرا ہوں، اوروں نے ان کے ذمے یہ تہمت (زنا وسرقہ) لگا دی ہو" مالک مباحثہ

آج سننے والے سیدنا الامام الکبیر کی ان تقریروں کے نہیں ہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ ان مواقع پر آپ نے فرمایا تھا، بجنسہ اس کے قلم بند کرنے میں روداد کے مرتب کرنے والے کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ اس باب میں جو کچھ بھی فرمایا جا رہا تھا، کسی وقتی مصلحت کے زیر اثر نہیں کیا جا رہا تھا کیونکہ واقعات اور جو کچھ ان میلوں میں گذرا ان کو ایک خاص نقطۂ نظر سے مرتب ومربوط کرنے کے بعد آج خواہ جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہوں، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ ایسی کوئی شہادت میرے پاس نہیں جس کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ پورے طور پر نہ سہی کسی نہ کسی حد تک سیدنا الامام الکبیر کو بھی خدا شناسی کے ان میلوں کے عقبی محرکات کا جن کا سراغ آج مل رہا ہے اندازہ ہو گیا تھا، بلکہ جہاں تک قرائن اور حالات کا تقاضا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان سے آپ قطعاً خالی الذہن تھے، ماسوا اس کے کچھ اسی میلے کی تقریروں ہی کی حد تک آپ کے مذکورہ بالا خیالات محدود نہیں ہیں۔ آپ کی دوسری کتابوں میں بھی یہی باتیں مختلف تعبیروں میں مل رہی ہیں۔ وہی کتاب جس کا نام "جواب ترکی بہ ترکی" ہے، مختلف حوالے اس کتاب کے گذر چکے بھی ہیں۔ اس کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا تو یہی ہے کہ حضرت والا کے تلمیذ سید مولانا عبدالعلی صاحب کی تصنیف ہے لیکن عموماً مشہور یہی ہے اور مصنف امام نے اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) نے کچھ بیان فرمایا، اور کچھ تحریر شروع کی، جس کو مولوی

عبدالعلی صاحب نے بطرز جواب لکھا اور نام "جواب ترکی بہ ترکی" رکھا ہے ص۳۷

مطلب جس کا یہی ہے کہ ترتیباً نہ سہی لیکن مضموناً یہ کتاب درحقیقت تو حضرت والا ہی کی ہے خود اسی کتاب

میں یہ عبارت جو پائی جاتی ہے یعنی

"مزید تحقیق کو مکتوب دوم نمبراول قاسم العلوم پر حوالہ کرکے یہ عرض کرتا ہوں ص۲۹ جواب

ترکی بہ ترکی

جو جانتے ہیں کہ "قاسم العلوم" حضرت والا کے چند خاص مکاتیب اور مقالات کے مجموعہ کا نام ہے،

وہ اگر یہ سمجھیں کہ قاسم العلوم ہی کے مصنف کے قلم یا زبان سے یہ نکلا ہوا فقرہ ہے، تو ایسا باور کرانے کی

یہ کافی وجہ ہے کچھ بھی ہو، آتنا بہرحال اب بھی کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا ہے کہ

"بایما حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین جناب مولٰنا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند

لکھے گئے"

نظر بوجوہ بالا اتنی بات مسلم ہے، کہ کتاب کسی نے لکھی ہو، لیکن اصل مضامین کی حد تک اس کتاب میں جو کچھ

ہے، وہ سب حضرت والا ہی کے براہ راست مصدقہ افکار و مسلمات ہیں۔ اسی کی تعبیر ان الفاظ میں فرماتے

ہوئے کہ

"ہم نے اب تک نہ وید کو برا کہا ہے، نہ پیشوایان دین ہنود کو برا کہا ہے، اور برا کہیں تو کیوں کہیں" ص۱۴

آگے جو یہ ارشاد ہوا ہے، کہ ہندو دھرم کے

"پیشواؤں کو برا کہئے تو ان کا کیا قصور"

یہ کتنی معقول اور انصاف کی بات ہے۔ فرض کیجئے کہ موجودہ نسلوں سے ان کی مسلمانوں کو تکلیف واذیت

بھی پہنچے، لیکن اس میں ان کے گذشتہ پیشواؤں اور بزرگوں کا کیا قصور ہے، کہ موجودہ نسلوں کے اعمال

کا بدلہ گذرے ہوئے بے قصور لوگوں سے لیا جائے۔ کاش دوسری قومیں بھی انصاف و عدل کے اس

نظریہ کی رعایت کریں، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے ان کو کوئی شکایت پیدا ہو تو وہ بھی اپنی یہ فرد ذوی

کو محسوس کریں کہ مسلمانوں کے بزرگوں یا ان کی قبروں سے، ان کے مآثر سے انتقام لینے کا بھلا کیا مطلب

ہو سکتا ہے، چوٹ آپ کو پہاڑ سے اگر لگی ہے، تو گھر کی سل سے اس کا بدلہ لینا خود ہی سوچئے کہاں تک انصاف کا، عقل کا، انسانیت کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ اسی مقام میں نہیں، بلکہ اسی کتاب کے ابتدائی اوراق میں بھی اسی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، منشی اندلال کو جنکے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، سمجھایا گیا ہے کہ

"تمہارے بڑوں کو سنائیں، تو ان بے چاروں کا کیا قصور" ص۵

اور ٹھیک جیسے میلہ کے جلسوں میں سری کرشن، اور سری رام چندر جی کے متعلق آپ نے فرمایا تھا، اسی کتاب میں بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"پھر یہ بھی خیال کر شاید اپنے زمانہ کے بزرگ ہوں، اور جو حرکات ناشائستہ ان کی طرف منسوب ہیں، عجب نہیں غلطی تاریخ کی ہو"

صرف پیشواؤں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ ہندو دھرم کی اساسی کتاب وید کا تذکرہ کر کے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"ویدوں کو برا کہئے، تو کیا ضرورت، اور پھر یہ احتمال کہ شاید کوئی مضمون الہامی ہو، اور شرک وغیرہ امور باطلہ کی تعلیم جو اس میں درج ہے کیا عجب ہے، از قسم تحریف ہو" ص۶

بہر حال ہندوؤں کے دینی پیشواؤں، اور ان کی دینی کتاب وید کے متعلق جس کے عام احساسات کی نوعیت یہ ہو، سوچا جا سکتا ہے کہ اسی نے جس وقت میلے میں اپنے ان احساسات کو جو کم از کم پادریوں کی توقعات کے بھی قطعاً خلاف تھے آخر جس زمانہ میں یہ پھیلایا جا رہا تھا کہ ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ جس زبان میں ہندوؤں کا مذہب ہے یعنی سنسکرت، مسلمانوں کو اس زبان سے ابدی نفرت رہی ہے، یا اور اسی قسم کی غلط فہمیوں سے لبریز معمور ماحول میں اچانک مسلمانوں کے ایک مسلم الثبوت عالم باعمل کی زبان مبارک سے مذکورہ فقرے نکل نکل کر کانوں سے جس وقت ٹکرا رہے ہوں گے، تو وقتی مصلحت کے تقاضوں کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہی واقعی آپ کے خیالات و احساسات تھے، قدرتاً لب ولہجہ کا جو رنگ، اور بیان میں زور و قوت کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،

ایسی صورت میں نہ پادریوں کے چہروں کی افسردگی، و خستگی ہی محل تعجب ہو سکتی ہے، نہ میلے میں عام ہندو

جو شریک تھے، ان میں اس کے برعکس آثار کا مشاہدہ اگر کیا گیا تھا تو بھی کیا یہ کوئی اچنبھے کی بات ہو سکتی ہے؟ بلکہ اسی کے ساتھ انصاف کی بات یہی ہے کہ گو خدا شناسی کے ان دونوں میلوں میں ہندوؤں یا ہندو مذہب کے نمائندے پنڈتوں کی طرف سے بعض اشتعال انگیز اقدامات ضرور ہوئے۔ پادریوں کے ساتھ بتدریج ان کا مل جانا، ملجا تا کیا معنی؟ ان ہی میں مدغم ہو کر کھپ جانا، ہندوؤں کے متعدد فرقوں کا نام لے کر ہر فرقہ کی طرف سے نمائندگی کا مطالبہ پیش کر کے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش، رائے دہی کے مواقع میں عموماً پادریوں ہی کے ساتھ ان کا ہاتھ اٹھانا، یہ اور اسی قسم کے کام قوان کی طرف سے بھی ایسے کئے جا رہے تھے جن سے مقابل پارٹی کے نمائندے مشتعل ہو سکتے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر نے منشی پیارے لال سے بطور شکایت کے کہا بھی تھا کہ پادریوں ہی کی طرف آپ لوگ ڈھل جاتے ہیں، ہندوؤں کے نمائندے جو کچھ کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آخر جلسہ کے مہتمم موتی میاں صاحب سے بھی نہ رہا گیا تھا اور ترش رو ہو کر بول اٹھے تھے کہ

"پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ بات سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔" ملٹ

کوئی شبہ نہیں کہ تنگ ظرفی اور تنگ نظری چاہتی تو اسی ترش روئی کو بڑھاتے ہوئے نفرت اور دشمنی و عداوت تک پہنچا سکتی تھی، لیکن پہلی بات تو یہی تھی کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا ہندو مذہب کے نمائندوں کی طرف سے ہو رہا تھا، لیکن میلے میں عام ہندو جو شریک تھے، ان بے چاروں کا اس سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، پھر ان پنڈتوں یعنی ہندو مذہب کے وکلاء کی طرف سے کرنے کی حد تک جو کچھ کیا گیا ہو، لیکن انہوں نے جو کچھ کہا، تقریر کی، یا تحریر پڑھی، اس میں ایسی بات شاید نہیں کہی گئی، جس سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہوتی، اب خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ واقع میں ان کی تقریروں اور تحریروں میں ایسی کوئی چیز تھی ہی نہیں، یا سنسکرت آمیز بھاشا والی زبان جو وہ استعمال کر رہے تھے، وہ پردہ پوش بن گئی۔

مگر برخلاف اس کے عیسائیوں کی طرف سے اول سے آخر تک وہی کیا گیا، اور وہی کہا گیا، جس سے نفرت و حقارت کی آگ قدرتاً مسلمانوں میں بھڑکتی رہی۔ ان کی سینہ زوریاں ہر ہر قدم پر اپنی برتری کا

اظہار اپنے قابوچی بننے پر اصرار، اپنی منہ زوریوں میں مسلمانوں کے پیغمبر ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک کے متعلق جب ان کی طرف سے گندگیاں اچھالی جا چکی تھیں، تو اس کے بعد بات ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سوچ سمجھ کر یہ کیا گیا تھا، لیکن حالات کے قدرتی نتائج کا ظہور اگر اس شکل میں ہوا کہ گو مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی طرح ہندو بھی اس میلے میں کھڑے ہوئے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے سب کچھ کرنے والے اور سب کچھ کہنے والے سیدنا الامام الکبیر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ عیسائیوں ہی کو اپنا مد مقابل بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے اساسی کلیات کی تشریح کرتے ہوئے جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے، وہاں آپ نے ہندو مذہب کے بعض عقائد کا بھی تمثیلاً ذکر کیا ہے۔ لیکن باایں ہمہ دونوں سالوں کے میلوں میں حقیقی نشانہ آپ کی تقریروں کا عیسائی ہی نظر آتے ہیں۔ یاد ہو گا کہ پہلے سال کے میلے کا پہلا دن جب ختم ہوا اور مولویوں کو آپ نے میلے میں گھوم گھوم کر تبلیغ کا حکم دیا، تو لکھا ہے، میں نے شاید پہلے بھی نقل کیا ہے۔ کہ

"چنانچہ واعظین (اسلام) نے جا کر علی الاعلان منادی اسلام و ابطال عیسائیت کو بیان کرنا شروع کیا۔" ص۲۱

ابطال کے کام کو عیسائیت ہی کی حد تک کیوں محدود رکھا گیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ ہندوؤں کی طرف رخ مولویوں کی تقریروں کا نہ تھا۔ نیز اس قسم کے واقعات جن کا تذکرہ ان روداوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً محی الدین لپشاوری نامی ایک کالے پادری نے کسی ریاض الدین نامی شخص کی کتاب کا حوالہ پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح میں الوہیت کی شان پائی جاتی تھی، یہی اسلامی عقیدہ ہے، ریاض الدین رومی نے یہی لکھا ہے، جو مسلمانوں کے معتبر پیشواؤں میں تھے، سیدنا الامام الکبیر نے اس کے جواب میں دوسری باتوں کے ساتھ اسی کالے پادری کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

"آپ بھی تو محی الدین لپشاوری ہیں، آپ کی شکل و صورت مسلمانوں کی سی ہے، نیچی ڈاڑھی کرتہ پہنے ہوئے ہیں، نام بھی مسلمانوں کا سا ہے۔" ص۴۲ مباحثہ

جس سے اس جھنجھلاہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، جو سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں پادریوں کے اقوال واعمال سے طبعًا پیدا ہوگئی تھی اور جیسا کہ کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکے کی تلاش کرنا ہے، ہم ان عیسائی پادریوں ہی کو پاتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا نشانہ وہ بھی اپنے آپ ہی کو قرار دیئے ہوئے تھے، ایک موقعہ پر اس کا تذکرہ فرماتے ہوئے، کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات پاک کو مخلوقات سے کیا نسبت ؟ جب دو مخلوقوں، بلکہ دو آدمیوں کا حال یہ ہے کہ پادری صاحب کو کوئی اگر چمار کہہ دے، تو آپے سے باہر ہوجائیں، حالانکہ پادری صاحب اور چمار میں کیا فرق ہے۔ یہ بھی مخلوق، وہ بھی مخلوق، وہ بھی انسان یہ بھی انسان، ان کے پاس بھی دو آنکھیں ایک ناک اور دو کان، تو اس کے پاس بھی یہی سب کچھ، حالانکہ یہ ایک بالکل برجستہ تمثیلی بات تھی، لیکن لکھا ہے کہ یہی کالے پادری صاحب محی الدین پشاوری کھڑے ہوکر سیدنا الامام الکبیر کو براہ راست مخاطب بناتے ہوئے چلانے لگے کہ

"آپ نے کل بھی بعض کلمات سخت کہے تھے۔ اور آج بھی اب آپ نے بعض کلمات سخت بیان کئے" ملفوظ مباحثہ

یعنی کل انجیل کے الحاقی فقرے کو نجاست سے تشبیہ دی، اور آج پادری کو چمار سے تشبیہ دی گئی، لکھا ہے کہ چیں بہ جبیں ہوکر اس نے سیدنا الامام الکبیر کو خطاب کرکے یہ بھی کہا کہ

"ہم تمہارے سن وسال کا لحاظ کرتے ہیں"

بہرحال عیسائی جیسی کہتے تھے، ان روداد وں سے معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ویسی نہیں، تو کچھ نہ کچھ اس جیسی بات کبھی کبھی ان کو سنا بھی دی جاتی تھی، لیکن اسی میدان مباحثہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں حالانکہ ہندو بھی صف آرا تھے، اور آپ دیکھ چکے کہ کرنے کی حد تک کافی اشتعال انگیز اقدامات ان کی طرف سے بھی مسلسل ہوتے رہے، لیکن ان کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کا رویہ اول سے آخر تک دونوں ہی میلوں میں، میلوں کے ہر اجلاس میں، اجلاسوں کے اندر بھی، اور ان سے باہر بھی کچھ ایسا رہا کہ شاید صلح وعفو، درگذر کے سوا، ہم آپ کے اس رویہ اور روش کو کوئی اور کچھ نہیں کہہ سکتے، کہنے والا چاہے، تو کہہ سکتا ہے، کہ ان دونوں متقابل فرقوں میں سے ایک کے ساتھ یعنی عیسائیوں کے ساتھ

آپ کا جو طرز عمل تھا، جیسے وہ قرآنی حکم

جزاء سیئة سیئة مثلها | برائی کا بدلا اسی جیسی برائی ہے۔

کی تمثیلی شکل تھی، اسی طرح قرآن میں اسی کے بعد قانون کے دوسرے پہلو کی طرف

فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللّٰہ | اور جو عفو وصلاح کی بات کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

کے الفاظ سے جو اشارہ کیا گیا ہے اس کا عملی تجربہ گویا اس سلوک سے کرایا جا رہا تھا، جو ہندوؤں کے ساتھ کر کے دکھایا جا رہا تھا، قرآنی قانون کے اسی دوسرے پہلو کا ثمرہ قرآن ہی میں جو یہ بتایا گیا ہے، یعنی اسی پہلو کی تعبیر

ادفع بالتی ھی احسن | سب سے زیادہ بھلے طریقے سے جواب دو

سے فرماتے ہوئے، اطلاع دی گئی ہے، کہ

فاذا الذی بینك وبینه عداوة کانه ولی حمیم	تو اچانک وہ کہ تم میں اور اس میں عداوت تھی مخلص دوست ہو جائے گا۔

گویا ذمہ داری لی گئی ہے کہ "مدافعت بالحسنیٰ" پر بہرحال یہی نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا، انسانی نفسیات کو ڈھالنے والے نے اسی سانچہ میں ڈھالا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر کے خطبات اور تقریروں کے تاثیری نتائج ان دونوں قوموں پر قطعاً متخالف رنگ میں اگر نمایاں ہو رہے تھے، تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کے سوا، دیکھنے والے اور دیکھتے کیا، دوسرے لفظوں میں چاہئے تو اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ خدا شناسی کے ان میلوں کو قائم کرنے والوں نے خواہ جس مقصد اور نیت سے قائم کیا ہو، لیکن سیدنا الامام الکبیر نے جیسا ان کو اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اسی طرح مذکورہ بالا قرآنی قانون کے ان دونوں پہلوؤں کی عملی تجربہ گاہوں کا قالب بھی ان ہی میلوں نے آپ کی بدولت اختیار کر لیا تھا۔ اب خواہ اسباب کچھ ہی ہوں، باطنی تصرفات کا نتیجہ سمجھا جائے، یا خلاف توقع ہندو دھرم اور ہندو دھرم کے پیشواؤں کے متعلق سیدنا الامام الکبیر نے اپنے جن احساسات کا اظہار فرمایا یا بجائے مجازاۃ بالمثل کے

ہندوؤں کے ساتھ "مدافعت بالحسنیٰ" کے قرآنی حکم کے تجربہ کا یہ اثر تھا 'یا واللہ اعلم بالصواب ان کے سوا کوئی اور بات ہو' مگر آنکھوں نے جو دیکھا تھا اور کانوں نے جو کچھ سنا تھا' ان رودادوں میں آپ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف جیسا کہ گذر چکا عیسائیوں کے متعلق تو عموماً یہی لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کے بعد ششدر و حیران' سراسیمہ و پریشان نظر آتے تھے' کالے پادری ہوں' یا گورے سب ہی پر افسردگی چھا جاتی تھی۔ عموماً غصہ میں بھرے ہوئے الفاظ ان کی زبانوں سے نکلتے تھے۔ چین بجبیں ہو کر گفتگو کرتے' کہنا کچھ چاہتے تھے' اور منہ سے کچھ نکلتا تھا' بعض دفعہ تو ایسی صورتیں بھی پیش آئیں' جیسا کہ لکھا ہے کہ کالا پادری محی الدین پشاوری جو کئی دفعہ اپنی بے محل گفتگو سے پادریوں کو رسوا کر چکا تھا' جب تقریر کرنے کیلئے اٹھا تو

"اور پادری ان کی طرف گھورنے لگے" ۳۵ مباحثہ

اسی سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی پیش آیا کہ امام فن مناظرہ مولوی ابوالمنصور نے باہم پادریوں کے اس رنگ کو دیکھ کر کہا کہ

"دیکھنا ان کو نہ کھڑا کرنا' نہیں تو پھر اسی طرح فضیحت کرائیں گے" مباحثہ

مرعوبیت کا حال یہ تھا کہ کالے تو کالے ایک یورپین نژاد گورے پادری جن کا نام جان ٹامسن صاحب تھا' لکھا ہے کہ بولنے کے لئے کھڑے ہوئے' مگر

"ایک دو لفظ کہنے پائے تھے کہ رہ گئے" ۳۸ مباحثہ

اور آگے کچھ بول نہ سکے' اپنی مغلوبیت کو محسوس کر کے شور اور ہنگامہ مچانے لگے' اور تو اور آخر میں تو پادری نولس تک کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا آخری سرمایہ بھی یہی رہ گیا تھا کہ

"چلا چلا کر اپنے مذہب کے فضائل بے دلیل بیان کرتے رہے" ۵۶ مباحثہ

بدحواسی میں اپنی کتابیں جلسہ میں چھوڑ کر بھاگے' مسئلہ تقدیر یا ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے گستاخانہ اشارے' اس قسم کی باتوں کو مذبوحی حرکات کے سوا اور کیا سمجھا جائے' مگر آئیے' اور دیکھئے ہندوؤں کا حال کیا تھا؟

ہندو مذہب کے نمائندے پنڈت دیانندیا منشی اندرمن کے ایسے اعترافات مثلاً رسالہ مباحثہ شاہ جہاں پور میں نقل کیا ہے کہ جلسہ برخاست ہونے کے بعد جب سیدنا الامام الکبیر اپنی فرودگاہ میں پہنچے، تو وہیں حاضر ہو کر

"موتی میاں، مولوی قاسم صاحب سے فرمانے لگے، کہ پنڈت دیانند سرستی اور منشی اندرمن آپ کی، اور مولوی منصور علی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے، اور دونوں صاحبان کی تقریر اور علم کے بہت مداح تھے۔" ص۵۵

اس کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے، کہ اس قسم کی منھ دیکھی تعریف تو پادری نولس وغیرہ نے بھی کی تھی مگر نولس صاحب کی تعریف تو واقعی سیدنا الامام الکبیر کے سامنے منھ پر کی گئی تھی، اور پنڈت جی یا منشی جی کی تعریف منھ پر نہ تھی، بلکہ پیٹھ پیچھے موتی میاں کے آگے کی گئی تھی

اسی طرح ایک موقع پر جب پنڈت جی کے سوال کا جو صحیح مطلب تھا، پادری اسکاٹ نہ سمجھ سکے اور پنڈت جی کے منشا کی وضاحت سیدنا الامام الکبیر نے فرمائی، تو منشی پیارے لال کے ہم دم و ہم راز لالہ بکتا پرشاد کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل پڑا کہ

"ہاں مولوی صاحب یہی مطلب ہے جو آپ نے بیان کیا۔" ص۵۶

اسی طرح مقصد تخلیق پر سیدنا الامام الکبیر نے جو تقریر فرمائی تھی، تو ختم تقریر پر لکھا ہے، کہ یہی لالہ بکتا پرشاد تھے یا منشی پیارے لال بانی میلہ، بہر حال ان دونوں میں سے کوئی ایک بے اختیار ہو کر بول اٹھا تھا، کہ

"جواب اس کو کہتے ہیں۔" ص۲۲ مباحثہ

یا کہا کہ "جواب تو یہ ہوا۔"

سچ پوچھئے، تو میرے تعجب کا تعلق اس قسم کی چیزوں سے نہیں ہے، جلسوں میں مقرروں اور خطیبوں کے ساتھ عموماً ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، بلکہ حیرت میں مجھے جس چیز نے ڈالا ہے، وہ ان عام ہندوؤں کا حال ہے، جو دونوں سال کے میلوں میں شریک تھے، اور قرائن کا اقتضاء

یہی ہے کہ ہر سال کے میلے میں اکثریت ان ہی کی تھی۔

ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کے متعلق جہاں جہاں ایسی خبریں دی گئی ہیں، مثلاً پہلے سال کی روداد کی وہی اطلاع جس کا شاید پہلے بھی کہیں ذکر گذرا ہے یعنی لکھا ہے، کہ

"یہی تقریر ہو رہی تھی، اور لوگوں پر ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، اور کسی کی آنکھوں میں حیرت" ۔ ص۳۲ میلہ

اسی طرح دوسرے سال کے میلے کی روداد میں بھی آپ کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے، کہ

"ایسا زور و شور کا وعظ ہوا، کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا ہے، اور ہر شخص پر سکتہ کا عالم تھا"۔

ص۹ واقعہ شاہ جہاں پور

اثر پذیریوں کی یہ تصویر جن الفاظ میں کھینچی گئی ہے، ان کا اقتضاء تو یہی ہے کہ حاضرین جلسہ کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ ان کو مخصوص نہ سمجھا جائے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ "ہر کوئی" یا "تمام جلسہ" جیسے عام الفاظ سے ہندوؤں کو مستثنیٰ کر کے جلسے کے ان ہی شرکاء تک ان کو محدود کر دیں جو مسلمان تھے۔ خصوصاً جب یہ تسلیم کر لیا جائے، کہ اکثریت ان جلسوں میں ہندوؤں ہی پر مشتمل تھی، یوں بھی بیانی خطابت کا جو تعلق عام انسانی احساسات کے ساتھ ہے، ان احساسات کو کسی خاص مذہب کے ماننے والوں ہی تک کیوں منحصر سمجھا جائے۔ مگر یہ حال تو اس وقت کا تھا، جب سیدنا الامام الکبیر کی تقریر ہوتی تھی لیکن تقریر سے فارغ ہونے کے بعد جو تماشے دیکھے گئے۔ اچنبھا تو ان ہی پر ہوتا ہے، بیان کرنے والوں نے بجائے اجمال و عمومیت کے صاف صاف واضح الفاظ میں ان کو بیان بھی کیا ہے، درحقیقت مقصود ان ہی کا تذکرہ ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیے، لکھا ہے، کہ جلسہ جس وقت برخاست ہوا، تو

"باہر آتے ہی، مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا، ہندو مسلمان سب گھیری کھڑی تھی"۔

آگے اسی کے بعد ہے کہ

"مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی، سو تھی مگر ہنود بھی بہت خوش تھے، آپس میں کہتے تھے کہ نیلی لنگی والے مولوی نے پادریوں کو خوب مات دی" ملاحظہ مباحثہ

کیا عجیب بات ہے کہ پادریوں نے ہندو مذہب کے نمائندے پنڈتوں کو جلسہ کی حد تک تو ہم نوا بنالیا تھا۔ لیکن جلسہ سے باہر ہونے کے بعد ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ الٹ جاتا تھا، میلہ کے عام ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر پادریوں کی ہزیمت و شکست کا گویا شادیانہ بجا رہے تھے۔

یاد ہوگا، پہلے سال کے میلے میں یہ صورت جو پیش آئی تھی، یعنی جلسہ کے برخاست ہونے کے بعد گھوم گھوم کر سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے مسلمانوں کے مولوی اسلام کی منادی اور عیسائیت کا ابطال کر رہے تھے، تو اس موقعہ پر بھی نقل کیا ہے، کہ پادری جب سامنے آجاتے، تو ان کو دیکھ کر

"عوام بھی کہتے تھے کہ پادری صاحب ہم کو ہی دھمکاتے تھے، اب تو کچھ بولئے"

اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کہنے والے عوام میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو بھی تھے، اسی کے بعد روداد میں تصریح بھی کردی گئی ہے کہ

"اور جملہ ہنود بھی خوش تھے" ملا میلہ

اور اپنی خوشی کا اظہار پادریوں پر فقرے کس کس کر کرتے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ جلسہ سے باہر نکلنے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا مجمع سیدنا الامام الکبیر کو گھیر لیتا تھا۔ بلکہ دوسرے سال کی روداد کے مرتب کرنے والے مولانا فخر الحسن گنگوہی جو اس سال کے میلہ میں خود بھی شریک تھے۔ اپنی یہ چشم دید شہادت بھی مولانا نے درج کی ہے کہ

"راقم الحروف نے دیکھا کہ اس وقت بعض ہندوؤں نے کہا کہ "واہ مولوی صاحب" اور بعض ہندو آتے تھے، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو سلام کرتے تھے" ملا مباحثہ

الغرض جلسہ کے اختتام کے بعد اس قسم کے حسرت انگیز نظارے تھے، جو میلے میں دیکھے جا رہے تھے، غریب پادریوں کے لئے یہ سماں عجیب ہوگا۔ سوچا کیا گیا تھا، اور ہو کیا رہا ہے، لکھا ہے، کہ میلہ اور میلہ کے میدان ہی تک نہیں، بلکہ لوگ میلہ کے منتشر ہونے کے بعد بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف جس وقت لوٹ رہے تھے، تو جس راستہ سے سیدنا الامام الکبیر گذرتے،

"میلہ کے ہندو وغیرہ مناظران اسلام کی طرف اشارہ کر کے اوروں کو بتاتے کہ" یہ ہیں" ۔ ۔ میلہ

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ عام طور پر میلہ سے رخصت ہونے والوں کے کلام کا موضوع خاص سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک اور آپ کی تقریریں بنی ہوئی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا، کہ جب کسی ٹولی کے سامنے سے گذرتے، تو لوگ بتاتے کہ جس شخص کا ہم ذکر کر رہے تھے، وہ یہی ہیں۔

اور چاندا پور کے صحرائی میدان سے لوٹ کر شہر یعنی شاہ جہاں پور پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے، کہ میلہ میں شریک ہونے والوں میں یہی چرچا ہوتا رہتا تھا، لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور کے

"بازاروں میں مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) اور ان کے رفقاء کو نکلنے کا اتفاق ہوا، تو ہندوؤں کا ساروں کی بھی انگلیاں اٹھتی تھیں" صلا مباحثہ

الغرض آپ کی تقریروں کی تاثیری کیفیات، جلسوں ہی تک محدود نہ تھیں، بلکہ جلسوں کے بعد بھی، میلہ کے اندر میلے سے روانہ ہونے کے بعد راستوں میں اور شہر پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ عام ہندوؤں میں تر و تازہ تھیں، اور پادریوں کے مقابلہ میں جو کامیابیاں ہوئی تھیں، وہ مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ہندو ان کو اپنی کامیابی بھی یقین کرتے تھے، اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنی ان کامیابیوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

لطف تو یہ ہے، کہ شہر یعنی شاہ جہاں پور کے سوا جو لوگ دوسرے شہروں تک پہنچے، ان میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو بھی، ملنے جلنے والوں سے اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کرتے تھے، وہ بھی سننے کے قابل ہیں، بریلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چند کھتری جو اس میلہ میں شریک ہوتے

کے بعد میاں پہنچے، وہ باہم ہندوؤں سے سنا گیا کہ کہہ رہے تھے کہ

"مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی، میلے کپڑے، نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی، بیان کرنے کھڑا ہوا، ایسی تقریر بیان کی کہ پادریوں کو کچھ جواب نہ آیا۔"

صرف یہی نہیں، بلکہ یہی صاحب جنہوں نے کھتریوں کی یہ گفتگو سنی تھی، وہی کہتے تھے کہ آخر میں ان ہی کھتریوں میں سنا کہ کوئی اپنے قلبی تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا ہے، یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا کہ

"کوئی اوتار ہوں، تو ہوں تا ملکم"

تقریباً یہ اسی قسم کی بات ہے، جو یورپین نژاد پادری اسکاٹ نے کہی تھی یعنی

"یہ مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں۔"

اسی طرح سہارنپور میں بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات تھے، ان سے ایک اچھے صاحب ذوق ہندو لیکھراج نامی کی ملاقات ہوئی، جو میلے کے بانی منشی پیارے لال کے خاص آشناؤں میں تھے۔ میلے میں وہ بھی شریک تھے، بہرحال لیکھراج نے مولانا ذوالفقار علی صاحب سے کہا تھا کہ

"ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجئے۔"

پھر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، اس کی تعبیر اپنی خاص اصطلاح میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"ان کے (سیدنا الامام الکبیر کے) دل پر تو علم کی مستی برل رہی تھی۔" صـ۹۲

یہی سوچنے کی بات ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی دفعہ ہندوؤں کو اس میلے میں لا کر کھڑا کیا گیا تھا،

ـلـه مولانا اشتیاق احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ مجھ کو میرے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب دیوبندی) نے بیان فرمایا کہ اسی زمانہ میں جب مباحثہ شاہجہانپور ہوا، شاہجہانپور کے کسی ہندو کا خط مولوی محمد منعم صاحب مظفر نگری وکیل کے پاس آیا۔ اس میں اس مباحثہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک مولوی جن کا حلیہ یہ تھا، دو پلی ٹوپی ایک پٹا پاجامہ، ٹخنے کرتہ کی چال و حالت کی رفتار، اس نے پادریوں کو نشانہ کیا کہ یہاں کی (ہندوستان کی) ساری قوموں کی لاج رکھ لی۔ یہ خط مولوی محمد منعم صاحب کے پاس سے لایا گیا اور پڑھا گیا۔ ۱۲   محمد طیب غفرلہ

کھڑا کرنے والوں کا جو مطلب بھی ہو، قرائن و قیاسات سے اس سلسلہ میں جن باتوں کا پتہ چل سکتا تھا۔
تفصیلاً انہیں پیش کر چکا ہوں، لیکن کچھ بھی ہو، اس کی بھلا کون توقع کر سکتا تھا، کہ مسلمانوں کے نمائندے
مولوی کو اوتار تک کے درجہ تک پہنچانے والے اسی میلہ میں پیدا ہو جائیں گے، اور سرستی یعنی
علم کی دیوی، یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ روح القدس کا تائید یافتہ وہی ہندوؤں کو نظر آنے لگے گا،

اسی سلسلہ میں ایک ہندو جوگی کی داستان کتنی دلچسپ ہے، پہلے سال کے میلہ کا قصہ ہے
میلہ جب اکھڑنے لگا، اور واپسی کے وقت مسلمانوں کے اصرار سے بجائے پیادہ پا چلنے کے بہلیاں
جن پر شاہ جہاں پور سے لوگ آئے تھے ان ہی میں سے ایک بہلی پر سیدنا الامام الکبیر کو بھی سوار ہونے
پر مجبور کیا گیا، اور قطار باندھ کر بہلیاں شہر کی طرف جا رہی تھیں۔ لکھا ہے کہ میلے سے تھوڑی دور بہلیوں
کی یہ قطار پہنچی تھی، دیکھا گیا جیسا کہ لکھا ہے

"گاڑیوں کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا، پاؤں میں کھڑاویں، سر پر لمبے لمبے
بال، برہنہ سر، ہاتھ میں دست پناہ، دو چار معتقد اس کے ساتھ"

اسی شان سے جوگی جا رہا تھا، کہ اچانک اس بہلی پر اس کی نظر پڑی، جس پر سیدنا الامام الکبیر سوار تھے بیان کیا
ہے کہ نظر پڑتے ہی

"مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا"

صاحب روداد نے اس کے بعد جوگی کے تلفظ خاص میں اس کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں یعنی اشارہ
کر کے کہہ رہا تھا کہ

"جی متو لبی ہے"

یعنی "یہ مولوی ہے" جوگی کی زبان سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے، لکھا ہے، کہ

"اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب کی نظر ادھر کو اٹھی"

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، سامنا ہوتے ہی جوگی ہی نے پیش قدمی کی، اور سیدنا الامام الکبیر کو سلام
کیا، جوگی کے اس سلام کی نوعیت کیا تھی، اس کو تو صاحب روداد نے نہیں بیان کیا ہے لیکن جنہ جوگی

کے سلام کا جواب دار العلوم دیوبند کے بانی سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جس طریقہ سے دیا گیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات کے ساتھ، ہاتھ اٹھا کر جواب دیا"

اس سے پہلے میلے میں جو کچھ کہا اور کیا جا رہا تھا، اگر سمجھا جائے کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں "مدافعت بالحسنیٰ" والے قرآنی قانون کی تعمیل کی وہ اجتماعی شکل تھی، یعنی اس کا رخ ان عام ہندوؤں کی طرف تھا، جو اس میلے میں شریک تھے، تو قرآن کے اسی حکم کا ایک شخصی اور جزئی تجربہ حضرت والا کے اس طریقہ کار کو ہم شاید قرار دے سکتے ہیں جو اسی ہندو جوگی کے ساتھ اس وقت اختیار کیا گیا، نتیجہ بھی اسی وقت اس شکل میں سامنے آگیا، لکھا ہے کہ

"اس نے (جوگی نے) جو دیکھا کہ مولوی صاحب التفات سے جواب دیتا ہے، تو وہاں سے (یعنی جہاں پردہ کھڑا ہوا تھا) دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑیبان سے کہا تھام دے"

کانہ ولی حمیم (گویا وہ ایک گرم جوش دوست ہے) نتیجہ کے ان قرآنی الفاظ کی یہ کتنی واضح اور کھلی ہوئی تصویر ہے مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کے معاملہ میں مقابلہ ہوگا، اسی خبر کو سن کر ظاہر ہے کہ اپنی قوم کی طرف سے گویا مقابل بن کر اس میلہ میں یہ جوگی پہنچا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ سے خاص دلچسپی بھی رکھتا تھا، آگے معلوم ہوگا کہ بجائے عام لوگوں کے اسی لئے خیمہ کے اندر اس جوگی کو جگہ دی گئی تھی،

بہر حال دوڑ کر جوگی نے گاڑی کے ڈنڈے کو پکڑا، اور "تھام دے" کی اصطلاحی آواز دے کر بہلیوں کی ساری قطار کو رکوا دیا۔ قاعدہ ہے کہ قطار میں چلنے والی گاڑیوں کے مقدمۃ الجیش کو جب دیہات والے کہتے ہیں کہ "تھام دے" تو وہ خود بھی تھم جاتا ہے، اور پیچھے لگی ہوئی گاڑیوں کو بھی تھم جانے کا حکم دیتا ہے، یہی صورت یہاں پیش آئی۔ اب آگے کیا ہوا، یہ لکھ کر کہ

"القصہ گاڑیاں تھم گئیں"

صاحب روداد نے بیان کیا ہے کہ اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر کو مخاطب بنا کر جوگی نے کہا کہ

مصنف امام نے کہا تھا کہ

"مدعا یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتھے میں اسلام کی ایک منادی ہو جائے اور خدا کی حجت ہندوں پر پوری ہو جائے سو وہ اس میلہ خدا شناسی میں ہو چکی" ص۳۱

اسی روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ

"چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وفات ہو گئی"

مطلب مصنف امام کے اس بیان کا اگر یہ سمجھا جائے کہ اسی تبلیغی نمونہ کا قائم کرنا بھی سیدنا الامام الکبیر کے وجود باجود کا آخری نصب العین ان کے نزدیک تھا تو جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے، خود ہی سوچئے کہ اس سے اور کیا سمجھا جائے، اور مجھ سے اگر پوچھتے ہیں، تو چاند اپور میں جو کچھ سیدنا الامام الکبیر نے کہا اور کیا اگر ایک طرف دین حق کی تبلیغی ذمہ داریوں میں اس سے جاگ پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اگر ہم فکر معقول سے کام لیتے ہوئے آپ کے طریقے سے چاہیں تو یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بغیر کسی تلخی اور ناگواری کے غیر قوموں کے درمیان بود و باش اختیار کر کے تبلیغ حق کے اس فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کا حکیمانہ طریقہ کیا ہو سکتا ہے، آپ کے اس حکیمانہ طریقہ کار کی تفصیل واقعات و شواہد کی روشنی میں پیش ہو چکی ہے اس کو بار بار پڑھئے، اور جو نتیجے اس سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کو حاصل کیجئے، حق تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی بادشاہی کے زمانے میں

"ہندو کی تند شمیر اسلام"

کا تماشا اگر دیکھا گیا تھا تو شاید یہ اتنا تعجب انگیز نہ تھا، لیکن خدا شناسی کے اسی میلہ میں جب مسلمانوں کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں کالے پادری مولیٰ داد کی طرف سے گندگی اچھالی جا رہی تھی اور سیدنا الامام الکبیر اسی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ اعلان کر رہے تھے۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین بھی ہمارے نزدیک مثل توہین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم موجب کفر و ارتداد ہے" میلہ

اسی لئے آگے مکالمہ یوں ختم ہوا۔

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے فرمایا آپ نے بڑی مہربانی کی جو آپ آئے"

جواب میں جانکی داس جوگی نے یہ عجیب و غریب الفاظ کہے۔

"ہم تو تمہارے بیٹا بیٹی ہیں"

یہ کہا اور

"سلام کر کے چل دیا"

سچ پوچھئے تو "انی لاشی ولی حمید" ہی کا اپنے الفاظ میں جوگی نے گویا ترجمہ کر دیا تھا، سیدنا الامام الکبیر کے برتاؤ اور حسن سلوک نے جو اثر خود اس کے دل پر ڈالا تھا، اور کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اپنی قوم یا کم از کم اس میلے میں اس جوگی کے ہم مذہب لوگ جو شریک تھے، سب ہی کو "بیٹا بیٹی" ٹھیراتے ہوئے اسی اثر کی عمومیت کا گویا جوگی اعتراف و اقرار کر رہا تھا، کیسا عجیب اور طراوت بخش نظارہ ہے کہ دشمن بنانے کے لئے جو لائے گئے تھے، دوست یا جوگی کے الفاظ میں "بیٹا بیٹی" بن کر وہی واپس ہو رہے تھے، اور جوگی بے چارا تو خیر جوگی تھا، اسی روداد میں ایک واقعہ یہ بھی نقل کیا ہے، کہ جن پنڈتوں کو مقابلہ ہی کے لئے خاص طور پر بلایا گیا تھا، ان میں ایک پنڈت صاحب جنہوں نے جلسہ میں عملی حصہ بھی لیا تھا، اور سنسکرت آمیز بھاشا والی تقریر کی وجہ سے ان کی تقریر جلسہ کے عام حاضرین نہ سمجھ سکے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دیانندی تحریک سے وہ بھی کافی متاثر تھے۔ تاہم تقریر کے وقت بھی ان کو دیکھا گیا تھا کسی خاص مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی طرف خاص اشارہ کر رہے ہیں، اور اشارہ کر کے کہہ رہے ہیں،

"خاص ان مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں"

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت والا کے علم و عمل سے وہ یوں ہی متاثر تھے، لیکن جلسہ جب برخاست ہو گیا تو بیان کیا ہے، کہ

"وہ پنڈت صاحب بھی اس وقت مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کے پاس آ بیٹھے"

جنہوں نے جلسہ میں یہ کہا تھا "میں سب سے پوچھتا ہوں اور مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا، خاص کر ان سے" ص۱۳

بہرکیف کہنا یہ ہے کہ یہی پنڈت جی جیسا کہ لکھا ہے، حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر کہہ رہے تھے کہ

"میں سچے جی سے مذہب کے مقدمہ میں پوچھنا چاہتا ہوں"

اور جلسہ میں حضرت والا کی تقریروں نے جو اثر ان کے اندر قائم کیا تھا، اس کا اظہار ان الفاظ میں کرنے لگے کہ

"ہر آدمی اس سے پوچھے جو دوسرے کو سمجھا سکے"

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ سمجھا سکنے کے اس حسن سلیقہ کا تجربہ چونکہ سیدنا الامام الکبیر میں پنڈت جی کو محسوس ہوا تھا، اسی لئے آپ کے پاس وہ حاضر ہوئے تھے۔ پنڈت جی کے اس معروضے پر حضرت والا نے جو کچھ فرمایا تھا، اس سے آپ کی تقریروں کی خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے، کہا گیا تھا کہ

"جو کچھ ہم کہیں گے، آپ بھی اس کو صداقت ہی پر محمول کریں گے، تعصب اور سخن پروری نہ سمجھیں گے"

یہی تعصب اور سخن پروری سچ پوچھئے تو مذہبی واعظوں کی تقریروں کو عموماً بے جان بنا دیتی ہے، اثر انداز کا سب سے بڑا گر یہی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ دین کا معاملہ اتنا ہلکا اور آسان تو نہیں ہے کہ کسی جلسہ کی چند تقریروں اور زبانی باتوں سے کام چل جائے، اسی لئے پنڈت جی کو آپ نے مشورہ دیا تھا کہ

"مذہب کے باب میں اطمینان ہے اس کے منصوص نہیں کہ مہینہ چند روز آپ اور ہم ساتھ رہیں اور باہم مذہب کی باتیں کرتے رہیں" ص۱۲

تاکہ گفتار کے ساتھ رفتار کا، قول کے ساتھ کردار کے تجربہ کا بھی موقعہ ملے۔ لکھا ہے کہ بیچارے پنڈت جی نے ساتھ رہنے کا اقرار بھی کر لیا تھا، پھر نہ معلوم کیا عوائق پیش آئے کہ ایفاء عہد

ذکر کیے

بہرحال ہندوؤں پر عیسائیوں کے برعکس سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا اثر پڑ رہا تھا، گویا وہی مثال صادق آرہی تھی، کہ کپڑے کو سکھانے کے لئے دھوپ میں دھوبی کھڑا ہوتا ہے، ایک ہی آفتاب ہوتا ہے جس کی شعاعوں سے دھوبی غریب کا چہرہ تو کالا پڑتا جاتا ہے، اور ٹھیک اسی وقت یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ کپڑا جسے دھوبی سکھا رہا تھا، سفید سے سفید تر بنتا چلا جاتا ہے۔ آثار کے اس اختلاف کا جو دعویٰ میں نے کیا تھا۔ کیا اب بھی اس میں شک کی گنجائش باقی ہے؟ حد تو یہ ہے کہ چاند اپور، اور سارنگپور نیز ان کے گردونواح کے دیہاتوں کی طرف سے میلے کے بعد بعض لوگ گذرے، وہی بیان کرتے تھے۔ کہ

"راہ میں جو ہندو گنوار ملے، ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ پٹھان جیتے"

پٹھان شاہجہاں پور کے علاقہ میں مسلمانوں کی تعبیر ہے۔ جیسے عام طور پر ترک بھی مسلمانوں کو ہندوستان میں کہتے ہیں۔ مطلب یہی ہے، کہ مسلمانوں کے ساتھ اس علاقہ کے ہندو گنوار بھی مسلمانوں کی کامیابی، اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ان کی جیت کا ذکر کر کے خوشیاں منا رہے تھے، گویا صحرائی علاقہ کا انتخاب اگر واقعی ناسد اغراض کے تحت کیا گیا تھا، جن کی غمازی قرائن و قیاسات کر رہے ہیں تو سمجھنا چاہئے، کہ معاملہ الٹ گیا یعنی ان تکو ہوا شیئاً وهو خیر لکم کے قرآنی اصول کی تفسیر پہلے بھی ان ہی شکلوں میں ہوتی رہی ہے، اور آئندہ بھی ہوگی۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ حکمرانی، اور بادشاہی کو اپنا موروثی حق یا پیشہ قرار دینے والے مسلمانوں نے ہندوستان پہنچ کر تبلیغ اسلام کے دینی فرض کے ساتھ جو رویہ بھی اختیار کیا ہو، لیکن ہندوستان ہی کیا، شاید بادشاہی اور ملوکیت کے اس ذوق کی تسکین کی گنجائش دنیا کے کسی گوشہ میں باقی نہیں رہی ہے، مصر جو تقریباً خالص اسلامی ملک ہے، وہاں کے معزول شاہ فاروق نے خواہ مزاحاً ہی کہا ہو کہ انگلستان کے سوا شاید کسی ملک میں بادشاہت اب باقی نہ رہے گی۔

چاہا جائے یا نہ چاہا جائے، مگر حالات کا بظاہر قدرتی اقتضا یہی ہو چکا ہے، ایسی صورت میں

مسلم وغیر مسلم باشندوں کی ملی جلی آبادیوں کے رہنے والے مسلمانوں کیلئے پہلے نہیں تو اب جب بادشاہی کا خواب صرف خواب بن چکا ہے کیا یہ سوچنے کا وقت نہیں آگیا ہے کہ جس دینی فرض کو حکومت کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ان کے اگلوں سے لاپروائی برتی تھی' اس فرض کی ذمہ داری کو وہ محسوس کریں' اور سوچیں۔ اس بات کو کہ غیر اسلامی آبادیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ایسا صحیح راستہ کیا ہو سکتا ہے جس پر چل کر دین کا فرض بھی ادا ہوتا رہے' اور دنیا میں دوسری قوموں سے ان کے تعلقات خوش گوار رہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بہرحال اس باب میں مسلمانوں کو فیصلہ تک پہنچنا ہی پڑے گا' میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ دوسری باتوں کے ساتھ چاہا جائے تو روشنی کا مینار سیدنا الامام الکبیر کے ان نمونوں کو بھی بنایا جاسکتا ہے' جنہیں خدا شناسی کے ان میلوں میں آپ کی رفتار و گفتار سیرت و کردار نے پچھلی نسلوں کے لئے چھوڑا ہے۔

آپ دیکھ چکے کہ دہی میلہ جس میں اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اسلام اور مسلمانوں کی دینی تحقیر و توہین کا ارادہ کر کے عیسائی مذہب اور ہندو دھرم کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ لیکن میلے میں پہنچنے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ ان ہی میلوں کو جو بنالیا تھا' اس باب میں آپ کی سعی و کوشش جن حدود تک پہنچی تھی' اس کی داستان سنا چکا ہوں۔

بلکہ ارواح ثلثہ میں مولانا طیب صاحب کے حوالہ سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے کہ ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ

> "جب مباحثہ شاہ جہاں پور ہو چکا' اور حضرت مولانا نانوتوی مظفر و منصور ہو کر واپس تشریف لائے تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا' وہ پورا ہو چکا۔"

"کام جو لینا تھا" اپنے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب یعنی ہمارے

"تم نے بڑا کام کیا"

اس سے یہ سن کر لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا میں نے کیا کیا؟"

مخاطب چونکہ ایک ہندو جوگی تھا، اس لئے آگے فرمایا گیا، کیا فرمایا گیا؟ معلم العلماء کی زبان مبارک سے اس فقرے کو سننے "میں نے کیا کیا" یہ کہنے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ

"پرمیشر نے کیا"

"سچ کہتے ہو" ان تصدیقی الفاظ کے بعد بیان کیا ہے کہ

"پھر جوگی مذکور نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کر کے کہا کہ جب تم نے "بولی ماری" (یعنی تقریر کی) تو ہم نے دیکھا کہ اس کالے یعنی پادری کا اتنا سر رہ سوکھ گیا تھا، یا یوں کہا کہ گھٹ گیا تھا"

دیکھ رہے ہیں۔ آپ ایک ہی تقریر کے ان دو مختلف اعترافی آثار کو، پادری کا سر یا جسم، سوکھ یا گھٹ رہا تھا، اور جوگی جس کی حیثیت ہندوؤں میں گویا وہی تھی، جو پادریوں کی عیسائیوں میں ہوتی ہے، اس کے دل کی مسرت ان الفاظ کی شکل میں جھلک رہی تھی،

اس کے بعد کسی "ولی جسم" سے میل ملاپ جیسی گفتگو ہوتی ہے، یہی گفتگو دونوں میں جس طریقہ سے ہوئی، روداد میں وہ بھی نقل کر دی گئی ہے، لکھا ہے کہ جوگی سے

"مولوی محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ تم کہاں تھے خیمہ کے باہر تھے؟"

جواب میں جوگی نے کہا کہ

"ہم بھی خیمہ کے اندر تھے"

حضرت والا نے دریافت کیا کہ

"آپ کا نام کیا ہے؟"

جوگی نے کہا مجانکی داس، شاید یہ گفتگو دیر تک ہوتی لیکن روداد ہی میں ہے، بہلیوں کی قطار رکی ہوئی تھی۔

جانتے ہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوا، مسلمان تو مسلمان لکھا ہے کہ مولانا اور بدبخت کو

"ہندو بھی برا بھلا کہہ رہے تھے"

صرف یہی نہیں بلکہ جوش میں دیکھا گیا، اسی روداد میں لکھا ہے کہ

"ایک ڈپٹی صاحب ہندو مذہب، جن کا نام غالباً جودھیا پرشاد ہے، کھڑے ہوئے، اور اس مضمون کو دیر تک بیان کرتے رہے کہ کسی کے پیشواؤں کو برا نہ کہنا چاہیے" ملہ

جس کا مطلب یہی تو ہوا کہ مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و عزت کی حفاظت کے لئے ایک ہندو ڈپٹی کلکٹر کھڑا ہو گیا، اور یوں ہندو ہی زندگی شیر اسلام کا جاں پرور، روح افزا نظارہ مسلمانوں کے عہدِ محکومیت میں اس وقت سامنے آ گیا تھا، جب چاندا پور کے اس میلے میں عیسائیوں اور ہندوؤں کے نمائندوں کو اسلامی دین پر اعتراض و تنقید کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا۔ اس تمام روداد میں ادفع بالتی ھی احسن یعنی مدافعت بالحسنیٰ کے قرآنی حکم کے قرآنی نتیجہ کو مشاہدہ بنا کر اس میلہ میں جس جس طریقہ سے دکھایا گیا تھا، چاہیے کہ کافی توجہ سے اس کو پڑھا جائے، اور آج جن مشکلات سے نکلنے کی راہیں مسلمان اس ملک میں اپنے اوپر بند پا رہے ہیں، میرا خیال تو یہی ہے کہ ان مشکلات کے حل کی ایک واضح راہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آ جائے گی، پیدا کرنے والے نے بنی آدم کو جن نفسیاتی قوانین کا پابند بنا کر پیدا کیا ہے۔ ان سے اور ان کے اقتضاء سے کوئی جدا ہونا بھی چاہے تو جدا نہیں ہو سکتا۔ برائی کا بدلہ بھلائی کے ساتھ جب دیا جاتا ہے، تو دشمن خواہ کامل دوست نہ بن جائے لیکن گویا کہ وہ ایک گرم جوش دوست یعنی کانہ ولی حمیم بنا ہوا ہے۔ قرآن کی یہ اطلاع بظاہر غیر منطقی ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن کیا کیجئے کہ تجربے سے ہمیشہ اس کی تصدیق ہوتی ہے، بنی آدم تو بنی آدم تجربہ کرنے والوں نے تو حیوانی نفسیات تک کے اوپر اسی قانون کو محیط پایا ہے۔

لیکن ہر تجربہ اپنے ساتھ کچھ شرائط رکھتا ہے۔ اس قانون کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے یعنی۔

اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل	وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا

وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم	مزاج ہیں، اور یہ بات ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے۔

میرے نزدیک تو اس تجربہ کے عملی نتائج کے شرائط ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کافی صبر بڑے ظرف اور وسیع حوصلہ کی ضرورت اسی لئے ہے کہ برائی کرنے والوں کے مقابلہ میں بھلائی پر اپنے دل کو آمادہ کرنا ہر کس و ناکس کے لئے آسان نہیں ہے، اور اس راہ میں دل ہی کی آمادگی در اصل آمادگی ہے۔ دل میں نفرت و عداوت کی آگ بھری ہو، اور زبان یا قلم سے خوبصورت، خوش کن الفاظ نکل بھی رہے ہوں، تو جس نتیجہ کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کے ظہور کا انتظار بڑی خطرناک غلطی ہوگی۔ اس طریقہ سے دھوکہ دینے والے ممکن ہے کہ خود دھوکہ کا شکار ہو جائیں، اس میں شک نہیں کہ بجائے غیر کے اپنے دل پر قابو بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اکثروں کے لئے یہی آسان بات عموماً دشوار ہوگئی، عملاً اسی لئے نفرت کا جواب نفرت ہی سے لوگ دیتے رہتے ہیں، شیطان کا یہی وہ چرخہ ہے، جس کا چکر کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ شاید "دافعت بالحسنیٰ" والی آیتوں کے بعد

واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم	اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو (فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے۔

پر کلام کو جو ختم کیا گیا ہے، اس سے یہی سمجھانا مقصود ہے کہ "شیطان" "دافعت بالحسنیٰ" والی بات (یعنی برائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنا) پر آدم کی اولاد کو چلنے نہیں دیتا، برائی کے مقابلہ میں برائی ہی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ علاج اس کا یہی بتایا گیا ہے کہ سارے شیطانی خطرات جو بظاہر عقلی مشوروں کے رنگ میں سامنے آتے ہیں، ان سے خدا کی پناہ ڈھونڈھی جائے، برائی کے مقابلہ میں واقعی دل سے ہم اگر بھلائی کریں گے تو خدا جو ہمارے دلوں کے حال سے آگاہ ہے وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق نتیجہ کو بہر حال سامنے لائے گا۔

میں اپنے موضوع بحث سے اس مسئلہ میں شاید ذرا زیادہ دور ہٹ گیا' زندگی کے ایک اہم قرآنی دستور کا ذکر چونکہ چھڑ گیا' سب کچھ کہنا تو دشوار تھا' لیکن کچھ نہ کہا جائے یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا' یہ گفتگو تو سیدنا الامام الکبیر کے ان قولی و عملی نمونوں کے متعلق ہو رہی تھی' جو خداشناسی کے ان میلوں میں آپ کی طرف سے پیش ہوئے' جن کے متعلق اپنا ذاتی احساس پیش کر چکا ہوں' ان نمونوں کو آپ کے احسانی حکم و علم کے آثار میں شمار کرتا ہوں۔

تاریخ کے جس عہد میں یہ نمونے مسلمانان ہند کے درمیان پیش ہو رہے تھے' یہ وہی زمانہ تھا' جب مسلمانوں کی حالت زار سے متاثر ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں مصلحین اس لئے کھڑے ہو رہے تھے کہ جو کچھ ہونا تھا' وہ تو خیر ہو چکا' لیکن ان ہی حالات میں اس ستم رسیدہ قوم کے جینے کا جو سامان بھی ممکن ہو' اسے فراہم کرنا چاہئے۔

ان کی کوششیں بھی جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے' اخلاص اور سچی بہی خواہیوں' دلی ہمدردیوں ہی پر مبنی تھیں' لیکن وہ جو کچھ سوچتے تھے' عقل سے سوچتے تھے' عقل جن مشوروں کو پیش کرتی تھی ان پر عمل پیرا تھے' اور اس کے سوا وہ بے چارے آخر کرتے کیا' احسانی علم و حکم کی دولت ہر ایک کو ارزانی نہیں ہوتی'

سچ پوچھئے تو سیدنا الامام الکبیر کی خدمات کی صحیح قدر و قیمت سے اسی لئے مسلمانوں کی عمومیت جیسا کہ چاہئے واقف نہ ہو سکی' اس کے مقابلہ میں عقلی علم و حکم والوں ہی کی باتیں زیادہ مشہور اور زیادہ پسند کی گئیں' ان ہی کے مشوروں کے مطابق پروگرام بنتے رہے' اور جو نتیجے ان پر مرتب ہو سکتے تھے' وہ مرتب ہوتے رہے اور آج تک ہو رہے ہیں۔

خصوصاً خداشناسی کے یہ میلے جو بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی پیدائش کے نصب العین کی تکمیل و ظہور کے آخری جلوہ گاہ تھے' وفات کی پیش گوئی تک اپنے اسی باطنی مکاشفہ کی روشنی میں انہوں نے کردی تھی' لیکن اب اسے کیا کہئے' پتہ یہی چلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی جس میں یہ میلے منعقد ہوئے' اور اس کے بعد بھی یہ میلے اور ان میلوں میں جو کچھ ہوا' سب ہی کے متعلق زیادہ سے زیادہ

عمومی تاثر یہی رہا کہ ان میلوں میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے باہم مذہبی مسائل پر کچھ بحث بحثی ہوئی، اوروں کا حال تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن مسلمانوں میں یہی مشہور ہوا کہ مولانا محمد قاسم کی بدولت ان ہی کی جیت ہوئی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ چند خاص لطیفوں کا چرچا بھی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق مسلمانوں کی مجلسوں میں ہوتا رہا، جن کی یاد اب بھی کبھی کبھی بطور گرمی بزم تازہ کر لی جاتی ہے۔

باقی مسلمانوں کے سوا عیسائیوں اور ہندوؤں میں چاندا پور کے ان میلوں اور ان کے نتائج کو کن نظروں سے دیکھا گیا، اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے سال کے میلہ کی روداد مطبع ہاشمی کے مہتمم مولوی محمد ہاشم، اور مطبع ضیائی کے مہتمم مولوی محمد حیات صاحبان، دونوں نے مل کر، اور دوسرے سال کی مولانا فخر الحسن گنگوہی مرحوم نے مرتب کی تھی۔ کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے، کہ مسلمانوں کی طرف سے جو روداد چاندا پور کے میلوں کی مرتب ہوئی ہے، اسی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"کیفیت میلہ چاندا پور بھی جس میں پنڈت جی (دیانند سرستی) بھی رونق افروز تھے، نہ چھپنے پائی۔"

آگے بیان کیا ہے کہ

"اور پنڈت جی نے کیفیت مذکورہ چھوڑ، رڑکی و میرٹھ وغیرہ مقامات کے تمام واقعات حسب دل خواہ گھڑ گھڑا کر چھپوا دیں۔" صـ۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کی طرف سے بھی چاندا پور کی سرگذشت مرتب ہو کر شائع ہوئی تھی، مگر مجھے یہ تحریر نہیں مل سکی، اور اس کا تو پتہ بھی نہ چلا کہ عیسائیوں کی طرف سے بھی کوئی رپورٹ چھاپی گئی تھی یا نہیں چھاپی گئی تھی۔

قرینہ کا اقتضا، تو یہی ہے کہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے اس زمانہ میں جو اخبار اور رسالے نکلتے تھے کم از کم ان میں ان میلوں کی کارروائیوں کا تذکرہ ضرور ہوتا ہوگا، لیکن کیا کیجئے کہ اس قسم کی کوئی چیز مجھے نہ مل سکی۔ "تھوڑی مروڑی ہی" لیکن اس کا تو اندازہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے سوا دوسرے

قرنوں میں خدا شناسی کے ان میلوں اور ان کی کارروائیوں کو کن نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔

زمانہ بھی کافی گزر چکا ہے، صدی نہیں تو پون صدی میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، اس زمانہ میں ہندوستان کا اسلامی پریس ہو، یا غیر اسلامی، دونوں بالکل ابتدائی منزلوں میں تھے، گنتی کے چند ہفتہ وار اخبار بعض مقامات سے نکلتے تھے، ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو میرے بعد شاید کوئی جدید مواد مل جائے، لیکن عام حال جیسا کہ میں نے عرض کیا، بظاہر ایک وقتی بحث و مباحثہ کی زیادہ اہمیت شاید کسی فرقہ میں ان میلوں اور ان کی کارروائیوں کو نہیں دی گئی، یہ بات کہ آئندہ نسلوں کی راہ نمائی کا کام بھی ان عملی نمونوں سے لیا جاسکتا ہے جو سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ان میلوں میں پیش ہوئے، شاید فرط عقیدت یا میری خیال آرائی، بلکہ ممکن ہے اس پر تک بندی تک کا شبہ کرنے والوں کو ہو، لیکن یہ اپنا اپنا خیال ہے، میں دوسروں کو ان نتیجوں تک پہنچنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا، ایک بات میری سمجھ میں آئی، وہ پیش کردی گئی۔ اور دنیا خواہ اس روشنی کو قبول کرے یا نہ کرے، مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جن نفوس قدسیہ نے زندگی کی دوسری شاخوں میں سیدنا الامام الکبیر کی خدمات کو آگے بڑھایا، آپ کے نصب کئے ہوئے پودوں کو پروان چڑھایا، ان بزرگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اول سے آخر تک اس باب میں بھی جو عملی مثالیں پیش کیں، اور آج تک جس راہ پر وہ چل رہے ہیں، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، تو یہی کہا جاسکتا ہے، کہ چاندا پور کے نمونوں سے جو عملی درس مل سکتا تھا، اس پر وہ عمل پیرا ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے، کہ پادریوں کا طبقہ جسے ان میلوں میں اس غیر ملکی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی، جو ہندوستان پر مسلط ہوگئی تھی اور براہ راست نہ سہی، لیکن بالواسطہ درحقیقت اسی حکومت مسلطہ کی ان میلوں میں نمائندگی کررہے تھے، اور سچ پوچھئے تو اسی حکومت کے پنجوں کو مضبوط کرنے کی دوسری تدبیروں میں کی ایک تدبیر وہ بھی تھی، جسے پادری انجام دیتے تھے، الغرض اس طبقہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر نے جو تعلق قائم کیا تھا، یا آپ کے طرز عمل سے

جو تعلق حکومت کے ان نمائندوں سے چاندا پور میں قائم ہو گیا تھا، بجنسہ اسی تعلق کو سیدنا الامام الکبیر کے ان جانشینوں نے اس غیر ملکی اقتدار کے ساتھ مسلسل قائم رکھا، اور گو ہندوؤں کو بھی ان میلوں میں پہلی دفعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا گیا تھا، لیکن آپ دیکھ چکے کہ بجائے دور ہونے کے ان میلوں میں ہندوؤں کی قومیت سیدنا الامام الکبیر سے جیسے قریب ہی ہوتی چلی گئی، یہی رنگ آپ کے جانشینوں کا بھی اس ملک کی غیر مسلم آبادی خصوصاً ہندوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ چاندا پور کے ان میلوں کے بعد تاریخ کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس سے ملک گذرتا ہوا موجودہ حالات تک پہنچا ہے اس طویل عرصہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات نشیب و فراز کی گھاٹیوں سے گذرتے رہے، سلجھاؤ کے ساتھ الجھاؤ، سیدھ کے ساتھ پیچ کی بیسیوں شکلیں سامنے آئیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں نے ان تمام حالات میں اپنی حد تک کوئی ایسی صورت اختیار نہیں کی، جس کی بنیاد پر یہ سمجھا جا سکے کہ ان کے کسی خاص طریقہ کار سے ملک کے ان دونوں طبقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی، یا منافرت پیدا ہوئی۔

بلکہ پہلے سال کے میلے میں یاد ہوگا، مباحثہ و تقریر وغیرہ کی مجلسوں کے اختتام کے بعد ایک پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں تحقیق حق کے لئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ

"میں سچے جی سے مذہب کے مقدمہ میں پوچھنا چاہتا ہوں" ص۴۲

پنڈت جی کی دل دہی کرتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے سیدنا الامام الکبیر نے آخر میں ان سے فرمایا تھا کہ

"مذہب کے باب میں اطمینان بے اس کے متصور نہیں کہ مہینہ پندرہ روز آپ اور ہم ساتھ رہیں اور مذہب کی باتیں کرتے رہیں" ص۴۲

ایک جزئی واقعہ یا شخصی مکالمہ سے زیادہ بظاہر اس فقرے کا وزن محسوس نہ کیا جائے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ ایک انفرادی شخصیت تک دین حق کی تبلیغ کا جو فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، جب اس فرض سے سبکدوشی کے لئے سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک مہینہ پندرہ روز کی رفاقت کی ضرورت تھی، تو

سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کا یہ فیصلہ کہ کروڑہا کروڑ انسانوں تک حق کی تبلیغ کا موقعہ قدرت کی طرف سے مسلمانانِ ہند کے لئے جو آسان کر دیا گیا ہے، اس میں دشواری نہ پیدا کی جانے، بتایا جائے کہ اس فیصلہ کو بے جا ٹھہرانے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے، سیدنا الامام الکبیر کے جواب کا یہ جزء یعنی

"باہم مذہب کی باتیں کرتے رہیں"

یقیناً ملے جلے رہنے ہی کی صورت میں یہ زیادہ آسان ہے۔

بہر حال ختم نبوت کے بعد جیسا کہ معلوم ہے، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا بھی ہے کہ "خود امت مسلمہ مبعوث کی گئی ہے"

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کے نفع و ہدایت) کیلئے بھیجے گئے ہو۔

کا مطلب شاہ صاحب کے نزدیک یہی ہے، ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے کہ دنیا کے جس حصہ میں مسلمانوں کو خدا نے پہنچایا اور پہنچا کر آباد کر دیا ہے، وہاں کے غیر مسلم باشندوں کی طرف آباد کاروں کا اسلامی طبقہ مبعوث ہے، اور اسی بنیاد پر مسلمانانِ ہند میں جو لوگ اپنے تبلیغی فرض کو محسوس کر کے سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کے مشورے کے مطابق وطنی تبدیلیوں پر راضی نہ ہوئے، بلکہ جہاں تھے، وہیں پڑے ہوئے ہیں، تو بتایا جائے کہ تبلیغ کے کفائی فرض سے سبکدوشی کی آخر دوسری شکل مسلمانانِ ہند کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ اس تبلیغی فرض کا ڈھنڈورا تو کبھی نہیں پیٹا گیا، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً اس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے ہیں، وقتاً فوقتاً ان بزرگوں کے ذریعہ مشرف باسلام ہونے کی سعادت جن خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی رہی ہے، یوں بھی مختلف اسباب و وجوہ کے تحت اس ملک کے غیر اسلامی طبقات کے لیڈروں اور زعیموں سے ان کے ایسے خوش گوار تعلقات قائم رہے، جس سے دوسروں کیلئے اسلامی تعلیمات سے مانوس ہونے کی زمین قدرتاً ہموار ہوتی رہی،

گویا مذہب کی باتیں کرنے کی ایک صورت یہ بھی تھی۔ اور گو عام طور پر لوگوں کو اس کا شاید علم نہ ہو لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ "دارالعلوم دیوبند" میں جب کبھی موقعہ ہمدست ہوا' ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت اور بھاشا کے سکھانے کا نظم بھی مدرسہ میں کیا گیا' یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سیکھنے کے لئے بھیجا گیا۔[1]

لیکن با ایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ خود مسلمانوں کے مختلف احزاب اور جماعتوں کی طرف سے دارالعلوم دیوبند اور دیوبندیت پر حقیقی بھی نکتہ چینیاں کی گئیں ہوں' بسا اوقات خود قصبہ دیوبند میں بھی دارالعلوم کے متعلق مسلمان باشندوں کے اندر کش مکش کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں' قیام دارالعلوم سے اس وقت تک جو زمانہ گذرا ہے' قریب قریب صدی ہی پوری ہو رہی ہے۔ اس طویل مدت میں ہندوستان کی غیر اسلامی آبادی کو مسلمانوں کے اس خالص دینی مرکز سے

---

[1] مدرسہ کی رودادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاشا اور سنسکرت زبانوں کے سکھانے کے لئے وقتاً فوقتاً مولانا ابو حجت حسن میرٹھی اور مولانا غلام محمد سیتاپوری' ڈاکٹر غلام محمد وغیرہ کی تدریسی خدمات دارالعلوم نے حاصل کیں' اسی طرح مولانا شہید اللہ صاحب (مشرقی بنگال کے مشہور فاضل سنسکرت کی خدمت میں تعلیمی وظائف دے کر طلبہ دارالعلوم سنسکرت زبان کے سیکھنے کے لئے بھیجے گئے' دیکھئے روداد ۱۳۲۳ھ یا کتاب فرنگیوں کا جال ص ۱۸۱۔

اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے مروجہ مذاہب و ادیان کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرنے کی ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں' بلکہ ہندی زبان ناگری خط کے ساتھ جب اس ملک کی دفتری زبان مانی جا چکی ہے تو تدریجاً اس کی وجہ سے اس زبان کی تعلیم کا انتظام زیادہ آسان ہو چکا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اسلامیات کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے' اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی زبان میں منتقل کر دیا جائے' ہمارا یہ ایک تبلیغی فرض ہے' اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا۔

از بندہ محمد طیب غفرلہٗ عرض ہے کہ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد اسی سال احقر کی طرف سے دارالعلوم کے درجہ فارسی میں ہندی اور رسم ناگری جاری کر دیئے جانے کی ہدایت بھیج دی گئی' اور ایک مستقل مدرس ہندی کے لئے مامور کیا گیا' جو آج تک جاری ہے' بعد میں اسے تمام بزرگان دارالعلوم نے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا' اور اب یہ ہندی کی تعلیم ضابطہ سے جزو نصاب درجہ فارسی بنا دی گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہ

تصادم و تزاحم تو خیر دور کی بات ہے، شاید کسی قسم کی کوئی قابل ذکر شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی، نہ باشندگان کی طرف سے کبھی ایسی کوئی آواز بلند ہوئی اور نہ خود قصبہ میں باوجودیکہ ہندوؤں کی کافی آبادی ہے ان ہی کو شکایت کا موقعہ میری دانست میں کبھی ملا ہے[1]۔

بہرحال یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ چاندا پور کے میلوں میں جو کچھ دیکھا گیا تھا، اگر سوچا جائے تو یہ نظارہ ان ہی میلوں کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا، بلکہ "دارالعلوم دیوبند" کی پوری تاریخ میں اس باغ کی باغبان کی وہ روش اب تک نظر آتی ہے، جسے دیکھنے والوں نے ضلع شاہجہاں پور کی مقامی ندی گرّا ناسی کے ساحل پر دیکھا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی ہند کی موجودہ مشکلات کے حل میں چاہا جائے تو اس روش سے آج بھی استفادہ کا امکان باقی ہے، واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

اور عمل کے لئے خدا شناسی کے ان میلوں سے جہاں یہ روشنی ملتی ہے، ویں عجیب بات ہے کہ علم کے دائرہ میں ہم جن "نظریات تائقہ" کی تعبیر "حکمت قاسمی" سے کر سکتے ہیں، یا چاہئے کہ کریں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی میلوں کی بدولت پہلی دفعہ وہ قلم بند ہوئے، میرا اشارہ سیدنا الامام الکبیر کی مشہور کتاب "حجۃ الاسلام" کی طرف ہے۔ اس کتاب میں کیا ہے، ظاہر ہے اس پر بحث کا موزوں ترین مقام تو سیرت طیبہ کی بعد کی جلد ہی ہو سکتی ہے، جس میں آپ کے خصوصی نظریات کی ترتیب و تبویب کا کام کیا جائے گا، مختصر لفظوں میں سردست اس سلسلہ میں بس اتنی بات کافی ہے، کہ اس کتاب کا خاص اڈیشن جب شائع ہوا تھا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا کہ

---

[1] ہاں افراتفری کے ان ہیبت ناک دنوں میں جب ۱۹۴۷ء میں غیر ملکی حکومت اچانک اپنے سیاسی اقتدار سے دست بردار ہو کر اس ملک سے رخصت ہو رہی تھی، جہاں دست و خیز کے اس ہنگامہ میں سب کچھ دیکھا گیا، دارالعلوم کو بھی بعض ناگوار حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن تحقیق نے اس وقت بھی یہی ثابت کیا، کہ شکایت کا مستحق دارالعلوم نہیں، بلکہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے گھن کے ساتھ گیہوں کے پیس دینے کا غلط اقدام کیا تھا۔

"اس تحریر کی نسبت حضرت مولانا و سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے یہ بھی سنا گیا کہ جو مضامین تقریر دل پذیر میں بیان کرنے کا ارادہ ہے، وہ سب اس تحریر میں آ گئے، اتنا تفصیل سے نہ سہی، بالاجمال ہی سہی۔" ص۳

جیسا کہ معلوم ہے "تقریر دل پذیر" نامی کتاب میں اسلام کے علمی و عملی نظام کو تعبیر و استدلال کے نئے پہلوؤں میں ڈھالنے کا ارادہ سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا، لیکن چند ابتدائی ابواب سے زیادہ یہ کتاب لکھی نہ جا سکی۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے لکھا تھا کہ

"تقریر دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قلق شائقان اسرار علیہ کو ہے، اس کی مکافات کی صورت بھی اس رسالہ (حجۃ الاسلام) سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی۔"

پھر اسی کتاب حجۃ الاسلام کے متعلق اپنے ذاتی احساس کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ارقام فرمایا تھا کہ

"تائید احکام اسلام، اور مدافعت فلسفہ قدیمہ و جدیدہ کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں، ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء (سیدنا الامام الکبیر) کے رسائل کے مطالعہ میں کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں، اور پورے غور سے کام لیں، اور انصاف سے دیکھیں، کہ ضروریات موجودۂ زمانۂ حال کے لئے وہ سب تدابیر سے فائق اور مختصر، اور بہتر و مفید تر ہیں، یا نہیں۔" ص۲

بظاہر ان الفاظ کا تعلق اگرچہ عام رسائل سے معلوم ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر "حجۃ الاسلام" ہی کے انہی پہلوؤں کی طرف حضرت شیخ الہندؒ نے ان جامع و مانع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، آپ کے اس دعوے کی توثیق تجربہ سے ہوتی ہے،

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چاندا پور کے یہ میلے خواہ کسی نیت اور ارادے سے جائے گئے ہوں، لیکن منجملہ دوسرے فوائد کے ایک بڑا علمی و دینی فائدہ ان میلوں کا یہ بھی ہوا، جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسی دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"بندہ محمود" حمد و صلوٰۃ کے بعد طالبان معارف الٰہیہ اور دل دادگان اسرار ملتِ حنیفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ۱۸۷۶ء میں پادری نولس صاحب اور منشی پیارے لال صاحب ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شاہ جہان پور نے جب ایک میلہ بنام "میلہ خداشناسی" موضع چاندا پور میں مقرر کیا، اور اطراف و جوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوائے کہ ہر مذہب کے علماء آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل سنائیں، تو اس وقت معدن الحقائق، مخزن الدقائق، مجمع المعارف، مظہر اللطائف، جامع الفیوض والبرکات، قاسم العلوم والخیرات سیدی مولائی حضرت مولانا محمد قاسم متعنا اللہ بعلومہ و معارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلہ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت میں مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ ۷ رمئی سر پر آگئی، چونکہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ مذاہب اور بیان دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی، اعتراضات و جوابات کی نوبت آئے گی، یا زبانی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت بیان کیا یا ثابت تحریری ہر کسی کو پیش کرنے پڑیں گے، تو اس لئے بہ نظر احتیاط حضرت مولانا قدس اللہ سرہ کے خیال مبارک میں یہ آیا کہ ہر ایک تحریر جو اصول اسلام اور فروع ضروریہ بالخصوص جو اس مقام کے مناسب ہوں، سب کو شامل ہو، حسب قواعد عقلیہ منضبط ہونی چاہئے، جس کے تسلیم میں عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے۔"

اسی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے یہ اطلاع دی ہے کہ

"چونکہ وقت بہت تنگ تھا، اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ غالباً ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔"

لیکن جیسا کہ گذر چکا تحریری مقالے کے سنانے کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کو نہ ملا، بلکہ بقول شیخ الہندؒ

"جلسہ مذکور میں تو مضامین مندرجہ تحریر مذکور کو زبانی ہی بیان فرمایا، اور درباره حقانیت اسلام جو کچھ بھی فرمایا، زبانی ہی بیان فرمایا۔"

مگر میلے کے بہانے سے "قاسمی معارف" کا ایک قیمتی حصہ، اور صدیوں کام آنے والا سرمایہ جو تیار ہو گیا تھا، اس نے تو تحریر کا قالب اختیار کر لیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سلسلہ میں یہ خبر بھی دی ہے کہ

"مولانا مولوی فخر الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے (یعنی قلم بند شدہ تحریر کے) مضامین کے لحاظ سے اس کا نام "حجۃ الاسلام" تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا۔" ص

"خدا شناسی کے میلہ" کی سرگذشت کو ختم کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی کتاب "حجۃ الاسلام" کے ذکر کی تقریب سے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے اکثر حصہ کو میں نے اس لئے بھی نقل کر دیا ہے کہ براہ راست اس میلہ میں اپنے حضرت الاستاذ سیدنا الامام الکبیر کی ہمرکابی میں شیخ الہند بھی شریک تھے، اسی لئے جو کچھ آپ نے لکھا ہے شنیدہ نہیں دیدہ ہے، آپ کے قلم مبارک کی لکھی ہوئی اجمالی روداد کو مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب میں بھی تبرکاً درج کیا جائے۔ اور ضمناً یہ اشارہ

ل تعارف کے اسی مضمون میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"صاحبان مطابع اس عجالہ مقبولہ (حجۃ الاسلام) اور نیز دیگر تصانیف حضرت مولانا (سیدنا الامام الکبیر) رحمۃ اللہ علیہ کی اشاعت دیکھ کر صرف بغرض تجارت معمولی طور پر ان کو چھاپتے رہے، کسی زائد اہتمام کی حاجت ان کو محسوس نہ ہوئی، اس لئے فقط کاغذ اور لکھائی چھپائی ہی میں کوتاہی نہیں ہوئی، بلکہ تصحیح عبارت میں نمایاں خلل پیدا ہو گئے"

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے "حکمت قاسمیہ" کی نشر و اشاعت کی تجویز کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"اس حالت کو دیکھ کر کشش بردارن قاسمی و دل دادگان اسرار علمی کو بے اختیار اس امر پر کربستہ ہونا پڑا کہ صحت و خوش خطی وغیرہ تمام امور کا اہتمام کر کے اس عجالہ مقدسہ کو چھاپا جائے اور بغرض توضیح حاشیہ پر ایسے نشانات کر دیئے جائیں جن سے تفصیل مطالب ہر کسی کو بے تکلف معلوم ہو جائے، اور

جملہ تصانیف حضرت مولانا نفع اللہ المسلمین بفیوضہ

کو اسی کوشش اور اہتمام کے ساتھ چھاپ کر ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے، واللہ ولی التوفیق"

لیکن شاید حجۃ الاسلام کے سوا سیدنا الامام الکبیر کی دوسری کتابوں کے متعلق اس تجویز کے مطابق عمل کا رباقی تشنہ رہ

بھی کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے واقعات تاریخ میں ایسے گذرے ہیں، جن کے دور رس نتائج کا اندازہ ان کے وقوع کے زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا تھا، جو بعد کو لوگوں کے سامنے آئے، یہی حجۃ الاسلام کتاب ہے لکھی تو گئی ہے کل ایک دن اور رات کے کچھ حصے میں، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے مضامین سے دنیا کب تک کن کن حالات میں کس حد تک مستفید ہوتی رہے گی، اور کتنوں کی ذہنی راتیں اس کتاب کی روشنی سے دن بنتی چلی جائیں گی، مجھے تو یہی رنگ ان عملی نمونوں کا بھی معلوم ہوتا ہے، جو ان میلوں میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے خواہ جتنے مختصر زمانہ میں بھی پیش ہوئے ہوں، مگر فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو ہندوستان کی اسلامی آبادی اپنے بود و باش کے الجھے ہوئے مسائل کو چاہے تو ان نمونوں کی مدد سے آج بھی سلجھا سکتی ہے۔ وما یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الا ذو حظ عظیم۔

بہر حال خدا شناسی کا یہ میلہ تو ختم ہو گیا، معلوم نہیں کہ اس کا سلسلہ آئندہ سالوں میں جاری رہا یا ان ہی دو میلوں تک قصہ ختم ہو گیا، جو بقول ہمارے مصنف امام درحقیقت قائم ہی اس لئے ہوا تھا، اور قدرت کی غرض ہی یہ تھی کہ

(گذشتہ صفحے سے) موقع نہ مل سکا میں نے اس تجویز کے الفاظ کو بجنسہ اس لئے نقل کر دیا ہے، کہ دار العلوم دیوبند اور اس کے ارباب نسبت و کشاد بلکہ شاید تمام وابستوں پر ایک قرض ہے، جو چڑھا چلا آ رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ قرض کب ادا ہوگا، دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ دیوبند کے اس معنوی سرمایہ کو جب اس کے شایان شان لباس پہنانے کا ارادہ کیا گیا، تو یہ عجیب اتفاق ہے کہ نظر انتخاب علیگڈھ پر پڑی، اور حجۃ الاسلام کا یہ خصوصی اڈیشن مطبع احمدی علیگڈھ میں چھاپا گیا، اسلام کی معنوی و صوری یا قلب و قالب کی خدمت کے سلسلہ میں تقسیم عمل کا یہ حسن اتفاق، باہمی وفاق کا کتنا اچھا اشارہ ہے۔ ۱۲

عہ اس قرض کی ادائیگی الحمد للہ شروع کر دی گئی ہے، حضرات کارکنان دار العلوم نے یہ بار ذاتی طور پر اپنے سر لے لیا ہے، ایک مستقل ادارہ بنام ادارہ نشر و اشاعت قائم کر کے اس میں ایک مستقل فنڈ اسی لئے کھول دیا گیا ہے کہ اس میں اسلاف دار العلوم بالخصوص حضرت بانی دار العلوم کے علوم اور تصانیف کو اچھے لباس کے ساتھ منظر عام پر لایا جانے کا کام شروع کر دیا گیا ہے، اور امید ہے کہ عنقریب جدیدیات قاسمیہ اور حکمت قاسمیہ کے مظاہر (تصانیف قاسمیہ) سامنے آنی شروع ہو جائیں گی۔ واللہ ولی التوفیق ۱۲ محمد طیب غفرلہ

"ان دو سال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص یعنی سیدنا الامام الکبیر یا کس پایہ کا ہے، اور فضل الٰہی کی کیا صورت ہوا کرتی ہے۔ "جز بہ تائید آسمانی نیست" کا نقشہ ظاہر ہو گیا۔" ص۳۵ سوانح قدیم

اور گو عام طور پر علمی حلقوں میں سیدنا الامام الکبیر کی علمی و عملی عظمت کا سکہ پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں آپ کی شہرت کا ذریعہ بظاہر ان ہی میلوں کی غیر معمولی کامیابیاں بن گئیں ان میلوں سے فارغ ہو کر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں جب

"بحمد اللہ نصرت اسلام کا پھریرا اڑاتے ہوئے حضرت مولنا المعظم واپس تشریف لائے" ص۷ (تعارف حجۃ الاسلام)

عرض کر چکا ہوں کہ دوسرے سال کے میلے کے بعد چند دن آپ کا قیام شہر شاہ جہاں پور رہا، مہمان نوازی کا فرض مولوی طاہر صاحب آنریری مجسٹریٹ یعنی ملا دن والے موتی میاں نے ادا کیا، اسی زمانہ میں جب موتی میاں کے یہاں دوسرے علماء جو میلے میں شریک ہوئے تھے، ان کے ساتھ مقیم تھے یہ تحریک کی گئی تھی کہ منشی اندرمن اور پنڈت دیانند سرسوتی دونوں صاحبوں کو چاندا پور سے جہاں منشی پیارے لال بانی جلسہ کے یہاں یہ دونوں مہمان تھے، شاہ جہاں پور بلایا جائے۔ خط لیکر آدمی چاندا پور گیا، بتا چکا ہوں کہ جواب میں دونوں صاحبوں نے آنے سے معذرت کی اور لکھا کہ آپ ہی لوگ چاندا پور آئیں، سند دادیا ہے۔ اکہ اس کے بعد

"مولوی محمد طاہر صاحب (موتی میاں) نے باشارہ مولوی محمد قاسم و حسب صلاح مولوی محمد علی صاحب (مصنف سوط اللہ الجبار) پھر مکرر لکھا کہ جنگل میں ہونا تھا کس نے دیکھا اور اب سکا دینی چاندا پور کا مجمع برخاست ہو گیا، اب وہاں کون ہے جو مباحثہ کا لطف اٹھائیگا۔"

ص۳۳ مباحثہ شاہ جہاں پور

لیکن باوجود دوبارہ تقاضے کے نہ منشی اندرمن ہی شاہ جہاں پور آنے پر راضی ہوئے اور نہ پنڈت جی ہی آئے۔ لکھ بھیجا تھا کہ

"آپ کے (یعنی موتی میاں کے) مکان پر نہیں آتا، ہاں! اگر منشی گنگا پرشاد ہوتے، جن کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مقام شاہ جہاں پور ہو گئی ہے، تو ان کے مکان پر میں آسکتا تھا۔" مباحثہ شاہ جہاں پور

اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی یہ کوشش تھی کہ منشی اندرمن، یا پنڈت دیانند سروتی جیسے لوگوں سے جو اس زمانہ میں اچانک مسلمانوں اور مسلمانوں کے دین پر اعتراض و تنقید کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، براہ راست ملیں لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ براہ راست ملاقات اور مکالمہ سے گریز کی راہ وہ کیوں اختیار کرتے رہے۔

شاہ جہاں پور کا یہ قصہ تو خیر شاہ جہاں پور ہی پر ختم ہو گیا، اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر گھر واپس ہوئے، چند ہی مہینے گذرے تھے کہ اچانک تیسرے حج کے سفر کا ارادہ کر کے آپ حجاز روانہ ہو گئے آپ کے اس حج کا جو آپ کی زندگی کا آخری حج تھا، اس کی تفصیل تو آگے آرہی ہے، آمد و رفت میں تقریباً چھ مہینے صرف ہوئے، یعنی دوسرا میلہ تو ۱۸۷۸ء کے ماہ مارچ میں منعقد ہوا تھا اسی سال کے ماہ اکتوبر میں آپ راہی حجاز ہوئے، اور جیسا کہ مصنف امام نے خبر دی ہے، اس حساب سے دوسرے سال ۱۸۷۹ء ماہ مارچ میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔ گویا حج و زیارت کا یہ سفر چھ مہینے میں پورا ہوا تھا۔

مارچ کے بعد صرف اپریل و مئی و جون کے تین ہی مہینے گذرے تھے، واپسی بھی اتنے طول و طویل سفر سے ہوئی تھی، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، کہ سفر سے واپس ہوتے ہوئے، مکہ اور جدہ کے درمیان آپ پر اس مرض کا حملہ ہوا، جو آپ کی ناسوتی زندگی کی گویا آخری علالت تھی۔ کسی نہ کسی طرح ہندوستان آنے والے جہاز پر آپ کو سوار تو کر دیا گیا تھا لیکن جہاز ہی میں مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"ایک دن یہ نوبت ہوئی، کہ ہم سب مایوس ہو گئے۔" ص۴۲

گو یہ مایوسی واقعی مایوسی اس وقت ثابت نہ ہوئی، لیکن مرض کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وطن پہنچنے کے بعد بھی زیر علاج رہے، کلی صحت تو پھر بھی حاصل نہ ہو پائی تھی، لیکن بقول مصنف امام

"مرض دفع ہوا، گو نہ طاقت آئی، مگر کھانسی ٹھیر گئی، اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا۔
زیادہ بولنا، دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا، پھر اس میں بھی کچھ تخفیف ہوئی" ص۳۲

"کچھ تخفیف ہوئی" کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ تکلیف کا کلی ازالہ نہیں ہوا تھا، آپ ان ہی حالات میں تھے، کہ وہی پنڈت دیانند سرسوتی جی نے ہندوستان کے طویل و عریض رقبہ میں خدا ہی جانتا ہے کہ کن مصلحتوں کے زیر اثر اپنی کد و کاوش کا مرکز ضلع سہارنپور کے قصبہ رڑکی کو بنا لیا، سیدنا الامام الکبیر نے اپنی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ میں خود ہی ارقام فرمایا ہے کہ

"بعد حمد و صلوٰۃ بندۂ ہیچمدان، سراپا گناہ محمد قاسم ناظرین اوراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ سن بارہ سو پچانوے (۱۲۹۵) ہجری رجب (مطابق ۱۸۷۸ء ماہ جولائی) میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آ کر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کئے" ص۲

نہیں کہا جا سکتا کہ رجب کے جس مہینہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس مہینہ کی کس تاریخ سے پنڈت جی کی گل افشانیاں کھیلے، یا شرربار یوں کا یہ قصہ رڑکی میں شروع ہوا تھا، بظاہر قیاس کا اقتضاء ہے کہ آخری رجب میں پنڈت جی نے رڑکی پہنچکر پادریوں کے طریقہ سے بر سر بازار اسلام کو اپنے تیروں کا نشانہ بنا لیا، رڑکی کے مسلمان بے چین ہو گئے، شاہجہاں پور کے میلوں کی سرگذشت عام طور پر مشہور بھی ہو چکی تھی، نیز قرب مکانی کی وجہ سے قدرتاً رڑکی کے مسلمانوں کی نظر سیدنا الامام الکبیر ہی پر پڑ سکتی تھی، واللہ اعلم آدمی رڑکی سے آئے، یا ڈاک سے اطلاع دی گئی، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اختتام رجب کے بعد شعبان میں یہ خبر سیدنا الامام الکبیر تک پہنچی، انہوں نے لکھا ہے کہ

"اسی سال (۱۲۹۵ھ جس میں حجاز سے واپسی ہوئی تھی) شعبان میں رڑکی سے خبر لی کہ پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں، اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشتہر کئے ہیں، اہل رڑکی مصر ہوئے کہ آپ تشریف لائیں"

مشتہر کرنے کا مطلب وہی ہے کہ پادریوں کی ریس میں پنڈت جی نے بھی بر سر بازار اپنی گل افشانیاں کیں کر

باشندے ریاستوں کا سلسلہ شروع کیا تھا' پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں' پنڈت جی اپنی ذہانت کے زور سے اس دعوے کا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑی بت پرست قوم مسلمانوں کی ہے۔ بظاہر رڑکی میں بھی اپنی اسی اچھوتی اور انوکھی اپج سے مسلمانوں کے دل و دماغ کو مجروح کر رہے تھے۔ پنڈت جی کے اعتراضوں میں گل سرسبد کی حیثیت اسی اعتراض کو حاصل تھی' اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے' کہ رڑکی کے اسی قصے کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر نے "قبلہ نما" نامی اپنی کتاب اسی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے' بہرحال شعبان میں پنڈت جی کی آمد کی خبر ملی' رڑکی کے مسلمانوں نے تو خیر طلب ہی کیا تھا' لیکن اس بیرونی کشش کے سوا سچ پوچھئے' تو خود سیدنا الامام الکبیر بھی رڑکی کی آئی ہوئی خبروں سے تلملا اٹھے تھے' اسی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ

"حسب الطلب بعض احباب (رڑکی) اور بتقاضائے غیرتِ اسلام یہ ننگِ اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں (رڑکی) پہنچا" ص۲

اس میں شک نہیں کہ رڑکی کا فاصلہ زیادہ نہ تھا' لیکن ذرا سوچئے تو سہی ان باتوں کو کہ حجاز کے طویل و طویل سفر سے ابھی آپ واپس ہوئے ہیں' اور واپسی بھی ایسی شدید علالت کے ساتھ ہوئی ہے' گو مرض میں وقتی طور پر گونہ افاقہ کی صورت ظاہر ہو چکی تھی' لیکن ضعف ہی نہیں' بلکہ مصنف امام نے جو اطلاع دی ہے' کہ

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے"

اس سے معلوم ہوتا ہے' کہ مرض کا لگاؤ بھی باقی تھا۔ مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب مذہب منصور میں رڑکی کے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے جس کا آگے ذکر آرہا ہے' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے' کہ رڑکی کا یہ سفر بہلی میں کیا گیا تھا۔ بیل کی اس گاڑی کے ہچکولوں کی اچھے اچھے تندرستوں کے بھی انجر پنجر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں' پھر مرض اور مرض کی نقاہت کے ساتھ یہ سفر جس حد تک تکلیف دہ ہو سکتا ہے' خصوصاً راستہ بھی جب ہموار نہ ہو' قبلہ نما کے

دیباچہ میں "راہ کی خرابی" کا ذکر بھی کیا گیا ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، کہ "غیرتِ اسلام" کے تقاضے نے ہر تقاضے کو سامنے سے ہٹا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی توہین کا خیال، ہر خیال پر غالب ہے، جس حال میں تھے "کھنچے ہوئے رڑکی پہنچ گئے" اور عجیب شان کے ساتھ پہنچے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ رڑکی کے اس سفر میں یہی نہیں کہ

"بہت سے خادم ساتھ ہولئے" ص۱۴۲

بلکہ شاہجہاں پور کے قصے مسلمانوں میں جو پھیلے ہوئے تھے، بظاہر ان ہی کا اثر تھا، کہ لوگوں کو جب خبر ہوئی کہ سیدنا الامام الکبیر اور پنڈت دیانند جی میں مباحثہ و مناظرہ بہ مقام رڑکی ہونے والا ہے، تو

"اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولنا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہو گئی" ص۱۴۲

خلافِ دستور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ رڑکی کے اس معرکہ میں قصداً اپنے خاص خاص شاگردوں کو جو دوسرے مقامات میں تھے، آپ نے طلب کر لیا تھا، مولنا حکیم منصور علی صاحب جو اس زمانہ میں منگلور نامی قصبہ میں کسی مدرسہ میں مدرس تھے جو دیوبند اور رڑکی کے درمیان راستہ میں ملتا تھا، حکیم صاحب نے لکھا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"ایک تلمیذ رشید (مولنا فخر الحسن گنگوہی) کو منگلور بھیجا، کہ اس کو (یعنی حکیم صاحب کو) ملنے کے لئے بلا لاؤ۔ میں یہ مژدہ سنتے ہی مولوی فخر الحسن گنگوہی کے ہمراہ چلا گیا، شرکت پر بہلی کو ٹھیراکر فرمایا، تم بھی ضرور رڑکی آجانا۔ حسب الارشاد دو تین روز بعد میں بھی رڑکی پہنچا" ص۱۹ مذہب منصور

بہر حال خدام خاص (تلامذہ وغیرہ) کے سوا عام مسلمانوں کا بھی کافی مجمع معلوم ہوتا ہے، کہ رڑکی میں اکٹھا ہو گیا تھا، گویا ایک برات ہی اتر پڑی تھی۔ اسی کے ساتھ جب ہم حضرت والا ہی کی براہ راست دی ہوئی اس اطلاع کو پڑھتے ہیں یعنی رڑکی پہنچنے کے بعد اقامت فرمایا گیا ہے کہ

"ارادۂ مناظرہ میں سولہ سترہ دن وہاں (رڑکی) ٹھیرا رہا" قبلہ نما ص۲

تو یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، نصف ماہ سے زیادہ دن تک باہر سے آئے ہوئے اتنے بڑے مجمع کے رہتے سہنے، کھانے پینے کا نظم، اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ ہر شخص اپنے کھانے پینے کا خرچ خود برداشت کرے، یہی حکم سیدنا الامام الکبیر کا تھا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اور مہینہ بھی جولائی آغاز موسم برشگال کا۔

"علاوہ بریں برسات کا موسم"

ان الفاظ سے قبلہ نما کے اسی دیباچہ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

لیکن اپنے ذاتی ضعف مرض، اور اتنے بڑے مجمع کے قیام و طعام کی دشواریوں سے بے پروا ہو کر تین چار دن نہیں بلکہ سولہ سترہ دن تک آپ رڑکی میں کیوں مقیم رہے؟

بظاہر جیسا کہ خود آپ کے ذاتی بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے، اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی سے آپ براہ راست دوبدو ہو کر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ قبلہ نما کے دیباچہ میں آپ کے الفاظ ہیں کہ

"ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہ بعنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں"

لیکن جیسا کہ مصنف امام نے اجمالاً یہ خبر دی ہے، کہ

"وہ اللہ کا بندہ (پنڈت دیانند سرسوتی) گفتگو پر یکانہ ہوا۔ اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا" [۱]

ان اینڈی بینڈی شرطوں" کی تفصیل تو آپ خود سیدنا الامام الکبیر ہی کے حوالہ سے آگے سنیں گے لیکن ان سے زیادہ دلچسپ حصہ مصنف امام کی خبر کا یہ ہے، کہ

"وہ اللہ کا بندہ گفتگو پر یکانہ ہوا"

آپ پچھلے ہی سے سن چکے ہیں کہ گفتگو یعنی بحث و مباحثہ، مناظرہ و مجادلہ کے میدان کے پنڈت جی اپنے وقت میں دھنی تھے، جے پور پہنچ کر راجہ رام سنگھ والی جے پور کے دربار کے فاضل پنڈت

رنگا چاریہ کو چیلنج پر چیلنج دے رہے تھے، آگرہ، اجمیر، پشکر جہاں پہنچے اشیوست کا جس کی پنڈت جی شد و مد میں پابند تھے۔ منڈن یعنی تائید اور وشنومت کا کھنڈن یعنی تردید اسی کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ پنڈتوں کے قدیم دائرے سے باہر نکلنے کے بعد جب عیسائیوں، مسلمانوں وغیرہ ہندستان کے مختلف مذہبی گروہ کے دین پران کے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا تھا، سہارنپور سے داناپور تک پنڈت جی نے اودھم مچا رکھی تھی، اپنی تقریروں اور مباحثوں میں پنڈت جی جن ہتھکنڈوں سے کام لیتے تھے، مدراس کے ڈاکٹر مرڈک ایم۔ اے ایل ایل ڈی کی شہادت ان کے متعلق گذر چکی کہ پنڈت جی کے ساتھ ان کی تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی رہتی تھی، اور جب پنڈت جی مباحثہ میں اپنے مخالف فریق کی

"ہنسی اڑاتے، قہقہہ لگاتے، تو یہ لوگ (منڈلی والے) اس کام میں ان کا ساتھ دیتے تھے"

اور یہی گواہی ڈاکٹر فارکوہار کی بھی نقل کر چکا ہوں جس میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی

"مباحثہ میں تند و ترش، بہت چیخنے والے اور مخالف پر ناجائز دباؤ ڈالنے والا تھے"

"سوامی دیانند اور ان کی تعلیم" نامی کتاب سے ان شہادتوں کو پہلے اپنے موقعہ پر پیش کر چکا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے مقابلہ میں آنے کے بعد نہ جانے کہ پنڈت جی پر کیا حال طاری ہوا، کہ خدا شناسی کے میلے میں سنسکرت آمیز بھاشا یعنی اسی زبان میں تقریر کی جس کے سمجھنے والے میلے میں دس پانچ آدمی بھی نہ تھے، نہیں کہا جا سکتا کہ پنڈت جی کے دل کا جو ارمان میلہ میں تھا دل ہی کے اندر رہ گیا تھا، اسی ارمان کو نکالنے کے لئے رڑکی پہنچے تھے اور رڑکی کے انتخاب کرنے کی وجہ یہی تھی کہ سیدنا الامام الکبیر کا وطن ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسی علاقے میں ہے، مگر اب اسے کیا کہئے، جب حضرت والا باوجود ضعف اور مرض کے رڑکی پہنچ گئے تو وہی پنڈت جی جنہوں نے رڑکی کے مسلمانوں کو بیٹھے بٹھائے بے چین کر دیا تھا، اور تنہا پیش قاضی روی راضی آئی، دائی مثال کے مطابق حضرت کی تشریف آوری سے پہلے سب کچھ

کہہ رہے تھے، وہی بجائے آگے بڑھنے کے گریز اور فرار کی راہ ڈھونڈھنے لگے، اور ان کے سارے پینترے، داؤ پیچ جو مباحثوں میں خرچ ہوتے تھے، رڑکی میں بالکل اس کے برعکس مباحثہ اور گفتگو کے روکنے میں استعمال ہوتے رہے، کوئی دوسرا لکھتا تو شاید شک و شبہ کی کچھ گنجائش بھی ہو سکتی تھی، لیکن اس سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی براہ راست شہادت ہے، قبلہ نما کے دیباچہ میں فرماتے ہیں

"مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے کہ میدان مناظرہ میں آتے، جان چرانے کے لئے وہ وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سوجھتے ہیں"

"داؤ کھیلنا" تو پنڈت جی کا عام دستور تھا، فرق یہی تھا کہ پہلے یہی کھیل وہ مباحثہ اور گفتگو کرنے میں کھیلتے تھے اور اب اسی داؤ کو وہ مباحثہ اور گفتگو کو ملتوی کرانے کے لئے کھیل رہے تھے۔ اس طرف پنڈت جی تو اپنے سارے کرتب اسی کوشش میں صرف فرما رہے تھے کہ کسی طرح سیدنا الامام الکبیر کا سامنا نہ ہو، اور دوسری طرف ٹھیک اس کے توڑ پر سیدنا الامام الکبیر کو دیکھا جا رہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پنڈت جی کو میدان میں اترنے پر مجبور کر رہے ہیں، خود ہی ارقام فرماتے ہیں، کہ برسر عام مباحثہ پر آمادہ کرنے کے لئے

"منتیں کیں، غیرتیں دلائیں، حجتیں کیں، سعیئیں کرائیں، مگر وہاں (یعنی پنڈت جی کے یہاں) وہی نہیں کی نہیں رہی"

افسوس ہے کہ ان منتوں، غیرتوں، حجتوں، سعیوں کی پوری تفصیل کا علم نہ ہو سکا، مصنف امام نے بھی حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا ہے۔ "اینڈی بینڈی شرطیں" بس ان ہی الفاظ میں سب کو لپیٹ کر انہوں نے رکھ دیا، اور دوسرے ذرائع سے بھی ان تفصیلات کا جیسا کہ چاہئے پورا پتہ چل سکا۔ چونکہ سولہ سترہ دن تک رد و بدل سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری رہا ہے، اس لئے بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ باتیں کافی دلچسپ ہوں گی۔ حکیم الامت تھانوی رح کے حوالہ سے قصص الاکابر میں ایک لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ پنڈت جی نے ایک دفعہ یہ عذر پیش کیا کہ۔

"میں اس ارادہ (یعنی مناظرہ و مباحثہ کے ارادہ) سے نہیں آیا ہوں"

تو معاً سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جواب میں کہا گیا کہ

"ارادہ تو فعل اختیاری ہے اب کر لیجئے"

"جھتیں کیں" کے اجمال کی یہ ایک مثالی تفصیل ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً نصف ماہ کے اس طویل عرصے میں کتنے نشاط انگیز، روح پرور لطائف پیش آئے ہوں گے لیکن افسوس کہ ذکر کرنے والوں نے عموماً خاموشی سے کام لیا، تاہم ادھر ادھر سے جن معلومات تک رسائی ہو سکی ہے، انہیں پیش کر دیتا ہوں زیادہ تر یہ معلومات خود حضرت کی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ ہی سے فراہم کی گئی ہیں۔ اسی کتاب میں ہے کہ رڑکی کی عام آبادی سے جہاں آپ مقیم تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر وہ جگہ تھی، جہاں پنڈت جی فروکش تھے۔ غالباً پنڈت جی کے کسی معتقد کا باغ تھا، سیدنا الامام الکبیر نے اطلاع دی ہے کہ

"ہماری فرودگاہ سے بلکہ شہر سے ان کا (پنڈت جی کا) مکان ڈیڑھ میل پر تھا" قبلہ نما ص

پنڈت جی کی یہی وہ قیام گاہ تھی، جہاں ان کے کھانے کا وہ تماشا دیکھا گیا تھا جس کا ذکر غالباً پہلے بھی کہیں گذرا ہے، امیر شاہ خان صاحب کے حوالے سے ارواح ثلاثہ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر اور پنڈت جی کے درمیان نامہ و پیام کے لانے اور لے جانے کا فرض اس زمانہ میں منشی نہال احمد مرحوم انجام دیتے تھے، خاں صاحب روایت کرتے تھے کہ

"منشی نہال احمد کو جو نہایت ذکی تھے، دیانند کے پاس شرائط مناظرہ طے کرنے کے لئے بھیجا گیا" صفحہ ارواح

ایک دفعہ جب منشی نہال احمد صاحب پنڈت جی کے پاس موجود تھے۔ پنڈت جی کی رسوئی کا وقت آ گیا، بقول خاں صاحب مرحوم انہوں نے دیکھا کہ

"کئی بڑی بڑی تھالیں پوریوں کی تھیں، اور سیروں مٹھائی تھی جس کو یہ (منشی نہال احمد) کئی آدمیوں کا کھانا سمجھے، مگر وہ اکیلے کے لئے آیا تھا، اور اسی تنہا نے وہ سب تھالیں

صاف کر دیں[1]"

اسی سلسلہ میں وہ لطیفہ پیش آیا تھا، جب سیدنا الامام الکبیر تک اس کی خبر پہنچی کہ منشی نہال احمد، پنڈت جی کے کھانے کی یہ رپورٹ لائے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کھانے میں مقابلہ کی پنڈت جی سے مولانا کی اگر ٹھن گئی، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ منشی نہال احمد مرحوم جو خود بھی پُرخوری میں کافی نیک نام تھے ان کو بلا کر حضرت والا نے فرمایا تھا کہ اس کے لئے آپ تو ہمارے ساتھ ہیں، تم ہی کو پنڈت جی سے بھڑا دوں گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے، اور زیادہ کھانا زیادہ احتیاج کی دلیل ہے اور احتیاج کمال نہیں نقص ہے، نقص میں بھلا کیا مقابلہ کیا جائے گا، خاں صاحب کے بیان میں یہ بھی ہے کہ آخر میں فرمایا گیا تھا کہ کھانے میں مقابلہ کی ٹھہر جائے تو

"کسی بھینسے یا ہاتھی کو لاکر کھڑا کر دینا[2]"

---

[1] پنڈت جی کے کھانے پینے کے قصے جیسا کہ ان کی سوانح عمریوں سے معلوم ہوتا ہے، کافی دلچسپ ہیں، انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ برہم چاری ہونے کی وجہ سے اپنا کھانا خود پکانا پڑتا تھا جس کی وجہ سے میری خواندگی میں حرج واقع ہوتا تھا، بنا بریں اس بکھیڑے سے چھوٹنے کیلئے میں نے ارادہ کیا کہ حتی الامکان کوشش کر کے سنیاس آشرم کے چوتھے عہد میں داخل ہو جاؤں (سوامی دیانند اور ان کی تعلیم صفحہ ۲۹ بحوالہ خود نوشت سوانح عمری) یوں گویا بے چارے پیٹ ہی کی مجبوری سے سنیاسی بنے۔ لذیذ کھانوں کا خاص شوق تھا، جس کے لئے رسوئیا، کہار وغیرہ رکھنے کی ضرورت ہوئی، اپنے حسب منشاء کھانا تیار کرانے کیلئے لکھا ہے کہ میزبانوں سے عموماً نقد روپیہ سوامی جی لے لیا کرتے تھے۔ لاہور پہلی دفعہ جب پہنچے تو ارزانی کے اس زمانہ میں بارہ روپیہ فی ہفتہ میزبانوں سے وصول کیا کرتے تھے۔ آخر میں ایک رسوئیا (باورچی) نے جیسا کہ ان کی سوانح عمریوں میں لکھا ہے زہر کھلا دیا۔ اور اسی زہریلے کھانے سے وفات ہوئی۔ تفصیل کے لئے پنڈت جی کی سوانح عمریوں کو پڑھئے۔ نیز کتاب "سوامی دیانند اور ان کی تعلیم" کا مطالعہ بھی کافی ہو سکتا ہے، خوش خوراک ہونے کے ساتھ پنڈت جی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کافی خوش پوشاک بھی ہو گئے تھے۔ مرنے کے بعد جیسا کہ میرٹھ کے اخبار آریہ سماچار میں چھپا تھا، متعدد سرخ زرد کامدار دوشالے، پشمینہ کی چادریں، پشمینے کے چغے، ریشمی دوشالے، دھیپ چھاؤں کے ریشمی دوپٹے، ریشمی چغے، ریشمی کرتے، سرخ پٹکا، ریشمی کناری کی دھوتیاں، کلابتوں کا دوپٹہ وغیرہ وغیرہ نکلے تھے۔ پنڈت جی کو تنہا کوہی نہیں بلکہ بھنگ وغیرہ چیزوں کے استعمال کی بھی عام عادت تھی ۱۲

[2] اس واقعہ میں یہ جز دیکھی میں نے اکابر سے سنا ہے کہ حضرت والا نے فرمایا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے نہ کہ نقص میں اور میں سمجھیں ہو کہ منشی نہال احمد سے فرمایا کہ تم اتنے دنوں صحبت میں رہے تمہارے ذہن میں (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال پنڈت جی شہر سے ڈیڑھ میل دور والے اسی مکان میں بیٹھے بیٹھے سوال و جواب کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھے حضرت والا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جیسے برسر بازار آپ نے اعتراضات کئے ہیں، ان کے جواب سننے کیلئے چاہئے کہ آپ برسر بازار آئیں، اپنے اعتراضات کو بیان کریں، اور سب کے سامنے مجھ سے ان کے جوابات سنیں۔ لیکن بجائے شہر آنے کے پنڈت جی کا اصرار تھا کہ گفتگو کے لئے آپ ہی میری قیام گاہ پر آئیے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ دوسری شرط پنڈت جی کی طرف سے یہ پیش ہوئی کہ آنا ہو، تو مجمع عام کے ساتھ نہ آئیے۔ زیادہ[1] سے زیادہ پچاس آدمیوں کے سامنے گفتگو کا موقعہ دیا جا سکتا ہے، واللہ اعلم ان پچاس آدمیوں میں پنڈت جی کے طرفداروں کا طبقہ بھی شریک تھا، یا حضرت والا کو پچاس آدمی کی حد تک اپنے ساتھ لانے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے قبلہ نما میں ارقام فرمایا ہے کہ

"اعتراض تو مجمع عام میں کئے۔ پر مناظرہ میں اپنی غلطی کھلنے کا وقت آیا تو پچاس آدمیوں سے زیادہ پر راضی نہ ہوئے"

لکھا ہے کہ وجہ آدمیوں کی تحدید کی جب پوچھی گئی، تو

"اندیشہ فساد زیب زبان تھا"

"اندیشہ فساد" کی جو آڑ پنڈت جی نے لی تھی۔ غالباً اسی سلسلہ میں حجت کو تمام کرنے کیلئے اپنی فطرت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

یہ سوال پیدا کیوں ہو کہ اگر کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کون جیتے گا یہ کہہ کر فرمایا کہ ہمیں بھی اور پنڈت جی کو کسی بند کوٹھری میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینے تک بلا خورد و نوش بند رکھا جائے، اور چھ ماہ بعد کھولا جائے تو جو ترو تازہ نکلے اس سے حق و باطل کا فیصلہ کیا جائے۔ محمد طیب غفرلہ

[1] "جواب ترکی بہ ترکی" میں یہ لکھ کر کہ "چاندا پور سے پہلے بھی مولوی محمد قاسم صاحب سے ان کو (پنڈت جی کو) پالا پڑا تھا۔ اس لئے وہاں نہ دس آدمیوں کی قید تھی نہ مجمع عام کو انکار نہ فساد کا اندیشہ نہ قتل کا کھٹکا، نہ تحریر کی ضرورت تھی نہ گوشہ تنہائی کی حاجت" صفحہ ۲۳ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں پنڈت جی نے کل دس آدمیوں کو ساتھ لانے کی اجازت دی تھی، پچاس تک رد و کد کے بعد راضی ہوئے تھے ۱۲

عام روش کے برخلاف حضرت والا اس اقدام پر مجبور ہوئے جس کا ذکر قصص الاکابر میں حکیم الامت تھانوی ؒ کے حوالے سے بایں الفاظ کیا گیا ہے

"مولنا محمد قاسم صاحب رڑکی دیانند سے مناظرہ کرنے کے لئے گئے اور بھی چند آدمی ساتھ ہو گئے۔ سنا ہے کہ مولنا ایک جگہ ٹھہرے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا تھا کہ کھانا بازار میں کھائیں، مجسٹریٹ کو خبر پہنچی، تو اول وہ سمجھا کہ دعوت خوری کے لئے آئے ہوں گے، مگر جب واقعی بات کی خبر ہوئی، کہ وہ اس طرح کے لوگ ہیں، تو اس کے دل میں بڑی قدر ہوئی، اور اس نے مولنا کو بلایا، اور اشتیاق ظاہر کیا۔"

حضرت حکیم الامت نے اس کے بعد بطور جملہ معترضہ کے یہ بیان کرتے ہوئے کہ

"مولنا کی عادت تھی کہ کبھی کسی بڑے آدمی سے نہ ملتے تھے۔ ایک دفعہ رامپور (ریاست) گئے نواب صاحب کو خبر ہوئی، تو مولنا کو بلایا۔ مگر مولنا نہیں گئے، اور یہ حیلہ کیا کہ ہم دیہاتی لوگ آداب شاہی سے واقف نہیں ہیں۔ خدا جانے کیا بے ادبی ہو جاوے۔ نواب صاحب نے کہا کہ آپ کو آداب وغیرہ سب معاف ہیں۔ آپ تشریف لائیں۔ ہمیں آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ مولنا نے جواب دیا کہ کیا تعجب کی بات ہے کہ اشتیاق تو آپ کو ہو ملنے کا، اور آؤں میں۔ غرض نہ گئے۔"

مگر پنڈت جی کو جس طرح بھی ہو، راہ پر لایا جائے۔ محض اس نصب العین کے تحت مجسٹریٹ کے بلانے پر حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"ملنے سے انکار نہ کیا۔ کیونکہ اس سے ملنے میں دینی مصلحت تھی۔"

مجسٹریٹ سے ملاقات ہوئی، اور اسی سلسلہ میں پنڈت جی کے طرز عمل کی شکایت کی کہ اعتراض تو انہوں نے برسر بازار کیا، اور اب جواب سننے کے لئے مجمع عام میں اس لئے آنا نہیں چاہتے، کہ ان کو فساد کا اندیشہ ہے۔ مجسٹریٹ سے بڑھ کر فساد کے اس بے بنیاد اندیشہ کے متعلق اور کون اطمینان دلا سکتا تھا۔ حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ

"مجسٹریٹ نے کہا کہ فساد کے ہم ذمہ دار ہیں"

اسی پر کہتے ہیں کہ پنڈت جی نے فرمایا تھا کہ میں نے مناظرہ کا ارادہ نہیں کیا۔ حضرت والا نے جس کے جواب میں کہا تھا کہ اب ارادہ کر لیجئے مگر اس اختیاری فعل پر بھی وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

جیسا کہ قبلہ نما کے حوالے سے براہ راست حضرت والا کے الفاظ نقل کر چکا ہوں کہ "پنڈت جی نے رڑکی میں سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراضات کئے ہیں" اسی لئے آپ نے چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہہ بعنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کردوں"

الغرض مجمع عام میں جو اعتراضات اسلام پر کئے گئے تھے، آپ کا مقصد تھا کہ جواب بھی ان کا مجمع عام ہی میں دیا جائے، اسی بنیاد پر یہ سوال ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جب جواب سننے سے پنڈت جی گریز کرتے رہے، اور اس حد تک اپنے گریز پر ان کا اصرار قائم رہا کہ علاقہ کے مجسٹریٹ کی ضمانت دہانی بھی اس اصرار سے ان کو ہٹا نہ سکی۔ ایسی صورت میں چاہیئے تو یہی تھا کہ قصہ کو ختم کردیا جاتا کہ اصل مقصد یعنی مجمع عام میں جواب سنانے کا موقعہ باقی نہ رہا تھا۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے پنڈت جی کا تعاقب جاری رکھا اور کس حد تک جاری رکھا، قبلہ نما کے دیباچہ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جواب سننے کے لئے پنڈت جی جب آمادہ نہ ہوئے، بلکہ حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے:

"مجمع عام کی جابد شواری دو سو تک آئے"

یعنی بجائے مجمع عام کے پنڈت جی نے کہلا بھیجا کہ زیادہ سے زیادہ دو سو آدمیوں کے درمیان آپ کے جوابوں کو سننے کے لئے میں تیار ہو سکتا ہوں۔ بظاہر جس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ و مباحثہ کے دونوں فریقوں کے آدمیوں کی تعداد دو سو سے متجاوز نہیں ہو سکتی، اور پنڈت جی کی ضد کہئے یا ہٹ دھرمی اسی نقطہ پر ختم نہیں ہوگئی، بلکہ اسی کے ساتھ یہ فرمائش بھی پیش ہوئی کہ جس جگہ میں ٹھیرا ہوا ہوں وہیں آپ آئیں، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آگے حضرت والا نے قبلہ نما میں جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مگر اپنے مکان تنگ کے سوا اور کہیں راضی نہ ہوئے"

اس کا یہی مطلب ہے کہ اپنی فرودگاہ ہی پر سیدنا الامام الکبیر کو آنے پر پنڈت جی نے مجبور کیا، جیسا کہ عرض

کرچکا ہوں کہ پنڈت جی کی یہ قیام گاہ اس جگہ سے جہاں حضرت والا ٹھیرے ہوئے تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھی، یہی نہیں بلکہ شہر جہاں عام مسلمانوں کی آبادی تھی۔ اس سے بھی یہی فاصلہ تھا۔ فساد کا اندیشہ جیسے پنڈت جی کو تھا، یہی اندیشہ دوسری طرف سے بھی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن پنڈت جی کی یہ شرط بھی مان لی جاتی ہے، فاصلہ کی درازی کی وجہ سے وقت بجائے شام کے چاہا گیا کہ صبح کو رکھا جائے۔ تاکہ آمدورفت میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو، لیکن پنڈت جی نے اس تجویز کو بھی مسترد کردیا، اور بجائے اس کے اپنی طرف سے شام کا وقت پیش کیا اور شام کو بھی چھ بجے کا وقت دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ چھ بجے کے بعد دن ہی کتنا باقی رہتا ہے۔ وقت کی تنگی کی شکایت کی گئی تو کہلا بھیجا کہ چھ بجے سے نو بجے تک میں وقت دے سکتا ہوں۔ ان ہی باتوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ

"وقت صبح کے بدلے چھ بجے شام کے ٹھیرائی۔ کمی وقت کی شکایت کی تو نو بجے تک اجازت آئی۔"

قید و بند کے ان سارے قصوں سے مطلب کیا تھا، حضرت والا نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"نو بجے فارغ ہو کر چلو تو ڈیڑھ میل کی مسافت کو طے کرکے، دس بجے (شہر) پہنچے، ایک گھنٹہ میں نماز سے فارغ ہوئے۔ اس وقت نہ بازار کھلا ہوا جو کھانا مول لیجئے، نہ خود پکانے کی ہمت جو یوں انتظام کیجئے۔ علاوہ بریں برسات کا موسم، مینھ برس گیا، تو اور بھی اللہ کی رحمت ہوگئی۔"

تہ کی بات یہ تھی جیسا کہ حضرت ہی نے لکھا ہے کہ

"ان کی (پنڈت جی کی)، یہ غرض تھی کہ یہ لوگ (یعنی سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء) تنگ ہو کر چلے جائیں اور ہم بغلیں بجائیں۔"

کچھ تحریری و تقریری مناظرے کی بحث بھی معلوم ہوتا ہے پنڈت جی کی طرف سے چھیڑی گئی حضرت کے الفاظ

"پھر اس پر تحریر و تقریر کی شاخ اوپر لگی ہوئی۔"

سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔

بہرحال جہاں تک واقعات کا اقتضا ہے۔ ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے سامنا کرنے کے لئے درحقیقت کسی شرط پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن ٹھیک اس کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو آپ چاہتے تھے کہ دو بدو گفتگو کرنے کا موقعہ پنڈت جی سے مل جائے۔ اسی لئے جو شرطا اور قید و بند کی جو صورتیں بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی رہیں، سیدنا الامام الکبیر ہر ایک کو تسلیم کرتے چلے جاتے تھے، خود ہی لکھا ہے کہ

بنام خدا ہم نے سب باتوں کو سر رکھا "

گویا مان لیا گیا۔ کہ آپ نہیں آتے، ہم ہی آتے ہیں۔ صبح کو نہیں شام ہی کو آئیں گے۔ کھانے پینے کا نظم ہو یا نہ ہو بہرحال برسات کی کالی بھیلی راتوں میں دس بجے ہی ہم واپس ہوں گے لیکن پنڈت جی نے اپنی فرودگاہ والی شرط جو پیش کی تھی، اسی میں ایک قانونی راز مضمر تھا۔ رڑکی میں فوجی چھاؤنی اس وقت تک قائم ہو چکی تھی۔ اور باغ جس میں پنڈت جی ٹھیرے ہوئے تھے، کنٹونمنٹ ہی کی حدود کے اندر واقع تھا۔ فوجی قانون کی رو سے کنٹونمنٹ کی حدود میں مذہبی بحث و مباحثہ کے جلسوں کی قانوناً اجازت نہیں ہوتی، پنڈت جی اس فوجی دستور سے غالباً واقف تھے۔ کنٹونمنٹ والوں کو جب اس کا علم ہوا کہ چھاؤنی کی حدود میں اس قسم کا قصہ پیش آنے والا ہے، تو جیسا کہ حضرت والا نے لکھا ہے

"حکام وقت نے قطعاً ممانعت کر دی کہ سرحد چھاؤنی رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے اور اس سے خارج ہو تو کچھ ممانعت نہیں " ص

یوں پنڈت جی کی قیام گاہ کا قصہ ختم ہو گیا، اور یہی پنڈت جی کی غرض بھی تھی۔ مگر اس کے بعد بھی سیدنا الامام الکبیر نے چاہا کہ قصہ ختم نہ ہو، کنٹونمنٹ کی حدود کے باہر بعض محفوظ مقامات تھے۔ انتہا یہ ہے کہ عیدگاہ جس کی حیثیت گو نہ مسجد جیسی تھی اس کے میدان تک میں حضرت والا راضی ہو گئے کہ پنڈت جی

آنا چاہیں، تو ہم ان کا استقبال کریں گے، خود ان کے الفاظ ہیں کہ

"ہم نے میدانِ عیدگاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماس قدم رنجہ فرمائی کیا"

مگر خدا ہی جانتا ہے کہ وہی پنڈت دیانند سرسوتی جو دنیا بھر کو مناظرہ اور مباحثہ کا چیلنج دیتے پھرتے تھے ان پر کیا حال طاری تھا، کہ کسی طرح وہ رودررو ہونے پر آمادہ نہ ہوئے، اور اس سے بھی حیرت انگیز سیدنا الامام الکبیر کا طرزِ عمل ہے، کہ روز دو روز نہیں، نصف ماہ سے زیادہ مدت تک تمام مشاغل سے الگ ہو کر رڑکی ہی میں صرف اس لئے خیمہ زن ہو گئے، کہ جس طرح بھی ممکن ہو پنڈت جی سے براہ راست مکالمہ گفتگو کا موقعہ پیدا کیا جائے۔ پنڈت جی کی طرف سے شروط پر شروط کے اضافے ہوتے چلے جاتے تھے، اور آپ ہیں کہ ان کی ایک ایک شرط کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے چلے جاتے ہیں گویا طے کئے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن ایک دفعہ تو اپنی بات ان کے کانوں تک پہنچا کر رہوں، آخر میں تو حد ہو گئی، یعنی جب آپ کو معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے زبانی مکالمہ پر پنڈت جی تیار نہ ہوں گے، تو آپ کی طرف سے پنڈت جی کے پاس یہ پیغام پہنچا کہ

"مرضی ہو تو آئیے، مناظرہ تحریری ہی"

حضرت والا نے اپنے اس پیغام کو نقل کرنے کے بعد یہ اطلاع دی ہے کہ

"مگر جواب تو درکنار، پنڈت جی نے اپنی راہ لی۔ شکرم میں بیٹھ، یہ جا وہ جا" ص ۲

حقیقت تو یہ ہے کہ پنڈت جی کا ناقابلِ فہم گریز، اور سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا اس کے مقابلہ میں تعاقب حیرت انگیز، دونوں ہی کی حقیقت ایک معمہ کی سی معلوم ہوتی ہے۔ پنڈت جی کی سیدنا الامام الکبیر کی ملاقات خداشناسی کے میلے میں ہو چکی تھی، بیان کر چکا ہوں کہ دونوں میں انفرادی طور پر گفتگو بھی ہوئی تھی، آپ نے پنڈت جی کو روک کر کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن پنڈت جی یہ کہتے ہوئے کہ

"اب بھوجن کا وقت آگیا ہے اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا" ص۳۲ مباحثہ شاہجہاں پور

کچھ بھی ہو، دونوں میں گو نہ شناسائی بھی پیدا ہو چکی تھی، پھر میلے کے جلسوں میں حضرت والا کی تقریر کے سننے کا کافی موقعہ بھی پنڈت جی کو مل چکا تھا، آپ کی علمی قابلیت کا اعتراف بھی جیسا کہ نقل

کر چکا ہوں۔ پنڈت جی کر چکے تھے آپ کی افتاد طبع، فطری نرم مزاجی، صلح پسندی وغیرہ کے اندازہ کرنے کے لئے جن باتوں کی ضرورت تھی، جہاں تک میرا خیال ہے، ان کا مشاہدہ کہئے، یا تجربہ بھی پنڈت جی کر چکے تھے، باایں ہمہ رڑکی میں سامنے آنے سے پنڈت جی کیوں گریز کرتے رہے جیسے میرے لئے یہ سوال کچھ ناقابل حل سا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت والا کے طرز عمل کی صحیح توجیہ سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں۔ صرف اعتراضوں کا جواب ہی دینا تھا تو اس میں شک نہیں، بہتر صورت تو یہی تھی کہ جیسے مجمع عام میں پنڈت جی نے اعتراضات کئے تھے، جوابات بھی اسی مجمع عام میں ان کو اور مجمع والوں کو سنا دیے جاتے، لیکن جب اندازہ ہو گیا تھا کہ پنڈت جی اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں، تو اعتراض کے سننے والے مجمع کے سامنے جوابوں کی تقریر کافی ہو سکتی تھی، جیسا کہ بعد کو یہی کیا بھی گیا، خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"مجبور ہو کر یہ ٹھیرائی کہ جو ان کے اعتراض سننے والوں سے سنتے ہیں، ان کے جواب مجمع عام میں سنا دیں، مگر چونکہ یہ بات ایک جلسہ میں ممکن نہ تھی، اور ہم کو دربارۂ توحید و رسالت وغیرہ ضروریات دین (اسلام) بھی کچھ عرض کرنا تھا، اور بوجہ ہجوم بارش و خرابی راہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھیرنے کی گنجائش نہ تھی (اس لئے) ایک جلسہ میں تو ان تین اعتراضوں کے جواب سنائے جو سب میں مشکل تھے اور دو جلسوں میں توحید و رسالت کا ذکر کر کے شب بست و سوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا، اور ایک دن گنگوہ اور تین دن دیوبند ٹھیر کر سنائیسوں کو اپنی قصبہ فراز میں جس کو نانوتہ کہتے ہیں، اور اس خاکسار کا وطن بھی یہی ہے پہنچا"۔

حاصل جس کا یہی ہے کہ "پیرا دوجا" کا ابوس کن نظارہ پنڈت جی کی طرف سے جب پیش ہوا، اور یقین ہو گیا کہ شافہتہ ان سے مکالمہ کی کوئی صورت باقی نہ رہی، تو تین جلسوں میں رڑکی والوں کو مخاطب بنا کر تقریریں کی گئیں جن میں پنڈت جی کے اعتراضوں کے جوابات بھی دیے گئے، جو دوسروں نے حضرت والا تک پہنچائے تھے۔ چونکہ پنڈت جی کے ان اعتراضوں کا چرچا رڑکی کے سوا دوسری جگہوں میں بھی

پھیلا ہوا تھا۔ خصوصاً جہاں جہاں پنڈت جی نے تقریریں کی تھیں۔ ان لوگوں تک جوابوں کو پہنچانے کے لئے، اور شاید وس نے بھی کہ کتابی صورت میں ممکن ہے کسی نہ کسی شکل میں پنڈت جی تک بھی ان کے اعتراضوں کے جوابات پہنچ جائیں۔ آپ نے اپنی کتاب قبلہ نما مرتب فرمائی جیسا کہ دیباچہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

میاں دنانو تہ آکر یہ چاہا کر بنام خدا در بارہ اعتراض پنڈت جی صاحب اپنے ارادہ مکنون کو پورا کروں یعنی ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں، تاکہ اس نامہ سیاہ کے حق میں دعا کا ایک بہانہ ہاتھ آئے، اور خدا تعالیٰ کی عنایت اور رحمت و مغفرت کو اپنی کارگزاری کا موقعہ ملے، الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرا ارادہ پورا کیا، اور میری فہم نارسا کے اندازے کے موافق اعتراضات مذکورہ کے جوابات مجھ کو سجھائے۔"

اسی کے بعد پنڈت جی کے اعتراضات میں سے پہلے اعتراض کو بایں الفاظ نقل فرما کر یعنی،

"مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں، اور خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں، جو مسلمان جواب دیتے ہیں، بعینہ بت پرست کہہ سکتے ہیں، اس لئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں۔"

سیدنا الامام الکبیر نور اللہ قلوبنا بانوار علومہ و معارفہ نے جواب میں حقائق و اسرار کے سربمہر گنجینوں کو وقف عام فرما دیا ہے، صرف اسی اعتراض کا جواب "قبلہ نما" کے نام سے شائع ہوا، جس کے مضامین پر بحث کرنے کا موقعہ یہاں نہیں ہے کتاب اردو زبان میں ہے پڑھنے والے چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔ پنڈت جی کے باقی اعتراضات کیا تھے، ان اعتراضوں کے جوابوں کو قلم بند کرنے کا موقعہ حضرت والا کو ملا یا نہ ملا اس کا پتہ نہ چل سکا۔ قبلہ نما کے دیباچہ کی مذکورہ بالا عبارت خصوصاً یہ ارقام فرما کر "ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں" آگے یہ اطلاع جو دی گئی ہے، کہ

"الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرے ارادہ کو پورا کیا۔"

بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس اعتراض کے سوا پنڈت جی کے دوسرے اعتراضوں کا

جواب بھی زیر تحریر آچکا تھا، لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہ ہو سکا۔

مگر سچ یہ ہے کہ اسی ایک اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے۔ وہی بیسیوں اعتراضوں کے جواب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ اعتراض جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، کل تین سطروں میں ختم ہوگیا لیکن متوسط تقطیع کے ایک سو سولہ[۱۱۶] صفحات صرف اسی ایک اعتراض کے جواب میں اس لئے کافی ہوئے ہیں کہ سطریں حد سے زیادہ گنجان اور گھنی ہیں، ورنہ عام کتابت کے لحاظ سے جہاں تک میرا تخمینہ ہے کم از کم تین سو صفحات سے کم میں یہ کتاب ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

بہرحال پنڈت جی کا مسلمانوں پر کعبہ پرستی، اور کعبہ کی دیواروں کے پتھروں کی پرستش و عبادت کا الزام بجائے خود اس کی نوعیت جو کچھ بھی ہو، ان کے علم و فضل، فکر و نظر کے متعلق جو رائے بھی اس اعتراض کے سننے والے قائم کریں، لیکن ہم تو پھر بھی سپاس گذار ہی ہیں، کہ ان ہی کے بھڑکائے ہوئے شر سے خیر کا دروازہ ہم پر کھل گیا سیدنا الامام الکبیر نے ان کی اسی مضحکہ خیز اپج کے جواب میں حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قبلہ نما میں وقف عام فرمادیا، پس محرک اور باعث تو اس خیر کے پنڈت جی ہی ہوئے، ورنہ سچ یہ ہے کہ الکعبہ (یا اول[۱] المساجد) کی طرف رخ کرکے خالق کائنات کی عبادت

---

[۱] جیسا کہ معلوم ہے کہ مخلوقات نہیں، بلکہ خالق کائنات کی عبادت و پرستش کے لئے قرآن نے اطلاع دی ہے، کہ سب سے پہلا گھر وہی ہے جو مکہ یعنی وادی مکہ میں تعمیر ہوا، اسی لئے الکعبہ کو ہم اپنی سب سے پرانی مسجد سمجھتے ہیں، اس کی قدامت ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں البیت العتیق (پرانا گھر) کے نام سے بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ الغرض اپنی سب سے پہلی تاریخی مسجد کو مرکز بنا کر دنیا کے جس حصہ میں مسلمان پائے جاتے ہیں اسی کی طرف رخ کرکے نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ اسی لئے حدیثوں میں آیا ہے کہ جعلت لی الارض مساجد (زمین کا سارا کرہ ہی میری سجدہ گاہ ہے) یعنی الکعبہ کی مرکزی مسجد کا صحن بسیط ارض کو قرار دے کر نماز کا جہاں وقت آجاتا ہے ہم اپنی اس پرانی مسجد کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ لیتے ہیں، یا زمین کے کرے پر جہاں کہیں مقامی مسجد بناتے ہیں اس کو مرکز سے مربوط کرنے کے لئے رخ اس مسجد یعنی الکعبہ ہی کی طرف کرتے ہیں، اپنی عبادت میں مسلمان اسی لئے مشرق و مغرب شمال و جنوب وغیرہ سمت کے پابند نہیں ہیں۔ ہندوستان والے مغرب کی طرف رخ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے حساب سے یہ پرانی مسجد مغربی سمت میں واقع ہوئی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جہاں کے مسلمانوں کے لحاظ سے جس سمت پر بھی یہ پرانی مسجد واقع ہوئی ہے اسی طرف نمازوں میں ان کا رخ ہوتا ہے خود الکعبہ کی دیواروں کو صفوں میں

جو مسلمان کرتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اگر واقعی پنڈت جی اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمان کعبہ اور کعبہ کی دیواروں کو پوجتے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی ابتدائی اور عام بنیادی معلومات سے واقفیت حاصل کئے بغیر اسلام پر تنقید کرنے کے لئے وہ آمادہ ہو گئے تھے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ مسجدوں میں مسلمانوں کو نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھ کر آج تک کسی عامی سے عامی ناخواندہ ہندو کو بھی اس کا شبہ نہیں ہوا کہ مسجد کی دیوار یا دیوار کی اینٹوں کو مسلمان پوجتے ہیں، یا کھیتوں، میدانوں میں ان کی نمازوں کو دیکھ کر آج تک کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ سامنے کی ہوا، یا درخت پہاڑ وغیرہ جو نظر آتے ہیں، ان کی مسلمان عبادت کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ پنڈت جی جیسے آدمی کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آئی۔ سیدنا الامام الکبیر نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

"اگر خود پنڈت جی کو ایسی باتوں میں فرق کرنا نہیں آتا، تو یہ شہرۂ کمال کس خیال پر مبنی ہے؟" ص۲

حق تو یہ ہے کہ اسلامی دین سے اتنی ناواقفیت کا انتساب بھی پنڈت جی کی طرف مشکل ہے، اور نہ اتنی سبک مغزی، خوابیدہ دماغی کی ان سے توقع ہو سکتی ہے، جیسے ایک جاہل اور ناخواندہ آدمی کی طرف منسوب کرنے کی بھی ہم جرأت نہیں کر سکتے۔

بلکہ پنڈت جی کی ذہانت شاباشی اور داد کی مستحق ہے کہ جاہلیت و شرک، و بت پرستی کے تاریک ایام میں بھی سب کچھ پوج ڈالنے کے باوجود عرب کے جاہلوں کے دلوں میں بھی کعبہ اور ان پتھروں کی عبادت کا خطرہ نہ پیدا ہوا، جن سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی۔ ان اصنام اور بتوں یا مورتیوں کو تو وہ ضرور پوجتے تھے، جنہیں جہالت کے ان ایام میں کعبہ کے اندر انہوں نے داخل کر دیا تھا، لیکن جس عمارت میں ان کے یہ بت رکھے ہوئے تھے، اس کو قطعاً انہوں نے نہ کبھی پوجا اور نہ اپنا معبود سمجھا، اور وہی کیا، دنیا کی بت پرست قوموں نے شاید ان مندروں اور شوالوں یا بتخانوں کی

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) عمارت کا براہ راست سامنے ہونا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ تعمیری ضرورت یا کسی اور وجہ سے کعبہ کی یہ پرانی مسجد شہید بھی ہو جائے جب بھی نمازوں میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل کے لئے قبلہ نما مطالعہ کرنا چاہئے۔ ۱۲

عمارتوں کو کبھی نہیں پوجا، اور نہ معبود بنایا، جن میں اپنے بتوں کو وہ بٹھاتے تھے، یا آج تک بٹھاتے ہیں۔ گویا انسانی تاریخ میں پنڈت جی پہلے آدمی ہیں، جن کے سینے میں کسی معبد کی عمارت کی معبودیت کا انوکھا خیال جلوہ گر ہوا، اور اپنے دل کے اسی خودآفریدہ خیال کو غریب مسلمانوں کے سر انہوں نے منڈھ دیا، جیسے ان کا یہ ذہنی انتقال بے نظیر ہے، اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زائد ہی ان کی یہ دیدہ دلیری اپنی آپ مثال ہے کہ منڈھنے کے لئے کسی اور قوم کا نہیں، بلکہ مسلمانوں ہی کا سر ان کو موزوں نظر آیا، کچھ بھی ہو، پنڈت جی کو اتنا بھولا بھالا، سیدھا سادھا انجان یا طفل نادان کیسے مان لیا جائے کہ واقع میں کعبہ کو وہ مسلمانوں کا معبود سمجھتے تھے، پس صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے ارقام فرمایا ہے کہ

"اگر دیدہ و دانستہ یہ حال ہے، تو پھر کچھ اور احتمال ہے، میں کیا عرض کروں، عاقلاں خودمی دانند"

میں تو حضرت والا کے ان الفاظ میں حد سے زیادہ اجمال دیکھتا تھا کہ وہ ان مجمل الفاظ میں کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر مصلحتاً قلم روک لیا گیا، تاہم آخر میں

"عاقلاں خودمی دانند"

کا جو فقرہ بے ساختہ قلم مبارک سے نکل گیا ہے، مجھے تو اس میں کچھ الہام کا رنگ نظر آتا ہے، جس احتمال کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، قطعاً اپنے اصلی رنگ روپ میں اس وقت تک سامنے نہیں آسکتا، جب تک عقل انسانی ابھارے ہوئے جذبات کے بھپاروں کے نیچے دبی رہے گی۔

ہاں بچھوڑے جذبات کے بھپاروں کی گندگی سے ملک کے باشندوں کی عقلیت جب پاک ہو کر آزاد ہوگی، اور کبھی نہ کبھی تو بہرحال یہ ہو کر رہے گا، آج ہو یا کل، تب صحیح حقیقی قیمت حضرت والا کے الفاظ

"عاقلاں خودمی دانند"

کی پہچانی جائے گی، ورنہ اس وقت ہم جس حال میں ہیں، ملک کے اچھے اچھوں کو سعدی کے اس

مشہور شعر یعنی

چراغے کہ بیوہ زنے[سلہ] برفروخت

بسے دیدہ باشی کہ عالم بسوخت

کا مطلب سمجھانا آسان نہیں ہے مگر تاریخ گواہ ہے کہ کسی بڈھی بیوہ عورت کے جلائے ہوئے

سلہ ہائے بے چارے برج لال رعت کا وہ نوحہ کہئے یا بین اجس میں رونے والے نے یہ کہہ کہہ کر خود رویا اور دوسروں کو رلایا ہے۔

یہی دن ہے ہوئے جب ملک خستہ حال کے ٹکڑے ہوئے پنجاب کے ٹکڑے ہوئے بنگال کے ٹکڑے
اڑے تہذیب آدم کے سنہرے جال کے ٹکڑے گرے کٹ کٹ کہیں ماں کے کہیں اطفال کے ٹکڑے
یہی وہ دن ہے جب اغیار کی امید بر آئی سحر آئی وطن میں ظلمتیں لے کر مگر آئی

اور اسی کے بعد بے چارے کی یہ کراہ

یہی وہ دن ہے جس کے ساتھ ہی آئی قیامت بھی دلوں میں جاگ اٹھی نفرت بھی دیرینہ عداوت بھی
نہ کام آئی ہزاروں سال کی آپس میں الفت بھی وہ حشر اٹھا کر اب تک رو رہی ہے آدمیت بھی
جو ایوانوں میں رہتے تھے وہ بے گھر ہو گئے سارے جو اپنے وقت کے قارون تھے بے زر ہو گئے سارے

ہندوستان کی تاریخ کا سوال جب خالص عقلی تنقید کی روشنی میں کیا جائے گا تب عقل والے جانیں گے ان باتوں کو جنہیں آج ہم شاید سن بھی نہیں سکتے، یہ مسئلہ کافی طویل و تفصیل طلب ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے پنڈت جی کا بھی کچھ تعلق ہے، پہلے تو اسی کا سراغ لگانا پڑے گا۔ پھر پنڈت جی کی خود نوشتہ اور دوسروں کی لکھی ہوئی انگریزی ہندی اردو زبانوں کی سوانح عمریوں سے پنڈت جی کے نظری رجحانات کا پتہ چلانا، جب شیومت اور وشنومت کے چکر میں تھے اس وقت جے پور میں گھر گھر ادھم مچانا، وشنومت کی توہین و تحقیر میں اتنا غلو کہ راجہ صاحب جے پور کے اصطبل کے گھوڑوں کے گلے میں بھی شیومت کی نشانی رُدراکش کی مالائیں ڈلواتے پھرتے تھے۔ اس سلسلہ میں پنڈت جی کا انگریزوں کے بڑے بڑے عہدہ داروں مثلاً گورنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ سے ملاقات کر کے اس خیال میں امداد طلب کرنا کہ چھوٹے متوں (یعنی وشنومت کے سوا سارے متوں اور فرقوں) کو مٹانا چاہئے، یہ حال تو ابتدا میں تھا، پھر جب ہندو مذہب کے مختلف فرقوں کے دائرے سے باہر نکل کر میدان میں آ گئے اور اس کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا اور کہا ہے اس کا حاصل یہی تھا کہ جس مت کو پنڈت جی نے آریہ سماج کے نام سے قائم کیا ہے اس کے سوا کسی مت یا مذہب کے ماننے والے کو جینے کا حق نہیں ہے، خواہ وہ ہندو ہو مسلمان ہو عیسائی ہو سکھ ہو، یہ ایسی عام باتیں ہیں جو پنڈت جی کی سوانح عمریوں بلکہ خود نوشتہ تصنیفوں میں بھری ہوئی ہیں ۱۲

مٹی سے کے دیا سے شہر کا شہر خاک سیاہ ہو کر رہ گیا۔

بہر حال جس "احتمال" کے سمجھنے کے لئے عاقلوں کی ضرورت سیدنا الامام الکبیر نے محسوس کی ہے، یہ ایسی ضرورت ہے کہ جب تک صحیح معنوں میں عقل اپنی جگہ واپس نہیں ہوتی، لاکھ سمجھانے کی کوشش کی جائے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے، اور تو اور ایسے سنجیدہ دل و دماغ والے لوگ جیسے لالہ لاجپت رائے تھے ان تک کا خیال یہ ہو کہ

"سودیشی اور نان کوآپریشن کے اصول مہاتما گاندھی کے میدان عمل میں آنے سے بہت پہلے سوامی دیانند سے سیکھے تھے۔" دیانند اور ان کی تعلیم ص۱۳ بحوالہ اخبار بندے ماترم مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۰ء

گویا گاندھی جی کی تحریک کا رشتہ لالہ جی کے نزدیک پنڈت جی کے دل و دماغ سے ملا ہوا تھا اسی طرح گروکل کانگڑی کے سابق پرنسپل پروفیسر رام دیو بی۔اے جن سے ملاقات کا موقعہ فقیر کو بھی ملا تھا وہ بھی صاف صاف لفظوں میں لکھتے ہوں کہ

"مہاتما گاندھی تو سوامی جی کی پولیٹیکل فلاسفی کو صرف عملی صورت دے رہے ہیں۔"

(اخبار جیون تتو مورخہ ۷ر فروری ۱۹۲۰ء)

(درحالیکہ گاندھی جی اپنے بعض مضامین میں یہ لکھ کر چھاپ چکے ہیں کہ ستیارتھ پرکاش میں گندگی اچھالنے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ وہی مثل ہوئی کہ مدعی سست گواہ چست۔ محمد طیب غفرلہٗ)

جہاں یہ اور اسی قسم کی باتیں سمجھی اور سمجھائی جاتی ہوں، وہاں غریب عقل کے لئے راہ پانے کی امید ہی کیا کی جا سکتی ہے۔

پس مناسب یہی ہے کہ آنے والے عاقلوں کا انتظار کرتے ہوئے ہم بھی اس داستان کو سربمہر چھوڑ کر دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پنڈت جی سے براہ راست مکالمہ اور مخاطبہ کے مواقع کی تلاش میں سیدنا الامام الکبیر کے حد سے گذرے ہوئے اصرار کی یہ توجیہ کہ مسلمان کعبہ کے معبود اور مسجد کو

نہیں پوچھتے، پنڈت جی کے ذہن نشین ان مسائل کے ساتھ خصوصیت سے اسی مسئلہ کو کرنا چاہتے تھے، اور صرف اتنی سی بات سمجھانے کے لئے مرض وضعف کی حالت میں پندرہ سولہ دن تک رڑکی میں آپ ٹھیرے رہے، اس راہ میں پنڈت جی کی ابتدائی بینڈی شرطوں کو مسلسل تسلیم کرتے چلے گئے تاآنکہ آپ کی فطرت کے لحاظ سے آج بھی ہم جس کا تصور نہیں کر سکتے۔ یعنی اسی سلسلہ میں انگریز حاکم کی کوٹھی تک پہنچے، اور قیام امن کے سلسلہ میں امداد کے طالب ہوئے، خود سوچنا چاہئے کہ کس حد تک قرین عقل وقیاس توجیہ ہو سکتی ہے، یہی نہیں بلکہ پنڈت جی کی طرف سے "یہ جا وہ جا" کا تماشا جب پیش آیا، یعنی شکرم میں بیٹھ کر رڑکی سے روانہ ہو گئے۔ اور اس کے بعد آپ کو بھی مجبوراً رڑکی چھوڑنی پڑی۔ اسی کا ذکر فرماتے ہوئے یہ جو ارقام فرمایا گیا ہے۔

"بوجہ ہجوم بارش، وخرابی راہ وقرب رمضان شریف زیادہ ٹھیرنے کی گنجائش نہ تھی" ص۳

بظاہر ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ یہ وقتی رکاوٹیں اگر پیش نہ آجاتیں، تو آپ کے قیام کی مدت شاید اور بھی زیادہ دراز ہو جاتی۔ قبلہ نا ہی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ ابتداء ماہ شعبان میں آپ رڑکی پہنچے تھے، اسی کتاب میں یہ اطلاع آپ نے دی ہے کہ

"بست وسوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا"

گویا کم وبیش یہی سمجھنا چاہیئے کہ ماہ شعبان کا اکثر وبیشتر حصہ رڑکی ہی میں گذرا، اور موانع نہ پیش آجاتے خصوصاً قیام وصیام کا مہینہ رمضان سر پر نہ ہوتا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ پنڈت جی کے تعاقب کا یہ سلسلہ کہاں تک پہنچتا، اور پہنچتا کیا معنی؟ "جواب ترکی بہ ترکی" میں جن واقعات کی طرف اجمالی اشارے کئے گئے ہیں، افسوس ہے کہ تفصیلات کا تو ان کے علم نہ ہو سکا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد مقامات میں اس قسم کے فقروں کے ساتھ مثلاً

"پنڈت جی بھاگتے پھرتے ہیں، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کے پیچھے پیچھے ہیں" ص۵

یا دوسرے موقعہ پر اس مشہور شعر کو درج کرتے ہوئے، یعنی

ہم وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں

میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

حضرت والا کی طرف سے پنڈت جی کو خطاب کر کے لکھا ہے کہ

"غرض جس چال آپ چلتے ہیں، ہم بھی ساتھ ہی پیچھے چلے آتے ہیں" ۳۵

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عام ہتھکنڈا زیادہ تر مسلسل تعاقب کے ان مواقع میں پنڈت جی کی طرف سے جو استعمال ہوتا تھا، وہ وہی فساد اور ہنگامہ کے اندیشہ کا تھا، اسی کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں جس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"فساد کا وقت تو وہ تھا کہ پنڈت جی مجمع عام میں جی کھول کر مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے" ۳۶

اور زیادہ تر یہی صورت پنڈت جی نے اختیار کر رکھی تھی، لیکن سیدنا الامام الکبیر جب ان سے براہ راست گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے، رڑکی میں آپ سن چکے کہ علاقہ کا انگریز مجسٹریٹ امن و امان کی ضمانت دے رہا تھا، پھر رڑکی میں بھی انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی، یہی حال میرٹھ کا بھی تھا، ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"کوتوالیاں کنسٹیبل بکثرت، سالم پلٹن، رجمنٹ لال کرتی موجود، اس پر بھی پنڈت جی کو خوف ہو"

انگریزوں کے جلال و جبروت کی قوتوں سے اس زمانہ میں سارا ہندوستان کانپ رہا تھا بقول مصنف کتاب کے

"فرماں روائے لاہور، اور بادشاہ لکھنؤ، راجائے بڑودہ، اور کابل تو سرکار (انگریزی) سے عہدہ برآہی نہ سکیں"

آگے اسی کے بعد ان ہی کے الفاظ ہیں

"فساد کریں گے تو کون ؟ مولوی محمد قاسم صاحب جو مطبعوں کی مزدوریاں کر کے اپنا پیٹ پالیں" ۳۷

اسی کے ساتھ ان ہی کی یہ بات کتنی صحیح ہے کہ

"علاوہ بریں اگر فساد ہوتا تو اول مولوی محمد قاسم اور ان کے ہواخواہ گرفتار ہوتے پنڈت جی کو اتنا ہی کافی تھا کہ ہم تو پہلے کہیں تھے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کو جب ہم سوچتے ہیں، تو قسمت کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے مل کر گفتگو اور بات چیت کرنے سے کیوں کتراتے رہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ملنے کے بعد دونوں کے درمیان کن کن مسائل کا ذکر آسکتا تھا۔ آخر ڑکی ہی میں دیکھنے والوں نے اسی زمانہ میں جب دیکھا تھا، حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اس روایت کے راوی ہیں کہ رڑکی کا وہی انگریز مجسٹریٹ جس نے حضرت والا کو بلا کر ملاقات کی تھی، اور امن و امان کی ضمانت لی تھی، انیسویں صدی کا اسی انگریز نے اس وقت جو انگریزی قوم کے الحاد اور بے دینی کا گویا عہد شباب تھا، اسی نے باتوں باتوں میں سیدنا الامام الکبیر سے

"بارش کی کمی کی وجہ پوچھی۔"

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ جواب میں

"مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کر دیا کہ گناہ سبب ہیں کمی بارش کے۔"

یہاں تک تو خیر کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تعجب ہو، لیکن آگے حضرت تھانوی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"وہ (یعنی انگریز مجسٹریٹ) بہت ہی محظوظ ہوا، اور مولانا کے علم کا قائل ہوگیا، اور بہت اچھی طرح پیش آیا۔" قصص الاکابر ابادی ۵۳ ماہ جمادی الاولیٰ

ہم جب اس خبر کو پڑھتے ہیں، تو خیال گذرتا ہے، کہ انیسویں صدی میں جب ایک انگریز کو سیدنا الامام الکبیر یہ سمجھا سکتے تھے کہ بارش کی قلت اور قحط خدا کی نافرمانیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے علمی احترام کی وجہ آپ کی یہی تقریر بن سکتی تھی، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی سے براہ راست گفتگو کرنے کی کوشش میں سیدنا الامام الکبیر اگر کامیاب ہو جاتے تو آپ کے خیالات و احساسات سے پنڈت جی

بھی متاثر نہ ہوتے، اور جو رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، یا چڑھایا گیا تھا، ازالہ نہ بھی، شدت اور تیزی میں اس کے کچھ کمی نہ ہو جاتی،

لیکن جو واقعہ پیش ہی نہ آیا، اب اس کے ثمرات و نتائج کے متعلق کیا سوچا جائے۔ بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آئندہ ہندوستانی تاریخ میں ثریا تک جو دیوار اس لئے کج ہوتی چلی گئی، کہ پہلی[1] اینٹ ہی اس کی کج رکھی گئی، شاید اس کی کجی اس حد تک نہ پہنچتی، کہ بالآخر اپنے او پردہ خود گر پڑی گھر کے چراغ ہی سے گھر میں آگ لگ گئی، پرانا قدیم تجربہ ہے کہ سلائی سے جس چھرنے کے منہ کو بند کرنا ممکن تھا، جب جاری رہنے کیلئے وہی کھلا چھوڑ دیا گیا تو

"چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل"

ہاتھیوں سے بھی دیکھا گیا ہے کہ اس کی روک روک کا ناممکن نظر آ رہا ہے۔

آخر یہی انگریز مجسٹریٹ تو تھا، عرض کر چکا ہوں، کہ حضرت والا اور آپ کے رفقاء کی طرف سے ابتدائی احساس اسی کے دل میں بقول حضرت تھانویؒ یہ پیدا ہوا تھا کہ

---

[1] پہلے بھی کچھ اشارے کر چکا ہوں کہ ایک بڑا طبقہ کا جس میں ہندوستان کے اچھے لکھے پڑھے تعلیم یافتہ لوگ شریک ہیں۔ خیال تھا کہ ہندوستان میں سیاسی جدوجہد کی ابتدا پنڈت دیانند سرسوتی جی نے کی پروفیسر رام دیو جی۔ اسے تو ہندوستان کی پولیٹکل بیداری کا جنم داتا اور بانی مبانی پنڈت جی کو کہا کرتے تھے، (دیکھو اخبار جیون تتو مورخہ ۶ فروری ۱۹۲۴ء) ڈاکٹر ستیہ پال کی تقریر لاہور کے انگریزی اخبار ٹریبون میں چھپی تھی۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ جو محبان وطن اس سرزمین (ہند) میں کبھی پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑے محب وطن رشی دیانند تھے (اخبار مذکور مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۲۵ء) ایسے کلمے بھی شائع ہوتے رہے جن میں ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے بانی اول کی حیثیت سے پنڈت جی ہی کی تصویر کو سب سے اونچی جگہ دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ فرط عقیدت کو بھی دخل ہو۔ لیکن بعض وجوہ سے کلیۃً اس قسم کے دعووں کو بے بنیاد ٹھیرانا بھی شاید درست نہ ہوگا۔ جس کی تفصیل کا موقعہ میری اس کتاب میں نہیں ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کے لئے وہی کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم کا مطالعہ کیا جائے۔ مندرجہ بالا اقتباسات اسی کتاب سے نقل کئے گئے ہیں ۱۲۔

[2] خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

"دعوت خود سے آئے ہوں گے۔"

لیکن ملنے اور باہم بات چیت کرنے کے بعد ان ہی سے آپ سن چکے کہ

"مولنا کے علم کا قائل ہوا اور بہت اچھی طرح پیش آیا۔"

جب ایک انگریز جو غیر ملک، غیر قوم کا رہنے والا تھا، ہندوستان کی زبان بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا جب اس میں اس انقلاب کا مشاہدہ کیا گیا تھا تو پنڈت جی بہر حال اپنے گھر کے آدمی تھے سیدنا الامام الکبیر سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ان کے احساسات میں کسی تبدیلی کی توقع، بے معنی توقع کیوں قرار دی جا سکتی ہے ولکن ما قال واللہ فسوف یکون

سچ تو یہ ہے کہ اپنی حد تک سیدنا الامام الکبیر جو کچھ کر سکتے تھے، کوشش کا کوئی دقیقہ آپ نے اٹھا نہیں رکھا، بلکہ کہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا آخری حصہ شاید اسی کوشش میں صرف ہوا،

ذرا سوچئے تو یہی، رڑکی کا واقعہ تو خیر وفات سے تقریباً دو سال پہلے کا ہے، لیکن رڑکی کے بعد پنڈت جی کے تعاقب کے سلسلہ میں میرٹھ کی جس سرگذشت کی طرف کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں بایں الفاظ اشارہ کیا گیا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے پنڈت جی کو میرٹھ سے بھگا کر کہیں کا کہیں پہنچا یا۔" ۳۹؎

اسی کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہوئے کہ

"پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے، اور وہاں بھی ان کے وہی دعوے تھے۔"

مصنف امام نے آگے یہ خبر دی ہے کہ

"ہر چند مرض کے بقیہ، اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی، مگر ہمت کر کے (میرٹھ) پہنچے۔"

اور حسب دستور براہ راست مکالمہ اور گفتگو کے لئے آپ جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے لیکن بقول مصنف امام

"وہ (پنڈت جی) بہانہ وحیلہ کر کے وہاں سے کافور ہوگیا"

اگرچہ صحیح طور پر میرٹھ کے اس واقعہ کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا لیکن مصنف امام نے اسی کے بعد بیان کیا ہے کہ اسی زمانہ میں کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" خاص لب ولہجہ میں اس لئے لکھی گئی، کہ

"پنڈت کے بعض معتقدوں نے کچھ تحریر بجواب مولنا (نانوتوی) بے سروپا لکھی تھی، اور کچھ اوٹ پٹانگ مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کئے تھے، یہ رسالہ اسی کے جواب میں ہے"

پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولنا عبدالعلی صاحب مرحوم کی طرف کتاب کی تالیف منسوب ہے۔ اگرچہ علمی افادات اس کے خود حضرت والا کے ہیں۔

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" تقریباً اسی زمانہ میں لکھی گئی کہ جب میرٹھ میں پنڈت جی سے گفتگو کرنے کی کوشش سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جاری تھی، اب ہم دیکھتے ہیں جیسا کہ اسی کتاب کے آخر میں لکھا ہے۔

"نویں رمضان شریف ۱۲۹۶ھ کو لکھنا شروع کیا تھا، اور بحمد اللہ ۲۱ ماہ مذکور بروز سہ شنبہ ختم کیا" ص۵۹

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات کی تاریخ ۴ جمادی الاولے ۱۲۹۷ھ سے کم وبیش چھ سات مہینے پہلے یہ کتاب ختم ہوئی، گویا اس بنیاد پر سمجھنا چاہئے کہ میرٹھ میں پنڈت جی کے تعاقب میں آپ کی تشریف آوری بحالت مرض ونقاہت تقریباً

اسی زمانہ میں ہوئی۔ پھر اسی کتاب میں پنڈت جی کے نام یہ چیلنج بھی ہمیں ملتا ہے، یعنی لالہ استدلال جن کے مضمون کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ان ہی کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا کہ

"آپ پنڈت جی سے کہہ دیکھئے، ہزار منتیں کرو گے، تب بھی مباحثہ کی طرح مباحثہ پر مولوی محمد قاسم صاحب کے مقابلہ میں آمادہ ہو جائیں تو ہم جھوٹے تم سچے" ص۳۱

جیسا کہ معلوم ہے، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" لفظی حیثیت سے سیدنا الامام الکبیر کی تصنیف نہ ہو، لیکن معناً آپ ہی کی تصنیفات میں یہ کتاب شمار ہوتی ہے، کم از کم اتنی بات تو بہر حال مسلّم ہے۔ خود لوح کتاب پر بھی لکھا ہوا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے ایما سے یہ کتاب لکھی گئی، ایسی صورت میں مذکورہ بالا چیلنج کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ پنڈت جی کے نام سیدنا الامام الکبیر ہی کی طرف سے یہ چیلنج تھا تو اس کے سوا آخر اور کیا سمجھا جائے۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرٹھ کے تعاقب کا قصہ اگر وفات سے چھ سات مہینے پہلے پیش آیا تھا تو اسی پر قصہ ختم کہاں ہوا تھا، بلکہ اسکے بعد بھی پنڈت جی سے بلاواسطہ براہ راست مباحثہ و مکالمہ کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہی رہا، تا آنکہ دل کی حسرت سیدنا الامام الکبیر نور اللہ مرقدہ کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

حق تو یہ ہے کہ "عاقلاں خود می دانند" کے الفاظ سے پنڈت جی کے طرز عمل کے جس پہلو کی طرف حضرت والا نے اشارہ کیا ہے، اور کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو، لیکن خود ان کی عقل و دانش سے پنڈت جی کے طریقہ کار کا یہ پہلو کیسے مخفی رہ سکتا تھا، اور اس سے واقف ہونے کے بعد حساس دلوں میں قلق اور بے چینی، اضطراب اور بے کلی کی جو کیفیت بھی پیدا ہو، تو اسے پیدا ہی ہونا چاہئے۔[1]

---

[1] اور تو اور لالہ لاجپت رائے جیسے لوگوں نے لکھا ہے کہ لاہور میں دیانند اینگلو ویدک کے نام سے جو کالج قائم کیا گیا تھا اگر ویدک کا لفظ اس کے آخر میں بڑھا دیا گیا تھا جس سے بظاہر عوام پر یہ اثر ڈالا جاتا تھا کہ ویدک دھرم کی تعلیم کا خاص اہتمام اس کالج میں کیا گیا ہے لیکن یہ بیان کرتے ہوئے کہ گریبالڈی ایبزینی وغیرہ یورپ کے مشہور سیاسی خطیبوں کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہنے والوں سے ہیں نے جو یہ سُنا ہے کہ بالآخر یہی قصّت۔ عالم اسباب میں سیدنا الامام الکبیر کے لئے جان لیوا ثابت ہوا تو اس پر کم از کم مجھے تو تعجب نہ ہوا۔

بہر حال ہم تو مؤمن ہیں۔ ظاہر اسباب خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہم سے منوایا گیا ہے اور اسی کو ہم مانتے ہیں کہ

ما کان لنفس ان تموت الا باذن اللّٰہ کتابًا مؤجلا	نہیں ہے کسی جیتی جان کیلئے کہ وہ مرے مگر اللہ ہی کے حکم سے لکھے ہوئے مقررہ وقت کے مطابق۔

ایک کم بچاس یعنی (۴۹) سال کی نوشتہ عمر کے ساتھ زمین کے اس خاکی کرے پر سیدنا الامام الکبیر بھیجے گئے تھے اور اسی کتاب موجل" کے مطابق جس کے حکم سے آئے تھے' اسی کے اذن سے "الحیٰوۃ الدنیا" (پست زندگی) کو چھوڑ کر خیر وابقیٰ والی زندگی سے سرفراز ہوئے' بلکہ جس ظاہری سبب کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے' اس کے ماننے کی گنجائش بھی ایمان ہی کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے لیکن صحیح طور پر تفصیلات ہی کا علم نہ ہو سکا اور نہ کوئی کتابی شہادت ہی اس سلسلہ میں مجھے مل سکی۔ مگر ذکر کرنے والے چونکہ کبھی کبھی اس کا ذکر کرتے ہیں'

(گزشتہ صفحہ سے) سوانح عمریوں اور کارناموں سے طلبہ میں سیاسی ذہنیت کو ابھارا جاتا تھا۔ لالہ جی لکھتے ہیں کہ

دیانند ویدک کالج کے حسابات کی جانچ پڑتال اگر کی جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ اس کے کل اخراجات کا سوال حصہ بھی مذہبی تعلیم یا ویدک تعلیم کی اشاعت کے لئے خرچ نہیں ہوتا۔ (اخبار بندے ماترم مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۲۷ء)

جس کا مطلب یہی ہے کہ سیاسی کامیابیوں کے لئے مذہب کے نام کو استعمال کیا جاتا تھا' اور جس قسم کی سیاست پنڈت جی کے پیش نظر تھی۔ علاوہ ان کی کتابوں' ارمان کے پیروکاروں کی شہادتوں کے اس کا تماشا متھرا میں خود اس ملک کے ان ہندوؤں نے کیا' جو آریہ سماجی خیالات نہیں رکھتے تھے۔ شتابدی کے نام سے پنڈت جی کی صد سالہ برسی متھرا میں ۱۹۲۵ء میں منائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ پنڈت جی کے ماننے والے متھرا پہنچ کر بگل بجاتے تھے۔ لاٹھیاں لے کر مندروں میں زبردستی گھستے تھے اور اردوں پر دیانند جی کی جے لکھتے تھے' کرشن کی مورتی پر تاج رکھا ہوا تھا' جسے لاٹھی سے ڈھکیل دیا گیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سوامی دیانند جی اور ان کی تعلیم ص۱۷۰) باوجود ہندو نام کے موسوم ہونے کے جب ان کی درگت یہ بنائی گئی' تو اس ملک کے جو باشندے ہندو نہیں ہیں' ان بیچاروں کی خود ہی سوچئے' اس قسم کی تنگ ذہنیت میں کتنی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ ۱۲

اس لئے اجمالی اشارہ اس کتاب میں بھی اس کی طرف مناسب معلوم ہوا۔[لہ]

اب ہم اس قصہ کو ختم کرتے ہیں، اِدھر اُدھر سے معلومات جو کچھ بھی اس سلسلہ میں فراہم ہو سکیں وہ پیش کر دی گئیں، کچھ طول بیانی سے کام ضرور لینا پڑا، جس کی ضرورت اس لئے تھی کہ عام طور پر اس قصہ کو سیدنا الامام الکبیر کی زندگی، اور زندگی کے کارناموں میں وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا یہ واقعی مستحق تھا، میں خیال کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں انشاء اللہ واقعہ کی اصل حقیقت سامنے آ جائے گی اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں آپ کی حیاتِ طیبہ کی آخری منزل سچ پوچھئے تو اسی قصہ پر ختم ہوئی، اور عین ان ہی دنوں میں جب اس راہ میں آپ کی جد و جہد کا سلسلہ جاری تھا، "کتاب مؤجل" کی رو سے آپ کا وقت موعود آ گیا، اور اب دوبارہ اسی داستان میں ہم مشغول ہوتے ہیں جس کے ذکر کا وعدہ ذاتی حالات کو ختم کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔

ربیع الاول سوانح قاسمی جلد ثانی تمام ہوئی بحمد اللہ

لہ براہ راست حضرت والا کے نورِ چشم فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سے خاکسار نے یہ روایت سنی ہے کہ مرض الموت والی بیماری کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ سیدنا الامام الکبیر پر سحر کیا گیا ہے، سحر اور سحر سے متاثر ہونے کا عقیدہ اسلامی روایات کا عام اقتضاء ہے، خود ختمی مآب رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم تک کے متعلق صحیح بخاری میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، بعد کو بھی بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ خصوصاً ہندوستان کے خواجگان چشت میں حضرت بابا فرید اور سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہما کے متعلق مستند کتابوں میں ہم یہ پاتے ہیں کہ دونوں بزرگوں پر سحر کیا گیا، جس سے کافی تکلیف اٹھانی پڑی۔ کرمانی کی سیر الاولیاء میں جس کی تفصیل آپ پڑھ سکتے ہیں، خاکسار نے بھی اپنی کتاب مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت میں ان قصوں کا ذکر کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو مصنوعی روحانیت جس کا ترجمہ آج کل مسمریزم کیا جاتا ہے، اور نفسیاتی ورزش کے جو قدرتی نتائج ہیں، روحانیت کی اس مصنوعی اور جعلی شکل میں اور وہ روحانیت جو براہ راست تعلق باللہ سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں میں دوسری امتیازی وجوہ کے ساتھ بڑی مدد اس قسم کے واقعات سے ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو آسانی درمیان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے اپنے سرچشمہ کے لحاظ سے روحانیت کی یہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے قطعاً الگ ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مصنوعی روحانیت والے اپنے نفسیاتی کرشموں کو تعلق باللہ والی روحانیت رکھنے والوں کو متاثر کریں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی پہلوان کشتی گیری کا کرتب ہو کر کسی خدا پرست آدمی کو گرا دے لیکن پہلوان کے فن کو خدا پرستی پر اس سلسلے ترجیح تو حاصل نہیں ہوتی ۱۲